

نوا تین اور دو شیرازوں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین مطالعہ

مارچ 2020

www.pklibrary.com

Digitized by Google

سید 10

ادارہ 11

نادر و خاتون 240



72 گل ارباب
108 فرح بھٹو

عشق زادہ،
محراب دُور نہیں،

انشاجی 16



156 سنیہ غیر

عرق،

میری ڈائری سے امت الصبور 238



61 حمیرا شفیق

مریضِ دل،

66 قوۃ العین

معاقلہ فہمی،

98 غزالہ نگار اور کئی

راستے میں خیر ہوئی،

ہماتیں فرح محمد سے، شاین رشید 18



105 زارا ہنجرا

بکرلہ،

151 جیالا کے ناں تم بن مورا، عتبرین ولی

جیالا کے ناں تم بن مورا، عتبرین ولی

شہاب الدین شہا سے ملنا، شاین رشید 30

24 فائتہ رابعہ

195 قوۃ العین خرماشی

اندھا شیشہ،



233 علی یاسر

غزل
نظم

233 فاطمہ نجیب

34 راحت جبین

176 عفت حر

202 نرہ احمد

تتلی جیسا پیارا،
رنگد ریز میکر،
حکام،



234 رنگارنگ سلسلہ
250 خیریں و بریں



256 نفسیاتی ازدواجی الجھنیں
عبدلہ خان



237 آپ کی بیاض سے
خالہ جیلانی



258 بیوٹی بکس کے مشورے امت الصبر



234 آپ کا باورچی خانہ
زینہ خانم

252 موسم کے پکوان
خالہ جیلانی

مارچ 2020
جلد 47 نمبر 11
قیمت 70 روپے

راحت جیں



اس گھر میں دو بھائی زیر اور سرد اپنی بیویوں شمینہ اور ساجدہ کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ زیر اور ساجدہ کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا دانیال تھا۔ بیٹیوں کی شادی ہو چکی تھی جبکہ سرد اور شمینہ کی دو بیٹیاں تھیں روشانے اور زو بار یہ۔ روشانے کی منگنی دانیال سے ہو چکی تھی۔

زو بار یہ پورے گھر کی لاڈلی میٹرک میں پڑھ رہی تھی۔ پڑوس میں رہنے والا صائم، فائقہ اور ابراہیم کی اکلوتی اولاد تھا۔ زینبی اور صائم میں بچپن سے بہت دوستی تھی، دونوں لڑتے جھگڑتے بھی تھے۔ فائقہ کو زینبی کا یوں چھت پھلانگ کر اپنے گھر آنا اور صائم سے بے تکلف ہونا برا لگتا تھا، ان کے خیال میں وہ اب بڑے ہو گئے تھے، اس لیے زینبی کو خاص طور پر احتیاط کرنا چاہیے۔



صائم کالج کے دوستوں کی پارٹی میں زہی کو لے جاتا ہے۔ جہاں ایک دوست زہی سے فری ہوتا ہے پھر اس کا نمبر لے کر زہی سے بات کرتا ہے۔ زہی صائم کی غلط فہمی میں شہیر سے بات کرتی ہے اور تحفے وصول کرتی ہے، بتا چلتے پر



پریشان ہوتی ہے۔ صائم کا شبیر سے جھگڑا ہو جاتا ہے۔

زوباریہ کے کہنے پر صائم اپنا گٹار توڑ دیتا ہے۔ صائم اس سے معافی مانگتا ہے۔ زہی اس کے لیے اپنی پاکٹ منی سے گٹار خریدتی ہے۔ اور صائم کی بالکونی میں کارڈ کے ساتھ رکھ دیتی ہے۔ صائم جان لیتا ہے کہ یہ کس کا تحفہ ہے۔

صائم اور زہی چھت پر بارش میں بھجک رہے ہیں۔ قاتقہ وہاں آ جاتی ہیں اور زہی کا ہاتھ پکڑ کر اس کے گھر لے جاتی ہیں اور اس کے گھر والوں خاص طور پر ثمنہ کو کھری کھری سناتی ہیں۔ دانیال بھی وہاں آ جاتا ہے۔ قاتقہ دانیال کو کہتی ہیں کہ اپنے گھر کی عزت سنبالو۔ دانیال کہتا ہے کہ رانی ہے تو پہاڑ بنتا ہے۔ ثمنہ زوباریہ کو زمانے کی اونچ نیچ سمجھاتی ہیں۔ گھر پہنچنے پر صائم قاتقہ سے بحث کرتا ہے۔ ابراہیم بھی قاتقہ پر ناراض ہوتے ہیں۔ صائم زوباریہ کے گھر معافی مانگتے جاتا ہے مگر ثمنہ اسے سخت ستا کر دروازہ بند کر دیتی ہیں۔

روشانے کی شادی ہو رہی ہے زہی اداس ہے کہ اس نے تو تمام پروگرام صائم کے ساتھ بنائے تھے۔

سب کے سونے کے بعد زہی کھانا پلیٹ میں لے کر چکے سے بالکونی میں جاتی ہے صائم وہاں موجود ہوتا ہے۔ قاتقہ بھی ان کے پیچھے آتی ہیں اور سب کے دانیال کو اوپر بلائی ہیں، دانیال دونوں کو آ کر تھپڑ مارتا ہے اور زہی کو لا کر روشانے کے کمرے میں اس کے سامنے پھینکتا ہے۔

صائم گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ وہ اپنے دوست مراد کے گھر میں کپاٹن اسٹڈی کے بہانے رہتا ہے۔ اس کے والد کو پتا چل جاتا ہے۔ وہ مراد کا گھر چھوڑ دیتا ہے۔ ایک فون کال آتی ہے کہ صائم کو گولی لگی ہے۔ وہ ہاسپٹل جاتے ہیں تو پتا چلتا ہے گولی اس کے بازو کو چھو کر گزری ہے، وہ اسے گھر لے آتے ہیں۔ زہی کے لیے صائم کا رشتہ آتا ہے۔ وہ لوگ انکار کر دیتے ہیں۔ قاتقہ کے ہمراہ زہی کو بلایا جاتا ہے۔ وہ انکار کر دیتی ہے۔ صائم دنگ رہ جاتا ہے۔

صائم قاتقہ سے معافی مانگتا ہے کہ وہ اب اپنی پڑھائی پر توجہ دے گا۔ لیکن کچھ عرصے بعد وہ دونوں پھر ملنا شروع کر دیتے ہیں۔ تب قاتقہ ان سے کہتی ہیں کہ وہ دونوں دو تین سال ایک دوسرے سے نہیں ملیں گے۔ پھر وہ ان کا ساتھ دیں گی۔ صائم ماں سے وعدہ کر لیتا ہے کہ وہ ان کی بات مان کر پڑھائی پر توجہ دے گا اور زوباریہ سے ملے گا نہیں ابراہیم صاحب کہتے ہیں کہ انٹرنیٹ کے ہیں دور میں ایسا کیسے ممکن ہے۔ زوباریہ کو صائم پر غصہ آتا ہے کہ اس نے ماں کی بات کیوں مان لی۔ قاتقہ فون پر بات کی اجازت دے دیتی ہیں۔

روشانے اس بات پر بہت خوش ہوتی ہے کہ اب ان کے ملنے پر باندی لگ گئی ہے اور صائم کا کمرہ نیچے شفٹ کر دیا گیا ہے۔ زوباریہ ایک دن سب کی آنکھ بچا کر صائم کے گھر پہنچ جاتی ہے سرد صاحب بخار کی وجہ سے گھر میں ہوتے ہیں۔ روشانے غصے میں دروازے کی کتہنی لگا دیتی ہے اور باب سے کہتی ہے کتہنی کچھ تو دروازہ آپ کھولے گا۔ ثمنہ کو برا چلتا ہے تو وہ دم بخود رہ جاتی ہیں۔ زہی صائم سے مل کر واپس آتی ہے دروازہ بند دیکھ کر کتہنی بجاتی ہے۔ دروازہ پر زرد چہرہ لیے باپ کو کو دیکھ کر شرم سے زمین میں گر جاتی ہے۔ وہ موبائل لے کر چند مجزہ دیکھتے ہیں اور اندازہ لگاتے ہیں کہ وہ صائم سے کس حد تک رابطے میں ہے۔

گھر میں سب کو پتا چل جاتا ہے کہ صائم کا رشتہ زہی کی مرضی سے آیا تھا۔ سرد صاحب ابراہیم اور قاتقہ کے پاس جاتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم اتنی کم عمری میں اس کی شادی یا رشتہ نہیں کر سکتے۔ ان کے انکار پر وہ زوباریہ کا رشتہ طے کر دیتے ہیں۔ صائم کو مانا کے پائے دوسرے شہر بھیج دیا جاتا ہے۔

کتہنی کی رات سرد بیٹی کے لیے کھانا لے کر کمرے میں جاتے ہیں۔ وہ پوچھتے ہیں کہ وہ باپ یا صائم میں سے کسے چنے گی۔ صبح وہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ وہ زہی کی خوشی کا خیال کریں گے اس کی شادی صائم سے ہی کریں گے۔ زہی صائم سے رابطہ کر کے اپنی کتہنی کا بتائی ہے دونوں بھائی کرمانا کے پاس لاہور جا کر نکاح کا پروگرام بنالیتے ہیں۔ زہی اور صائم گھر چھوڑ دیتے ہیں۔

صائم اور زہی رات کے دو بجے مراد کے گھر پہنچتے ہیں۔ وہ انہیں اپنے سرورٹ کو ارٹھر میں رکھتا ہے۔ مراد کو زہی بہت بری لگتی ہے جو اپنے گھر والوں کو یوں دھوکا دے کر آ گئی تھی۔ سرد ہسپتال پہنچ جاتا ہے۔ ٹرین میں بیٹھنے کے بعد انہیں دانیال اور ابراہیم اسٹیشن پر نظر آتے ہیں۔ وہ ٹرین سے اتر کر چھپ جاتے ہیں۔

زہی اور صائم مسجد میں جا کر نکاح کرنا چاہتے ہیں لیکن مولوی صاحب منع کر دیتے ہیں کہ اتنی کم عمر لڑکی کا نکاح ولی

کے بغیر نہیں ہو سکتا۔

ایک ٹیکسی ڈرائیور انہیں اپنے گھر لے جاتا ہے۔ صائم اسے پیسے دیتا ہے وہ ان کا نکاح کروا دیتا ہے۔ پولیس اس کے گھر آ جاتی ہے۔ وہ دونوں وہاں سے بھی بھاگ جاتے ہیں۔

پانچویں قسط

دونوں نے ایک ساتھ گردن موڑ کر آنے والی گاڑی کو دیکھا..... اس میں کوئی بھی ہو سکتا تھا۔ کوئی اجنبی جو انہیں منزل تک پہنچا دے۔ یاد انیاں بھائی۔ انجام یا منزل ایک ہی تھی کہ زو بار یہ گھر پہنچ جاتی۔ اس بے درد و بے مروت موسم میں انہیں مزید خوار ہونا نہ پڑتا۔

صائم نے خود سے ہٹ کر زو بار یہ کے لیے سوچا..... سوچ کا وہ ایک لمحہ جب تیز بارش سرگوشی میں ڈھل رہی تھی۔ اور گاڑی تھی کہ وہاں سے گزرنے کو تھی۔ صائم نے ایک دم اپنے دونوں ہاتھ زو بار یہ کے گرد سے اٹھائے، پیروں پر گھوما اس سے قبل کہ زو بار یہ کچھ بھی سمجھتی۔ وہ گاڑی کے سامنے کود چکا تھا۔ بریک کی چمکھاڑ کے ساتھ بارش کا پانی اچھلا اور سارا منظر اوجھل ہو گیا۔

زو بار یہ کی حیات یوں ماؤف ہوئیں کہ اس کے لبوں سے چیخ تک نہ نکلی۔ بس دل اچھل کر خلق میں آیا اور سانس بند ہو گئی۔

بس ایک لمحے کو سارا منظر منجمد ہو گیا تھا۔

بارش ساکن ہوئی اور ہوائے دم سادھ لیا۔

پھر گاڑی والے کو ہوش آیا۔ کسی بھی نقصان کا اندازہ لگانے کے بجائے اس نے گاڑی پیچھے ہٹائی اور سائیڈ سے ہو کر نکل گیا۔ اس کے نکلنے ہی ہوا چمکھاڑی، بارش بے قابو ہوئی اور وہ جو بت نی پھٹی پھٹی نگاہوں سے سڑک پر پڑنے صائم کے بے حس و حرکت وجود کو دیکھ رہی تھی۔ دیوانہ وار بھاگتی ہوئی صائم کے پاس آئی۔
”صائم! صائم! آنکھیں کھولو۔“

زو بار یہ کی آواز جیسے بہت دور سے آرہی تھی۔ مگر اس آواز میں موجود خوف نے صائم نے ماؤف دماغ کو جھنجھوڑ ڈالا۔ تب ہی اس کے لبوں سے کراہ نکلی۔
”تم ٹھیک ہوتا۔“ صائم کو بری طرح جھنجھوڑتے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

”اگر تم نے اپنے خوف ناک پنجے مجھ سے دور نہ کیے تو یقیناً ٹھیک نہیں رہوں گا۔“ اس خوفناک اور تکلیف دہ لمحے میں بھی اسے مذاق سوچھا۔

زو بار یہ کی انگلی ہوئی سانس بحال ہوئی۔

”اب اٹھ جاؤ کہ اگلی گاڑی کا انتظار ہے۔“

اس طوفانی بارش میں پناہ گاہ ڈھونڈنا بھی مسئلہ تھا۔ صائم کو سہارا دینے کی کوشش میں وہ خود دوبار گری۔ لیکن کسی نہ کسی طرح وہ اسے کنارے تک لے ہی آئی تھی۔

☆☆☆

وہ ایک زیر تعمیر عمارت تھی۔ جس کے اندرونی حصے میں زیر و بلب جل رہا تھا۔ عمارت کے اس کمرے میں ابھی دروازے، کھڑکیاں نہیں لگے تھے اور کمرہ اینٹوں، بجری، سینٹ اور لکڑی سے اٹا تھا۔ ایک طرف بہت سے گتوں کا ڈھیر تھا..... صائم کے گھٹنوں پر شدید چوٹ تھی۔ جس کی وجہ سے چلنا بھی مشکل تھا۔ زو بار یہ بمشکل سہارا

دے کروہاں تک لائی..... وہ ان ہی گتوں پر دیوار کے سہارے بیٹھا تھا۔

”بہت درد ہو رہا ہے۔“

”نہیں، شوقیہ ہائے کر رہا ہوں۔ میری جان نکل رہی ہے یار.....“ اس نے عقب میں سرٹکانے کی کوشش کی تو کسی اینٹ کا کونہ سر پر لگا۔

”کیا مصیبت ہے یار، بس اسی کی کمی تھی۔“

”تم سے بیرو بننے کو کس نے کہا تھا۔ گاڑی کے سامنے چھلانگ لگا دی۔“ زو باریہ نے جھنجھلا کر اس کا سر سہلایا۔

”میں نے کہا۔ ویسے تو وہ گاڑی روکے گا نہیں۔ اسی طرح سہی، گھر تو پہنچیں گے۔“

”گھر پہنچنے سے پہلے اللہ میاں کے پاس پہنچ جاتے۔“

”ایسے تو نہ کہو۔ اچھی ابھی ہماری شادی ہوئی ہے۔“ زو باریہ کو دیکھتے صائم کو احساس ہوا وہ دونوں پوری طرح بھگ چکے تھے۔ بلکہ خچر رہے تھے۔

”تم پوری بھگ گئی ہو.....“ صائم نے فکر مندی سے ادھر ادھر دیکھا۔

”مجھے بہت ٹھنڈ لگ رہی ہے۔“ زو باریہ نے گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے۔

”اٹھ کر دکھو، شاید کوئی مطلب کی چیز مل جائے۔“ وہ خود بھی باتا عہدہ کاٹنے لگا تھا۔

”ہاں، یہاں مجھے ملیں گے۔ نرم گرم کابل اور بہت سے کپڑے۔“

”یار! طنز کرنا تو بند کرو۔ آئندہ گھر سے بھاگیں گے تو۔“

”ہاں، مجھے ساری زندگی یہی کام ہے کہ میں گھر سے بھاگتی رہوں۔“ زو باریہ نے بہت غصے سے اس کی بات کاٹی۔

”محبت میں تو اس سے بھی بڑے امتحان آتے ہیں۔ تم ابھی سے گھبرا گئیں۔“ صائم نے اپنی گیلی جیکٹ اتاری۔

”میں باز آئی ایسی محبت سے جو خوار کر کے رکھ دے۔“

صائم نے چونک کر دیکھا۔ محبوب کے لہجے میں بے زاری کی شکنیں تھیں۔ صائم نے یک دم اپنے اندر ڈھیروں ٹھکن کو اترتے محسوس کیا وہ بری طرح تھک گیا۔ اس نے مرے مرے انداز سے جیکٹ کی اندرونی جیب سے چیزیں نکالنی شروع کر دیں۔ موبائل..... نکاح نامہ..... دونوں چیزیں محفوظ نہیں تھیں..... زو باریہ اسے مصروف دیکھ کر کھڑی ہوئی اور ادھر دیکھنے لگی۔ کمرے کے کونوں میں تاریکی کا راج تھا۔

صائم نے احتیاط سے نکاح نامے کی تہہ کھولی..... اس ایک کاغذ کو پانے کے لیے انہیں کیا کچھ جھیلنا پڑا تھا۔ اس نے گردن گھما کر زو باریہ کو دیکھا..... وہ دونوں ہاتھوں کو آپس میں رگڑتے کونے کھدروں میں من و سلوی ڈھونڈ رہی تھی۔

صائم نے احتیاط سے نکاح نامہ ایک طرف رکھا۔ موبائل بھی بارش کی زد میں آ کر بے ہوش ہو چکا تھا۔ اس نے بیٹری نکال کر موبائل بھی ایک طرف ڈال دیا۔

”ایسی جگہوں پر مزدور لوگ جائے وغیرہ بناتے ہیں۔ دیکھو کوئی ماحس مل جائے۔“ صائم کی آواز کی بازگشت ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ زو باریہ چپختی چلاتی اس پر آگری۔

”ک..... کیا ہوا؟“ صائم نے بڑی پھرتی سے اسے اپنی پناہ میں لیا اور کسی نادیدہ مخلوق کے مقابلے کے لیے قریب ہی موجود لکڑی کھینچ لی۔

”ج..... چو ہاتھا۔“

”چو ہا.....“ صائم نے حیرت سے اس کو دیکھا۔ وہ گویا دابھریشن پر لگی تھی۔

”چو ہے یہ کون ڈرتا ہے یار۔“ ایسا کہتے ہوئے اس نے لکڑی نہیں چھوڑی تھی۔

”میں ڈرتی ہوں۔“ زوہار یہ نے کہا اور رو پڑی۔ صائم نے آہستگی سے لکڑی رکھ دی۔ وہ ابھی طرح جانتا تھا۔ یہ رونا چو ہے کے ڈر کی وجہ سے نہیں ہے۔ وہ نازک سی لڑکی تھک گئی تھی۔ مزید حالات کا جبر نہیں سہہ سکتی تھی۔

”زی۔“ صائم نے نرمی سے اس کے کیلے ہال سمیٹے۔

”ہر رات کے بعد صبح ہوتی ہے۔“

”رات بہت طویل ہو گئی ہے صائم۔“

”جانتا ہوں۔ اس رات کا ذمہ دار میں ہوں..... لیکن تمہاری صبح کا ستارہ بھی میں ہی بنوں گا۔“ زی نے سراٹھا کر اسے دیکھا۔

صائم نے دیوار کے سہارے کھڑے ہونے کی کوشش کی۔

”خود کو تکلیف مت دو۔“ زی نے اسے روکنا چاہا۔ مگر صائم نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اسے بہت تکلیف تھی مگر یہ احساس ہر تکلیف پر غالب آ گیا کہ وہ مرد ہے۔ اسے اس لڑکی کی حفاظت بھی کرنی ہے اور اسے ہر ممکنہ خطرے سے بھی بچانا ہے۔

زی بلیٹڈ حال ہی اسے ہمت کرتے دیکھتی رہی۔

وہ واقعی تھک چکی تھی۔

☆☆☆

چھوٹے سے گھر میں دو ہی تو کمرے تھے۔ کریم نے ان کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ مگر دانیال کے ساتھ سپاہی کے ایک ہی دھکے نے اسے سیدھا کر دیا۔

”بتا دوئے، دونوں کو کہاں چھپایا ہے۔“

”صاحب اکس کا پوچھ رہے ہیں۔“ کریم نے انجان بننے کی کوشش کی۔ کیونکہ نے شور مچانے کی کوشش کی۔

”بی بی ا خاموشی سے ایک طرف ہو جا..... مردوں کو بات کرنے دے۔“

انہیں بحث کرنا چھوڑ کر دانیال اس کمرے میں داخل ہوا جہاں صائم اور زوہار یہ ٹھہرے تھے۔ باہر کیونکہ کا شور، سپاہی کی گھڑکیاں اور کریم کی مٹیں شروع تھیں۔ دانیال بھی جانتا تھا، وہ اس طرح رات کے وقت کسی کے گھر داخل نہیں ہو سکتے۔ مگر زوہار یہ کے ملنے کی خبر نے اسے سارے قانون بھلا دیے تھے۔

بارش رک گئی تھی اور ابھی اس علاقے میں بجلی نہیں آئی تھی۔

دانیال کے موبائل کی ٹارچ روشن تھی۔

کمرہ خالی تھا۔ مگر پلٹتے پلٹتے اسے چار پائی پر رکھا زوہار یہ کا اسکارف نظر آ گیا۔ دانیال نے اسکارف ہاتھ میں لیا۔

”تو وہ دونوں یہاں تھے مگر اب جا چکے تھے۔“

لب بھینچ کر اسکارف ہاتھ میں جھٹکتے وہ باہر نکلا..... تیز بارش بوند باندی میں ڈھل گئی تھی۔ وہ سب کھلے آسمان تلے کھڑے تھے۔

”اس کا کوئی تصور نہیں۔ ہم نے کچھ نہیں کیا۔ اللہ کا واسطہ اس کو چھوڑ دو، یہاں کوئی نہیں آیا۔“

”کوئی نہیں آیا تو پھر یہ کیا ہے؟..... دانیال نے اسکارف سامنے کیا۔“

”یہ تو میری بیوی کا ہے۔“ دانیال کا تھپڑ کریم کی زبان بند کر گیا۔ اور سیکینہ تڑپ اٹھی۔

”کیوں ان نامرادوں کی خاطر مار کھا رہے ہو..... صاحب امیں بتاتی ہوں۔ وہ یہاں آئے تھے۔ بس رات گزارنا چاہ رہے تھے۔ پھر پتا نہیں کیا ہوا، دونوں آدمی رات کو اٹھ کر بھاگ گئے۔ صاحب قسم لے لو۔“

دانیال کی کھوپڑی میں لاوا پکتنے لگا۔

(بس رات گزارنا چاہتے تھے)

اسکارف کو صحن میں پھینک کر وہ گھر سے نکل گیا۔ پیچھے پیچھے سپاہی بھی۔

کریم نے سکون کا سانس لیتے پیشانی سے بارش اور پسینے کے قطرے صاف کرتے سیکینہ کو دیکھا۔ سیکینہ نے دونوں ہاتھ کریم کے بازو پر پوری قوت سے مارے۔

”کہتی تھی۔ مت پڑا اس فساد میں۔ اب آ گیا سکون۔“

”اچھا بس چپ۔۔۔۔۔“ کریم دھاڑا۔

”ہاں..... مجھ پر ہی زور چلتا ہے..... کیسے بھگی ملی بنا ان سے چپ رہیں کھا رہا تھا۔“

”تو نے بھی کھائی ہیں۔“ کریم نے ہاتھ اٹھایا تو سیکینہ نے بھاگ کر کمرے میں گھس کر کنڈی لگالی۔ اچھی طرح جانتی تھی۔ کریم نے اس بے عزتی کا احساس سیکینہ کی ہڈیاں سینک کر ہی نکالنا تھا۔

☆☆☆

کمرے کے درمیان چھوٹی چھوٹی لکڑیوں کی ڈھیری تھی۔ لکڑیاں چٹخیں تو فضا میں چنگاریاں بلند ہوتیں۔ زو بار یہ صائم کے کندھے پر سر رکھے خاموشی سے ان اڑتے ستاروں کو دیکھتی تھی۔ یہ ستارے ان ستاروں سے بہت مختلف تھے جو وہ صائم کے ساتھ بالکونی میں بیٹھ کر دیکھتی تھی۔ ان ستاروں کی نیلا ہٹ میں اس کے خواب جگمگاتے تھے۔ اور ان ستاروں کی تپش، حقیقت کی پہچان کرواتی تھی کہ حسین صرف خواب ہوتے ہیں۔ صائم کو توقع کے مطابق لائٹر مل گیا تھا..... اور یہ تھوڑی سی حدت ان کے ٹھٹھرتے وجود کو آسودگی بخشی تھی۔ صائم نے کمرے کی کھڑکی میں بڑا گتھا ٹھونس دیا۔ اب وہ دونوں اور آگ ہوا کی شوریدہ سری سے محفوظ تھے۔

”تھوڑی سی گرمی بھی کتنی بڑی نعمت ہے.....“ صائم نے گھبرا کر اس طویل خاموشی کو توڑنے کی سعی کی۔

زو بار یہ خاموش ہی رہی۔

”سو گئی ہو؟“ صائم نے آہستگی سے کندھا ہلایا۔

”نہیں.....“

”کیا سوچ رہی ہو؟“ وہ صرف بات کرنا چاہتا تھا تا کہ رات گزر سکے۔

”کاش تھوڑی سی چائے اور بسکٹ مل جاتے۔“ زو بار یہ کہنے پر صائم کو احساس ہوا وہ کس شدت کے بھوکے ہیں۔

”میری الماری میں بہت سے چاکلیٹ اور کوکیز رکھی تھیں۔“ صائم کو بھی یاد آیا۔

”نجن کی الماری میں ڈرائی فروٹ کے بھرے جادر رکھے تھے۔“ زو بار یہ کی آواز لڑکھرائی۔ یہ وہی جار تھے جنہیں سرمد نے کبھی خالی نہیں ہونے دیا تھا۔

”ان شاء اللہ ہم ناشتہ گھر جا کر کریں گے۔“ صائم نے خود کو تسلی دی۔

”تمہارا موبائل بھی نہیں چل رہا۔ ورنہ ہم دانیال بھائی کو بلا لیتے۔“ صائم زو بار یہ کی بات پر چل بھن گیا۔

”ہاں۔ تمہیں وہ اپنے ساتھ لے جاتے اور مجھ سے کہتے۔ بیٹا کل تمہارا ویکسہ ہے۔ ضرور شرکت کرنا۔“

”مگر ویسے کی دعوت تو لڑکے والے کرتے ہیں۔“ اس کی بات سمجھے بغیر زو بار یہ نے سادگی سے کہا۔
”اسٹوپڈ! تمہارا تو بس نہیں چل رہا کہ اڑ کر گھر پہنچ جاؤ۔“

”تمہارا دل نہیں چاہتا؟“ زو بار یہ نے سر اٹھا کر صائم کو دیکھا..... اور بہت غور سے دیکھا اس شخص کو پانے کے لیے اس نے کتنا بڑا رسک لیا تھا۔ سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ تب لگتا تھا۔ وہ صائم کی نہ ہوئی تو مر جائے گی۔ اور آج وہ اس کے کتنا قریب تھا۔ وہ اس پر پورا حق رکھتی تھی۔ اسے چھو سکتی تھی۔ مگر وہ پاگل دل جو اس کے نام کی مالا جپتا تھا۔ بالکل خاموش تھا۔

صائم ہلکا سا مسکرایا۔

”کیا تمہارا دل بے ایمان ہو رہا ہے.....“

”اسٹوپڈ! کوئی بات مت کرنا۔“ صائم کی بات نے من کو گدگدایا نہیں تھا۔ بلکہ وہ بے زار ہوئی تھی۔
”زی۔“ صائم نے ذرا سارخ اس کی طرف موڑا۔

”یہ رات، بارش، تنہائی، میں اور تم..... یہ غنیمت ہے۔“ زی نے اس کے لفظوں پر پیچھے ہٹنا چاہا۔ مگر صائم کے انداز میں اتنی سنجیدگی تھی کہ وہ خاموشی سے اسے دیکھے گئی۔ صائم نے اس کے بھرے بال سمیٹے۔
”میں ان لمحوں کو اپنے دل میں ہمیشہ کے لیے قید کر لوں گا۔ یہاں سے جانے کے بعد نجانے ہمیں کیا کچھ نہیں کرنا پڑے۔ ہو سکتا ہے کچھ عرصہ ایک دوسرے سے بات کرنا تو ایک طرف، ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہ پائیں۔“

”ایسا کیوں کہہ رہے ہو؟“ زی سی ڈر گئی۔

”تمہارے گھر والے تم پر زور ڈال کر یہ نکاح ختم کروانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔“

لکڑی چٹخی اور چنگاری اڑ کر زی کے پاؤں پر پڑی۔ زی کے منہ سے سسکاری نکلی اور اس نے پاؤں سمیٹ لیا۔ صائم نے اپنا ٹھنڈا ہاتھ اس کے پاؤں پر رکھ دیا۔ چنگاڑی اس کے ہاتھ تلے بچھ گئی..... مگر اس کی جلن کا ہلکا سا احساس دونوں نے محسوس کیا۔

”اور اگر یہ دباؤ تمہارے گھر والوں نے تم پر ڈالا تو۔“ زی نے پوچھا۔

”مجھ پر کسی کا زور نہیں چل سکتا۔ میں تو پورے کا پورا تمہارا ہو چکا ہوں۔“

”میں بھی.....“ زی نے صائم کا ہاتھ اپنے پاؤں سے ہٹا کر اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

☆☆☆

کمرے کے ماحول سے گھبرا کر روشانی کارڈور میں آ کر بیٹھ گئی تھی۔ سرمد صاحب کے پاس شمینہ موجود تھیں۔ وہ بے توجہی سے آنے جانے والوں کو دیکھنے لگی۔

”زندگی کتنی بدل گئی ہے۔“ بھاگتے دوڑتے، پریشان حال لوگوں، عجلت میں آتی جاتی نرسوں اور ڈاکٹروں کو دیکھتے اس نے سوچا۔ اتنے دنوں کی پریشان خیالی کو چھوڑ کر وہ کچھ مثبت سوچنا چاہتی تھی۔ یہاں سے گھر جا کر وہ پہلا کام کیا کرے گی؟ اپنا کمرہ صاف کرے گی، گل دان میں پھول سجائے گی، کوئی ایئر فریشر لیکن پھولوں کی موجودگی میں ایئر فریشر کی ضرورت ہی کیا ہے؟“

اس نے مسکراتے کی کوشش کی مگر مسکراہٹ سہی بچی کی طرح ہونٹوں کے گوشوں میں سمٹ گئی..... وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کا محبوب شوہر..... وہ جب بھی اس کا چہرہ دیکھتی تھی۔ محبت اس کی آنکھوں میں الہڑ مٹار کی طرح کھل کھیلنے لگتی تھی۔ مگر یہ گزرے زمانے کی بات تھی۔

وہ زمانہ جو تین دن قبل اسے ساتھ بہت کچھ سمیٹ کر لے گیا تھا۔ اب تو وہ سہم جاتی تھی۔
کیونکہ بظاہر خاموش دکھائی دیتے شخص کے اندر بلاوا ابل رہا تھا۔

”اس شخص نے کہا۔ وہ میرے گھر ایک رات گزارنے آئے تھے۔ اس بات کا مطلب سمجھتی ہو۔“ دانیال
پھنکارا۔ روشا نے اس بات کا مطلب نہیں سمجھنا چاہتی تھی۔ اس لیے کھڑی ہوئی۔ مگر دانیال نے اسے بازو پکڑ کر بٹھالیا۔

اکادہ کا لوگوں کی نظر بڑی، ٹھٹھکے پھر گزر گئے۔

”میں ان تک پہنچ گیا تھا مگر وہ میرے ہاتھ سے نکل گئے۔“

”میں ان کے بارے میں بات کرنا نہیں چاہتی۔“ روشا نے کہنا چاہتی تھی مگر لب سی لیے۔ وہ دانیال کی
بیوی تھی۔ اس کا مزاج خوب سمجھتی تھی۔ دانیال کو اپنے اندر کا غبار نکالنا تھا..... اور وہ ایک اچھی سامع تھی۔ ماں
نے ایک بات سمجھا کر بھیجا تھا۔

”مرد و عورت بحیثیت انسان برابر ہیں۔ مگر جب بات رشتے کی ہو تو ہمیشہ یاد رکھنا۔ گھر کا سربراہ مرد ہوتا
ہے۔ اور سربراہ سے مقابلہ نہیں کیا جاتا۔ جب شوہر غصے میں ہو تو عقل مند بیویاں بحث نہیں کرتیں..... گھر اکنواں
بن جاتی ہیں۔ جس کے اندر مرد کا سارا غصہ اتر جاتا ہے۔ اور جب وہ اپنے غصے کے کھنور سے نکل آئے تو پھر اپنی
کہو..... احساس دلاؤ کہ اس نے تمہارے ساتھ کتنا برا کیا تھا یقین جانو۔ وہ تمہاری سنے گا۔ شرمندہ ہوگا۔ گلے
سے لگا کر آنسو بھی پونچھے گا۔“

روشا نے اپنے ماں کی نصیحت گروہ سے باندھ لی۔ گھر اکنواں بن گئی۔ جس میں پھر اتنی گہرائی میں گرتے کہ
آواز تک نہ آتی تھی۔ وہ بولتے بولتے تھک گیا تو اسی کے سامنے رو پڑا۔
”میں کیا کروں روشا نے؟“

روشا نے کو دانیال پر ترس آ گیا۔ وہ تو گھر آنے والی عورتوں کی باتیں سن کر مر رہی تھی۔ اور دانیال کو تو باہر
نکلتا تھا۔

”چلیں، ابو کے پاس چلتے ہیں۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے گئی۔ شمیمہ سامان سمیٹ رہی تھیں۔
ڈاکٹر نے آج انہیں ڈسچارج کر دیا تھا۔ دانیال ان کا ہاتھ چوم کر تسلیاں دلا۔ سے دیتا گیا۔ وہ تسلیاں جو وہ خود کو
نہیں دے پاتا تھا۔ سرمد نے آنکھیں بند کر لیں۔
بن میں ہوتا تو ہمیشہ کے لیے کر لیتے۔
مگر بس میں ہی تو کچھ نہیں تھا۔

☆☆☆

”آج یار۔ رات تو بارش نے بے سوا دی کر دی۔ جسم ٹوٹ رہا ہے۔“
وہ چاروں آگے پیچھے عمارت میں داخل ہوئے۔ چاروں اپنے لباس، وضع قطع سے مزدور ٹائپ نشئی لگ
رے تھے۔ آج جمعہ تھا تو کام کی چھٹی تھی۔ مگر نئے سے نوٹا بدن نہ جمعہ دیکھتا ہے نہ ہفتہ، اتوار..... اور طلب
پوری کرنے کے لیے یہ بہترین جگہ تھی۔ یہاں اگلے چھ دن ان کی مزدوری لگنا تھا..... رحیم نے چٹائی کھینچ کر
بچھائی۔

”چل سلیم اتو پتے پھینٹ..... میں سگریٹ بناتا ہوں۔“
سب دائرے میں بیٹھ گئے۔ ایک نے جیب سے پڑیا نکالی احتیاط سے کھولی اور اسی احتیاط سے سگریٹ

بھرنے لگا۔

سلیم نے جتے پھینٹ کر بانٹے شروع کر دیے۔

پہلاکش ہی انگ انگ میں سرور بھر گیا۔ ٹوٹتے بدن کو قہر آنے لگا۔

”اب دے بھی دے۔“ دوسرے نے چھینے کی کوشش کی تو جلدی جلدی کش لگانے لگا۔

”کیوں سر رہا ہے۔ دے تو رہا ہوں۔“

”مر ہی تو رہے ہیں۔ اپنی محبوبہ کی جدائی میں۔“ اس نے سگریٹ کو چوم لیا تو سب کے قہقہے بلند ہوئے۔

صبح کی روشنی تھی یا اجنبی آوازیں۔

زوباریہ کی نیند ٹوٹی..... نجانے رات کے کس پہ آنکھ لگی تھی۔ جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ اس نے

چکراتے سر کے ساتھ سیدھا ہونے کی کوشش کی..... آگ بجھ کر رکھ ہو گئی تھی۔ اور صائم وہاں کہیں نہیں تھا۔

”صائم.....“ وہ گھبرا کر سیدھی ہوئی تو احساس ہوا۔ وہ اس پر اپنی جیکٹ ڈال کر گیا تھا۔ مگر وہ اسے تنہا

چھوڑ کر کہاں گیا تھا۔“

زوباریہ گھبرا کر اٹھی اور بنار کے، بنا سوچے سمجھے باہر کی طرف لپکی۔

☆☆☆

”آ..... ایک ہی کش نے جنت کی سیر کروادی۔“ فضل نے گہرا کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑا اور اسی

کے ساتھ اڑنے لگا۔

”پریاں اور دھواں۔“ سب نے سولہ نظروں سے ان میں مماثلت ڈھونڈنے کی کوشش کی..... پھر ہاتھ

برہا تھ مارتے بے ہنگم قہقہے لگانے لگے۔ زوباریہ کے قدم نامکمل ہال کے دروازے پر ہی رک گئے اور فضل کی

انگلی فضا میں منجمد ہو گئی۔

”حور.....“ اس نے حواس باختہ ہو کر اپنی آنکھیں مسلیں۔ مگر حور موجود تھی اور اتنے مردوں کو دیکھ کر اس کا

رنگ اڑا ہوا تھا۔

”ادئے ایہ توج مچ کی حور ہے۔“ سب کی گردنیں اس طرف مڑ گئیں۔

”کون ہے تو؟“ تاش..... نشہ و شہ سب بھول گیا۔

”ص..... صائم کہاں ہے۔“ زوباریہ کی آواز پھنس پھنس کر نکلی۔

”کون صائم؟“ ایک نے حیرت سے دریافت کیا۔

”وہی جس کے ساتھ رنگ رلیاں منانے اس ویران جگہ پر آئی تھی؟“ خباثت بھرا سوالیہ زوباریہ کو پتھر کی

طرح لگا۔ دوسرے نے داڑھی کھجاتے زوباریہ کو سر تا پا دیکھا۔

”وہ بھاگ گیا اور تجھے چھوڑ گیا ہمارے لیے۔“

زمین قدموں تلے لرزی۔

باقی تینوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ان کی آنکھیں بدلیں اور شکلیں بھی۔ معمولی مزدوروں

سے شیطان کا روپ دھارنے میں دیر کتنی لگتی ہے۔ زوباریہ اندر کی طرف بھاگی۔ تینوں نے ہیبانی کیفیت میں

ایک دوسرے کو دیکھا۔

فلکیسی بہت مشکل سے ملی تھی۔

صائم نے اسے کچھ دور ہی روکا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ فلکیسی والا انہیں اس عمارت سے نکلنے دیکھے۔ تقریباً

بھاگتے ہوئے وہ عمارت کے اندر آیا۔

ایک مشکل مرحلہ ختم ہو گیا تھا۔

دوسرا مشکل مرحلہ شروع ہونے والا تھا۔ وہ دوبارہ کو گھر لے جاتا..... فائقہ اور ابراہیم انہیں تنہا نہیں چھوڑیں گے۔ اس کا صائم کو یقین تھا۔ وہ ڈٹ کر ناشتہ کرتے، اپنے نرم گرم بستر پر لمبی ٹان کر سوتے۔ بعد کی بعد میں دیکھی جاتی۔ وہ مطمئن تھا۔ دوسرا مرحلہ اتنا مشکل نہ تھا۔

تب ہی دوبارہ کی چیخوں نے زمین و آسمان ہلا دیے۔ صائم کے اندر پہنچنے تک وہ چیخیں گھٹ کر رہ گئی تھیں کہ ایک کمر دراز گندہ ہاتھ اس کے ہونٹوں پر جما تھا۔ اس منظر کی وحشت صائم کے اندر اتر گئی۔

اس نے ایک طرف پڑی لکڑی اٹھائی۔ اور بل بھر میں وحشیوں کی طرح ان پر ٹوٹ پڑا۔ کس کے کہاں لگی

کیا ہوا؟ وہ بس چلا رہا تھا اور مار رہا تھا۔ وہ بد معاش ہوتے تو چاروں مل کر اسے گھیر لیتے۔

مگر وہ بزدل نشے باز نکلے۔ اکیلی لڑکی کو دیکھ کر شیر بننے والے گیدڑ کی طرح دم دیا کر بھاگے۔

صائم نے لکڑی پھینکی اور ہانپتا کانپتا زہی کے نزدیک گھٹنوں کے بل گرا۔ زہی گھڑی بنی بے حس و حرکت پڑی تھی۔ یہ بھی شکر تھا کہ وہ زیادہ دور نہیں گیا تھا۔ کسی بڑے نقصان سے پہلے لوٹ آیا تھا۔
”زہی! میری طرف دیکھو۔ میں آ گیا ہوں۔“

زہی اتنا ڈر گئی تھی کہ وہ جتنا اس کے قریب ہوتا۔ وہ اتنا دیوار میں سمٹی تھی۔ صائم نے اسے بری طرح جھنجھوڑ دیا۔

”مجھے دیکھو، میں تمہارا صائم ہوں۔“

زہی پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ پھر اس نے باہر جانے والے رستے کو دیکھا۔

”وہ جا چکے ہیں۔“ صائم نے تھک کر دیوار سے ٹیک لگائی۔ دوبارہ نے وحشت زدہ انداز میں صائم کو دیکھا۔

”آئی ایم سوری، میں تو بس.....“

”یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔“

”میں نے کیا کیا ہے..... میں تو بس۔“

”تم میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہو صائم۔“ دوبارہ یہ چلائی۔

”زہی!“ وہ ششدر سا رہ گیا۔

”تم مجھے اپنی ذمہ داری پر نکال کر لائے تھے اور اس دیرانے میں اکیلا چھوڑ کر چلے گئے۔ ابھی میرے ساتھ

کچھ ہو جاتا تو.....“

”زہی! خدا کا شکر ہے۔ کچھ ہوا تو نہیں خود کو سنبھالو۔“

”تم کتنے آرام سے یہ بات کر رہے ہو۔ شروع سے ہی تمہاری نیت غلط تھی۔ تم مجھے مانا کے گھر لے کر نہیں

جارہے تھے۔“ زہی کا گویا دماغ ہی الٹ گیا تھا۔

”کیا بکواس کر رہی ہو۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ تم صرف میرا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔“ زہی پھٹ پڑی تو صائم کا بھی دماغ الٹ

گیا۔

وہ کیسے اس پر اتنا گھٹیا الزام لگا سکتی تھی۔

”زوبار یہ! میں تمہارا سر پھاڑ دوں گا۔ میرا داغ خراب مت کرو۔ تم میرے ساتھ تھیں۔ میرے نکاح میں تھیں۔ میں نے تمہارا کیا فائدہ اٹھایا۔ ہاں اگر اتنی ہی بے اعتباری تھی تو مت میرے ساتھ آتیں۔“ غلطی ہو گئی۔“ وہ بھر کر کھڑی ہوئی۔

”غلطی تو مجھ سے ہوئی ہے۔“ وہ بھی کھڑا ہو گیا۔ دونوں دشمنوں کی طرح آمنے سامنے کھڑے اپنے تلخ لفظوں سے محبت کا دامن تار تار کر رہے تھے۔

”تم سے محبت کی۔ نکاح کے لیے سو سو پاؤ بیلے۔ مگر تم، تم اس قابل ہی نہیں ہو کہ تمہارے لیے اتنی تکلیفیں اٹھائی جائیں..... مجھے تم سے نکاح کرنا ہی نہیں چاہیے تھا۔“

”نکاح۔“ زمی نے لپک کر نکاح نامہ اٹھا کر صائم کی نظروں کے سامنے لہرایا۔ ”اس ڈرامے کی بات کر رہے ہو۔“ تم اسے ڈرامہ کہہ رہی ہو۔“

زمی نے اس کاغذ کے دو ٹکڑے کر کے صائم کے منہ پر دے مارے۔ ٹکڑے صائم کے چہرے سے ٹکرا کر نیچے گرے۔ وہ ہکا بکار رہ گیا۔

”تم نے نکاح نامہ پھاڑ دیا۔“

”مجھے گھر جانا ہے۔ اپنے لوگوں کے پاس..... جو میری حفاظت کر سکتے ہیں۔ جن کی نیت میں تمہاری طرح کھوٹ نہیں ہے۔“

”زمی! اس ٹوچ۔ جہاں دل چاہتا ہے چلی جاؤ۔ میں بے وقوف گدھا نہیں ہوں۔ جو تمہاری خاطر اپنا گھریا چھوڑ کر یہاں دھکے کھا رہا ہوں۔“

وہ مٹھیاں بھیج کر چلا گیا۔

بس پھر کہانی ختم ہو گئی۔

اک وحشت ناک لمحہ ان کی محبت کھا گیا۔

اک ذرا سی بے اعتباری، ساتھ نبھانے کے وعدے پر ساری ٹل گئی۔

صائم نے زمی کو جاتے دیکھا اور پھٹے ہوئے نکاح نامے کو۔

تو ساری خواری اس لیے تھی؟

وہ متحیر سانجھوں کے بل بیٹھ کر نکاح نامے کے ٹکڑے اٹھانے لگا۔ اس لیے گھر والوں کا مان توڑا تھا؟

اس نے دو کے چار ٹکڑے کرنا چاہے مگر محبت نے کرا کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس لیے سڑکوں پر دھکے کھائے تھے؟ بھوک کاٹی تھی ننگے فرش پر سوئے تھے؟ پتا نہیں وہ کس سے سوال کر رہا تھا۔

کہ جواب تو ہاتھ میں پکڑے دو کاغذ کے ٹکڑے تھے۔

☆☆☆

تیرا میرا رشتہ کچھ ایسا الجھا ہے
اس کو سلجھاتے سلجھاتے
اپنے دل کی پوری زخمی کر بیٹھا ہوں
رشتہ شاید سلجھ نہ پائے
لیکن اس کو سلجھانے کی دھن میں جاناں
سارے خواب بھلا بیٹھا ہوں
اپنا آپ گنوا بیٹھا ہوں

علاقے کی سڑکیں بارش کے پانی سے بھری تھیں۔ اور صائم اسے پاگلوں کی طرح ڈھونڈ رہا تھا۔ کہاں گئی ہوگی۔ اس کے پاس تو پیسے بھی نہیں ہیں۔ کہیں پھر کسی مشکل میں نہ پھنس جائے۔ صائم ہی جانتا تھا، وہ کتنی دور سے وہ ٹیکسی ڈھونڈ کر لایا تھا۔ جواب وہاں نہیں گئی۔

”ایک لمحے کو مجھ پر بھروسہ نہیں کیا اور چلی گئی میرے ساتھ ساری زندگی گزارنے۔“ اس نے غصے سے بارش کے پانی میں پاؤں مارا۔۔۔۔۔ تو گھٹنے کی چوٹ نے چٹخیں نکلوادیں۔۔۔۔۔ جسے وہ اب تک بھولا ہوا تھا۔“
”چلو، اچھا ہوا پتا چل گیا تم مجھے جھٹکتی کیا تھیں؟ ابھی تو آغاز ہی تھا کہ ساتھ چھوڑ دیا۔“
اس نے بے دردی سے چہرے پر آئے آنسو صاف کیے۔ جنہیں وہ اب تک بارش کی بوندیں سمجھ رہا تھا۔
حالانکہ بادل اس زمین کے حصے کا پانی لٹا کر کسی اور زمین کی پیاس بجھانے چلے گئے تھے۔
کبھی نے کالر سے پکڑ کر اسے دھکا دیا تھا۔ وہ پشت کے بل پانی میں گرا۔
”زیبی کہاں ہے۔“

”دانیال بھائی۔۔۔۔۔“

”میں نے کہا۔ زیبی کہاں ہے؟“ دانیال نے اس کا گلا دبوچ لیا۔

”میں نہیں جانتا۔“ اس نے اٹھنے کی سعی کی۔

”وہ تمہارے ساتھ بھاگی تھی اور تم کہہ رہے ہو۔ تم نہیں جانتے۔“ دانیال نے اسے اٹھنے نہیں دیا تھا۔ اس کا آدھا سر پانی میں ڈوبا تھا اور گدلا پانی اس کے کانوں میں جا رہا تھا۔

”وہ مجھے چھوڑ گئی ہے دانیال بھائی۔۔۔۔۔“ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رویا مگر سامنے اس کا ہمدرد نہیں۔۔۔۔۔ ایک غیرت مند بھائی تھا اور ایسے موقعوں پر ہمیشہ غیرت اندھی ہو جاتی ہے۔ دانیال نے اسے دھنک کر رکھ دیا۔ بھوک، بے آرائی اور چوٹوں سے نڈھال، محبت میں شکست خوردہ وجود۔۔۔۔۔ سہہ نہ سکا۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

اس کی ناک اور لیوں سے بہتا خون۔

دانیال کو احساس ہوا۔ وہ بہت زیادہ کر گیا ہے۔

☆☆☆

زوباریہ کو نہیں معلوم تھا۔ وہ اسی ٹیکسی میں گھر آئی تھی جو صائم اس کے لیے لایا تھا۔ بوڑھا ٹیکسی ڈرائیور اسے مصیبت زدہ جان کر حفاظت سے گھر کے دروازے پر چھوڑ گیا۔ کتنی دیر ہاتھ بے جان ہو کر پہلو میں گرے رہے۔

دستک دینے کی اہمیت نہ ہو رہی تھی کہ یہ دروازہ وہ خود پر بند کر کے گئی تھی۔ مگر سڑک پر کب تک کھڑی رہتی۔ دروازہ اس جزوقتی ملازمہ نے کھولا تھا جسے ساجدہ بھی گہوار کام زیادہ ہونے کی وجہ سے بلوایا کرتی تھی۔
”زوباریہ بی بی۔۔۔۔۔“ وہ زوباریہ کی حالت دیکھ کر ششدر سی رہ گئی۔

”مجھے اندر آنے دو آسیہ۔“ وہ اپنے گھر کے دروازے پر کھڑی گھر کی ملازمہ سے منت کرنے لگی۔
”آ جاؤ۔۔۔۔۔ میں کون ہوتی ہوں روکنے والی۔“ ملازمہ ایک طرف ہو گئی۔ زوباریہ اندر آ گئی۔ آسیہ نے عقب میں دروازہ بند کیا تو زوباریہ کے لیوں سے ایک گہری سانس خارج ہوئی۔ اس کی پناہ گاہ، اس کی جنت سامنے تھی۔

انسان کو جنت کی قدر اس وقت ہوئی جب جنت سے نکالا گیا اور یہاں تو اس نے خود اپنی جنت کو ٹھکرایا تھا۔
گھر کی روش پر کھڑے ہو کر زیبی کو لگا، پیروں تلے زمین بھی آگئی ہے اور سر پر آسمان بھی۔
وہ تین دن گویا کسی خلا میں گزرے تھے۔

”اف! باہر کی دنیا کس قدر ظالم ہے۔“

”واپس کیوں آگئی ہو زوباریہ بی بی؟“

آسیہ کے سوال نے زوباریہ کو احساس دلایا کہ وہ جیسی گئی تھی، ویسی واپس نہیں آئی ہے۔

”میں اپنے گھر آئی ہوں۔“

”بیٹی جب رات کی تاریکی میں گھر چھوڑتی ہے تو گھر گھر نہیں رہتا۔“ وہ آہستہ سے کہہ کر اندر کی طرف بڑھ گئی۔ زوباریہ کی ہمت نہ ہوئی فوراً اس کے پیچھے جائے۔ روش پر خشک پتے بکھرے تھے۔ لان کی گھاس پانی میں بھگی پڑ مردہ سی لگ رہی تھی۔ ابھی گھر کی صفائی شروع نہیں ہوئی تھی۔ غیب ویرانی کا احساس تھا۔ وہ بیرونی کاریڈور کی سیڑھی پر سر جھکا کر بیٹھ گئی۔

عقب میں جالی کا دروازہ بند تھا۔

پتا نہیں گھر میں کون تھا اور کون نہیں۔ وہ آسیہ سے ابو کے بارے میں ہی پوچھ لیتی۔ اندر جا کر کسی کا بھی سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ کسی نے ایک جھٹکے سے زوباریہ کا سراپا اٹھایا۔

”تم یہاں ہو تو وہ کہاں ہے؟“

فائقہ کی آنکھیں بتاتی تھیں، انہیں دوراتوں سے نیند نصیب نہیں ہوئی تھی۔

”میں نہیں جانتی۔“

”کیا مطلب نہیں جانتیں۔ تمہیں اندازہ ہے۔ ہم کس عذاب سے گزر رہے ہیں۔ اس کا باپ پاگلوں کی طرح شہر کی سڑکیں ٹاپ رہا ہے۔“

”وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ میں وہاں اکیلی تھی..... پھر وہاں کچھ غنڈے آگئے۔ انہوں نے میرے ساتھ.....“ زوباریہ کے لفظ بے ربط تھے۔ فائقہ نے غصے سے اس کا کندھا دبوچا۔

”مجھے کہانیاں مت سناؤ..... بتاؤ صائم کہاں ہے؟“

”میں اسے چھوڑ آئی ہوں۔ اس نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ وہ مجھے چھوڑ گیا تھا۔“ زوباریہ چلائی۔ عقب کا دروازہ کھلا اور روشانی باہر آئی۔ زوباریہ کو دیکھ کر متحیر سی کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

”آئی ایم سوری روشانی۔“ اس نے سر جھکا کر کہا اور روشانی کو ہٹا کر تیزی سے اندر چلی گئی۔ شاید اسے لگایہ چھوٹا سا سوری ان سب کے زخموں کا مداوا کر دے گا۔

”اس سے پوچھو، میرا بیٹا کہاں ہے؟“

”یہ آگئی ہے تو وہ بھی آگیا ہوگا۔“ روشانی نے کہہ کر پلٹ گئی۔ فائقہ تیزی سے گھر کی طرف بھاگی تھیں۔

☆☆☆

زوباریہ کے قدم جکڑے گئے..... تین دن پہلے وہ جس شخص کو دیکھ کر گئی تھی، وہ یہ شخص نہیں تھا۔ یہ وہیل چیئر پر بیٹھا لاغر، کمزور شخص..... جو اپنا ایک ہاتھ ہلانے سے قاصر تھا..... جو بولتا تھا تو اس کا جڑا ٹیڑھا ہوتا تھا۔

یہ شخص اس کا باپ نہیں تھا۔ انہوں نے زبانی سے کہا تھا۔

”بھئی کچھ غلط کرنے کے بارے میں سوچنا بھی مت، کیونکہ جب بیٹی کچھ غلط کرتی ہے تو باپ مر جاتے ہیں..... مرنے سکیں تو زندہ درگور ہو جاتے ہیں۔“

اور زبانی نے انہیں زندہ درگور کر دیا تھا۔

وہ بھاگ کر گھٹنوں کے بل گری اور ان کے پیر پکڑ کر معافی مانگنے لگی۔

سہ ماہ کا جسم جھٹکے کھارہا تھا۔ وہ اسے خود سے دور کرنا چاہتے تھے تب ہی شہینہ جیل کی طرح جھپٹیں۔ اسے

بالوں سے کھینچ کر دوبارہ پھینکا۔

”دفع ہو جاؤ..... دور ہو ہماری نظروں سے..... ہمارے لیے تم مر چکی ہو۔“ غم و غصے سے ان کی آواز پھٹ گئی۔

”امی! مجھ سے غلطی ہو گئی۔ مجھے معاف کر دیں۔“ زو بار یہ زمین پر گری بلک رہی تھی۔ مگر کسی کو اس پر ترس نہیں آ رہا تھا۔

”تو اس قابل ہے کہ تجھے معاف کیا جائے..... جا..... اسی کے ساتھ جا کر مر..... جس کی خاطر ہمیں مارا تھا۔“ ثمنینہ کی آواز پھٹ گئی۔

”ابو۔“ روشا نے بھاگ کر باپ کے پاس آئی۔ وہ بلک بلک کر رو رہے تھے۔ جھٹکے کھا رہے تھے۔ زو بار یہ کو نظروں سے دور جانے کو کہہ رہے تھے۔ روشا نے اسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹا۔

”بتائی امی..... تایا ابو.....“ وہ سب کو پکار رہی تھی۔ مگر سب نے منہ پھیر لیا۔ روشا نے اسے کمرے میں دھکا دے دیا۔

”اگر چاہتی ہو کہ ہمارا باپ ہمارے لیے زندہ رہے تو ان کے سامنے مت آنا۔“ وہ جہاں گری تھی، وہاں سے اٹھی نہیں اور روشا نے دروازہ بند کر کے وہاں سے چلی گئی۔ زو بارہ نے سر اٹھا کر دیکھا۔

یہ اسٹور روم تھا۔ یہاں گھستے ہی اسے چھینکیں آنے لگتی تھیں۔ کبھی سب خواتین مل کر یہاں کی صفائی کرنے لگتیں تو وہ آنے بہانے سے کھسک جاتی۔ مگر اب اسے یہ گھر کا سب سے محفوظ حصہ لگ رہا تھا۔ وہ اپنے گھر میں تھی.....

اسنے لوگوں میں..... گھر والوں کا نفرت بھرا رویہ اور ہنک آمیز انداز اسے دکھی کر گیا تھا۔

”اگر ابو نے معاف کر دیا تو سب کر دیں گے۔“

اس نے تھک کر پرانے پڑے میٹرز پر گردن ٹکا دی۔

اسے نیند آرہی تھی۔

☆☆☆

”آپ کیسے اسے اس گھر میں قبول کر سکتے ہیں؟ آخر وہ یہاں آئی ہی کیوں..... ابو! اسے اس گھر سے نکالیں..... ورنہ میں نکال دوں گا۔“ دانیال غصے سے پھر رہا تھا۔

ساجدہ اور زبیر نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ روشا نے توکل سے باپ کے ساتھ لگی تھی۔

”تو پھر تین دن سے اسے گھر واپس لانے کے لیے خوار کیوں ہو رہے تھے۔ گھر سے نکالنے کے لیے.....“

ساجدہ نے بے زاری سے کہا۔

”آپ لوگوں نے دنیا والوں کی باتیں نہیں سنیں۔“ زبیر صاحب نے طویل سانس لے کر بیٹے کو دیکھا۔

”بہرا نہیں ہوں، سن رہا ہوں۔ لیکن کیا کروں؟ جب لوگوں کے ہاتھ میں کالک آئی ہے تو ہمارے منہ پر ہی ملیں گے۔“

”بس بیٹھ کر منہ کالا کرتے رہیں۔“ دانیال زچ ہو کر خود بھی بیٹھ گیا۔

”فیصلہ تو اس کے ماں باپ نے کرنا ہے، ہم کیا کر سکتے ہیں۔“ ساجدہ نے جھل سے سمجھایا۔

”واہ، کیا بات ہے۔ ساری زندگی اس گھر کے فیصلے آپ لوگوں نے کیے..... تو اب یہ بے بسی کیوں؟“

دانیال نے تعجب سے ماں باپ کو دیکھا۔

”کیونکہ یہ اولاد کا معاملہ ہے۔“

”ٹھیک ہے تو پھر آپ لوگ بھی سن لیں، اگر چاہا، چاہی نے اپنی بے غیرت اولاد کو گھر میں رکھتا ہے تو پھر ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔“ وہ حسی لہجے میں کہتا کھڑا ہوا۔

”میں دونوں پورشن الگ کر دوں گا۔“

ساجدہ اور زبیر صاحب نے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھا۔

”اب کریں تو کریں کیا؟ لڑکی ذات کو گھر سے بھی نہیں نکال سکتے۔“ زبیر صاحب نے بے بسی سے کہا۔

”بدنامی کی اس پوٹ کو گھر میں رکھ کر بھی کیا کریں گے۔ کچھ نہ کچھ تو سوچنا ہی ہوگا۔ یہاں تو دانیال اسے رہنے نہیں دے گا۔“ ساجدہ نے کہا تو زبیر صاحب گہری سوچ میں ڈوب گئے اور بہت سوچ سمجھ کر انہوں نے ٹمپینہ اور سرمد سے وہ بات کی تھی۔

”ہم کچھ کہنے کے قابل کہاں رہے ہیں بھائی جان! جو مناسب لگتا ہے کر لیں۔“

ٹمپینہ نے سرمد کو دیکھتے ہوئے تھکے تھکے لہجے میں کہا تو سرمد نے آنکھیں بند کر کے گویا تائید کر دی تھی۔

زبیر صاحب نے بھائی کا ہاتھ تھپتھپایا۔

”ہر تار کی کے بعد روشنی ہے۔ اللہ بہتر کرے گا۔“

☆☆☆

دردازہ کھلاتو پتا چلا باہر گلابی سی صبح پھیلی ہے۔ اسٹور کا دردازہ چکی سی راہداری میں کھلتا تھا جہاں سے لان کا کچھ حصہ دکھائی دیتا ہے۔ وہ ننگے پاؤں راہداری میں سیدھی چلتی گئی اور لاؤنج کی کمر کی میں آکھڑی ہوئی۔ پردے ہٹا دیے گئے تھے۔۔۔۔۔ اسے ایک طرف موجود ناشتے کی میز دکھائی دے رہی تھی۔ دانیال، ساجدہ اور زبیر صاحب۔۔۔۔۔ بھی وہ بھی اس منظر کا حصہ تھی۔

زوباریہ نے آنکھوں کے کونے صاف کیے۔ موقعہ اچھا تھا۔ وہ خاموشی سے باپ کے کمرے میں داخل ہو سکتی تھی۔ وہ مڑنے لگی تھی کہ کچن سے روشانے ٹرے اٹھائے نکلی۔ دانیال نے اسے اشارے سے روکا۔

”کہاں جا رہی ہو؟“

”ابو کو ناشتا کروانے۔“

دانیال نے ٹرے میں موجود لوازمات دیکھے تو لہجے میں طنز درآیا۔

”مریض نے آلیٹ، پرائٹا کھانا شروع کر دیا ہے۔“

”وہ۔۔۔۔۔ یہ امی کے لیے۔۔۔۔۔“ روشانے ہکلائی۔

”جاؤ بیٹا۔“ زبیر صاحب نے اس کی مشکل آسان کی۔

زوباریہ کی آنکھیں پھر سے بھیگ گئیں۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی، امی بھی آلیٹ پرائٹا نہیں کھاتی تھیں۔ وہ سادہ روئی دہی کے ساتھ کھاتی تھیں۔

بہنیں آخر بہنیں ہی ہوتی ہیں۔۔۔۔۔

تب ہی آسیہ بھاگی آئی۔

”صاحب جی! باہر پولیس آئی ہے۔ دانیال صاحب کو بلارہی ہے۔“

”پولیس۔۔۔۔۔ پولیس کیوں آئی ہے۔۔۔۔۔“ ساجدہ بیگم نے دہل کر دانیال کو دیکھا۔

دانیال نے اطمینان سے ہاتھ صاف کیے۔ غیپکن پھینکا اور کھڑا ہو گیا۔

”مار کر پھینک آیا تھا اس عاشق کی اولاد کو۔۔۔۔۔“

زبیر اور ساجدہ کے کلیجے منہ کو آ گئے۔

روشانے کے ہاتھ سے ٹرے چھوٹی..... سنہکستی ہوئی نیچے گری۔
اور رعی زو بار یہ..... تو وہ دیوار کے ساتھ کھسکتی ہوئی نیچے گری۔

جب سے آئی تھی تو ایک لمحے کو بھی صائم کا خیال نہیں آیا تھا..... اور اب..... اس کے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ اسی سنسناہٹ میں صائم کی آواز نمایاں ہوئی۔

”مجھے پورا یقین ہے تم آج کے دور کی صاحبان ثابت ہوگی۔“

”صاحبان کون؟“ کون کھاتی زو بار یہ نے حیرت سے پوچھا۔ اس دن صائم نے بلیک پیٹ پروڈکٹ ٹی شرٹ پہنی تھی جس پر آئی ایم یور پریس لکھا تھا اور سورج اس کے عقب میں ڈوب رہا تھا۔
”جس نے اپنے بھائیوں کی خاطر مرزا کے ہتھیار چھپا دیے تھے۔ کم بخت نے عین وقت پر دھوکا دیا۔“
صائم کو ساری لوک داستانیں از بر تھیں۔

”میں دھوکا نہیں دے سکتی۔ زندگی دے دے تو پتا نہیں۔“ سورج اس کی جھیل جیسی آنکھوں میں ڈوب گیا تھا اور ساتھ ہی صائم کا دل بھی۔

”ایسی باتیں مت کرو۔ تم پر آنچ آنے سے پہلے میں اپنی جان دے دوں گا۔“ صائم نے تڑپ کر کہا۔

روشانے زو بار یہ کا کندھا دبوچ لیا۔

”کتنی منہوس ہو رہی! تمہاری نخوست پورے گھر کو کھا جائے گی۔ دانیال کو پولس لے گئی۔ تمہاری وجہ سے وہ قاتل بن گیا۔“

وہ چلا رہی تھی۔ زہی اس کے ہٹے ہونٹ دیکھ رہی تھی مگر آواز صائم کی سن رہی تھی۔
”تمہیں دیکھ کر احساس ہوتا ہے..... محبت کتنی خوب صورت ہے۔ میں تمہیں دیکھ کر مکمل ہو جاتا ہوں

زہی!“

روشانے نے دوبارہ اسے جھنجھوڑا تو وہ بے ہوش ہو کر اس کے ہاتھوں سے نکل گئی تھی۔

☆☆☆

”غلبی دونوں سے ہوئی ہے..... اور دانیال بہت جذباتی لڑکا ہے۔ میں اس کی طرف نئے معافی مانگتا ہوں۔“ ہسپتال کے کارڈور میں زہیر صاحب..... ابراہیم صاحب کے سامنے کھڑے تھے۔ بکھرے بال، سرخ آنکھیں اور حواس باختہ ابراہیم..... بیٹے کو جس حال میں پایا تھا گویا کسی نے کلیجہ بوج لیا تھا۔
”دانیال کو پولیس نے پکڑا تو میرے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ وہ جوتوں سے چور چور ہسپتال کے بیڈ پر پڑا ہے..... اس کے جسم کی کوئی ہڈی ایسی نہیں جو فریچر نہ ہوئی ہو۔ جانتے ہو وہ ہمارا کیا ہے.....“ ابراہیم کی آواز پھٹ گئی تھی۔

”وہ میرا بیٹا ہے زہیر..... میری کل کائنات!“

زہیر کا سر جھک گیا۔

”میرا کلوتا جوان بیٹا مر رہا ہے زہیر.....!“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

زہیر صاحب نے تسلی دینے کے لیے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھنا چاہا تو ابراہیم نے تڑپ کر زہیر کا ہاتھ

جھٹکا۔

”کیا تصور تھا میرے بیٹے..... اس نے اغوا کیا تھا؟ زبردستی لے گیا تھا؟“

”جانتا ہوں اس میں ہماری اولاد کا بھی تصور ہے۔“

”تم دعا کرو..... میرا بیٹا بچ جائے۔“ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ رگڑا۔

”ورنہ..... تمہارے بیٹے کو پھانسی لگنے سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔“
”ایم ایہم.....“ زیر صاحب تڑپ اٹھے۔

”یہاں سے چلے جاؤ..... میرے ضبط کا امتحان نہ لو۔“
وہ جی سے کہہ کر وہاں سے چلے گئے۔ اگلوتے بیٹے کو پھانسی لگنے کے خیال نے انہیں کچھ اور بوڑھا کر دیا۔
واپسی کے لیے مڑے تو کمر جھک گئی تھی۔ قدم من من کے ہو گئے تھے۔ اس رات پورے گھرنے رو رو کر صائم
کے زندہ بچ جانے کی دعائیں کی تھیں۔

اور زو بار یہ کمرے میں رو رو کر مر رہی تھی۔ دانیال سے پوچھ گچھ کے بعد پولیس نے اسے گھر جانے دیا۔
جب تک صائم ہوش میں آ کر بیان نہ دیتا، وہ آزاد تھا۔
زو بار یہ لڑکھڑاتے قدموں سے باپ کے کمرے تک پہنچی۔
کیا ملا محبت میں؟

یہ کمزور بیمار باپ.....

صائم کی موت.....

دانیال کی پھانسی.....

اس کی خواہش کی تکمیل میں کون کون عذاب جھیل رہا تھا۔

جبکہ یہ خواب بچا تھا نہ اس کی تکمیل کی خواہش۔

”ابو! یہ میں نے کیا کر دیا..... ابو! یہ میں نے کیا کر دیا.....“ وہ ان کے پیر پکڑ کر بلک رہی تھی۔ نماز پڑھتی
ثمینہ کے سر پر اس کی آواز ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھی۔
انہوں نے بمشکل سلام پھیرا۔

”سب کی ذمہ دار میں ہوں ابو..... میری وجہ سے آپ کی یہ حالت ہوئی..... میری وجہ سے صائم مر گیا.....
میں کتنی بری ہوں.....“

ثمینہ خاموشی سے اسے ہلکتے دیکھتی رہیں۔

”ٹ..... ثمینہ.....“ سرمد کر لائے۔

زو بار یہ کے نرم ہاتھ ان کے پیروں کو کاٹ رہے تھے۔

اس کے آنسو اندر باہر آگ لگا رہے تھے۔

”وہ ابھی زندہ ہے۔“ ثمینہ کی آواز نے اس کے آنسوؤں پر بند باندھ دیا۔ زو بار یہ نے گردن موڑ کر ثمینہ
کو دیکھا۔

وہ جائے نماز کو تہ کر کے سرمد کے پاس آئیں۔ رومال اٹھا کر ان کے آنسو صاف کرنے لگیں۔

”اب تم جاؤ۔ انہیں پریشان نہ کرو۔ اپنے کچھ نکتے کے لیے کمرے میں جا کر روؤ۔“ ثمینہ کے ٹھنڈے
لہجے میں بلا کی کاٹ تھی۔

”امی.....“ زو بار یہ نے کچھ کہنا چاہا۔

ثمینہ نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

زو بار یہ اٹھ کر باہر چلی گئی۔

”آ..... رج..... ب..... بھی اس کے لیے رو رہی ہے.....“ سرمد نے انک انک کر کہا۔

ثمینہ خاموشی سے گلاس میں پانی ڈالنے لگیں۔

دونوں صائم کے پاس بیٹھے تھے۔ وہ خطرے سے باہر تھا۔ یہ سن کر انہیں احساس ہوا وہ ابھی زندہ ہیں۔ ابراہیم نے گردن موڑ کر فائقہ کو دیکھا اور ہلکا سا سکرائے (اور نجانے کتنے دنوں کے بعد سکرائے تھے) ”تمہارے بال سفید ہو رہے ہیں۔“ ہر وقت تک سک سے تیار آفس جاتی فائقہ ایک بوڑھی ماں لگ رہی تھیں۔

”آپ بھی تو بوڑھے ہو گئے ہیں۔“
”میں نے تو صدیوں کا سفر دنوں میں طے کیا ہے۔“
”میں تو مر کر دوبارہ جی اٹھی ہوں۔“ فائقہ نے پیار سے صائم کو دیکھا۔..... جس کا وجود اب بھی پیوں میں جکڑا تھا۔

”لیکن ابراہیم..... صائم نے اپنے بیان میں دانیال کا نام کیوں نہیں لیا۔“
”میں نہیں جانتا۔“
”اس نے دوبارہ یہ کا نام بھی نہیں لیا۔“
”میں اس لڑکی کا نام بھی سنتا نہیں چاہتا۔“ ابراہیم نے تلخی سے کہا۔
”لو تم تیار کر لو۔ صائم جیسے ہی ڈسچارج ہوگا، ہم یہ گھر چھوڑ جائیں گے۔“
”کہاں؟“

”میں کہیں اور گھر کا بندوبست کرتا ہوں، ہم یہاں نہیں رہیں گے۔“
فائقہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ صائم کراہا۔
دونوں لگ کر اس پر جھکے۔
”بہت تکلیف ہے امی!“ وہ جب بھی ہوش میں آتا ہی کہتا تھا۔
”ابھی نرس انجکشن دے گئی ہے۔“
”یہ درد انجکشن سے ٹھیک نہیں ہوگا ماما۔“ اس کے لہجے کی تڑپ نے ماں باپ کے دل کو کاٹ کر رکھ دیا۔
”برداشت کرو بیٹا۔“ فائقہ نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھنا چاہا..... مگر پٹی کو چھو کر ہاتھ کھینچ لیا۔ ابراہیم تیزی سے باہر نکل گئے۔

”اے مجھ پر اعتبار نہیں تھا ماما۔“
”اے بھول جاؤ۔“
”وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔“
”زیادہ بات مت کرو۔ تمہارا درد بڑھ جائے گا۔“
”نہیں کروں گا۔“ اس نے سعادت مند بچے کی طرح بات مان لی تھی۔

☆☆☆

”آئی!“ فون کے دوسری طرف دوبارہ یہ کی آواز سن کر فائقہ کے اعصاب تن گئے۔
”میری کتنی خواہش تھی کہ میں تمہاری منخوس آواز بھی نہ سنوں۔“
دوبارہ یہ کے حلق میں گولا پھنس گیا۔
”صرف اتنا بتادیں، وہ کیسا ہے؟“
”ٹوٹی پھوٹی ہڈیوں کا ڈھانچہ ہے۔ جسے پھر سے جوڑ کر صائم بنارہی ہوں۔“ کراہ روکنے کو دوبارہ یہ نے اپنے لیوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

”اتنی اجازت تو اس ماں کو ملے گی یا نہیں۔“
ان کے گہرے طنز پر دوباریہ لب کاٹ کر رہ گئی۔
”آئی ایم سوری۔“

”مجھے تمہاری معافی کی ضرورت نہیں۔ جو زخم تمہاری وجہ سے صائم کو آئے ہیں، وہ میں کبھی معاف نہیں کر سکتی۔“ فائقہ کا لہجہ زہر میں بجھا تھا۔

”ایک بات تو بتاؤ۔ کیا ملا؟ ایک محبت کو پانے کے لیے کتنی محبتیں کھودیں۔“

ان کے سوال کا جواب دوباریہ کے پاس کہاں تھا۔

”لیکن تم سے کیا کہوں؟ تم دونوں کے عشق نے دو گھروں کو برباد کر دیا۔ اب اگر ہوش ٹھکانے آ گئے ہوں تو ہاتھ جوڑ کر التجا کرتی ہوں..... صائم سے دور رہو۔ وہ اب تمہارا نام بھی نہیں لیتا۔ تم سے نفرت کرتا ہے۔“
زوباریہ نے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔

”تمہاری محبت نے اسے مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ کیا پتا تمہاری نفرت اس کے جینے کا آسرا بن جائے۔“

زوباریہ نے روتے ہوئے کال کاٹ دی۔

تو کیا یہ طے ہے کہ اب عمر بھر نہیں ملنا

تو پھر یہ عمر بھی کیوں تم سے کر نہیں ملنا

فائقہ نے ایک گہری سانس لے کر موبائل رکھا۔

”مما.....“ صائم کی آواز پر وہ سن سی ہو گئیں۔ انہیں اندازہ نہیں تھا، وہ جاگ رہا ہوگا۔ وہ آہستہ سے اس کی طرف مڑیں۔ وہ ان ہی کو دیکھ رہا تھا۔

”جی بیٹا!“ انہوں نے خود کو سنبھالنے کی سعی کی۔

”میں نے آپ کو بہت تکلیف دی ہے۔“ وہ ابھی ابھی جاگا تھا اور جب بھی اس کی آنکھ کھلتی وہ ماں کو روتے ہی دیکھتا تھا۔

”تکلیف؟“ فائقہ کا چہرہ کرب سے چیخ چیخ گیا۔

”ہمیں غور سے دیکھو صائم! ہم تو گلے میں پھندے ڈالے پھانسی گھاٹ پر کھڑے تھے۔ تمہاری ایک کم ہوتی سانس پر ہم سو بار لٹک جاتے تھے۔ میرے بچے! ہم نے تمہاری سانسوں کو مدھم ہوتے سنا ہے۔ تم ہمارے لیے دوبارہ پیدا ہوئے ہو۔ تم تکلیف کی بات کرتے ہو، ہم نے قیامت جھیلی ہے۔“ وہ قیامت اب بھی ان کے لہجے میں برپا تھی۔

”تم نے زوباریہ کی خاطر.....؟“

”کون زوباریہ؟“ صائم نے ٹھنڈے لہجے میں بات کاٹ دی۔

فائقہ نے رک کر اس کا چہرہ دیکھا۔

”میں کسی زوباریہ کو نہیں جانتا اور نہ یہ نام دوبارہ سننا چاہتا ہوں۔“ اس نے کہہ کر منہ موڑ لیا۔

فائقہ تذبذب سے صائم کو دیکھ رہی تھیں۔

وہ سچ میں زوباریہ کو بھول چکا تھا.....

یا اسے بھول جانا چاہتا تھا۔



وقت ختم سا گیا تھا۔
نہ دن گزرتا تھا، نہ راتیں کتنی تھیں۔
ایک دن وہ چپکے سے اپنے کمرے میں آگئی۔ اس کا اپنا کمرہ اسے پہچاننے سے انکاری تھا۔ ہر چیز اس سے
روشنی تھی۔

بالکونی میں دھول اڑ رہی تھی۔ وہ خاموشی سے جھولے پر آ کر بیٹھ جاتی اور صائم کے گھر کی بالکونی کو دیکھے
جاتی۔ ویسی ہی دھول ادھر بھی اڑ رہی تھی۔ شاید فائقہ گھر آتی نہیں تھیں۔
گھر کے کسی فرد کو فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ کہاں رہتی ہے، کیا کھاتی ہے..... بیمار ہے یا تندرست..... وہ لاؤنج
کی کھڑکی سے ناک چپکا کر ان سب کو کھانا کھاتے دیکھتی۔

ایک دن سرد صاحب کو بھی دیکھا۔ اس کے پیارے ابو وہیل جیئر پر تھے مگر کھانے کے لیے میز پر آئے
تھے۔ جب کھانا کھا کر سب اپنے اپنے کمروں میں چلے جاتے تو چپکے سے کچن میں جاتی۔ مائیکرو ویو میں اس کے
لیے کھانا رکھا ہوتا۔ وہ گرم کیے بغیر پلیٹ نکال کر اپنے کمرے میں آ جاتی۔
بھی کبھی اس کے اندر شدید غصے کی لہر اٹھتی۔

ٹھیک ہے اس سے غلطی ہوگئی تو کیا وہ لوگ اسے معاف نہیں کر سکتے۔
اس دن کھانے کی پلیٹ یوں ہی مائیکرو ویو میں پڑی رہتی۔
اس دن روشا نے نجانے کیسے زو بار یہ کے پاس آ بیٹھی۔
”کیسی ہو؟“

”جیسی نظر آتی ہوں، ویسی ہی ہوں۔“ وہ جھولے پر بیٹھی اپنی انگلیوں کے ناخن چبا رہی تھی۔ روشا نے
دیکھا اس نے اپنی انگلیاں زخمی کر لی تھیں۔ روشا نے غور سے زو بار یہ کو دیکھا اور ڈر گئی۔ بکھرے، الجھے بالوں
والی بے حد کمزور لڑکی، جس کی آنکھوں کے گرد حلقے اتنے گہرے تھے کہ لگتا براؤن آئی شیڈو سے جان بوجھ کر
بنائے گئے ہیں۔

نجانے وہ کتنے دنوں سے نہائی بھی نہیں تھی۔

”زمزمی! تم بیمار ہو؟“

”ہاں، مجھے کینسر ہو گیا ہے اور اللہ کرے مجھے کینسر ہو ہی جائے۔ سب کی جان چھوٹ جائے گی۔“ عجیب
بے حس سا لہجہ تھا۔

روشا نے اندر تک لرز گئی۔

زو بار یہ کو دیکھ کر سمجھ میں نہیں آتا تھا.....

زندگی زیادہ مشکل ہے یا موت زیادہ آسان۔

”میرے ساتھ چلو۔“ اس نے زو بار یہ کا ہاتھ پکڑ کر کہینچا۔

زو بار یہ خاموشی سے اٹھ گئی۔ اپنے فیصلوں کا انجام دیکھ لیا تھا، اب خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑنا
تھا۔

☆☆☆

لاؤنج میں ستارہ خالہ آئی بیٹھی تھیں۔ وہ شمسہ سے ایک سال چھوٹی تھیں۔ خاندان سے باہر شادی ہوئی۔
سرازم بہت عجیب سا تھا۔ گھٹیا ذہنیت کے لوگ، شکی مزاج اور ذرا ذرا سی بات پر ہاتھ اٹھانے والا شوہر۔ تنگ
آ کر انہوں نے طلاق کا فیصلہ کیا تو خاندان بھر میں بھونچال آ گیا تھا۔ اس سے پہلے خاندان کی کسی لڑکی نے

اپنے منہ سے طلاق نہیں مانگی تھی مگر وہ ڈٹی رہیں اور شوہر سے علیحدہ ہو گئیں۔ ایک ہی جینی تھی، جسے وہ اچھے ماحول میں پالنا چاہتی تھیں۔

خاندان نے گویا بایکاٹ ہی کر دیا تھا۔

وہ پھر بھی خوشی، مٹی میں شامل ہو جاتیں مگر بیٹی کو نہیں لاتی تھیں۔ انہیں کامیاب و رنگ و دمن دیکھ کر حسد کے مارے لوگ عجیب و غریب باتیں کرتے تو بیٹی کا دل اور دماغ دونوں خراب ہوتے۔

”اتنا سب کچھ ہو گیا اور تم نے مجھے اطلاع تک نہیں دی۔ لاہور یہاں سے اتنا دور تو نہیں تھا۔“ نفیس سے براٹھ ڈسوٹ میں وہ بہت گریس لگ رہی تھیں۔

”جب کسی نے تمہارے ساتھ تعلق ہی نہیں رکھا تو اطلاع کون دیتا اور رہی میں..... تو مجھے ہوش کہاں تھا۔“

ثمینہ کے لہجے میں بے زاری مستقل ہو گئی تھی۔ جیسے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر دور بھاگ جانا چاہتی ہوں۔

”ہاں، میں تو خاندان کی نظر میں بری ہی رہی۔“ ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ انہوں نے چائے کا کپ واپس رکھا۔

”شوہر کے ظلم سہہ سہہ کر مر جاتی تو سب خوش رہتے۔“

”تم نے نوکری بھی تو کر لی۔ ہمارے خاندان کی کون سی عورت کمانے نکلی تھی۔“ ساجدہ بیگم نے کہا۔

”بیٹی کو نہیں پالنا تھا۔“

”سب تمہاری مدد کو تیار تھے۔“ اس معاملے میں ساجدہ کی سوچ روانہ تھی۔

”جی ہاں۔ بھائی اپنی بیویوں سے اور بہن اپنے شوہر سے چھپا کر جواہر ادا دیتی، اس پر اپنی بیٹی پالتی۔“ ستارہ کے لہجے میں ہلکی سی غمی در آئی۔

”اچھا چھوڑو..... ان پرانے قصوں میں کیا رکھا ہے۔“ ثمینہ نے بات بدل دی۔

”ٹھیک کہا..... ان قصوں کو کیا دہرا میں، جو کچھ اب ہو رہا ہے وہ تو نہ دیکھنا نہ سنا۔“ ساجدہ کے لہجے میں طنز اتر آیا۔

چوری ثمینہ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

”اچھا چھوڑیں، یہ باتیں بچیاں کیسی ہیں؟“ ستارہ نے پوچھا۔

”میری صرف ایک ہی بچی ہے روشا نے اور وہ اپنے گھر میں خوش ہے۔“ ثمینہ تڑخ کر بولیں۔

”تو پھر اس کا گلا گھونٹ دیں تاکہ ایک ہی بار جان چھوٹ جائے۔“ روشا نے نے زو بار یہ کو گھسیٹ کر سامنے کیا۔

”اس منحوس کو کیوں لے آئی ہو۔“

”کیونکہ یہ منحوس آپ کی اولاد ہے۔ مانا اس کی غلطی بہت بڑی ہے تو کیا آپ اس کے ساتھ یہ سلوک کریں گے۔“ روشا نے سب کچھ بھول کر اس کا مقدمہ لڑنے کھڑی ہو گئی تھی۔ زو بار یہ سر جھکا کر شدت سے ناخن چبانے لگی۔

”کیا سلوک کر دیا اس کے ساتھ۔“ ساجدہ کو روشا نے کی جرات اچھی لگی نہ لہجہ۔

”سینہ تان کر واپس آ گئی۔ گھر میں رہ رہی ہے۔ کھاپی رہی ہے۔ زندگی تو بانی لوگوں کی عذاب ہے۔ اس کی صورت نظر نہ آئے، دانیال پورا پورا دن گھر میں نہیں گھستا۔“

”تو آپ لوگ کس بات کا انتظار کر رہے ہیں۔ ایک دن یہ پوری پاگل ہو جائے گی تو پاگل خانے میں جمع کر دیا کر جان چھڑا لیجیے گا۔“ روشا نے تڑپ اٹھی پھر ثمینہ کی طرف مڑی۔

”امی! خدا کا واسطہ ہے، یہ آپ کی اولاد ہے۔ دنیا تو اسے ساری زندگی معاف نہیں کرے گی۔ کم از کم آپ تو کر دیں۔ ورنہ یہ دہنی مریم بن جائے گی۔“

”روشانے! جاؤ۔ جا کر اپنے شوہر کی فکر کرو۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔“ ثمینہ کے لہجے میں وہی بے زاری درآئی۔ ”زبیر بھائی گئے ہیں۔ کوئی نہ کوئی فیصلہ کر کے ہی آئیں گے۔“

”کہاں گئے ہیں؟“ تب ہی دانیال نے روشانے کو پکارا۔

زوبار یہ دہلی سی گئی۔ پھر فوراً وہاں سے بھاگ گئی۔

روشانے نے بے بسی سے ستارہ خالہ کو دیکھا جو حیرت، خاموشی اور ہمدردی سے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھیں۔

”جاؤ جا کر اپنے شوہر کو دیکھو۔“ ساجدہ نے کہا تو وہ سر جھکا کر وہاں سے چلی گئی۔

☆☆☆

”ک..... کیا کہا اس نے.....“ زبیر صاحب کی خاموشی طویل ہوئی تو سر نہ نہ لڑکھڑاتی زبان میں پوچھا۔ دانیال نے بھی بے چینی سے باپ کا چہرہ دیکھا۔

زبیر صاحب نے مایوسی سے سر ہلادیا۔

دانیال نے غصے سے مکا اپنی پھٹکی پر مارا۔

سرمد صاحب کے چہرے پر بھی مایوسی چھا گئی۔

”ٹھیک ہو جائے گا۔ تم فکر نہ کرو۔“ زبیر نے بیٹے اور بھائی دونوں کو تسلی دی۔

یہ تو وہی جانتے تھے، وہ کس دل سے ابراہیم کے پاس منت کرنے گئے تھے کہ وہ دوبارہ یہ کو اپنی بہو بنالیں اور ابراہیم سنتے ہی پھر گئے۔

”میں اس لڑکی کی شکل نہیں دیکھوں گا، جس کی وجہ سے میرا بیٹا اس حال کو پہنچا۔ آپ اسے بہو بنانے کی بات کر رہے ہیں۔“

”نکل سے میری بات سنیں اور سمجھیں ابراہیم صاحب! وہ لڑکی آپ کے بیٹے کے نام سے بدنام ہو گئی ہے۔ اب کوئی اور شخص اسے قبول نہیں کرے گا۔“

”میری طرف سے اسے زندہ دفن کر دیں۔“ انہوں نے سفاکی کی انتہا کر دی۔

”اور وہ اپنی مرضی سے بھاگی تھی۔ صائم نے اسے اغوا نہیں کیا تھا اور کس منہ سے آپ یہ سب کہہ رہے ہیں۔ ہم تو رشتہ بھی لے کر آئے تھے، انکار تو آپ لوگوں نے کیا تھا۔“

”ہم سے غلطی ہو گئی تھی۔“

”لیکن میں یہ غلطی دوبارہ نہیں دہراؤں گا۔ یہاں سے چلے جائیں۔ میرے ضبط کا امتحان مت لیں۔“

ان کی منت سماجت کچھ بھی کام نہ آ یا تھا اور وہ گردن جھکا کر واپس آ گئے۔

”اب کچھ بھی ٹھیک نہیں ہوگا ابو۔“ وہ دانیال کی آواز پر چوٹے۔

”تو پھر کیا کریں؟“ زبیر صاحب چڑ گئے۔

”کچھ بھی کریں، مگر میں اسے اس گھر میں برداشت نہیں کروں گا۔“

”دانیال.....“ زبیر نے جھنجھلا کر سر اٹھایا۔

”آپ کو فیصلہ کرنا ہوگا۔ میں نے کہا تھا اگر وہ اس گھر میں رہے گی تو اس گھر کے دو پورشن بنیں گے۔“

سرمد نے تڑپ کر بھتیجے کو دیکھا۔

”اگر آپ کو یہ گوارا نہیں تو میں روشانے کو لے کر الگ ہو جاؤں گا اور اگر اس کو بھی اپنی بدنام بہن کے

~~~~~



ساتھ رہتا ہے تو اس کی مرضی۔“

”بکو اس بند کرو تم۔“ زبیر پھر کرکھڑے ہوئے۔

سرمہ نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر منہ سے صرف آوازیں نکلی تھیں۔

دانیال مزید بھی کچھ کہتا مگر چچا کی حالت دیکھ کر کمرے سے نکل گیا۔

”دماغ خراب ہو گیا ہے اس لڑکے کا۔ اب کیا سب کا جینا حرام کر دوں۔“ وہ غصے سے بولے پھر قریب

آ کر سرمہ کے ماتھے پر اپنا ہاتھ رکھ کر سلی دی۔

”تم فکر نہ کرو۔ میں زندہ ہوں۔ کرلوں گا کچھ نہ کچھ۔“

سرمہ نے اپنے حرکت کرتے ہاتھ کے ساتھ زبیر کا ہاتھ پکڑ لیا۔

ان کی گرفت میں خوف اور تکلیف نمایاں تھی

زبیر صاحب ان کا ہاتھ سہلانے لگے۔

☆☆☆

ستارہ خالہ نے بہت اصرار کے ساتھ زوباریہ کے سر کی مالش کی تھی۔ وہ اتنی چپ تھی کہ اسے بولنے پر آمادہ

کرنے کے لیے ستارہ کو ڈھیر دے بے معنی باتیں کرنی پڑیں۔ پھر زوباریہ کے تھے ہوئے اعصاب سکون پانے

لگے تو ان کے گھٹنوں پر سر رکھ کر اس نے سب کچھ کہہ ڈالا۔

”اگر اس سے اتنی ہی محبت تھی تو چھوڑا کیوں؟“

وہ اب اس کی انگلیوں کی زخمی پوروں پر تیل لگا رہی تھیں۔

”چھوڑا نہیں تھا، ڈر گئی تھی۔“

زوباریہ نے سسکاری لبوں میں دبا کر کہا۔

”اس رات میں بہت ڈر گئی تھی۔ مجھے لگا، وہ میری حفاظت نہیں کر سکتا۔“

وہ رات زوباریہ کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

وہ ان کی محبت کا قاتل لمحہ۔

لاشعوری طور پر اس نے اپنے ناخنوں کو دائتوں کے ساتھ چبانے کی کوشش کرنا چاہی مگر ستارہ خالہ نے نرمی

سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”اور اب؟“

”اب.....؟“ زوباریہ نے اپنے اندر جھانکا۔

اتنا خالی پن تھا کہ وہ خود ہی ڈر گئی۔

”اب تو میرے اندر کچھ بھی نہیں بچا۔“

”تمہارا دل کیا چاہتا ہے؟“

اس نے جسم کے گنبد میں خاموش دل کی صدا سنی اور مسکرائی۔

”میرا دل چاہتا ہے، سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے۔ گھر والے پہلے کی طرح مجھ سے محبت کریں۔ روٹانے

میری ہر ضد مانے۔ ابو کی آنکھیں مجھے دیکھ کر پہلے کی طرح چمکیں۔ وہ پھر سے مجھے اپنا فخر کہیں۔ امی پہلے کی

طرح ڈانٹیں۔ وہ ڈانٹ جس میں غصہ نہیں ہوتا تھا۔ تایا ابو، تائی امی..... میرے پہلے کی طرح غرے اٹھائیں۔“

ستارہ نے اس کے بال سیٹ کر چونی گوندھنا شروع کر دی۔

”میں زندگی کو رپوائنڈ کر کے وہاں سے شروع کرنا چاہتی ہیں۔ جہاں میں اور صائم صرف دوست تھے۔“



ایک دوسرے سے محبت نہیں کرتے تھے۔ میں نے گھر والوں سے جھوٹ بولنا، انہیں دھوکا دینا نہیں سیکھا تھا۔ یہ کم بخت محبت بہت بری چیز ہے..... دھوکا دینا سکھا دیتی ہے۔“

ستارہ خالہ کہنا چاہتی تھی کہ دھوکا محبت نہیں سکھاتی۔ ہمارا نفس سکھاتا ہے مگر وہ خاموش رہیں۔ وہ ابھی زوہاریہ کو کوئی نصیحت کرنا نہیں کرنا چاہتی تھیں کہ جنہیں وقت سکھا دے، انہیں سبق پڑھانے کی ضرورت نہیں رہتی۔

”آؤ، تھوڑی دیر لان میں چلیں۔“

”نہیں..... مجھے نہیں جانا۔“ وہ ڈر کر سمٹ گئی۔

”میری جان، میرے ساتھ جا رہی ہو۔“ وہ اسے بہلا کر لے گئیں۔

خزاں کے لبوں پر رخصتی کے گیت تھے۔

مگر کیاریوں میں نئی پنیری اب تک نہیں لگی تھی۔ وہ خشک پتوں سے انٹی ہوئی تھیں۔ زوہاریہ نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر پتے نکالنے شروع کر دیے۔ وہ دیوانہ وار پتوں، ٹوٹی شاخوں کا ڈھیر لگا رہی تھی۔ ان ہی میں کوئی مردہ تنگی یا چڑیا کا ٹوٹا رہتا تو وہ ایک لمحے کو رک جاتی۔ انہیں پتوں کے ڈھیر میں دفن کر کے پھر سے شروع ہو جاتی۔ ستارہ نے اسے ٹوکا نہیں تھا۔

اسے اسی طرح اپنے وجود کی مایوسی، ناامیدی اور بے اعتباری کو جمع کر کے آگ دکھانی تھی۔

پھر اس کے ہاتھ رک گئے۔

کچھ شور سا ہوا تھا۔

زوہاریہ نے گردن گھما کر ساتھ والے گھر کو دیکھا۔

مزدور سامان نیچے اتار رہے تھے۔

وہ حیران نظروں سے دیکھتی رہی تب ہی روشا نے چائے کا کپ لے آئی۔

”خالہ! آپ کی چائے۔“

اس نے زوہاریہ کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔

”محبت فاح عالم سمجھنے والوں کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ ان کی وجہ سے گھرا جڑ جاتے ہیں۔ آباد گھروں پر

تالے بھی لگ جاتے ہیں۔“

روشا نے کی آواز پر زوہاریہ کا چہرہ سوکھے پتے کی طرح ہو گیا۔

وہ وہاں سے اٹھ کر بھاگ گئی تھی۔

”روشا نے! کم از کم تم تو اس طرح مت کرو۔“ ستارہ خالہ نے تاسف سے اسے دیکھا۔

روشا نے شرمندہ ہو گئی۔

”بس منہ سے نکل گیا خالہ!“

ستارہ خاموشی سے سر ہلا کر زوہاریہ کے پیچھے چلی گئیں۔

☆☆☆

ثمینہ سرمد کو سوپ پلا رہی تھیں۔ جب ستارہ اندر آئیں۔ ایک طرف زبیر صاحب بیٹھے بھائی سے چھوٹی چھوٹی باتیں کر رہے تھے۔

”بھائی جان! میں زوہاریہ کو لے کر ہاسپٹل جا رہی ہوں۔“

”اسے کیا ہوا ہے؟“ ثمینہ نے گھبرا کر پوچھا۔



”ماں آپ ہیں اور پوچھ مجھ سے رہی ہیں۔“ ستارہ کے لہجے میں طنز درآیا۔  
”بہر حال..... وہ ٹھیک نہیں ہے۔ ڈاکٹر کو دکھانا ضروری ہے۔“ ان کے لہجے میں تلخی تھی گو یا وہ ضرور جانیں گی۔

”تم کب تک یہاں ہو۔“ زبیر صاحب نے سادہ سے لہجے میں پوچھا جبکہ ستارہ اچھی طرح جانتی تھیں۔  
انہیں ستارہ کا یہاں رکنا پسند نہیں۔

”آج کل میں چلی جاؤں گی۔ سرمد بھائی کا پتا چلا تو عیادت کے لیے آگئی۔“  
انہوں نے کل سے جواب دیا۔  
”بیٹی کو تنہا چھوڑ کر۔“

”بوائی ہیں اس کے پاس اور مجھے ان پر اعتبار بھی ہے۔ ثمنینہ! میں جلدی آ جاؤں گی۔ پھر بھی دیر ہو جائے تو گھبرا نا نہیں۔“

ڈاکٹر نے انہیں بہت لتاڑا تھا۔  
وہ بہت کمزور تھی۔ فوراً ڈرپ لگا کر کچھ ٹیسٹ بھی لکھ دیے۔  
یہ تو جسمانی علاج تھا۔ ستارہ کسی سائیکائٹرسٹ سے بھی ملنا چاہتی تھیں مگر اس کے لیے ضروری تھا کہ گھر والوں کو قائل کیا جاتا۔ انہوں نے آنے سے پہلے ثمنینہ سے علیحدگی میں بات بھی کی تھی۔  
”باقی سب کو چھوڑو۔ میں تمہارے رویے پر پریشان ہوں۔ تمہاری بیٹی ہے، اس سے غلطی ہوگئی مگر اب وہ بچھتا رہی ہے۔“

”اس کا بچھتا د ا ہمارے کس کام کا۔“ ثمنینہ غصے میں دوپٹے کے دھانگے نوچتی رہیں۔

”تم لوگوں کے رویے سے پاگل ہو جائے گی۔“

”ہو جائے..... کسی پاگل خانے بھجوا کر سکون میں آ جاؤں گی۔“

”یا اللہ۔ اتنی نفرت..... بالکل ہی دل سے اتر گئی ہے۔“

”کیا کروں؟ اس کا باپ فوج زدہ ہو کر بستر پر پڑا ہے۔ دوسری بیٹی کا گھر بار داؤ پر لگا ہے اور یہ سب اس نامراد کی وجہ سے ہوا ہے۔“ وہ رو پڑیں۔ ”پھر بھی میرا دل اس کے لیے کڑھتا ہے، مگر کروں تو کیا کروں۔“

”اولاد تو نادانیاں کرتی ہی ہے، معاف کر دو ثمنینہ!“ ستارہ نے نرمی سے سمجھایا۔

”اگر زو بار یہ کی جگہ بیٹا ہوتا تو اس کے ساتھ بھی یہی سلوک کرتیں۔“

”بیٹی کی نادانی کا بوجھ بہت بڑا ہوتا ہے ستارہ۔“

”تو یہ ہے۔ رب بھی معاف کر دیتا ہے، زندگی بھی دوسرا موقع دے دیتی ہے مگر تم لوگ.....“ ستارہ جھنجھلا کر اٹھ آئی تھیں۔

”تم یہیں بیٹھو۔ ڈاکٹر نے کچھ ٹیسٹ کیے ہیں۔ میں ان کی رپورٹس لے کر آتی ہوں۔“ ستارہ اسے ویٹنگ روم میں بیٹھا کر گئی تھیں۔

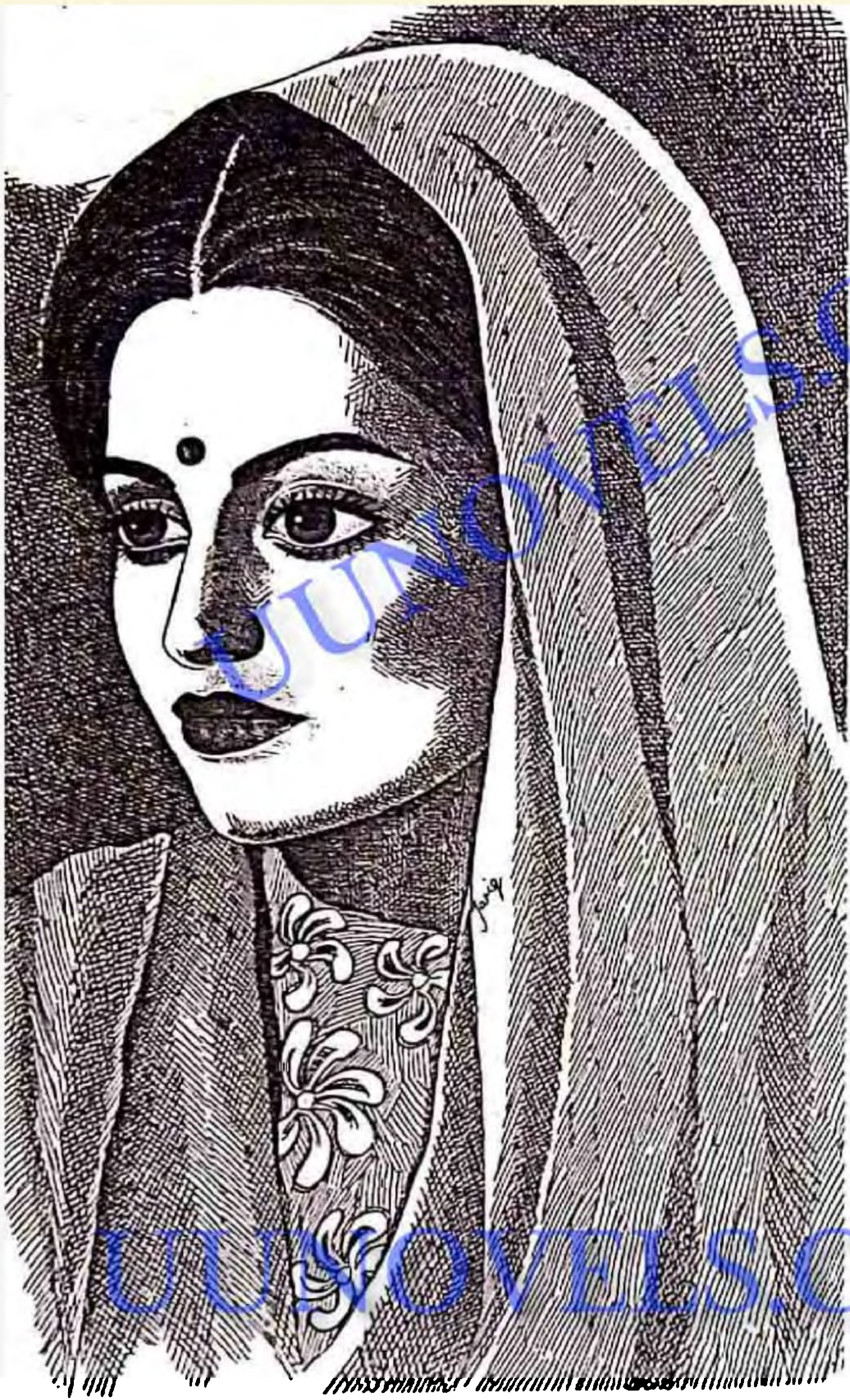
انجانے چہروں کو بے توجہی سے دیکھتے ہوئے اک شناسا چہرہ نگاہوں کی گرفت میں آ گیا۔ زو بار یہ نے گھبرا کر دوپٹے کا پلو پیشانی سے نیچے تک چھینچ لیا۔

فائقہ اس کے سامنے سے گزر کر چلی گئیں۔

زمینی بے اختیار اٹھی اور ان کے پیچھے چلی پڑی۔

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ





حیدر اشفیاع

مگر صبرِ دل

نہند آنکھوں سے کوسوں دور تھی مگر وہ پھر بھی  
آنکھیں موندے بیڈ پر چیت لیٹے بیگم کے سو جانے کا  
انتظار کر رہے تھے۔ جوں ہی ان کے کانوں میں  
خراٹوں کی جل ترنگ سی بجی تو انہوں نے بائیں آنکھ  
ذرا سی کھول کر دیکھا۔ بیگم صاحبہ نہند میں ڈوبتی دکھائی  
دیں۔ انہوں نے چند لمحے مزید انتظار کیا۔ پھر ہولے  
سے کبل سر کا کراٹھ بیٹھے۔ پاؤں میں چپلیں اڑیں۔



جاتے جاتے ایک چور نظر بے خبر بیگم پر ڈالی اور آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر آ گئے۔

خنک ہوا کے جھونکے نے استقبال کیا۔ انہوں نے ذرا سی جھرجھری لی۔ برآمدے کی گرل سے باہر جھانکا۔ خوب بڑے سارے کمن پر ہوا کا عالم طاری تھا۔ اس وقت تک تو حامد اور سرمد بھی اپنے کمرے میں سونے کے لیے جا چکے تھے۔ انہیں مزید اطمینان ہوا۔

اب میدان صاف تھا۔ وہ دبے پاؤں برآمدے کے کونے میں دھرے گرے رنگ کے جہازی سائز فرج کی جانب بڑھے۔ لپک کر دروازہ کھولا۔ بلب کی زرد روشنی ایک لکیر کی صورت باہر تک چلی آئی۔ انہوں نے اوپر نیچے نظر دوڑائی۔

تمام اشیاء نہایت فرینے سے رکھی ہوئی تھیں۔ سب سے اوپر کندھا ہوا آٹا اور دودھ کی پتیلی رکھی تھی۔ اس سے نیچے ٹھنڈے پانی کی بوتلیں موجود تھیں۔ پھر آکر خری خانے میں تازہ سالن اور کچھ پھلے دنوں کے نیچے سجے سالن رکھے تھے۔ انہوں نے ایک ایک ڈھکن اٹھا کر دیکھا مگر انہیں اپنی مطلوبہ چیز نظر نہ آئی۔ وہ مایوس ہو کر فرج کا دروازہ بند کرنے لگے، جب اچانک ان کی نظر سب سے نیچے موجود سبز یوں اور پھلوں والے ڈبے پر پڑی۔ انہوں نے جھٹکے کھینچ کر نکالا اور پھر ان کی آنکھوں کی چمک یک دم بڑھ گئی۔

رس ملائی کا بڑا سا پیالہ وہیں رکھا بلکہ ایک طرح سے چھپایا گیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں بیگم کی چالاکی پر ہنس دیے۔ پھر انہوں نے نہایت احتیاط سے وہ پیالا باہر نکالا۔ فرج کا دروازہ بند کیا اور اس سے پہلے کہ واپس پلٹتے، اچانک پیچھے سے ایک مردانہ بازو ان کی گردن کے گرد حائل ہو گیا۔ اس ناگہانی افتاد پر وہ اچھل پڑے۔ پیالا ان کے ہاتھوں سے پھسلنے ہی لگا تھا کہ آنے والے نے اپنے دوسرے ہاتھ سے فوراً اسے اپنے قبضے میں لے لیا۔ اب وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے سامنے کھڑے حامد کو دیکھ رہے تھے۔

”پیارے بابا جان! اماں جان کو یہی دھڑکا لگا تھا کہ آپ آج رات اس رس ملائی کے پیالے پر ضرور ہی شب خون ماریں گے۔ اس لیے وہ سونے سے پہلے مجھے چوکس رہنے کا کہہ کر گئی تھیں۔

اور ابھی جب آپ فرج کی جانب بڑھ رہے تھے تو میں کمرے کی کھڑکی سے یہ نظارہ دیکھ رہا تھا۔“ وہ فخر سے بتا رہا تھا مگر وہ جل کر خاک ہو گئے۔

”ارے! تمہاری ماں اکیلی کیا کم تھی، جو تم بھی اس کے ساتھ میری چوکیداری میں شامل ہو گئے ہو۔ منہ کا ذائقہ خراب ہو رہا تھا۔ اس لیے تھوڑی سی رس ملائی کھانا چاہ رہا تھا۔“ وہ پیالے کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

”کھائی تو تھی آپ نے شام کو سب کے ساتھ، پیالی بھر کر۔“ حامد نے انہیں یاد دلایا۔

”اتنی چھوٹی چھوٹی سی تو پیالیاں رکھی ہوتی ہیں تمہاری ماں نے۔ بامشکل چار پیچ کھائے ہوں گے۔“ وہ بھڑک اٹھے۔

”آپ کے لیے وہ بھی کافی ہے۔ ڈاکٹر نے تو اس سے بھی منع کر رکھا ہے۔ اتنی مشکل سے تو شوگر کنٹرول ہوئی ہے آپ کی۔“ حامد نے ذرا نرمی سے سمجھانا چاہا۔

”ہاں اب تو شوگر کنٹرول ہی ہے۔ پھر تھوڑی سے کھالینے میں کیا ہرج ہے۔“ انہوں نے پیالہ حامد کے ہاتھ سے لینے کی کوشش کی مگر وہ بدک کر مزید پیچھے ہٹ گیا۔

”بابا جان! آپ باز آنے والے نہیں لگتے۔ اب میں پکا انتظام کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی چابی برآمد کی۔ پھر پیالے کو فرج میں رکھا۔ وہ چابی دروازے میں گھمائی۔ ٹک کی آواز کے ساتھ فرج لاک ہو گیا۔

”سوری بابا جان! احتیاط بہت ضروری ہے۔ دل کے مریض ہیں آپ..... پرہیز کیا کریں۔“ یہ کہہ کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنے کمرے کی



طرف چل دیا اور وہ برآمدے میں کھڑے کھستے رہ گئے۔

”ارے دل کا مریض ہوں تو کیا ہوا..... کیا خود خود کشی کر لوں۔ حد ہے بھی، اپنی کمائی کی اپنے ہی گھر سے کوئی اچھی چیز نہیں کھا سکتا ہوں۔ چور بن کر رہ گیا ہوں۔“

وہ بھی کچھ دیر تک بڑبڑاتے رہے پھر تھک ہار کر پاؤں پٹختے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چل دیے۔

☆☆☆

میاں بشیر صاحب ایک خوش باش، خوش لباس، خوش گفتار اور سب سے بڑھ کر خوش خوراک شخص واقع ہوئے تھے۔ چٹ پٹی اور مرغن غذاؤں کے رسیا، ہر قسم کے میٹھے کے دیوانے۔ شوئی قسمت سے بیگم بھی پکانے میں بہت ہنرمند تھیں۔ میاں کے چٹورے پن کی تسکین کے لیے کھانے پکانے کے ایک دو کورسز مزید کر کے اپنی صلاحیت کو چار چاند لگا لیے تھے۔

میاں بشیر صاحب کا حلقہ احباب بھی خاصا وسیع تھا۔ پھر وہ کچھ ہلے گلے کے شوقین بھی بہت تھے۔ آئے روز گھر میں دعوتیں ہوتیں۔ کھلا کھایا پکایا جاتا۔ بیگم بشیر بھی خوش دلی سے کچن میں جتی رہتیں۔ ان کو بڑا ناز تھا کہ وہ معدے کے راستے ہی سہی، میاں کے دل میں براجمان تو ہیں۔

مگر سدا دن ایک جیسے نہیں رہتے۔ ہر چیز میں توازن ضروری ہوتا ہے۔ میاں بشیر صاحب کی کھانے پینے میں حد درجہ بے اعتدالی کا نتیجہ شوگر اور بلڈ پریشر جیسی بیماریوں کی صورت میں نکلا۔

ایک رات سینے میں زور کا درد اٹھا۔ ایمر جنسی لے جائے گئے۔ ڈاکٹر نے انجائنا کا ایک بتایا۔ ڈھیر ساری ادویات کے ساتھ بیگم صاحبہ کو ایک لمبا لیکچر بھی دیا کہ یہ سب کھانے پینے میں بے احتیاطی کا نتیجہ ہے اور ساتھ ہی ان کے لیے سادہ خوراک کا چارٹ بنا کر دیا۔

بیگم صاحبہ کے تو ہاتھوں کے توتے اڑ گئے

حالانکہ وہ سب کچھ میاں کی فرمائش پر کرتی تھیں مگر پھر بھی وہ خود کو مجرم سمجھنے لگیں۔

انہوں نے گھر آتے ہی کچن سے تمام بازارڈ سالوں کے ڈبے غائب کیے۔ کولڈ ڈرنک کی بوتلوں کو الماری کے سب سے نچلے خانے میں دفن کیا۔ دیگر میٹھی اشیاء کو کام والی کے حوالے کیا۔ روٹین کے میوے میں ہنگامی تبدیلیاں کیں۔

لیکن وہ نہیں جانتی تھیں کہ سالوں سے بھنی ہوئی مرغن غذاؤں کے عادی شخص کو سادہ خوراک پر لانا کتنا دشوار ہے۔

وہ ان کے لیے پرہیزی ہنڈیا تیار کرتیں۔ وہ چولے پر دھری رہ جاتی اور وہ باقی اہل خانہ کے لیے بنائے گئے سالن سے کھانا نوش فرمالتے۔

وہ نمکو کے پکٹ اور ڈرائی فروٹ کا جار چھپا کر رکھتیں مگر کسی آئے گئے پر پکٹ غائب اور جار آدھے سے بھی کم ملتا۔ ڈھونڈ ڈھاڈ کر غٹا غٹ کولڈ ڈرنک پی جاتے۔ وہ سختی کرتیں تو خوب جھگڑا کرتے۔ بچوں کی طرح روٹھ جاتے۔

ایک دن تو حد ہی ہو گئی۔ ان کے بھتیجے کی شادی ہوئی تھی۔ انہوں نے نئے جوڑے کی دعوت کی تھی۔ وہ پتیلا بھر کر پلاؤ کے لیے گوشت کا چولے پر چڑھا کر خود قریبی مارکیٹ سے ان کے لیے کوئی تحفہ وغیرہ خریدنے چلی گئیں۔

بشیر صاحب پانی پینے کچن میں گئے تو سوندھی سوندھی خوشبو سے بے قرار ہو کر پتیلے کا ڈھکن ہٹایا۔ نمکین گوشت ابل رہا تھا۔ ان کے منہ میں پانی بھر آیا۔ فوراً ایک بولی نکال کر چکھی۔ بہت مزا آیا۔ اب وہ چمچہ چلاتے، ایک بولی نکال کر کچھ دیر چٹکی میں پکڑا کر ہوا میں لہراتے اور پھر منہ میں ڈال لیتے۔

یوں کرتے کرتے جب پتیلے میں بوٹیوں کی شرح بہت کم رہ گئی اور نقص امن کا خطرہ نظر آنے لگا تو انہوں نے فوراً فریزر کھول کر گوشت کا ایک اور پکٹ نکالا اور بغیر سوچے سمجھے پتیلے میں جھونک دیا۔



بیگم خاصی دیر سے واپس آئیں۔ انہوں نے جلدی میں زیادہ چیک نہ کیا اور ویسے ہی پلاؤ تیار کر لیا۔ اب کھانے کی میز پر مہمانوں کے سامنے انہیں بہت سکی ہوئی کیونکہ پلاؤ میں کوئی کوئی بوئی تو بہت مٹی ہوئی تھی اور باقی سارا گوشت کچا تھا۔ اس وقت تو ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا ماجرا ہے۔ مگر مہمانوں کے جانے کے بعد جب انہوں نے فریزر کھولا تو گوشت کا ایک اضافی پیکٹ عائب تھا۔ وہ جھٹ سب سمجھ گئیں۔

پھر جو گھر میں گھسان کی جنگ ہوئی تو وہ مسایوں کو بھی کئی دن تک یاد رہی ہوگی۔

☆☆☆

ان کے دونوں بیٹے بھی ماں باپ کی ایسی جھڑپوں کے عادی ہو چکے تھے۔ لاکھ ان دونوں کو اپنے باپ سے پیار تھا مگر ساتھ وہ اپنی ماں کا ہی دیتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں وہ جو کچھ کرتی تھیں، ان کی بہتری کے لیے کرتی تھیں۔ پھر انسان کی اپنی جان لذت کام و دہن سے زیادہ پیاری تو نہیں ہوتی۔

☆☆☆

ایسے ہی کٹھے میٹھے دنوں میں حامد نے اپنی تعلیم مکمل کر لی۔ جوں ہی اسے ایک کمپنی میں نوکری ملی تو ساری مشرقی ماؤں کی طرح بیگم بشر کے دل میں بھی اس کی شادی کا ارمان جاگا۔ اب وہ دن رات ”حامد کی دہن لاؤں گی“ کا راگ الاپنے لگیں۔ وہ اکثر بے زار ہو کر کہتا۔

”اماں! آپ دہن کا قصہ تو رہنے دیں۔ آپ کی اور ابا کی اتنی لڑائی ہوتی ہے۔ اہل محلہ کے ساتھ ساتھ آنے والی بھی لطف اندوز ہوا کرے گی۔“

بیٹے کے انداز پر وہ تڑپ جاتیں۔ ”ارے! تم کیوں فکر کرتے ہو۔ بہو کی کچھ تو حیا کریں گے ہی وہ۔ ہو سکتا ہے کچھ سدھ رہی جائیں۔“

پھر وہ ہر رشتہ کرانے والی سے اصرار کرتیں۔ ”بس چاندی بہو ڈھونڈ دو۔“

”بہو چند سی ہو یا سورج سی..... بس کھانا چھپانے والی نہ ہو۔“ وہ آس پاس کہیں موجود ہوتے تو ضرور گل افشانی کرتے۔ وہ فقط طنزیہ نظروں سے گھور کر رہ جاتیں۔

پھر خدا خدا کر کے حامد کی شادی طے پا گئی۔ دونوں میاں بیوی نے خوب دل کے ارمان پورے کئے۔ وسیع پیمانے پر تقریب کا انتظام کیا گیا۔ خاندان بھر کو مدعو کیا گیا۔ انواع و اقسام کے پکوان تیار کروائے گئے۔ مہمانوں کی آؤ بھگت کے ساتھ ساتھ میاں بیوی صاحب کو خود بھی ایک طرح سے کھلی چھوٹ ملی ہوئی تھی۔ انہوں نے ہر ہر ڈش کے ساتھ خوب انصاف کیا۔

بیگم دور دور سے دیکھ رہی تھیں اور اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہی تھیں مگر وہ بھی کیا کرتیں۔ اب بھری برادری کے سامنے ان کا ہاتھ روکا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ پھر وہی ہوا جس کا تمام اہل خانہ کو ڈر تھا۔ شادی کے چوتھے روز ہی ان کو دوسرا بڑا ہارٹ اٹیک ہوا۔ ہفتہ بھر وہ آئی سی یو میں پڑے رہے۔ ڈاکٹروں کے نزدیک ان کے دل کے چاروں والو شدید متاثر ہوئے تھے اور ان کا بیج جانا ایک معجزہ تھا۔

ہسپتال سے فارغ ہو کر گھر آئے تو شدید نقاہت محسوس کر رہے تھے۔ شاید کچھ شرم سار بھی تھے۔ بیگم صاحبہ ملامت بھری نظروں سے دیکھتیں تو نظریں چمکاتے۔ وہ دلیہ، چھڑی جو بھی کھلائیں، چپ چاپ بغیر کسی احتجاج کے کھا لیتے۔ موت کا منہ دیکھ آئے تھے، اس لیے زندگی اور صحت کی قدر جان گئے تھے۔ عجیب پڑ مردگی کا شکار رہتے۔ پہلے والی شوخی، شرارت اور شگفتہ مزاجی مفقود تھی۔

ایک دن بیگم صاحبہ کو کسی عزیز کی فوتگی پر جانا پڑا تو انہیں پرہیزی کھانا کھا کر دوا کھا لینے کی تاکید کرتے ہوئے روانہ ہو گئیں۔ انہوں نے کچن میں جا کر دیکھا۔ ایک پٹیلی میں مونگ کی بدرنگ دال اور دوسری میں پھیکا دلیہ ڈھکا تھا۔ بھوک تو پہلے ہی نہیں تھی۔ وہ



دونوں چیزیں دیکھ کر بالکل ہی مر گئی۔

اتنے میں چکن کے دروازے پر آہٹ سی ہوئی۔ انہوں نے پلٹ کر دیکھا تو نئی نویلی بہو کھڑی تھی۔

”آداب ابا جان! آپ کو کچھ چاہیے تھا۔ مجھے بتائیں، میں نکال دیتی ہوں۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

شادی کے فوراً بعد تو وہ بیمار ہو کر ہسپتال جا پہنچے تھے۔ اس لیے بہو سے ٹھیک طرح سے تعارف بھی نہیں ہو سکا تھا۔ وہ کچھ جھجک سے گئے۔

”ارے نہیں بٹیا! بھوک نہیں ہے۔“

وہ ان کے تاثرات سے سمجھ گئی کہ وہ پیتلوں  
میں موجود کھانا نہیں چاہ رہے، اس لیے پھر گویا  
ہوئی۔

”ابا جان! آپ اپنے کمرے میں جائیں۔  
میں آپ کے لیے کچھ اور لاتی ہوں۔“

ابھی انہیں کمرے میں تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ بہو ایک چھوٹی سی ٹرے تھاے اندر داخل ہوئی۔ ٹرے میں ایک کپ چائے اور ایک چھوٹی پلیٹ میں لیک کے چند ٹکڑے نفاست سے کٹے رکھے تھے۔

”ارے بیٹا! میں یہ بازاری کیک کہاں کھا سکتا ہوں۔ بیکری کی چیزیں بھی منع ہیں مجھے۔“ وہ کیک کے ٹکڑوں کو حسرت سے دیکھتے ہوئے بولے۔

”ارے نہیں ابا جان! یہ بکری کا یک نہیں ہے۔  
میں نے رات کو خود بیک کیا تھا آپ کے لیے۔ بغیر  
چکنائی اور میٹھے کے۔ بس تھوڑا سا شہد شامل کیا ہے۔“

”ارے واہ۔“ ان کا اشتیاق بڑھ گیا۔ فوراً ایک ٹکڑا اٹھا کر منہ میں رکھا۔ اگرچہ میٹھا برائے نام تھا، مگر ذائقہ اور خشکی لا جواب تھی۔

”وہ دراصل میرے والد صاحب بھی آپ کی طرح کھانے پینے کے بہت شوقین تھے۔“ اس کی آنکھوں میں نمی سی چمکی۔ (بہو کے والد حیات نہیں

تھے) ”مگر وہ بھی چونکہ دل کے مریض تھے۔ اس

لے سب ۔ کچھ نہیں کھا سکتے تھے۔ جب میں گریجویشن کے بعد فارغ تھی تو اماں جان نے مجھے سلائی کڑھائی کے ساتھ ساتھ کچھ کوکنگ کورسز بھی کروائے تھے۔“

وہ ہولے ہولے بول رہی تھی اور وہ نہایت  
انہماک سے بہو کی باتیں سن رہے تھے۔

”اور پھر میں نے ان کی خاطر ایسے کھانے بنانے کی تربیت بھی حاصل کی جو شوگر اور دل کے مریضوں کے لیے بھی محفوظ ہو۔ بغیر چکنائی اور قدرتی مٹھاس کے ساتھ۔“

”اچھا بیٹا! کیا کیا بنا لیتی ہو تم؟“ وہ دے دے دے  
جوش سے پوچھنے لگے۔

”بغیر چھنائی کے ملے مسالوں کی برہانی.....  
سبزی کباب جو فرائی نہیں کیے جاتے بلکہ اسٹیم کیے  
جاتے ہیں۔

مختلف طرح کے بسکٹ جن میں تھوڑا سا شہد شامل ہوتا ہے۔

اباجان! میں آپ کے لیے بھی تیار کر دیا کروں گی۔ آپ وہ محدود مقدار میں آسانی سے لے سکتے ہیں۔ ”وہ فخر یہ بتا رہی تھی۔

آج انہیں احساس ہو رہا تھا کہ وہ بیٹی جیسی کتنی بڑی رحمت سے محروم تھے۔ واقعی بیٹیاں کتنی حساس ہوتی ہیں۔ کتنی فکر کرنے والی..... والدین کی خوشی کی

خاطر کوئی نہ کوئی درمیانی راہ نکال ہی لیتی ہیں۔  
کتنے خلوص سے وہ ان کے لیے کیک لے آئی  
تھی۔ اگر وہ بد مزہ اداہل اور دلیہ بھی لے آئی تو وہ خوش

خوش نوش فرماتے۔  
ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ اپنے رب  
کے حضور شکر گزاری کے آنسو تھے، جس نے انہیں بہو

کی صورت میں بیٹی دے دی تھی۔ انہوں نے اپنا ہاتھ  
پیارے اس کے سر پر پھیرا اور پھر وہ دونوں ہلکی  
آنکھوں کے ساتھ مسکرا دیے۔



قرۃ العین سکندر

# معاملہ بھائی

یہ سیلون اپنے قرب و جوار میں اس لیے اتنا مشہور و معروف تھا کہ یہاں سے کسی بھی کسٹمر کو انکار سننا نہیں پڑتا تھا۔ رابی کسی نہ کسی طرح اسے ٹھنڈے میٹھے لہجے سے آنے والی خواتین اور لڑکیوں کو اپنا ہمنوا بنا ہی لیا کرتی تھی۔

دعوے کرتے ہیں، مگر شادی کے بعد ان کے سارے دعوے دھڑے دھڑے رہ جاتے ہیں۔“

تارہ نے دھیمے لہجے میں اماں کے سامنے اپنے دل کی بات رکھی تھی۔ وہ انہی ہی تھی، دھیمے سروں میں بولنے والی۔ سب کے دکھ سکھ میں شامل ہونے والی۔ ہر غم کی گھڑی میں دوسروں کو ڈھارس دینے والی اور اب بھی ہر طرح کے نامساعد حالات میں وہ اپنے اہل خانہ کے لیے ڈھال بنی ہوئی تھی۔ اس نے بیٹی ہو کر بھی بیٹوں سے بڑھ کر اپنا فرض ادا کیا تھا اور اب سب سے چھوٹی بہن کے فرض سے بھی سبکدوش ہو جانا چاہتی تھی۔

تارہ نے یہ بیوٹی پارلر شروع تو کر لیا تھا مگر یکے بعد دیگرے اوپر تلے ہونے والے بچوں کی وجہ سے وہ یہاں زیادہ وقت نہیں دے پاتی تھی۔ اگر دو دن سیلون کھلا ملے تو چار دن بند بھی رہتا تھا۔ کبھی بچوں کے ایگزامز، کبھی بچوں کی ناساز طبیعت بہانا بن جاتی۔ اگر اس سب سے اس کو رہائی مل بھی جاتی تو کوئی نہ کوئی نند یہاں رہنے آ جاتی تھی۔

اس نے اپنے سے چھوٹے بھائی کو تعلیم حاصل کرنے کے بعد بیرون ملک بھجوا دیا تھا۔ مگر اس نے بھی لیٹ کر یہاں کی خبر تک نہ لی تھی۔ اس کا اماں کو گہرا قلق تھا۔ دکھ تو خود تارہ کو بھی از حد تھا۔ مگر اس نے اس سلال کو زیادہ دیر تک اپنے دل میں نہ رہنے دیا تھا۔ دکھ ہونے کے لیے اور دو جہات کیا کم تھیں کہ وہ اس بات کو بھی جان کا روگ بنالیتی۔ اس نے تو اب ویسے بھی ہر حال میں شکر کا کلمہ ادا کرنا سیکھ لیا تھا۔

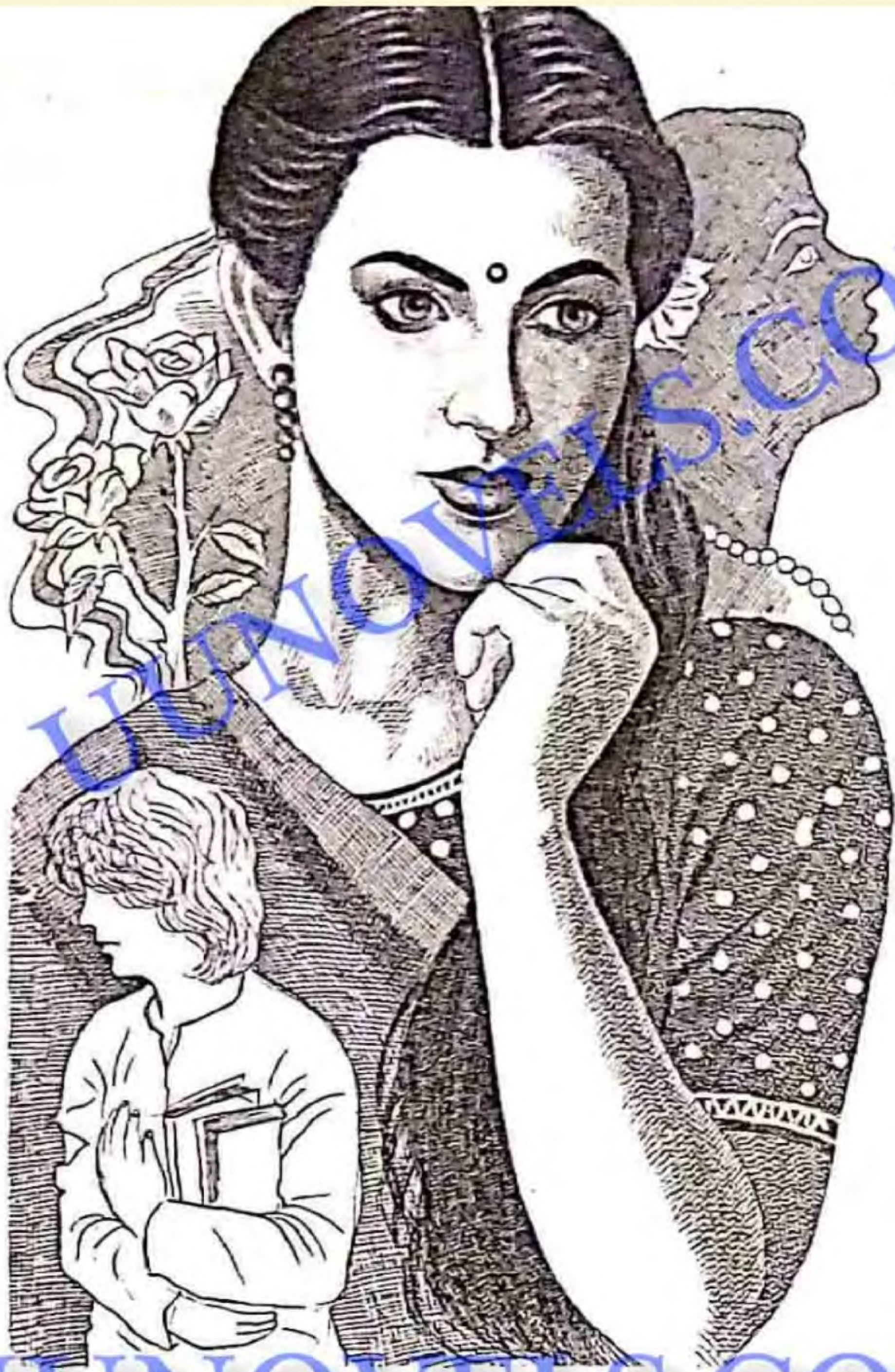
تارہ اب بھین کا شکار ہو جاتی تھی۔ وہ پروفیشنل ازم کی قائل تھی۔ تارہ کی تین بہنیں اور دو بھائی تھے۔ اس نے اسی کاروبار سے اپنی بہنوں کی شادیاں کی تھیں۔ بڑے کو تعلیم دلوائی تھی اور اب بھی چھوٹا بھائی پڑھ لکھ رہا تھا۔ وہ شادی نہیں کرنا چاہتی تھی مگر یہ دس سال پہلے کی بات تھی پھر اس کے لیے پرویز کا رشتہ آ گیا تھا۔ پرویز کا رشتہ ہر لحاظ سے اماں کو موزوں اور قابل قبول لگا تھا۔ اماں بھند تھیں کہ وہ ہاں کر دے۔

”دیکھ تارہ! تیرے بھائی سے اب مجھے کوئی توقع نہیں ہے۔ تیری عمر ڈھل رہی ہے۔ تجھ سے چھوٹی دونوں عائلہ اور رائے ایک ایک بچے کی ماں بن چکی ہیں اور اب نائلہ کا تو رشتہ بھی طے ہو چکا ہے تو ہاں کر دے تو نائلہ کے ساتھ ساتھ تیرے بھی ہاتھ پیلے کر دیتی ہوں۔ یوں میری جان کو بھی قرار مل جائے گا۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ تیری سسرال یہاں سے قریب ہی ہے۔ دو گلی کا فاصلہ عبور کر کے تو

”دیکھو تارہ! لڑکا برسر روزگار ہے۔ خوش حال گھرانہ ہے۔ پھر انہیں تیرے یوں کام کرنے پر بھی اعتراض نہیں ہے۔“ اماں بھند تھیں۔

”وہ سب تو ٹھیک ہے اماں! مگر ابھی مجھے نائلہ اور چھوٹے زوہیب کی تعلیم کی طرف توجہ دینی ہے۔ یہ سارے فرائض میرے پارلر کی کمائی سے ہی حل ہو سکتے ہیں پھر سب آغاز میں یوں ہی بلند و بانگ





جب چاہے مجھ سے لئے آ جایا کرتا۔“ اس قدر دلفریب تھے کہ نگاہ ٹھہری جاتی تھی۔ تارہ اور

پرویز کا ساتھ مقدر میں لکھا جا چکا تھا۔ ادھر تارہ بیاہ کر اپنے گھر گئی تھی۔ ادھر ہی تارہ بھی بیاہ کر پرویز کے گھر آ گئی تھی۔

پرویز کی دو بہنیں اور ایک چھوٹا بھائی تھا۔ بہنیں بیابنی تھیں جبکہ بھائی ابھی زیر تعلیم تھا۔ سر اور ساس دونوں ہی ماشاء اللہ سے حیات تھے۔ سر کوئی کام کاج نہ کرتے تھے اور سارا دن گھریلو سیاست میں مشغول رہتے تھے۔ جبکہ ساس صاحبہ بھی اس عمر میں کسی کام کو ہاتھ تک نہیں لگاتی تھیں۔ ہر بچے کی پیدائش کے وقت اس کے گھر سے اماں ہی کھانا بنانا

اماں اسے لالچ دے رہی تھیں۔ وہ بھی دام میں آ گئی یا اماں کی باتوں کو سن کر انکار کرنے کی جسارت نہ کر سکی۔ بہر حال اس کے نصیب میں پرویز کا ساتھ لکھا ہوا تھا اور اب پرویز سے شادی کے بعد اس نے مزید جدوجہد کرنے میں اپنی زیت کے ماہ و سال تمام کر دیے تھے۔

☆☆☆

پرویز ایک دیتی ہوئی رنگت کا، عام سے نقوش کا مرد تھا۔ جسے صرف غربت کی چکی میں پستی ہوئی تارہ نصیب میں ملی تھی۔ تارہ کی رنگت سنہری تھی اور نقوش



کے جانے کے بعد اپنے ہی کھائے ہوئے برتنوں کا ڈھیر تک وہ اکثر اوقات تارہ کے لیے ہی چھوڑ کر چلی جایا کرتی تھیں۔

پرویز جب آفس سے گھر آتا تو اسے ایک نئی ہی کہانی کو سننے کو ملا کرتی تھی۔

رقیہ بیگم سنا تیں اور سامنے بیٹھا ہوا پرویز ماں کی بات پر سر جھکائے رہتا تھا مودب سا۔

”یہ تارہ تو بہت ہی خود سر ہو گئی ہے۔ سارے کام تو میری بچیاں آ کر کر جاتی ہیں اور وہ شام کو آ کر دو چار برتن دھو دیتی ہے۔ اسے علم نہیں کہ میں کتنی تنہائی محسوس کرتی ہوں اور پھر اب کام کاج تو چھوڑو اپنے بچے بھی میرے سر پر مسلط کر جاتی ہے۔“

رقیہ بیگم کالج بزر خند تھا۔  
”تو اماں! آپ بچوں کو اس کے ساتھ ہی بھیج دیا کریں ناں۔“

پرویز تھکا ہارا لوٹا تھا۔ شاید بحث و مباحثہ سے تھک چکا تھا۔ اس لیے اس نے سادہ سے لہجے میں کہا تھا۔

”واہ بیٹے، یہ بھی خوب کہی۔ اپنے بچوں کو اس موئے سیلون میں بھیج دوں، جہاں بھانت بھانت کی عورتیں آتی ہیں۔ ادھر ادھر کی لگائی بھجائی کرتی ہیں۔ اس قدر شیطاں اور چالاک عورتیں۔۔۔ تو بہ ہے۔ کیا بچوں کو تم یہ تعلیم دینے کے خواہش مند ہو۔“

اماں کا ایک نیا اعتراض تھا۔ پرویز کے سامنے انہوں نے ایسا نقشہ کھینچا تھا کہ وہ بھی دبک سا گیا۔

”ارے نہیں اماں! میں نے تو یہ کہا ہے کہ آپ پریشان ہوتی ہیں۔ وہاں کم از کم تارہ بچوں کو تو دیکھ ہی لے گی۔“

پرویز نے بھی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔ اس وقت تو بہر حال بات آئی گئی ہو گئی تھی مگر اس کے بعد پرویز نے تارہ کی اکیلے میں اچھی خاصی کلاس لے ڈالی تھی اور تارہ اتنے دنوں سے ایک الاؤ میں جل رہی تھی۔ اس وقت بھی اپنے مجازی خدا کی تندو

کر بھیجا کرتی تھیں اور وہ شکر کا ٹکڑا ادا کرتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ پرویز ایک تنگ دست انسان ہے۔ اس لیے وہ اس حالت میں بھی جبکہ اس کی زرچگی کا وقت پینے حد قریب ہوتا آخیر تک پارلر کے کام میں جتی تھی۔ اسے معلوم ہوتا تھا کہ پھر وہ چند ماہ کسی قابل نہ رہے گی اور اس کی بھی آمدنی اس کے اہل خانہ کی کفالت کا سبب بنے گی۔ پہلے پہل تو پرویز نے اسے کام کرتے دیکھ کر کبھی کوئی اعتراض نہ کیا تھا مگر پہلے بیٹے کی پیدائش کے بعد ہی وہ اس کے کام پر معترض رہنے لگا۔

”سنو، یہ پارلر کے چکر زیادہ ہی نہیں لگ رہے، ذرا کم کرو۔“

”مگر پرویز! آپ نے ہی تو پہلے سب طے کیا تھا کہ میرے کام کاج سے آپ کو کوئی بھی اعتراض نہیں ہوگا۔“

وہ دبے دبے لفظوں میں باور کرواتا تھا اور اس کا باور کردار ہی پرویز کو جیسے ہتھے سے اکھاڑ دینے کے لیے کافی ہوتا تھا۔

”تو کیا اب حالات تبدیل ہو جانے کے بعد بھی میں اپنے ہونٹ سی لوں۔ تم نہیں دیکھ رہیں اماں کی حالت اب ایسی نہیں رہی ہے۔ ان میں اتنی طاقت ہی نہیں کام کاج کی اور میری بہنیں کب تک اور کہاں تک یہاں آ کر کام کریں۔ وہ اپنے گھریار کی ہیں۔ اپنا گھریار دیکھیں یا پھر یہاں تمہارے گھر کی دیکھ لکھ میں کھلتی رہیں۔“

پرویز کالج بزرخ سا ہو چلا تھا۔ تارہ کا جی چاہا کہ

صاف اور واضح کاف لفظوں میں پوچھے کہ اس کی بہنیں یہاں آ کر کیا کام کرتی ہیں۔ سوائے فساد اور لگائی بھجائی کے۔ سارا کام تو وہ کر کے پارلر کے لیے کبھی ایک تو کبھی دو بچے گھر سے روانہ ہوتی ہے۔

اس کو نا صرف پرویز کی بہنوں کو ناشتا کروانا ہوتا تھا بلکہ گھر کی صفائی ستھرائی سے لے کر دوپہر کے کھانے تک سب اسی کی ذمہ داری ہوا کرتا تھا۔ اس



تیز باتوں کے نشتر سہ جانے پر مجبور تھی۔

☆☆☆

پھر ایک دن رابی آگئی تھی۔ وہ محض یہاں سیکھنے کے ارادے سے آئی تھی مگر اس کی لگن دیکھ کر تارہ ششدر رہ گئی تھی۔ صبح سویرے آ کر رابی سیلون کی خود صفائی ستھرائی کرتی تھی۔ ایک ایک شے کو ٹھکانے پر رکھتی تھی اور پھر اس نے غیر محسوس طریقے سے تارہ کی ساری ذمہ داری سنبھال لی تھی۔ تارہ کو قید رے سکون ملا تھا۔ وہ دوپہر کے بعد ہی چکر لگاتی تھی۔

اس کی سب سے اچھی بات، اس کی خوش اخلاقی۔ اور خوش گفتاری تھی۔ تارہ کے سامنے تو وہ اس قدر مؤدب رہتی تھی کہ تارہ اس کی اس ادا پر اتراتی تھی۔

وہ تارہ جسے گھر میں پرویز لفظوں کی مار مارتا اور ساس اس کو طعنوں کا ہار پہناتی تھی۔ یہاں آ کر اس کی روح رابی کے میم کہنے سے کس قدر سرشاری محسوس کرتی یہ تو صرف اب تارہ ہی سمجھ سکتی تھی۔ تارہ نے رابی کو تقریباً سارے اختیارات سونپ دیے تھے۔ سارا حساب کتاب البتہ شام کو آ کر ضرور کیا کرتی تھی۔

بہر حال آنکھیں تو تارہ نے بھی بند نہیں کی تھیں۔ اس نے اپنی ایک جاننے والی مچھر لڑکی چھوڑ رکھی تھی جو ہر دوسرے دن پارلر کا چکر لگاتی تھی۔ بطور کسٹمر رابی کے لیے وہ بھی معتبر ہی تھی۔

وقت کے ساتھ ساتھ تارہ بھی مطمئن ہو چکی تھی۔ اس لیے سب کام رابی کے سپرد کرتی چلی گئی مگر اس نے آنکھیں اور کان کھلے رکھے ہوئے تھے اور رابی بنانا تھے پر شکن لائے اس کو دن بھر کے واجبات کی تفصیل نہ صرف بتاتی تھی بلکہ اس کے سامنے سارے واجبات رکھتی بھی تھی اور تارہ اس سے مطمئن تھی۔

”کیا بات ہے، کیا سارا پارلر اس لڑکی کے نام

کر دیا ہے۔ تم جانتی ہی نہیں ہو بہو۔“

اب کے اس کی ساس نے ایک نیا کتہ اعتراض اٹھایا تھا۔ دراصل بیٹے کے کان بھر کر وہ ایک، شاری کی کیفیت میں مبتلا رہا کرتی تھیں پھر بہو کے جاتے ہی میدان صاف ہو جاتا تھا۔ بیٹیاں اور ماں مل کر سارا دن جو چاہتیں، کھاتی جیتی تھیں۔ مگر اب تارہ کے گھر میں رہنے سے بہت سارے مسائل سر اٹھا رہے تھے۔ وہ لوگ اب تارہ کے ہی پیسوں سے حرے اڑاتے تھے۔

ان کے بیٹے کی آمدنی سرف اس قدر ہی تھی کہ وہ لوگ گھر کے اخراجات پورے کر پاتے۔ بیٹے کی تنخواہ میں من چاہی خواہشات کا پورا ہونا ناممکنات میں سے تھا۔ یہ تارہ ہی تھی جو اپنی ساس کو بھی ماں کا درجہ دے کر آدھی رقم ماں کو اور اس کا آدھا حصہ اپنی ساس کو دیا کرتی تھی۔ مگر اب وہ دیکھ رہی تھی کہ اس کی محنت کی کمائی کو کس طرح دونوں ہاتھوں سے بے دریغ لٹایا جا رہا تھا۔ اس دن تارہ پارلر نہ گئی تھی۔ صفائی ستھرائی کے بعد کچن کا بکھیرا سیٹ کر کمرے میں آ گئی۔ اس کی چھوٹی بند مستطیل دو دن سے ادھر ہی تھی۔ ابھی وہ سوچ رہی تھی آج کچھ اچھا سا کھانا بنائے گی۔ وہ کچن میں قدرے توقف سے آئی اور اس نے بلاؤ اور ساتھ میں قورمہ بنانے کا فیصلہ کرتے ہی عمل بھی شروع کر دیا تھا۔

چاول دم پر تھے، جب ڈور بیل بجی تھی۔ اس نے سوچا کہ وہ جا کر دیکھتی ہے مگر جتنی دیر میں وہ کچن سے باہر نکلی، اس نے دیکھا کہ باہر مین ڈور پر اس کی نند کھڑی پہرا دے رہی ہے۔ ساتھ میں شاید بند تھیلیوں میں کچھ کھانے مینے کا سامان بھی تھا جو نظروں سے اوجھل تھا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے، جب اس نے نند کو ہزار کے دونوٹ گیٹ پر پیزا ڈلیور کرنے لڑکے کو دیتے دیکھ کر جب سادھ لی تھی۔ پھر اس کی نند خاموشی سے اندر چلی گئی تھی اور وہ وہیں منجھد کھڑی رہ گئی تھیں۔ اس کی تو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا



کچن کی طرف تھا۔ اس نے ایک ڈونگے میں سالن انڈیل لیا۔ اور پلاؤ دیتی سمیت ہی اٹھا کر اپنے کمرے کا رخ کیا۔

اس نے اپنی سنگھار میز کے نیچے والا خانہ کھٹ سے کھول کر دونوں چیزیں وہاں رکھ دی تھیں اور الماری کو تالا لگا کر تیز تیز قدموں سے باہر نکل آئی تھی۔ ایسا قدم اس نے زندگی میں پہلی بار اٹھایا تھا تو قدموں میں تیزی بھی خود بخود ہی آگئی تھی۔

شام کو اس کی گھر واپسی قدرے تاخیر سے ہوئی تھی۔ جب گھر میں غیر معمولی خاموشی محسوس کر کے اس کا دل دھک دھک کر اٹھا تھا۔ شاید اس کی تند جاچکی تھی۔

”یہ کیا حرکت کی ہے آج تم نے۔ میری بہن یہاں سے بھوکی گئی ہے اور اماں صبح کی بھوکی پیاسی بیٹھی ہوئی ہیں۔“ پرویز غرار ہا تھا۔ اس کا اشتعال دیدنی تھا۔

”اچھا واقعی، ایسا ہی ہے۔“

وہ اچنبھے سے بولی تھی پھر رکی نہیں سیدھا رخ اماں کے کمرے کی طرف ہی تھا۔ کوئی نہ کوئی ثبوت تو مجرم بھی چھوڑ ہی دیتا ہے۔ وہ بھی اندھیرے میں تیر چلانے کی نیت سے ہی کمرے میں آئی تھی۔ آج اس کے تیور کچھ اس طرح کے تھے کہ اماں بھی بوکھلا سی گئی تھیں۔ ہر روز والی مکارانہ مسکان اس وقت کا فور ہو چکی تھی۔ مگر تارہ رکی نہیں تھی اس نے آگے بڑھ کر اماں کی ٹیبل پر کپڑے سے ڈھکی ہوئی ٹرے سے کپڑا الٹ دیا تھا۔

چکن کے بڑے بڑے پیسز کے باقیات وہاں منہ چڑا رہے تھے۔ تارہ کے انداز اور اس ٹرے نے پرویز کو لا جواب کر دیا تھا۔ یہی نہیں اس نے سامنے ہی باسکٹ میں پڑا ہوا پیزا کا ڈبا اٹھا کر اس کی عین آنکھوں کے سامنے لہرایا تھا۔

”پرویز! میں نے آج تک لب نہیں کھولے۔ بند آنکھوں سے جتی رہی۔ جو آپ نے دیکھا، وہی

کہ اس قدر کشادہ دلی سے رقم اڑانے کی کیا ضرورت تھی؟ مگر وہ کہاں بولنے کی جسارت کر سکتی تھی۔

اس نے کھانا تیار کر لیا تھا اور اب ساس کے کمرے میں ان کو مطلع کرنے کی نیت سے ہی گئی تھی تاکہ یہ فرض ادا ہو تو وہ اپنا کام دیکھے اور پارلر کا چکر لگا آئے کیونکہ گھر میں تو کاموں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوتا تھا تو ختم ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔

وہ ساس کے کمرے میں گئی تو ساس اور نند آپس میں سر جوڑے، گہرے راز و نیاز میں مگن تھیں۔ اسے دیکھ کر ایک دم سیدھی ہو بیٹھیں۔

”کھانا تیار ہے، آپ کہیں تو میں لگا دوں۔“

تارہ نے پوچھا تھا۔

”نہیں، ابھی اتنی کوئی خاص بھوک نہیں ہے، ٹھہر کر کھالوں گی۔ میں شازی سے کہہ دوں گی۔“

رقیہ بیگم نے کہا تو وہ سر ہلا کر واپس پلٹ گئی۔ اس نے جلدی سے بچوں کو کھانا دیا اور اس کے بعد کچن میں جا کر برتن دھو کر جگہ پر رکھے۔ ایسے سیدھے ہاتھ بالوں میں پھیرتی جب باہر نکلنے والی تھی اسے دھیان آیا ساس کو تو بتایا ہی نہیں، وہ پلٹ کر ساس کے کمرے میں آئی تھی کہ ساس کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

”کھانا سارا پیک کر لیتا۔ وہاں جا کر اب کچن میں خوار نہ ہوتی رہنا۔“

وہ دم بخود سی کھڑی رہ گئی۔ اپنی بیٹی کے لیے اس قدر آسودہ حال زندگی کی خواہاں تھیں وہ۔ مگر بہو جو سارا دن گھن چکر بنی رہتی تھی۔

وہ ان کو نہ تو دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی وہ دیکھنا چاہتی تھیں۔ اس کی نند شازی اس وقت جرمہ اور پیسز سے انصاف کر رہی تھی۔ وہ حیرت سے اس منظر کو دیکھ رہی تھی اس کی نند نے جھٹ اس ٹرے پر کپڑا ڈھک دیا تھا۔

سلام کر کے وہ باہر نکل آئی تھی۔ اس کا رخ



میں نے بھی سچ مان لیا۔ مگر آج میں چاہتی ہوں کہ آپ نہ میری، نہ کسی اور کی آنکھوں سے دیکھیں، مگر ہاں۔ ایک منصف بن کر ضرور دیکھیں۔ یہ کیا ہے۔ کیا اماں بھوکی پیاسی بیٹھی ہیں..... کیا ان کی بیٹی بھوکی گئی ہے..... ہرگز نہیں.....

پرویز کا چہرے کا رنگ اڑ چکا تھا۔ اماں کے چہرے کا رنگ تیزی سے بدل رہا تھا۔ پہلے شرم ساری اور اب اس کی جگہ جلال نے لے لی تھی۔ کل کی آئی بھوکا اتنا کہنا ان کو ان کی ہی نظروں میں گرا رہا تھا اور اشتعال بھی دلارہا تھا۔

”امی! یہ تو بہت ہی نا انصافی والی بات ہے۔ آج آپ نے مجھے بھی شرمندہ کروایا ہے۔“

وہ شرمندہ سا بولا تھا۔ ہلکی سی مسکان نے تارہ کے لبوں کو چھوا تھا۔ تارہ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی آئی تھی۔ اس نے کھانا کچن تک منتقل کیا اور اسے گرم کرنے لگی۔

اتنے میں اس نے اپنے عقب میں پرویز کی آہٹ محسوس کی تھی۔

”پرویز! یہ سچ ہے کہ میں کھانا چھپا کر گئی تھی کیونکہ تم اور میں مل کر اتنی مشقت کر رہے ہیں، صرف اپنے بچوں کی خاطر اور سارا اناج اور کھانا شازی اٹھا کر لے جاتی ہے۔ اسی ماہ میں نے اماں کو چند روپے ہزار روپے دیے ہیں اور ابھی دو دن پہلے وہ مزید رقم کا تقاضا کر رہی ہیں۔ میں جانتی ہوں آپ خود دار انسان ہیں، مجھ سے کبھی رقم کا مطالبہ نہیں کرتے۔ مگر میں نے کبھی کبھی اپنے فرائض میں کوتاہی نہیں برتی ہے۔“

تارہ آج انکشافات کرنے کے درپے تھی اور وہ تو جیسے سب سن کر حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔ ”تم نے یہ سب مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا تارہ؟“

وہ بے حد حیران تھا۔ اس کی تو سمجھ میں ہی اب

آیا تھا۔

”میں صرف رشتوں میں مضبوطی اور خوب صورتی کی خواہش مند ہوں۔“

تارہ نے مضبوط لہجہ میں کہا۔ پرویز کے دل میں اس کا مقام پہلے سے کئی گنا بڑھ گیا تھا۔

تارہ نے ٹرے میں سلقے سے کھانا چنا اور سیدھا ساس کے کمرے کا رخ کیا تھا۔ جہاں اس کی ساس کا مزاج برہم تھا۔ رقیہ نے ایک ترچھی نگاہ اپنی بہو پر ڈالی ضرور تھا مگر رخ موڑے بیٹھی رہیں۔

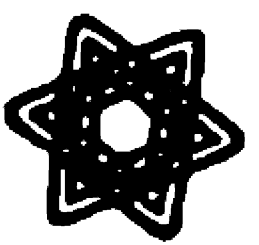
”آپ ناراض ہیں، جانتی ہوں۔ مگر ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔ میں نے ہر مرتبہ آپ کا ہر الزام سر آنکھوں پر رکھا، برداشت کیا۔ آج بھی چپ رہتی مگر.....“

وہ دانستہ چپ ہو کر ساس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ ”شازی کی ساس کل مجھے راستے میں ملی تھیں اور کہہ رہی تھیں اس کی عادت خراب کرنے والی اس کی ماں ہے۔ کیا آپ چاہتی ہیں کہ آپ کے نام پر شازی کا گھر برباد ہو؟“

اس کی بات پر رقیہ بری طرح سے چونکی تھیں۔ معاملہ فہم تھیں، سو روپے میں لچک لے آئیں۔ ”مگر میرے بیٹے کے سامنے یہ ڈراما کرنے کی کیا تک تھی؟“ وہ سختی سے بولیں۔

”تاکہ شازی کے سارے راستے مسدود ہو جائیں۔ وہ سارے چور راستے جو اس کا گھر تباہ کر رہے ہیں۔“

ساس سنبھل گئی تھیں۔ چپ چاپ ٹرے کھسکا کر کھانا تاول کرنے لگیں۔ تارہ مسکرائی۔ اس نے معاملہ فہمی سے کتنے ہی محاذ ایک ساتھ طے کر لیے تھے۔







## گل اریاب



تمہاری حسین زلفیں اچھی لگتی ہیں۔“ میں نے اپنی انگلیوں کو بھینچ کر ان کی مٹی بنائی اور اس کے ریشمی بالوں کو چھو کر ان کی ملائمت محسوس کرنے کی شدید خواہش کو بڑی مشکل سے کنٹرول کرتے ہوئے رومینٹک انداز میں کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

”مجھ سے زیادہ تمہیں کچھ بھی اچھا لگے گا تو میں اسے ختم کر دوں گی۔“ اس کی آنکھوں سے ٹپکتی شرارت نے میرے دل میں جیسے گدگدی سی کی۔

”پکی بات ہے نا؟“ میں نے تصدیق چاہی تو اس نے سر ہلا دیا۔

”ٹھیک ہے پھر سب سے پہلے اپنے سر پر بالوں کے نام پر سب سے ان ریشمی پتھوں کو کاٹو۔ پھر

”عامر! تمہیں مجھ میں سب سے زیادہ کیا اچھا لگتا ہے؟“

ازل سے صنف نازک کا شاید سب سے زیادہ پوچھا جانے والا سوال ہی یہ تھا اور مرد اس سوال کے جواب میں شاید سب سے زیادہ جھوٹ بھی بولتے ہوں گے۔ لیکن میں اس کے سوالیہ وجود کو الفاظ میں نہیں آنکھوں کی زبان میں جواب دیتا۔ اسی لیے اس کی مشتاق آنکھوں سے میری آنکھیں ہم کلام ہوئیں اور اس کی آنکھوں نے میری فصیح و بلیغ نگاہوں کا پیغام وصول کرتے ہی جھک جانا مناسب سمجھا کیونکہ اظہار کی اس سے زیادہ شدت شاید وہ سمجھ نہیں پار ہی تھیں۔

”سچ کہوں جاؤں۔ تو مجھے تم سے بھی زیادہ





## مُکملِ تاویل

اس کا سوال مجھے سکرا نے پر مجبور کر گیا۔  
”جانتی ہو، آئینہ کیوں تمہیں کوئی اور بات بتاتا  
ہے؟ کیونکہ اس میں میرا دل نہیں دھڑکتا۔ تمہارا حسن  
تو دل والے ہی دیکھ سکتے ہیں۔  
آنکھ والوں میں اتنا ظریف کہاں آنکھ والوں کی  
نظر میں اتنی گہرائی ہی نہیں ہوتی جو دل والوں کی نظر  
میں ہوتی ہے۔“  
وہ خاموش ہو گئی۔  
میں اسے دل کی آنکھوں سے دیکھتا رہا اور وہ  
شرماتی رہی۔

☆☆☆

ہماری پہلی ملاقات لاہور کے ایک خوب صورت  
پارک میں ہوئی تھی۔ میں دوسرے شہر سے اپنے کچھ  
دوستوں کے ساتھ پہلی بار لاہور دیکھنے آیا تھا۔ ہم سب  
دوست ایک ہوٹل میں رکے ہوئے تھے اور روزانہ صبح

زندگی سے بھرپور اس سکراہٹ کا گلا گھونٹنے کی  
کوشش کر رہا تھا جیسی ہے۔ پھر ان چمکتی آنکھوں پر  
تاریکی کو راج کی دعوت دو کیونکہ اندھیروں کو۔ کہیں  
پناہ کی جگہ نہیں مل رہی۔“  
”خدا کے لیے اب چپ ہو جاؤ، کتنی مشکل اور  
گہری باتیں ہیں تمہاری۔ ان میں اتر کر بندہ خود سے  
نکل کر تم میں کم ہو جاتا ہے۔“ وہ اپنی نازک ہتھیلیاں  
جوڑ کر معافی والے انداز میں بولی تو میں ہنس دیا۔  
”میرے پاس تو فقط باتیں کرنے کا ہنر ہے  
جانم! تم تو سراپا حیرت ہو۔ پہلی نظر ہی ساکت ہو جاتی  
ہے کہ کیا کیا دیکھوں؟“

”آئینہ تم جیسی باتیں کیوں نہیں کرتا وہ کیوں  
سچ بولتا ہے؟“ وہ اداسی سے اپنے ناخنوں کی طرف  
دیکھ رہی تھی جو اس کے ہاتھوں کی سانولی رنگت پر اور  
سفید لگ رہے تھے۔



میں ہر اس آنٹی کا کم عمری سے ہی عاشق رہ چکا ہوں۔ جس کی شکل معمولی بھی ہوئی بس بال لمبے اور حسین ہوتے۔ یہ بات تو میرے ساتھ سارے خاندان کو یاد تھی کہ جب چھوٹے ماموں کی شادی ہوئی تب میں چھ سال کا تھا اور سٹیج پر دلہن بنی ماما نے لمبے بالوں کو کندھے سے آگے کر کے سینے پر سجا رکھا تھا اور ان کے بال اتنے لمبے کہ گود میں پڑے ہوئے تھے میں تو چل گیا۔

”امی! میں نے دلہن سے شادی کرنی ہے۔“  
امی حیران۔ انہیں رسموں کے لیے بلایا جا رہا تھا میں نے ان کا کامدانی والا دوپٹہ مٹھی میں جکڑ لیا۔  
”چھوڑو بیٹا۔ ماموں کی دلہن کو رخصت کرانا ہے لیٹ ہو رہے ہیں۔“ انہوں نے بڑے پیار سے کہا کیونکہ تھیر وہ مار نہیں سکتی تھیں آس پاس ساری رشتے دار خواتین ان ہی کی طرف متوجہ تھیں۔  
”ماموں کی دلہن نہیں ہیں یہ میری دلہن ہیں۔“

میں زور زور سے رونے لگا تو سب لوگ۔ میری طرف متوجہ ہو گئے۔

بات اتنی بڑھ گئی کہ ہار پھول پہنے ماموں اسٹیج سے اتر کر میرے پاس آئے اور مجھے چکارتے ہوئے وعدہ کیا کہ ”یار چھوٹے۔ دلہن آدمی آدمی کر لیتے ہیں۔“

میں نے زور زور سے نفی میں سر ہلا کر کہا۔  
”میں صرف دلہن کے بال لوں گا۔“

اس رات مجھے ہر طرح کے لالچ دے کر دلہن کے کمرے سے نکالا گیا اور میں دلہن کے بال بانہوں میں بھر کر ہی باہر نکلا تھا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ دلہن نے وگ لگا رکھی تھی ورنہ بال کاٹ کر مجھ سے پیچھا چھڑایا جاتا۔ بعد میں مجھے دلہن میں کبھی دلچسپی محسوس نہ ہوئی کیونکہ اس کے بال اب میرے پاس تھے۔ ماموں اکثر چھیڑتے کہ بچے اپنا حصہ لے کر ایسے بھاگے کہ اب ہمیں لفت ہی نہیں کراتے اور.....

خیر..... میں نے بغور اسے دیکھا تو احساس ہوا کہ اس کی شخصیت کی ساری کشش ان دراز زلفوں کی ہی مرہون منت تھی۔ سانولا رنگ مناسب آنکھیں،

ہونٹ سے نکلنے تو شام ڈھلے ہی داپسی ہوتی اس شہر کا ہر قافلہ ذکر مقام ہم دیکھ چکے تھے اور اس دن ہماری داپسی تھی۔ دل بوجھل سا تھا اتنی مہکتی محسوس اور حسین شامیں گزاری تھیں یہاں کہ اب داپسی کا خیال اداس کر رہا تھا۔ میں سوچوں میں گم تھا کہ نظر کچھ دور گئی۔ پارک کے ایک کونے میں گول گیوں کی ریڑھی نظر آ رہی تھی جس پر اچھا خاصا رش بھی تھا اور میں جانتا تھا کہ یہ روزانہ آنے والے لوگ ہیں اور یقیناً اچھے گول گپے ہی ہوں گے تب ہی تو یہ لوگ کھا رہے ہیں۔

میں نے دوستوں کو اپنی جیب سے گول گپے کھانے کی دعوت نہایت جویز دی تو دونوں دوستوں نے میرا مذاق اڑانا شروع کر دیا۔

”یار کوئی مردوں والی بات کر۔“  
”یہ کیا زانہوں والی خوراک ہے۔“ میں نے

جل کر کہا۔ ”چلو تم لوگ مردوں والی خوراک یعنی کہ لوہے کے نئے چبالواتنی دیر۔ بے شک میرا حصہ بھی کھا لیتا۔ میں گول گپے کھا کر آ جاؤں گا۔“

میں مزے دار گول گپے کھا کر مڑا ہی تھا کہ مجھے عقب سے ایک سُریلا تہقہ سنائی دیا۔ یقیناً جب سریلا تھا تو کسی مازنین مطلب صنف نازک کا ہی ہوگا۔ مڑنا تو دیے بھی تھا لیکن اب کے مڑنے میں شوق اور تجسس بھی شامل تھا مڑتے ہی وہ مازنین نظر آ گئی۔ وہ دو تھیں لیکن میری نظر اس ایک پر ہی جا کر رک گئی تھی۔ اور وجہ اس کے غیر معمولی لمبے بال تھے جو کھلے تھے اور حسین موسم کی ہلکی سی خنک ہوا سے اڑ رہے تھے۔ کبھی وہ گال سے کھیلتی تھیں سر کے ایک خفیف جھکے سے پیچھے کرتی۔ کبھی ہاتھوں سے انہیں تھپک تھپک کر پیار سے سمجھاتی کہ ہوا سے انکھلیاں نہ کرو۔ باز آ جاؤ۔

میں اس کے گلے سے لٹے دوپٹے کی طرف دزدیدہ نظروں سے دیکھ کر رہ گیا اگر سر براؤں کو یہ دوپٹہ تو۔ میرے جیسے مردوں کو بے قرار کسے کر دگی؟ خواتین کے لمبے بال میری بچپن کی کمزوری کہے جاسکتے ہیں کیونکہ کچھ مجھے یاد ہے اور کچھ امی نے بتا رکھا ہے کہ



”ہم ترے ساتھ نہیں ہیں اگر کسی کو بتایا بھی تو ہم منکر ہو جائیں گے اس لیے ہم سے دوستی والی تمہاری یادداشت کھو جانی چاہیے۔“

میں نے ان ہر جانی دوستوں کا ٹھیکہ نظر انداز کیا اور اس کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اڑنی ہوئی زلفوں کو بالکل قریب اور غور سے دیکھ کر بھی کوئی نقص نہ ڈھونڈ پایا۔ نقص مطلب؟ جیسے خشکی بالوں کے دو مونہہ وغیرہ میں نے ہلکے سے کھنکھار کر اسے متوجہ کیا۔

”سنیے!“ میری آواز کچھ بھاری ہو گئی تھی وہ تیزی سے مڑی۔

”جی فرمائیے؟“ خلاف توقع وہ میری آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈالے بے خونی سے پوچھ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، وہ بول پڑی۔

”اچھا تو آپ ان مردوں میں سے ہیں جنہیں کہیں بھی لڑکیاں نظر آ جائیں، وہ ان سے فری ہوتا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ویسے بانی دادے دیگر فرائض بھی یونہی انجام دیتے ہیں یا.....؟“ وہ میری توقع سے

قدرے نمایاں لمبی ناک، گول چہرہ اور مناسب بدن، قد بھی درمیانہ سا۔ غرضیکہ کہ نہ اسے حسین و جمیل کہا جاسکتا تھا اور نہ اس کی مناسب صورت بد صورتی میں شمار ہو سکتی تھی۔ شاید اسے بھی اپنی دراز زلفوں والی خوبی، اضافی خوبی کا پتا تھا کیونکہ چند لمبی گزرے تھے مجھے اس کی طرف تکتے ہوئے اور ان مختصر لمحات میں اس نے اپنی کالی گھٹاؤں سی دراز زلفوں کو لمبی گردن کی مدد سے چار چھ جھٹکے تو دے ہی دیے تھے اور یقین مایہ ہر جھٹکے پر میرے دل میں کچھ کچھ ہونے لگتا تھا۔

میں نے ان ہی زلفوں اور ان ہی جھٹکوں سے متاثر ہو کر اس سے دوستی کا فیصلہ کر لیا اور مجھے جاننے والے جانتے ہیں کہ میں جب کسی کام کی ٹھان لوں تو وہ کر کے ہی چھوڑتا ہوں۔ چاہے اس کے لیے مجھے کچھ بھی کرنا پڑ جائے۔ چونکہ دوست آپ کی رگ رگ سے واقف ہوتے ہیں اور ان سے آپ اپنے اندر کا کمینہ پن بھی نہیں چھپا سکتے تو دوستوں نے ارادہ میری

آنکھوں میں بھانپ کر سرنفی میں ہلایا اور اشاروں کنایوں کے بجائے مادری زبان میں منع کیا بلکہ ڈرایا بھی۔ ایک نے اپنے کندھے سے مجھے ٹھٹھا مار کر کہا۔ ”دیکھ لے یہ لاہور ہے اور یہاں کا قانون کج ہو رہا ہے۔“

”یہاں کی لڑکیاں بڑی پانچہ قسم کی ہیں۔ بچے دریا سے بندے کو پیاسا واپس لے آئے والی چالاکی ہے ان میں۔“

”ارے لڑکیاں چھوٹے بڑے شہروں کی سب ایک جیسی ہوتی ہیں۔ محبت کے دو لفظی دانے سے شکار ہونے والی میٹھی نظروں کے جال میں پھنسانے کے لیے بس چند منٹ لگتے ہیں۔ دیکھ لینا، میں کیسے اس کا شکار کرتا ہوں۔“ میں نے کالر جھاڑتے ہوئے مغرور انداز میں کہا تو وہ ایک دوسرے کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھنے لگے۔

”جیسے کہہ رہے ہوں۔ جاؤ جدھر مرتے ہو مرد ہمیں کیا ہے؟“

میں نے دو قدم ہی اٹھائے تھے کہ پیچھے سے ایک بولا۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے مہینوں کے لیے خوب صورت ناول

# بلاؤچی

فییم سحر قریشی



قیمت - 400/- روپے

منگوالیہ کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ فون نمبر: 32735021

37، اردو بازار، کراچی



”کیا مطلب آپ کو کوئی خطرناک بیماری لاحق ہے؟“ اس کے لہجے میں تجسس تھا۔

”خطرناک بیماری؟“ میں ہنسی سا سوچ رہا تھا کہ کہیں میری شکل پر کسی بیماری کے آثار تو نہیں دیکھ لیے اس لڑکی نے۔  
”مطلب کینسر وغیرہ؟“

”نہیں نہیں۔ خدا نہ کرے کہ خطرناک بیماری لاحق ہو۔ اصل میں ہم پشاور سے یہاں گھومنے پھرنے آئے تھے اور جلدی واپس جارہے ہیں۔“  
میری وضاحت پر وہ دھیرے سے مسکرائی۔

”ویسے تو میں ایسے لوگوں کو شور مچا کر پبلک سے دو چار تھپڑ کھلا دیتی ہوں جو خواہ خواہ چپکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن آپ جانے کیوں مجھے ایک شریف انسان لگ رہے ہیں۔۔۔ میں اسی لیے تو اتنی دیر سے آپ کی کمپنی انجوائے کر رہی ہوں کیونکہ آپ کے چہرے پر لکھا ہے کہ آپ برے یا فلرٹ۔ قسم کے انسان نہیں ہیں۔ میں نے سائیکالوجی پڑھی ہے اور فیس ریڈنگ اور مختلف حرکات سے بندے کو پہچان لیتی ہوں۔“  
”یا ہودو“ میرا جی چاہا مانتے لگوں دھمال ڈالنے لگوں کہ ایک اچھی خاصی۔ لے بالوں والی لڑکی نے مجھے ایسے الفاظ کہے تھے۔

ظاہری بات ہے، یہ تبصرہ بہت ہی مثبت تھا۔ اسی لیے میں نے بظاہر سنجیدگی سے اسے دیکھتے ہوئے خود کو دل ہی دل میں ہنس کر جھکی دی۔

”چلیں فون نمبر کا تبادلہ ہو سکتا ہے۔ آپ مجھے اعتبار کے قابل نظر آ رہے ہیں شکل سے اور ویسے۔۔۔ بھی میں ایک مخلوط ادارے میں تعلیم حاصل کر رہی ہوں۔ میں مرد اور عورت کی دوستی کو معیوب بات نہیں سمجھتی۔“

اس کے لہجے کا اعتماد مجھے متاثر کر گیا۔ میں جو اپنے آس پاس دو قسم کی لڑکیوں کو ہی دیکھتا آرہا تھا۔ میرے لیے دوپٹے کے کونے کو انگلیوں پر کھولتی پینٹی اتنی آسانی سے مان جائے گی مجھے اس کا یقین نہیں تھا۔

☆☆☆

یہ ملاقات ہماری دوستی کی وجہ بنی اور یہ دوستی محبت

کس زیادہ تیز لگ رہی تھی۔

”آپ موقع تو دیں۔ پھر دیکھے کیسے میں حقوق اور فرائض میں توازن رکھتا ہوں“ میں نے حقوق اور فرائض پر زور دیتے ہوئے کہا تو وہ جھینپ سی گئی۔ اس کے ساتھ کھڑکی لڑکی فون پر کسی سے بات کرتے ہوئے کچھ دور جا چکی تھی۔

”آپ کے بال بہت پیارے ہیں۔“ میں ڈائریکٹ مطلب پر آ گیا۔

”کیا خریدنے میں دلچسپی رکھتے ہیں؟“ وہ سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔

مجھے اس بات کا علم نہیں تھا کہ بڑے شہروں میں خواتین کے بالوں کا کاروبار بھی ہوتا ہے۔ خریدے اور بیچے جاتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ میری ہنسی شکل دیکھ کر وہ سمجھ جاتی کہ بندہ پینڈو ٹائپ ہے۔ میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”مجھے بالوں کے ساتھ بالوں والی بھی پسند ہے؟“ وہ ہکا بکا سی مجھے دیکھے گئی۔ ہم دونوں دھیرے دھیرے چلتے ہوئے پارک میں رکھی ایک بیچ کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

”آپ تو کچھ زیادہ ہی دل پھنک ثابت ہو رہے ہیں۔“ وہ وہیں ماربل کی بیچ پر بیٹھ چکی تھی۔

”مجھے آپ اچھی لگیں، تب ہی آپ سے بات کرنا ضروری سمجھا۔“ میں بھی ہمت کر کے اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

کن انگلیوں سے اپنے دوستوں کو دیکھا تو وہ مجھے ہی گھورے جارہے تھے۔ رشک آمیز نظروں سے۔ کیونکہ ان کو اندازہ نہیں تھا کہ چند منٹوں میں وہ لڑکی میرے ساتھ یوں ایک بیچ پر بیٹھ جائے گی۔

ہم سب دوستوں کا تعلق جس معاشرے سے تھا وہاں تو پبلک مقامات پر شادی شدہ جوڑے بھی یوں سرعام انٹھٹھے نہیں بیٹھتے تھے۔

”میں یہ سب اتنی جلدی نہیں کہنا چاہتا تھا لیکن میرے پاس وقت بہت کم ہے۔“ وہ میرے چہرے پر سچائی ڈھونڈنے لگی۔



میں کب بدلی پتا ہی نہ چلا۔ جب دو گھنٹے بعد ہم لاہور سے نکل رہے تھے تب اس کا فون نمبر میرے فون میں پری کے نام سے محفوظ تھا حالانکہ اس کا نام پروین اختر تھا۔ پروین کو پری بنا لینا کوئی انوکھی بات نہیں تھی لیکن اگر اس کا نام رشیدہ یا گلشن بھی ہوتا تو میں اسے پری ہی کہتا کیونکہ میں نے بچپن سے ہی سوچ رکھا تھا کہ بڑے ہو کر جس سے محبت کروں گا اس کا اسم شریف پری رکھوں گا۔ پری سے محبت تو سب ہی کرتے ہیں میں محبت کو پری بناؤں گا اب اس سوچ کو عملی جامہ پہنانا تو تھا۔ تقریباً ایک سال تک ہم روزانہ کئی کئی گھنٹے فون پر بات کرتے تھے۔ گرمی میں سکنز کے لیے میں پتی دھوپ میں چھت پر گھنٹے بھر کھڑا رہتا۔ کبھی سخت سردی میں بارہ بجے کے بعد دوائے پیکیج کے لیے مجھے کھلے سخن کی سیڑھیوں میں بیٹھنا پڑتا اس وقت پرندے یا جانور بھی کہیں دیکھے یا چھپے ہوتے تھے۔

بھی بھئی اماں کی کام سے چادر میں منہ چھپا کر باہر نکلتیں اور مجھے یوں گرم چادر ٹوپی میں فون کان سے لگائے دیکھ کر ماتھے پہ ہاتھ مار کر آسمان کی طرف دیکھتیں اور فریاد کرتیں۔

”ہائے۔ میرے اللہ جی! اس مجنوں کے دوسرے جنم کا اعزاز مجھے ہی بخشا تھا؟

اس سلی کا کوئی والی وارث نہیں ہے جو کسی وقت تو اسے روک دے کہ بیٹی بے شک سلی کی وراثت تمہیں مل گئی ہے لیکن اس وراثت کا اہل خود کو ثابت کرنے سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ مجنوں بے چارے کو زندہ بھی رہنے دو اس سلی نے تجھے نمویے سے مار کر چھوڑنا ہے۔“

میں نے اماں کو اس کے بارے میں سب کچھ بتا رکھا تھا اس کی تصویر بھی دکھائی ہوئی تھی۔ انہوں نے ناک بھوں چڑھا کر حیرت سے تصویر کو دیکھ کر پھر مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

”کھودا پہاڑ اور نکلی چوہا وہ بھی ایسی چھپکلی جیسی۔“ انہوں نے پری کی سیکنفی میں گول گول بنائے گئے ہونٹوں کی نقل اپنے ہونٹ سیکر کر اتاری

تھی تو میں بے ساختہ قسمیں کونہ روک پایا۔

”ارے اسے تم پری کہتے ہو بس ذرا کچھ دن پار نہ جائے تو دیکھنا موچھوں والا جن نظر آئے گی۔“ اس کے ہونٹوں اور ناک کے درمیان جگہ ہنر ہوئی ہوتی تھی ادرا ماں نے اس کی پکراتی زوم کی تھی کہ سب ہی کچھ صاف نظر آنے لگا تھا۔

”یہ دوستی شوستی تو ٹھیک ہے میں اس سے تمہیں منع اس لیے نہیں کر رہی کہ تم نے کون سا باز آ جانا ہے۔ لیکن دل پشوری سے آگے نہیں بڑھنا ہے۔ یہ یاد رکھنا اور شادی دادی کا مت سوچنا کیونکہ تمہارے باپ نے میرے کانوں میں یہ بات ڈال رکھی ہے کہ تمہاری اکلوتی پھوپھو کی بیٹی سے وہ رشتہ کرنا چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں میری بیوہ بہن ہے اس کا حق ہے مجھ پر۔“

اماں کی بات سن کر میں تقریباً اچھل ہی تو پڑا تھا۔ ”اس پر کئی کبوتری کا نام نہ لیں میرے سامنے۔ گل جاں۔“ ان کے باب کٹ رشتی بال دیکھ کر میں ہمیشہ منہ بنا لیتا تھا۔

”اپنا بھی بتا دیں اور محلے والوں کا بھی کہ آپ سب نے کیا سوچ رکھا ہے میرے مستقبل کی ساتھی کے بارے میں؟“ میں نے جل کر پوچھا تو وہ مسکرا دیں ”ماں باپ کو حق حاصل ہے بچوں کی زندگی کے فیصلے کرنے کا اور تمہاری پھوپھو نے بہت دھبی زندگی گزاری ہے، اکلوتی بہن ہے ان کی بہت محبت ہے دونوں بہن بھائی میں۔“ ماں نے ہمیشہ سسرالی رشتوں سے پیار کیا تھا شاید اس کی وجہ ابو سے ان کی بے پناہ محبت تھی

میں نے ناگواری سے کہا۔ ”اور پھوپھو نے بھی اکلوتے بھتیجے کو دکھی کرنے کا سامان پیدا کر رکھا ہے۔“ میری آنکھوں کے سامنے گل جاناں کا چہرہ آگیا۔ عجیب قسم کی لڑکی تھی وہ۔ سچی سنوری۔ با ادب۔ با اخلاق اور قابلیت کا نمونہ۔ مجھے اس کی اتنی اچھائی ڈرامہ لگتی تھی۔

”کتنی پیاری ہے گل جاناں۔ کوئی کمی نہیں اس میں اچھے کردار اور سیرت کے ساتھ شکل و صورت



لاٹھوں میں ایک ہے۔ یہ بڑی بڑی نیلی آنکھیں سرخ و سفید رنگت اور اونچا لمبا قد۔ نصیب والوں کو ملتی ہیں ایسی لڑکیاں۔ ”وہ یوں اس کی خوبیاں گنوا رہی تھیں جیسے میں نے کبھی اسے دیکھا ہی نہ ہو۔“ میں بچپن سے اسے دیکھ رہا ہوں ساتھ کھیلی ہے میرے۔ آپ تو یوں اس کی تعریفیں کر رہی ہیں جیسے میرے لیے وہ اجنبی ہو۔“ میں نے بری کایج پڑھتے ہوئے کہا تو انہوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔ ”کیا میں نے کوئی جھوٹ بولا ہے یا مبالغہ آرائی کی ہے اس بچی کے بارے میں؟“ ”نہیں ابھی تو اس کی تعریف میں دو گھنٹے مزید بھی لگ سکتے ہیں۔“ میں نے فون جیب میں رکھ کر طنز کیا۔

”مثلاً بورڈ میں ٹاپ کرنے والی خاندان کی پہلی لڑکی ہے۔ میڈیکل کالج میں اسے میرٹ پر داخلہ ملا ہوا ہے۔ اس کا اوڑھنا بچھونا بڑھائی ہے۔ اس کے لیے رشتوں کی لائن لگی ہوئی ہے لیکن پھوپھو کو اپنے بھائی اور بھتیجے کے علاوہ کوئی قبول نہیں اس لیے ان کی شدید خواہش ہے کہ گل جاناں میرے متھے لگے۔“

میں نے پیچھے مڑے بغیر جواب دیا۔ ”ماں پہلے تو یہ شادی ہوگی ہی نہیں اور خدا نخواستہ اگر ہو بھی گئی تو وہ شادی نہیں ہوگی بلکہ نمی ہوگی وہ بھی سب کے لیے۔“

میں دل پر بوجھ لیے باہر نکل آیا باپ کی ضدی طبیعت سے ہم دونوں ماں بیٹا واقف تھے اور اس معاملے میں تو ماں بھی ان کے ساتھ تھی۔ مطلب میری محبت آسانی سے ملنے والی نہیں تھی بہت لڑنا تھا مجھے۔ اسی لیے میں اپنی ساری ہمت جمع کرنے میں لگا ہوا تھا۔ گھر سے باہر نکل کر میں نے فون نکالا اور پری سے بات کرنے لگا۔

☆☆☆

اب جدائی مزید برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ اسی

لیے ایک سال بعد ہم نے دوبارہ ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ ہم دونوں اپنی ملاقات کی پہلی سالگرہ وہیں منانا چاہتے تھے جہاں ہم دونوں پہلی بار ایک دوسرے سے ملے تھے۔ میں اس سے ملنے لاہور پہنچ گیا اس بار میں اکیلا ہی گیا دوستوں نے بہت کہا ساتھ چلنے کے لیے لیکن مجھے کچھلی بار کے سارے سبق یاد تھے۔

☆☆☆

ملن کے وہ لمحات حسین ترین تھے۔

”جب پہلی بار ملے تھے تب صرف اچھی لگتی تھیں اور اب تو لگتا ہے کہ اچھا لگنا۔ محبت کرنا۔ تمہیں سوچتے رہنا۔ بس یہ ہی زندگی ہے تم سے پہلے تو جو تھے زندگی میں وہ رہیں گے۔ جیسے ماں باپ خاندان وغیرہ۔ لیکن تمہارے بعد کوئی بھی نہیں آئے گا۔ مرتے دم تک کے لیے یہ وعدہ ہے۔“

میری گیمبر آواز لور لہجے کی سچائی نے اسے نظریں جھکائے پر مجبور کر دیا تھا وہ گلابی سوٹ کے ہم رنگ گالوں کے رنگ چھپانے کی کوشش میں ناکام تھی۔

”بچے تو ہوں گے ناں؟“ اس نے شوخی سے پوچھا۔ ”ہاں بچے تو ہمیں باندھے رکھنے کی زنجیر ہوں گے۔ مگر یاد رکھو بچے صرف دو ہوں گے۔ مجھے باؤں میں بیڑیاں تو منظور ہیں لیکن ساتھ ہی ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پسند نہیں۔ یہ نہ ہو کہ تم گلے میں پھندا بھی ڈال لو۔“

وہ ہنسنے لگی اور میں اسے وارفتہ نظروں سے دیکھتے ہوئے دھیسے لہجے میں جدائی کے زمانے میں لکھی نظمیں سنانے لگا۔

ہم نے ایک ہفتہ ایسے گزارا کہ روز صبح سے شام ایک دوسرے کی معیت ایک دوسرے کی حسین رفاقت میں گزرتی۔ بہت اچھا، بہت خواب ناک وقت گزرا لیکن واپس تو آنا تھا سو ایک بار پھر ملنے کے وعدے پر ہم بادل ناخواستہ الگ ہوئے۔ وقت رخصت میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا تھا۔ وہ بھی رو رہی تھی، تڑپ رہی تھی۔

”مجھ سے اب مزید دوری کا کرب نہیں سہا جائے گا ملن کے لیے دعا کے علاوہ دوا بھی ضروری



ہے عامر۔“ وہ سکنے لگی۔

”میرے ساتھ مجبوریوں سے بھی رشتہ جڑا ہوا ہے تمہارا ان کو سمجھو۔ ان کے حل کے لیے سوچو۔ ہم ایک تب ہی ہوں گے جب مجبوریاں اور مشکلیں آسانیوں میں بدلیں گی۔“

میں مبہم سا جواب دیتا۔ وہ مایوسی سے مجھے دیکھتے ہوئے کہتی ”کوئی بھی مشکل محبت سے بڑی نہیں ہو سکتی۔ میں نے اسے سینے سے لگا رکھا ہے تو ساری مجبوریوں کی خبر تھی۔ مجھے بس اپنا نام دے دو۔ نکاح کے بعد جو تم کہو گے وہ میرے لیے حکم کا درجہ رکھے گا۔“ میں لفظوں سے تسلی دے سکتا تھا۔ عملی طور پر کچھ بھی میرے بس میں نہیں تھا۔

☆☆☆

یوں تین سال بیت گئے ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ صبح سے شام کرنے میں اور شام سے صبح تک ساتھ رہتے ہوئے۔ میں اس کی آواز پر اٹھتا تھا اور اس کی دھڑکنوں کی آواز سن کر خند آتی تھی۔ ہم دونوں جب باتیں کرتے کرتے تھک جاتے تو میں اس سے کہتا۔ ”مجھے ابھی خند نہیں آرہی تم اپنے سینے پر فون رکھ کر سو جاؤ میں بھی تمہاری سانسوں کی لوری سننے سننے سو ہی جاؤں گا۔“

ہم دونوں کے فون میں جب تک چارج ختم نہیں ہو جاتا تھا تب تک جاگنے والا سونے والے کی سانسیں گنتا رہتا تھا۔ ہم اک عرصے سے ایک دوسرے کے بغیر نہیں جے تھے اور اب تو ہمیں ایک دوسرے کے بغیر جینے کا طریقہ بھی بھول گیا تھا۔ وہ یہ ہی کہتی تھی کہ رشتہ بھیجو کیونکہ بقول اس کے کئی رشتے اس نے مسترد کر دیے تھے اور اب والدین شادی کے لیے بہت زور ڈال رہے ہیں۔

میں تین بہنوں کا اکلوتا بھائی ابھی تعلیم نامکمل تھی تینوں بہنوں سے چھوٹا بھی تھا ایک کی شادی ہو چکی تھی باقی دو کی منگنی اور نکاح ہو چکا تھا۔ میں اسے انتظار کا ہی کہہ سکتا تھا اور وہی کہتا رہا کیونکہ بہنوں کی شادیوں سے پہلے میری شادی کسی صورت بھی ممکن

نہیں تھی۔ گل جاناں کے بارے میں۔ میں نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا لیکن میرے دل میں اندر ہی اندر کہیں یہ دھڑکا ہر وقت لگا رہتا تھا کہ کسی دن اچانک والدین منگنی ہی نہ کرا دیں۔

پری۔ فخر تھی اور اس کے پاس بھی دوسرا کوئی رستہ نہیں تھا جس کی منزل مجھ تک پہنچنا ہو وہ دوسرے رستوں پر کیسے چل سکتی تھی۔ دوسرے رستے تو الگ منزلوں کے لیے طے کیے جاتے ہیں۔ میرے سامنے گل جاناں بھی تھی کیونکہ والدین شادی کا ذکر کرتے ہی گل جاناں کا نام ضرور لیتے تھے۔

”ارے گلے بیٹا بھی پڑھائی سے فارغ ہو جائے گی اور تم بھی بہنوں کے فرض سے سبک دوش ہو جاؤ گے۔“ یہ ابو کا فرمان تھا۔

☆☆☆

اس دن منجھلی آپا کی رخصتی کی تقریب تھی دبیر کی سرد ترین سی شام کی خشکی لہو کو جمارہی تھی۔ دوسرے شہروں سے آئے ہوئے رشتے دار اکٹھے تھے اور ایک بالچل بچی ہوئی تھی۔

”کیسے ہو عامر؟“ گل جاناں بی بی میرا حال پوچھ رہی تھیں۔ جی تو چاہا کہہ دوں تم نے خندیں حرام کر رکھی ہیں میرے ساتھ میری ماں کی بھی۔ وہ کہیں میری زندگی میں لانے کے لیے اور میں کہیں زندگی میں نہ لانے کے لیے رات رات بھر سوچوں، منصوبوں اور دعاؤں میں مگن رہتے ہیں۔

”ٹھیک ہوں گل! تم ساؤ پڑھائی کیسی جارہی ہے؟“ میں نے بڑے سپاٹ سے انداز میں رکی سوال کیا گل کے ساتھ جاناں لگانے کی مجھے دل نے اجازت نہیں دی۔

”تم جانتے ہونا کہ گل جاناں حبیب ہمیشہ پڑھائی کو سب سے اوپر رکھتی ہے اسی لیے تو اللہ تعالیٰ ہمیشہ کامیابی بھی عطا فرماتا ہے۔ اس وقت تک تو اپنے کالج کی ٹائر ہوں اور آگے بھی ان شاء اللہ تعالیٰ یہ کامیابی ملتی رہے گی کیونکہ میں محنت سے جی بالکل نہیں چراتی۔“ کس قدر توانائی تھی اس لڑکی کے ہر انداز



میں۔ میں نے بغور اس کی طرف دیکھا چمکتی نئی آنکھوں میں مستقبل کے کئی روشن خواب جگمگا رہے تھے۔

اس کے سنہری بال کندھوں تک ترشے ہوئے تھے اور اسے دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ میڈیکل کی خشک پڑھائی کر رہی ہے۔

میں نے بے اختیار دل ہی دل میں اس کی خوب صورتی اور انداز کو سراہتے ہوئے سوچا۔

”اگر بڑوں نے اس کی شادی میرے ساتھ کرادی تو اس لڑکی کے ساتھ بھی بہت بڑی زیادتی ہوگی۔ ایک تقسیم شدہ مرد کی بیوی ہونے سے بڑی سزا عورت کے لیے اس دنیا میں کوئی اور نہیں ہو سکتی۔“

”عامر! تم کچھ اچھے اچھے سے نظر آ رہے ہو؟“ وہ میرے سامنے کھڑی پوچھ رہی تھی، ہم دونوں گھر کے وسیع لان میں ایک دوسرے کے روبرو کھڑے تھے۔ پھوپھو اور امی جان دونوں قریب ہی کھڑی تھیں۔ پھوپھو ممتی خیر انداز میں ہمیں دیکھتے ہوئے مسکرائے جا رہی تھیں۔

”جی بیٹا۔ اصل میں بہن کی شادی کا دن ہے لازمی بات ہے کہ بھائی تو ادا اس ضرور ہوگا۔“

ماں نے پیچھے سے آکر — میری کیفیت کو بہن کی رخصتی سے ملا کر وضاحت کر دی تو وہ بھی ادا سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں ان دونوں کو وہیں چھوڑ کر باہر نکل آیا۔

دو دن سے میں بہت مصروف تھا اور ہر وقت ابو میرے ساتھ تھے اس لیے میرا پری سے رابطہ کم تھا اور ایسا پہلی بار ہوا تھا۔

اس کے نمبر سے مسلسل کالز آ رہی تھیں اور میں نظر انداز کر رہا تھا کیونکہ مہمانوں کے ساتھ لڑکے والوں کو بھی فل پروڈوکول دینا کافی مشکل کام تھا چند لمحوں بعد میں نے کسی ایمر جنسی کے خدشے یا ڈر کی وجہ سے اس کا فون ریسیو کیا اور اس کی بات سن کر دم بخود سا خلا میں گھورنے لگا۔

”یہ..... یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ نہیں نہیں۔ یہ مذاق کا ٹائم نہیں ہے یار۔“

”میں نے پہلے کبھی تمہارے ساتھ ایسا مذاق کیا ہے جواب کروں گی۔“

مجھے پھر بھی یہ لگا کہ میں نے کچھ غلط سنا ہے لیکن دوسری طرف سے اس کی رندگی ہوئی آواز میری سماعتوں کو زخمی کیے جا رہی تھی۔

”عامر! میرا یقین کرو میں سچ کہہ رہی ہوں میں پشاور ریلوے اسٹیشن پر اکیلی اور بے یار و مددگار کھڑی تمہارا انتظار کر رہی ہوں پلیز جلدی سے مجھے لینے آ جاؤ۔ میں اپنے ماں باپ بہن بھائی۔ اپنا گھر، اپنا شہر سب کچھ چھوڑ کر تمہارے پاس آ گئی ہوں وہ لوگ میری شادی کہیں اور کرنا چاہ رہے تھے مگر مجھے تمہاری بنا زندگی قبول نہیں۔ میں ہمیشہ کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی تھی اس لیے میں نے یہ فیصلہ لیا ہے۔“

میں دم بخود سا یہ سب سننا رہا آپا کے سرال والے بارات لے کر آچکے تھے میں باپ کے ساتھ کندھے سے کندھا ملائے کھڑا تھا۔ باراتیوں کا استقبال کرنے کے لیے۔ ایسے وقت وہ مجھ سے ایسی توقع کر رہی تھی جو میرے بس کی بات ہی نہیں تھی۔ دوسری طرف سے وہ روتے ہوئے ہیلو ہیلو کر رہی تھی۔

”پلیز مجھے اپنے گھر کا ایڈریس ہی دے دو۔ میں..... تمہارے والدین کے پاؤں پڑ جاؤں گی ان کی منت کروں گی۔ تم پر کوئی الزام نہیں آنے دوں گی۔ میں کہہ دوں گی کہ یہ مجھ اکیلی کا فیصلہ ہے۔ تم بے تصور ہو۔ تم بول کیوں نہیں رہے عامر؟ میں بہت دیر سے اکیلی کھڑی ہوں لوگ مجھے عجیب نظروں سے گھورنے لگے ہیں..... میں نے گھر سے نکلنے سے پہلے تمہیں نہیں کہا۔ کیونکہ مجھے پتا تھا تم مجھے منع کرو گے اپنی مجبوریوں کا رونا رورو کر مجھے کسی اور سے شادی کے لیے ہاں کرنے کا کہو گے۔ لیکن یہ میرے بس میں نہیں ہے عامر! میں خود اپنے بس میں کہاں ہوں مجھے تو محبت نے اس طلسم نگر میں لا کر پٹا ہے کہ جس میں مڑ کر دیکھنے والے پھر کے ہو جاتے ہیں۔ عامر! میں مڑ کر نہیں دیکھوں گی۔ مجھے پتھر نہیں بننا۔ پتھروں کو بڑی ٹھوکریں سہنی پڑتی ہیں۔۔۔ محبت کے



درہنہ کے بعد یہ ٹھوکریں کون برداشت کر سکتا ہے؟  
بولو تو سہی، چپ کیوں ہو؟“

میں نے بنا سوچے سمجھے فون بند کر دیا۔ وہ بار بار کال کر رہی تھی میں نے فون ساکنٹ کر دیا۔ مجھے اس وقت اور کچھ نہیں سوچ رہا تھا۔ میں اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی ناکام سعی کرتے ہوئے ہمیشہ کی طرح مشورے کے لیے امی کے پاس اندر چلا آیا۔ چونکہ گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا اور امی بھی مصروف تھیں تو میرے اشارے پر وہ پریشانی سے مجھے دیکھنے لگیں شاید انہیں ڈر لگا کہ مردانے میں کوئی جھگڑا نہ ہو گیا ہو۔ عموماً ایسے موقعوں پر حق مہر وغیرہ پر تو تو میں میں ہو جاتی ہے۔ میں انہیں لے کر اندر کمرے میں آگیا۔ دو چار بل تو وہ میری بات سمجھیں ہی نہیں اور جب سمجھیں تو ایک دم سے صوفے پر گر سی گئیں۔ میں نے دیکھا ان کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے تھے اور رنگت بالکل زرد ہو گئی تھی۔ انہوں نے چند لمحوں کے توقف کے بعد سخت لہجے میں کہا۔

”میری بات دل سے نہیں دماغ سے سنو عامی۔ ایک تو تم ابھی اپنے پیروں پر نہیں کھڑے ہوئے۔ ہم نے اپنا سب کچھ تمہاری اچھی تعلیم پر لگا دیا ہے۔ یہ گھر سرکاری ہے تمہارے باپ دل کے مریض ہیں۔ وہ یہ بدنامی سہہ نہیں پائیں گے کہ ان کے بیٹے نے اک بھاگی ہوئی لڑکی کو اپنایا ہے، ہم عزت دار لوگ ہیں۔ محبت کی شادی اسے وقت پر تو ٹھیک ہے، یہ معاشرے کے گلے میں کانٹے کی طرح نہیں اٹکتی بلکہ ہمارے ہاں یہ نوبالہ لوگ نکل ہی لیتے ہیں۔ لیکن یاد رکھو تمہاری آنے والی نسل اس جرم کی سزا بھگتے گی تمہاری کئی نسلیں بھاگی ہوئی ماں۔ بلکہ مائی دادی کا طعنہ سنیں گی۔“

میں پریشان سا انہیں دیکھے گیا۔  
”ماں اب میں کیا کروں۔ کیا کسی کو بھیج کر اس کے لیے ہوٹل وغیرہ کا انتظام کر ادوں۔ وہ جوان جہان لڑکی اس زردوں کی بستی میں بالکل اکیلی ہے اور بار بار کال کر رہی ہے۔ سوچیں تو سہی، وہ لڑکی ہو کر یہاں تک پہنچ گئی اور میں مرد ہو کر اسے بالکل اچھی جگہ اکیلا

چھوڑ دوں؟ لعنت ہے میری مردانگی پر۔“

میں نے ککھٹس اور پریشانی کے طے جملے تاثرات سے انہیں دیکھا۔

”نہیں۔“ وہ فیصلہ کن انداز میں بولیں ان کا لہجہ جذبات سے عاری اور بالکل سرد تھا میں نے پہلے کبھی ان کا یہ رویہ نہیں دیکھا تھا۔

”تم فون بند کرو۔ سم نکال کر مجھے دو، کل دوسری سم ڈال لینا۔ کسی اور کا نمبر تو اس کے پاس نہیں ہے؟“

ابھی میں کہہ رہی والا تھا کہ چھوٹی بہن کا نمبر اس کے پاس ہے، وہ کبھی کبھی بات کرتی ہیں ایک دوسرے کے ساتھ کہ اسی وقت چھوٹی بہن موبائل فون اٹھائے اندر آ گئی۔ ”بھیا! پری بھا۔“ اس نے ماں کے کڑے تیوروں سے گھورنے پہ لفظ بھا بھی منہ میں رکھ لیا۔

”پری کا فون ہے مجھ سے پوچھا کہ بھیا کدھر ہیں تو میں نے بتا دیا اب فون کرنی ہیں۔“ اس نے فون میرے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے کہا۔

”اپنا فون آن رکھا کریں نا۔“ وہ ماں کی نظروں کا مطلب سمجھ کر بولی تو میں نے بے بسی سے اپنے خالی ہاتھوں کو ماں کے سامنے پھیلا دیا۔

”آج بہت کڑی آزمائش کا شکار ہے وہ لڑکی۔ پلیز مجھے جانے دیں میں اسے کسی طریقے سے سمجھا بچھا کر واپس بھیجتا ہوں۔“ میری التجا میں نظر انداز کرتے ہوئے وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

”اسے گھر کا ایڈریس تو نہیں بتایا ہوا؟“

”نہیں۔“ میں نے رد دینے والے لہجے میں کہا۔

”کسی اور سے تو رابطہ نہیں ہے اس کا۔ کسی ایسے سے جو اسے ہمارے گھر تک لائے؟“

”نہیں۔“ مجھے افسوس ہوا کہ کیوں اسے گھر کا

ایڈریس نہیں دیا تھا۔ وہ سیدھی میرے گھر کے

دروازے پر آ جاتی تو ہو سکتا ہے میرے والدین اسے

قبول کر ہی لیتے۔ سوچوں کہ بھنور سے مجھے امی کی

دھیمی آواز نے نکالا۔

”عامر! بہت نازک لمحات ہیں۔ تمہاری

بہن تو قیاں اب ختم ہو جانی چاہئیں۔ گھر مہمانوں سے



بھرا ہوا ہے اور ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔  
دوسرے شہروں کے مہمان ابھی پورا ہفتہ گزاریں  
گے۔ تمہاری پھوپھو اور کل جاناں بھی یہاں پر موجود  
ہیں، اس دوران وہ لڑکی یہاں نہ بھی رہی تب بھی  
پوکیس کو اس کے گھر والے تمہارا نمبر ضرور دیں گے  
اور چند ہی گھنٹوں میں وہ نمبر سے لوکیشن دیکھ کر یہاں  
پہنچ جائیں گے۔ تم بہنوں والے ہو۔ معاشرہ بہنوں  
کے کیے کی سزا بھائیوں کو اور بھائیوں کے کیے کی سزا  
بہنوں کو دینے کا عادی ہے میں نہیں چاہتی کہ ہم سب  
صرف ایک لڑکی کے لیے برباد ہو جائیں۔ وہ مایوس  
اور ناامید ہو کر گھر واپس چلی جلتے گی۔“

وہ جلدی جلدی بولتے ہوئے بار بار وال  
کلاک کی طرف بھی دیکھ رہی تھیں۔ اب وقت کے  
پابند تھے اور کھانا کھانے میں چند ہی منٹ تھے۔ وہ  
جانتی تھیں کہ اگر کچھ دیر وہ ادھر رہیں تو ابوان کی تلاش  
میں اندر آ جائیں گے۔

”ای! مایوسی اور ناامیدی کی انتہا پر انسان  
موت کی آغوش میں پناہ لیتا ہے۔ اگر اس نے کچھ  
ایسا کر لیا تو میں خود کو اور آپ کو بھی کبھی معاف نہیں کر  
سکوں گا۔“ میں نے سردنوں مٹھیوں میں بھیج لیا تھا۔  
دل کی دھڑکنیں عجیب سا تقاضا کر رہی تھیں اندر سے  
کوئی چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

”اے یوں بچ راہ میں نہ چھوڑو عامرا! وہ تم سے  
بہت محبت کرتی ہے۔“ میں نے کان بند کر لیے اور چیخیں  
سناٹوں میں بدل گئیں! می کی آواز سنائی دی۔

”کچھ نہیں کرے گی۔ سیدھی گھر واپس جائے  
گی فکر نہ کرو۔ تم ایسا کرو کہ ابھی سزنکا لو دونوں فونز  
سے اور مجھے دو۔“

ان کا فیصلہ کن انداز مجھے چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا  
کہ وہ کبھی نہیں مانیں گی۔ میں نے سر جھکا دیا۔ باہر  
سے ابو کا پیغام آیا کہ زمان خانے میں کیا کر رہے ہو  
باہر نکلو۔ کھانا لگنے والا ہے

☆☆☆

اسی وقت میں نے ماں کے کہنے پر دونوں نمبر

بند کر دیئے اور اپنی روح پر ایک مسلسل بوجھ کا عذاب  
سہتے ہوئے۔ موت جیسی زندگی گزارنے لگا تھا۔  
زندگی کو زندگی کی طرح جینے والے جان ہی نہیں سکتے  
کہ میں کس عذاب میں زندگی گزار رہا تھا۔ جس  
وقت فون ہاتھ میں لیا۔ سم نکالنے کے لیے، اس وقت  
بھی اس کی کال آرہی تھی۔ اس کے بعد تو۔ رات دن  
کا کوئی ایک لمحہ ایسا نہیں ہوتا تھا کہ جب اس کی  
سسکیاں میرے کانوں میں گھلے ہوئے سیسے کی  
طرح اتر کر سماعتوں کو نہ جلائی ہوں وہ منت بھرے  
انداز میں اس کا سسکنا مجھے تڑپاتا رہتا تھا۔

”خدا کے لیے جلدی آؤ عامر۔ مجھے یوں لگ  
رہا ہے کہ میرے آس پاس کے ہر مرد کو میرے ماتھے  
پر لکھا نظر آ رہا ہے کہ میں گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی  
ہوں اور گھر سے بھاگی ہوئی لڑکیاں لوٹ کا مال ہوتی  
ہیں۔ مجھے میری دیوانگی نے لوٹ کا مال بنادیا ہے۔“  
اس کے ہر ہر لفظ میں درد کی ٹیسیں اٹھ کر  
میرے دل کو تڑپا رہی تھیں۔

میں اس قدر بے غیرت آدمی ہوں کہ یہ بھی نہ  
سوچا کہ وہ اکیلی لڑکی پشاور جیسے شہر میں کہاں جائے  
گی؟ ریلوے اسٹیشن پر ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔  
پری جس حلیے میں بے پردہ پھرتی تھی۔ یہاں کی  
لڑکیاں عموماً ایسے نہیں پھرتیں بلکہ شٹل کاک برقعے  
اور عبایا پہنے حجاب میں لمبوں خواتین ہی آس پاس  
دکھائی دیتیں۔ جو یہاں کی ہوتیں، وہ تو اسی حلیے میں  
ہوتیں اور جو کہیں دوسرے شہر سے آتیں۔ وہ پہلے  
سے جانتیں کہ بے پردہ گھومیں گے تو تماشا بن جائے  
گا مگر پری کو تو کچھ پتا نہیں تھا۔ اسے تو میں نے  
سرسری سا بتایا تھا کہ مچھلی کی شادی ہے۔ یہ بھی پتا  
نہیں تھا اسے کہ ہمارے ہاں رسوم و رواج کتنے سخت  
ہیں ہم تو برسوں سے صرف پیار محبت کی باتیں کرتے  
آئے تھے۔ ہمارے درمیان مستقبل کے منصوبوں پر  
باتیں ہوتیں۔ یہاں تک کہ ہم نے اسے ہونے  
والے بچوں کے نام بھی سوچ رکھے تھے۔ وہ کہتی۔

”عامر! بیٹی ہوگی تو ہم اس کا نام در شہوار رکھیں



گے اور بیٹا ہوا تو التمش ہوگا۔

اور ہم دونوں بچوں کو ایک جیسا پیار دیں گے  
کبھی بیٹی کو بیٹی نہیں۔ بلکہ بیٹے کی طرح مکمل انسان  
سمجھیں گے۔“

میں اس کی چکار پر ہنس دیتا۔

”نہیں۔ میں یہ نہیں کروں گا۔ پہلے سے بتا رہا  
ہوں۔“

وہ ڈر جاتی۔ ”مجھے تو پہلے ہی ڈر لگتا ہے کہ تم  
لوگوں میں بیٹیوں کو وہ حقوق نہیں ملے بلکہ جتنا میں  
نے پڑھایا سنا ہے تمہارے ہاں عورت کو مرد سے کمتر  
اور فقط غیرت کا سہیل ہی سمجھا جاتا ہے۔“

”تم نے ٹھیک سنا ہے۔“ میں اس کے ڈر سے  
لطف لیتا۔

”مگر تم تو کہتے تھے کہ تم سب سے الگ ہو اب  
کیوں؟“

وہ رو ہانسی ہو جاتی۔

”ارے بابا! میں بیٹی اور بیٹے کو برابر نہیں  
سمجھوں گا بلکہ بیٹی کو بیٹے پر فوقیت دوں گا۔ مجھے  
بیٹیاں بہت اچھی لگتی ہیں۔ اتنی اچھی کہ میں دعا کرتا  
ہوں خدا مجھے صرف بیٹیوں کا باپ بنائے۔“ میری  
جذباتی آواز سے وہ خوش ہو جاتی۔

ہماری باتیں ایسی ہی ہوتی تھیں۔ آنے والے  
کل کے منصوبے۔

”سنو! ابھی سے بتا رہی ہوں ہمارے بیڈ پر  
صرف ایک تکیہ ہوگا۔ مجھے تمہاری بانہوں کے تکیے پر  
سردکھ کر سونا ہے بس۔“

”میں خرائے لیتا ہوں، ابھی سے سن لو۔ بعد  
میں بگڑنا نہیں۔“

میری بات سن کر وہ کھکھلا کر ہنس دیتی

”زبیدہ آیا کے ڈھیر سارے ٹوکے آزما کر  
دیکھوں گی اور اگر پھر بھی خرائے سننے پڑے تو کانوں  
میں روئی ٹھونس کر سویا کروں گی۔ لیکن تکیہ تمہارے  
بازو ہی ہوں گے۔“

”اور جب کانوں میں روئی رکھو گی تو وہ محبت

کے حسیں دیریلے نغے کیسے سنو گی جو میں نے  
تمہارے لیے تخلیق کیے ہیں اور تمہاری سماعتوں کی  
نذر کرنے کے لیے نہ جانے کب سے ان نغموں کی  
دھنوں کو امانت کے طور پر سنبھال رکھا ہے؟“

وہ شرما جاتی اور اس کے سانولے سلونے  
گالوں پر پھیلی حیا کی سرخی تصور کی کٹڑی سے میں  
دیکھ لیتا۔ وہی معصوم سی لڑکی جو اندر باہر سے بالکل  
ایک جیسی تھی اس عہد میں بھی۔ اسے میں نے کھودیا  
تھا۔ اس کا انسانوں پر سے اعتبار ہمیشہ کے لیے اٹھ  
گیا ہوگا۔ وہ محبت کے نام سے بھی نفرت کر رہی  
ہوگی۔ میں ذہنی اذیت کی انتہا پر تھا۔

مجھے لگ رہا تھا جیسے مجھ سے میں کھو گیا ہوں۔  
خود کو ڈھونڈنا وہ بھی رسوں رواجوں کی تاریکی میں

بہت مشکل کام تھا۔ میری کیفیت کو وہی لوگ سمجھ سکتے  
ہیں جن سے اپنا آپ گم ہوا ہو۔

اماں میری ذہنی کیفیت کو سمجھتی تھیں اسی لیے تو  
رات دن تسلیاں دیتی رہتیں۔

”دیکھو عامر! تم اپنے والدین اور بہنوں کا  
اکھوتا سہارا ہو۔ تم نے ہمارے بڑھاپے کا بوجھ اپنے  
جوان کندھوں پر اٹھا کر ہمیں زندگی سے گور تک پہنچانا  
ہے خدا را ایک عام سی، معمولی لڑکی کے لیے خود کو اور  
ہم سب کو برباد نہ کرو۔ اٹھو ایک نئی زندگی تمہیں  
بانہیں کھولے پاس بلا رہی ہے۔ یہ اس پرانی زندگی  
سے بہت اچھی ہوگی۔ نئے مسکراتے اس کا استقبال  
کرو۔ پیچھے مڑ کر مت دیکھو۔ ماضی میں رہنے والے  
کبھی خوش نہیں رہ سکتے۔ اور میں تمہیں خوش دیکھنا  
چاہتی ہوں گل جاناں جیسی لڑکیاں نصیبوں سے ملتی  
ہیں اپنے نصیب کو ٹھو کر مت مارنا۔“

”اب بھی آپ کو اپنے بیٹے کی فکر ہے آپ یہ  
نہیں سوچ رہیں کہ اس اکیلی لڑکی کے ساتھ کیا ہوا  
ہوگا کتنا ظلم کیا ہے ہم نے اس پر؟“

میں نے افسوس سے ان کی طرف دیکھ کر کہا تو  
انہوں نے نظریں چڑھائیں۔

”ایسے لوگوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہ



بھی تو شریف والدین کی اولاد ہے۔ اس نے اپنی ماں کے ساتھ کتنی بڑی زیادتی کی ہے، جس عورت نے اسے جہنم دیا، جس باپ نے خود کو تکلیف دے کر اسے راتیں بچائیں۔ کیا دیا اس نے؟ بدنامی۔ تکلیف رسوائی۔ اور بھوٹ؟“

وہ شدید برہم تھیں۔ میں چکا بیٹھا رہا اس وقت انہیں کچھ بھی کہنا مصیبت کو گلے سے لگانا تھا۔ ”ماؤں کی تربیت پر سوال ہوتی ہیں ایسی بیٹیاں۔“

اور یاد رکھنا کہ ایسی بیٹیاں عزت اور خوشیوں کے لیے ہمیشہ ترستی رہتی ہیں۔ وہ کیسے خوش رہتی جس نے خونی رشتوں کی قدر نہیں کی۔ اور وہ کسی بھی رشتے کی کیا قدر کرتی؟“

ان کی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی بس میرے اندر ایک سوال ہر وقت اٹھتا تھا اس سوال کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے تھک گیا تھا۔

اس لیے روح کا بوجھ اتارتے ہوئے میں نے پوچھا۔

”عورت ہو کر اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس لڑکی کا انجام کسی صورت اچھا نہیں ہوگا۔ آپ نے ایسا فیصلہ کیا۔ مجھے تو حیرانی ہو رہی ہے اپنی ہمدرد اور انسانیت کا درد رکھنے والی ماں کی بے حسی دیکھ کر۔“ وہ غصیلے لہجے میں بولیں۔

”بس اب اس موضوع کو ہمارے گھر میں ہمیشہ کے لیے بند ہو جانا چاہیے۔“ ان کے پاس میری بات کا جواب بھی تو نہیں تھا۔

مگر مجھے سکون نہ ملا، یوں لگتا تھا جیسے نشئی کا نشہ ٹوٹ رہا ہو۔ وقت تھا کہ گزر ہی نہیں رہا تھا بجائے کم ہونے کے زیادہ ہی ہو رہا تھا۔ پہلے صبح سے شام کرنے کا پتا ہی نہیں چلتا تھا لیکن اب تو دن گزرتا ہی نہیں تھا۔ دو صدیوں جیسے دو مہینے میں نے اسی کیفیت میں گزار دیے۔

اس دن بری کی سالگرہ تھی۔ پچھلی سالگرہ کی یادیں جنگاریوں کی صورت میں جمع ہو کر شعلوں میں بدل گئی تھیں میں اس پیش اس جلن کو برداشت نہیں کر

ماں رہا تھا۔ میں نے خود کو مصروف رکھنے کی بہت زیادہ کوشش کی باہر نکل گیا۔ پارک میں بیٹھی ہر عورت ہر لڑکی نے اس کا چہرہ، اس کا لباس اوڑھ رکھا تھا۔ میں کس کس کے تعاقب سے خود کو روکتا؟ گھر آ کر اپنے کمرے کا دروازہ بند کیے کئی پل سسک سسک کر رونے کے بعد بھی دل کو چین نہیں آ رہا تھا: بھی رونے سے بھی پہاڑ جیسے دکھ کم ہوئے ہیں؟ میں نے خود کو آئینے میں دیکھ کر سوچا اور جواب نفی میں پا کر آئینے میں خود پر غور کرنے لگا۔

”یہ میں ہوں؟“

میں نے خود کلامی کی۔

”نہیں۔ یہ تم نہیں ہو۔ یہ تو کوئی اور ہے تم تو روشن آنکھوں اور چمکتے چہرے والے عامر تھے تمہارے ہونٹوں پر مسکراہٹ چلی رہی تھی۔“

”یہ زرد چمکے ہوئے گال بے رونق آنکھیں، مدقوق جسم اور جھکے جھکے شانوں والا مرد تو کوئی اور ہے۔“

میں نے آئینے سے ڈر کر اپنے خالی دل کو پہلانے کی کوشش کی اور ٹی وی آن کیا اور فلم لگا دی فلم دیکھنی شروع کی ہی تھی کہ ہیروئین کی ہر ہر ادا میں سے پری جھانکنے لگی۔ بہت کوشش کی کہ ذہن میں سے اسے نکال باہر کروں۔ لیکن دل اور دماغ میں پری کے علاوہ اور کچھ نہیں آ رہا تھا۔ دل کے شدید مجبور کرنے پر میں نے ہمت کی اور دیر تک سوچنے کے بعد فیصلہ کن انداز میں سر ہلاتے ہوئے سوچا۔

”بے شک ماں نے اپنے سر کی قسم دے کر مجھے پابند کر رکھا ہے۔ لیکن غیر اللہ کی قسم چاہے وہ ماں ہی کیوں نہ ہو شرک ہے۔“ میں نے خود کو سمجھاتے ہوئے موبائل فون اٹھا لیا۔ دل مکمل طور پر باغی ہو چکا تھا۔ اب کسی صورت رکنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ تب میں اس کا نمبر جو دل پر لکھا ہوا تھا کانٹتے ہاتھوں سے ملانے لگا۔

جو نمبر سوتے ہوئے بھی ملا ہوتا تھا اور جس فون پر اس کی سانسوں کی لے سن کر میری دھڑکنیں دھماں ڈالا کرتی تھیں آج وہ نمبر بند آ رہا تھا۔ میں نے اپنے پاس محفوظ پری کی سہیلی کے نام پر سیو نمبر ملایا یہ وہی



سہیلی تھی جو پہلی ملاقات میں بھی اس کے ساتھ تھی۔  
مجھے اس کا نام ٹھیک سے یاد نہیں تھا پری سے اس کا  
نمبر لیتے ہوئے میں نے کہا تھا۔

”یار اگر کسی دن کسی بھی وجہ سے تمہارا نمبر بند  
ملا تو میرا دل بند ہو جائے گا۔“

تب اس نے مجھے یہ نمبر دے کر کہا تھا اس نمبر  
پر میرے بارے میں معلومات کر لینا میری اس سہیلی  
کو میرے بارے میں سب پتا ہوتا ہے۔

”تو کس نام پر یہ نمبر سیو کروں؟“  
”کوئی ضرورت نہیں ہے کسی بھی نام پر سیو  
کرنے کی۔ مجھے اپنے علاوہ کسی لڑکی کا نام تمہارے  
فون کے کنٹیکٹ میں قبول نہیں۔ منظور نہیں۔“

وہ حتمی انداز میں بولی تو میں نے اس کی دیوانگی  
پر ہنستے ہوئے پری کی سہیلی لکھ کر نمبر سیو کر لیا تھا۔ آج  
وہی نمبر فون پہ آ رہا تھا۔ میری دھڑکنیں فون کی بیل  
سے بھی زیادہ تیز تھیں۔

اس نے جب فون نہیں اٹھایا تو..... میں نے  
اسے میسج کیا کہ پری کیسی ہے؟ اس کا جواب غیر متوقع  
طور پر فوری آ گیا۔

میں نے دھڑکتے دل اور بے قرار نظروں سے  
میسج پڑھا۔

”مبارک ہو، وہ مر گئی ہے۔“

میں دم بخود سا سکرین پر لکھا میسج بار بار پڑھ رہا تھا۔  
”مر گئی.....؟ گریوہ کیسے مر سکتی ہے؟ وہ زندگی

سے بھرپور لڑکی جو ہنستی تھی تو پھول کھلنے لگتے تھے۔ وہ  
ندیوں کی روانی جیسی لڑکی، وہ بہتے صاف پانیوں  
جیسی لڑکی، وہ صبح کا روشن ستارہ وہ بہتے دریا کا پرسکون  
کنارا وہ بچوں کی آنکھوں میں جاگتی حیرانیوں جیسی  
لڑکی، وہ محبت کی لوک کہانیوں جیسی لڑکی، وہ مشکلوں  
میں آسانیوں جیسی لڑکی۔ وہ کیسے مر سکتی ہے؟“

میں دم بخود سا یہ ہی سوچے جا رہا تھا میں نے  
بار بار فون ملا یا۔ وہ فون ریسو ہی نہیں کر رہی تھی میں  
نمبر ملاتا تھا اور وہ کاٹ دیتی تھی چند لمحوں کے اس  
عذاب نے جیسے مجھے بے جان سا کر دیا تھا۔

”کیا واقعی مرنے سے اس کا مطلب مر جانا  
ہوگا؟“ میں با آواز بلند سوچے جا رہا تھا۔

موت تو عورت کے لیے بے وفائی سہنا بھی ہوتی  
ہے۔ موت تو عورت کے لیے محبوب سے جدائی بھی  
ہوتی ہے۔ موت عورت کے لیے رد کیے جانا بھی ہوتی  
ہے۔ ہاں وہ اسی موت کی بات کر رہی ہوگی۔ ایسی  
موت کی آغوش سے کوئی میسا ضرور اسے نکال سکتا تھا۔  
کاش اسے یہ ہی موت آئی ہو“ میں نے تھک کر بیڈ کے  
سرہانے سے ٹیک لگالی تھی کہ اس کی سہیلی کا میسج آیا۔  
”کیا ہوا، شاید اس کی موت کی خبر سن کر تم بھی  
مر گئے ہو؟“

طنز بھرا میسج سکرین پر چمک رہا تھا۔  
”کیا ہوا ہے اسے۔ خدا کے لیے مجھے سچ سچ  
بتاؤ؟“ میں نے تھکے ہوئے دل و دماغ کی ساری  
توانائی یکجا کرتے ہوئے کانپتی انگلیوں سے پھر میسج  
ٹائپ کیا۔ اس کا جوابی میسج آ گیا۔

”ماردی گئی ہے اور تم نے اسے مار دیا ہے۔ آج  
ساتواں دن ہے۔ اس کی موت کو تم عجیب قاتل ہو۔  
اسے اپنے ہاتھوں سے قتل کر کے کہتے ہو کہ مقتولہ کو کیا ہوا  
تھا۔ کیسے مر گئی؟“ میسج کیا تھا میرے لیے تو جیسے زہر  
میں بچھا تیر تھا اگر وہ بے وفائی کو موت کہتی تو اس واقعہ کو  
کئی مہینے گزر چکے تھے۔ ساتواں دن اس کی طبعی موت کا  
تھا۔ میں نے اس کی منت سماجت کی کہ پلیز میرے  
ساتھ بات کر لو۔ اس نے گھنٹہ بھر خوب بڑبڑایا۔ میری  
پیشانی سے پسینے کی دھاریں بہہ کر آنکھوں کو جلارہی  
تھیں۔ اپنی دھڑکنوں کی آواز مجھے میرے کانوں میں  
سنائی دے رہی تھی اس نے فون ریسو کر لیا۔

”پلیز۔ مجھے میری پری کے بارے میں چند  
سوالوں کے جواب دے دیں۔“ میں نے منت  
بھرے انداز میں کہا تو وہ ناگوار لہجے میں بولی۔

”جلدی پوچھیں عامر صاحب۔ میری مجبوری یہ  
ہے کہ میں فون بند نہیں کر سکتی ورنہ جی تو چاہ رہا ہے کہ یہ  
نمبر بند کر کے یہ مصیبت ہی ختم کر دوں۔۔۔ مجھے ایک  
قاتل سے بات نہیں کرنی تھی۔ لیکن یہ ہی قاتل کبھی اس



کامیاب بھی تھا یہی سوچ کر فون ریو کیا ہے۔  
دوسری طرف سے اس کی سہیلی کی بات نے  
دل کو تڑپا دیا تھا۔ میں تڑپ رہا تھا اور پیری سسکتی آواز  
نے شاید اسے میری کیفیت سمجھا دی تھی تب ہی تو وہ  
قدرے نرم لہجے میں بولی۔

”جلدی جلدی بولیں۔ میں میت والے گھر  
میں ہوں میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“

”پلیز آپ مجھے یہ کہہ دیں کہ آپ نے میرے  
ساتھ جھوٹ بولا ہے۔ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتی۔ اس  
کے آس پاس تو ایسے خوب صورت رشتے موجود تھے  
جو انسان میں جینے کی امنگ پیدا کرتے ہیں۔ مجھ  
جیسے بے بس اور کمزور انسان کے لیے وہ بہادر لڑکی  
کبھی بھی یہ بزدلانہ حرکت نہیں کر سکتی تھی۔“

میں رو رہا تھا دوسری طرف تھوڑی دیر کے لیے  
خاموشی چھا گئی۔

”بعض اوقات ہم لڑکیوں کے لئے ساری دنیا  
صرف اور صرف ایک انسان میں سمٹ کر رہ جاتی ہے  
اس کی دنیا تو ویسے بھی اس کے ہاتھ سے نکل  
چکی تھی۔ بے وقاف ہوتی ہے یہ دنیا، یہ موت کے حوالے  
کر کے انسان سے دامن چھڑا لیتی ہے۔ پھر بھی  
اسے بہت سمجھایا مگر مر ہی گئی۔ زندہ رہتی بھی تو کس  
کے لیے؟“

”ایسا نہ کہیں۔ وہ تو زندگی سے بھرپور لڑکی۔  
بھلا وہ مر کیسے سکتی ہے میں زندہ ہوں تو اس کا مطلب  
کہ وہ بھی زندہ ہے۔ ہماری سانسیں تو ایک دوسرے  
کے ہونے کے ساتھ مشروط تھیں؟“

میں ابھی بھی یہ سمجھ رہا تھا کہ شاید خفا ہے مان  
جائے گی لیکن یہ غلط نہیں ہی نکلی۔

”غور سے سنیں۔ بہت سارے انکشافات  
کرنے والی ہوں مجھ سے بار بار یہ سب دہرایا نہ  
جائے گا۔“ وہ چپ ہوئی تو میں بے قرار سامنے لگا۔

”پلیز سب کچھ کہنا۔ مجھے بے شک گالیاں  
دے دینا۔ بددعا میں بھی دے دیں۔ نفرت کا اظہار  
بھی قبول ہے۔ اپنی ہر قسم کی ذلت قبول ہے۔ لیکن

لیکن۔ اس کے مرنے کی خبر کو جھوٹا کہہ دو۔“  
دوسری طرف سے سسکیاں سنائی دینے لگیں۔

”کاش یہ آپ نے اس وقت سوچا ہوتا جب  
فون بند کر کے اسے سزائے موت سنارہے تھے۔“

میں پچھتاوے کے کھنور میں ڈوبا جا رہا تھا۔  
”وہ اس رات پشاور سٹیشن پر بیٹھی آپ کا رستہ  
دیکھتی رہی تھی۔ یہ سوچ کر کہ اس نے آپ کو بتا دیا تھا  
کہ وہاں انتظار کر رہی ہے۔“

وہ سمجھ رہی تھی آپ اسے لینے آرہے ہیں۔

رات بھر وہاں موجود مردوں کی عجیب سی نظروں  
کے تیر دل پر تکتی رہی۔ کس سے پوچھتی اور کیا پوچھتی؟  
یہاں گھر میں اک قیامت تھی جو اس کے جانے کے چند  
گھنٹوں بعد بیا ہو چکی تھی۔ وہ خط چھوڑ کر گئی تھی۔ اسے  
زعم تھا کہ اس کے من کا میت اسے بل بھر کے لیے بھی  
اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ اسی لیے تو وہ سارے رشتوں سے  
دامن چھڑا کر آپ کی پناہ میں آئی تھی۔

آپ نے اسے پناہ تو نہ دی۔ ذلت بے پناہ  
دے دی۔“

وہ لفظوں کے تیروں سے مجھے زخمی کر رہی تھی۔

”پھر کیا ہوا؟ وہ اس رات کہاں چلی گئی تھی؟“

”وہ تو اس دن لاش کی شکل میں سر جھکائے گھر  
واپس آئی تھی۔“

جاننے میں پھر کیا ہوا؟“

میرے نفس میں جواب دینے پر اس نے جو  
تفصیل بتائی اس نے مجھے مار دیا تھا اور اب برسوں  
سے میں اپنے ہی کندھے پہ اپنی لاش اٹھائے زندہ  
نظر آنے کی اداکاری کرتا رہتا ہوں۔

اس نے کہا کہ پشاور سے واپس آ کر اس نے

گھر والوں کی نفرت بھی سہی اور رات دن کی ملامت  
بھی۔ وہ سب کچھ سہہ لیتی اگر آپ اس کا ساتھ

دیتے وہ دن میں کئی بار آپ کا اور آپ کی بہن کا نمبر

ملانی اور خود کو یہ کہہ کر تسلی دیتی کہ کوئی مجبوری، کوئی

حادثہ، کوئی ناگہانی ہی میرے عامر کو مجھ سے دور

کرنے کا سبب بنی ہوگی۔ میں اسے سمجھاتی کہ وہ



تمہارا تھا ہی نہیں اگر تمہارا ہوتا تو دنیا ت، گھر والوں سے لڑ پڑتا مگر تمہیں یوں بچہ جنور میں ڈوبنے کے لیے تمہانہ چھوڑ جاتا۔“

شرمندگی کا پسینہ میری پیشانی سے پھر بہنے لگا تھا۔

”پٹھان تو غیرت مند مشہور ہیں؟ وہ تو عورت کو اپنی عزت اپنی غیرت سمجھتے ہیں۔ چلیں محبت کے ناتے نہ کسی، غیرت سمجھ کر ہی اسے یوں بے یار و مددگار نہ چھوڑا ہوتا۔“

وہ بول رہی تھی اور میری موبائل فون پکڑنے والی ہتھیلی بار بار پسینے سے بھیکے جا رہی تھی۔

”آپ سن رہے ہیں نا؟“ اسے میری خاموشی سے کچھ شک ہوا تھا۔

”ہاں۔ سب سن رہا ہوں۔ اور آج اس بات پر افسوس ہو رہا ہے کہ میں گونگا بہرا کیوں نہیں ہوں۔ کاش میری سماعتوں میں اتنی طاقت نہ ہوتی کہ میں کسی کے منہ سے یہ سب سن سکتا۔“

آنسوؤں اور سسکیوں کے ساتھ وہ بولتی رہی اور آنسوؤں اور سسکیوں کے ساتھ ہی میں سنتا رہا۔

”چند ہی دنوں میں وہ سوکھ کر کاٹا ہو گئی تھی اس کے لمبے بال بھی گرنے لگے تھے جس پر وہ یہ کہتی کہ یہ عامر کی امانت ہیں۔ ان میں خیانت ہو رہی ہے۔ وہ دن میں کیسے بھول سکتی ہوں

جس دن اس کے ٹیسٹ کی رپورٹ آئی تھی،

ایک قیامت تھی جو ہم سب پر بیت رہی تھی۔ ڈاکٹرز نے جگر کا کینسر بتایا علاج کیا ہوتا؟ اس میں زندہ رہنے کی خواہش ہی نہ رہی تھی۔ چند ہی دنوں میں اس نے اسپتال کے بستر پر میرا ہاتھ پکڑے جان دے دی اور وصیت یہ کی کہ عامر کو میری موت کی خبر نہ دینا وہ بہت حساس ہے کسی وجہ سے وہ مجبور ہوا ہوگا اور اب میری موت اس کے ضمیر پر اک بوجھ بن جائے گی۔ میں نے سوچا تھا۔ عامر نے کون سا رابطہ کر لیا ہے جو اسے سب بتاؤں گی اور وہ احساس جرم میں مبتلا ہو۔ جائے گا۔

لیکن وہ آخری وقت تک آپ کی آواز سننے کی امید میں نہر مانی رہی تھی وقت رخصت اسے میں ناظم شایب میں دنیا چھوڑنے کا دھک نہیں تھا بلکہ وہ اس فم میں تھی کہ عامر کی آواز نہ سن سکی۔“ باتیں تھیں کہ کالک بھی جو میرے منہ پر لی جا رہی تھی۔ میں اپنا کالا منہ کہاں لے جاتا؟“

وہ چپ ہوئی تو میں جو خود پر بڑی مشکل سے کنٹرول پاچکا تھا پھر سے سکھنے لگا۔ یہ سکھنا بلکلنا اور بڑھنا مجھے احساس جرم کے بوجھ سمیت اسپتال کے بستر تک لے گیا۔

اس کی سبیلی کا فون بند ہوا تو میرے مفلوج بدن میں اتنا دم نہیں تھا کہ فون بند کر سکوں۔ چکراتے سر اور دھندلی آنکھوں سے میں نے تصور میں اسے دیکھا وہ سفید کفن میں کھلے بالوں کے ساتھ دور کھڑی بائیں پھیلائے مجھے بلا رہی تھی۔ میں بے ہوش ہونے سے پہلے یہ ہی دعا مانگ رہا تھا کہ میں اس کے ساتھ چلا جاؤں۔

میری بے ہوشی پر۔ گھر والے پریشان کہ اکلوتے بیٹے کو کیسے زندگی کی طرف واپس لائیں۔ میرے نروس بریک ڈاؤن نے سب کو سہا دیا تھا ماں نے ایک دن اسپتال میں میرے سامنے بیٹھ کر کہا۔

”عامر! مجھ سے بہت بڑا گناہ میرا ہو گیا ہے۔

میں نے تمہاری محبت کو محض وقتی جذبات سمجھ کر تم سے دور کر دیا۔ اب تم زندگی بھر اسے تلاش کرتے رہو گے اور مجھے مورد الزام ٹھہراتے رہو گے۔“

”تلاش؟ اب ختم ہو گئی ہے۔“

ماں کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

”اچھی بات ہے اسے بھول کر نئی زندگی کی ابتدا کرو۔“

”وہ مر گئی ہے اماں۔“ میں نے اسپتال کے بستر پر لیٹے لیٹے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو میری آنکھوں کے گوشوں سے بہتے آنسو بیڈ کی سفید چادر پر گر کر جذب ہونے لگے۔ میں سک سک کر روتا رہا۔



وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں مروڑ رہی تھیں اور ان کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ میں اب پچھتاوا دیکھ سکتا تھا ان کے سارے وجود سے چمٹا ہوا۔ لیکن آنسوؤں کی دھند اور دواؤں کی غنودگی نے مجھے یہ سب دیکھنے نہ دیا۔

اس دن کے بعد میں نے کبھی ماں سے بات نہیں کی۔ بس ان کی بات کے جواب میں ہوں ہاں کر دیتا تھا۔ ماں میری اس نفرت کی وجہ جانتی تھیں میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے سچ میں اپنی سگی ماں سے نفرت ہو گئی تھی۔ میں گھر سے باہر دقت گزارہ نہ لگا تھا ہمہ وقت بری میری آنکھوں کے سامنے تڑپتی رہتی تھی زندگی کی بھیک مانگتی رہتی تھی۔ میں نے خود کو طرح طرح کے نشوں میں غرق کرنے کی کوشش کی مگر یہ دکھ کم نہ ہوا۔

☆☆☆

اماں کی اچانک موت نے میرے صحت مند اور زندہ دل ابو جی کو بالکل اکیلا کر دیا۔ میں جنازے کے ساتھ چلتے ہوئے اپنی ماں کے لیے دعا کر رہا تھا کہ.....

”اللہ انہیں معاف فرمادے۔ انہوں نے کئی دلوں کی آہیں لی ہوئی ہیں اور پری کی جوان موت بھی ان کے سر ہے۔ اس فل میں تو میں شریک جرم تھا اسی لیے تو ساری دنیا اس گناہ سے انجان ہے لیکن میرے اللہ تو جانتا ہے کہ میں بے اختیار تھا اور میری ماں اختیار والی تھی۔ اس کا گناہ بخش دینا مولا۔“

میرے اندر سے آواز آئی۔

”اور تم عامر۔ کیا تم نے اپنی ماں کو معاف کر دیا ہے؟ یہ آواز میری اماں کی تھی۔

”میں آپ کو معاف کرنا بھی چاہوں تو نہیں کر پاؤں گا اماں! مجھے اس کی یاد ہر لمبے پچھتاوے کے بھنور میں دھکا دیتی ہے۔ اور میں خود کو کمزور کہہ کر اسی وجہ کے تنکے کو پکڑ کر کناروں کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھتا رہتا ہوں۔ جہاں آس پاس کے لوگ ان کی اچھائیوں کا ذکر کر رہے تھے وہیں میرا ذہن پری کی موت کی وجہ میں الجھا ہوا تھا۔

”عامر! مجھے بہت دکھ ہے ماں جان کی موت کا۔ اللہ ان کے لیے ابدی جہان میں آسائیاں پیدا فرمائے گا۔ تم اپنا اور ماموں جان کا خیال رکھو کیونکہ اس کے علاوہ کوئی اور راستہ بھی نہیں ہے۔“

گل جاناں کئی لمحوں تک مجھے حوصلہ دیتی رہی۔ میں سپاٹ چہرہ لیے اس کی باتیں سنتا رہا۔ میں چاہتا تھا کہ ماں کی موت پر چیخ چیخ کر روں لیکن میرے اندر ایک عجیب پتھر ملی سی چپ کا راج تھا میں جو کسی کے بھی دکھ پر تڑپ اٹھتا تھا اپنی سگی ماں کی موت پر ایک آنسو بھی نہ بہا سکا۔ عجیب سا سکوت تھا میرے اندر ذہنی طور پر میں بالکل برباد چکا تھا۔

چلنے پر آتا تو پورا پورا دن بیٹھتا نہیں تھا اور جب مجھ پر خاموشی اور تھکاوٹ کا دورہ پڑتا تو میں کئی کئی گھنٹے سویا رہتا نہ کسی سے بات کرتا اور نہ ہی کسی کی بات کا جواب دیتا تھا بس چپ چاپ اندھیرے کمرے میں لیٹا چھت کو تکتا رہتا۔ میں اب دنیا میں بالکل اکیلا رہ گیا تھا۔ بہنیں اپنے گھروں میں آباد تھیں انہیں بھائی کے حوالے سے طعنے ہی سننے پڑتے تھے۔ اس لیے وہ مجھ سے زیادہ ملتی جلتی نہیں تھیں۔

ابا مجھ پر شادی کے لیے ہر قسم کا پریشر ڈال کر تھک چکے تھے گل جاناں اور راحت پھوپھو دونوں سے وہ بہت شرمندہ تھے شاید اسی ملال اسی افسوس نے انہیں بیمار کر دیا تھا۔ راحت پھوپھو سے فون پر دھیرے دھیرے باتیں کرتے اور اس کے بعد میرے کمرے میں آکر بیٹھ جاتے۔

”مجھے پتا ہے کہ تجھے میری یہ بات پسند نہیں لیکن میں تیرا باپ ہوں تجھے شادی کا نہ کہوں گا تو کون کہے؟“

میں چپ چاپ سنتا رہتا۔

”گل جاناں کب کی ڈاکٹری کر چکی ہے اور کتنا انتظار کر لے اسے؟“

وہ امی کے مرنے کے بعد مجھ سے بہت نرمی سے بات کرنے لگے تھے ورنہ تو ان کی بارعب شخصیت نے ہمیشہ مجھے آنکھیں جھکا کر بات کرنے



پر مجبور کیا تھا۔

”کئی بار کہہ چکا ہوں کہ مجھے اس سے شادی نہیں کرنی۔ بلکہ میں شادی کروں گا ہی نہیں۔ اور ابا! آپ نے مجھے مجبور کرنا نہیں چھوڑا تو میں گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔“

میرے اس جواب پر ان کے مرجھائے ہوئے چہرے کی رنگت مزید زرد ہو گئی۔

”کئی سالوں سے وہ رشتے ٹھکرا رہی ہے۔ خاندان اور خاندان کے باہر سے بھی بے شمار لوگ اسے اپنایا جاتے تھے اور اب بھی چاہتے ہیں۔ لیکن اس کی بد قسمتی کہ وہ تمہارے نام سے خود کو جوڑ چکی ہے۔“

وہ اٹھتے ہوئے بولے۔ تو مجھے غصہ آ گیا۔  
”میں نے کب اس سے کہا ہے کہ میرا انتظار کرے یا میرے نام سے جڑ جائے؟“

”ساری غلطی میری ہے، مجھے لگا تھا کہ شاید میں اور تم ایک ہی ہیں۔ میرا فیصلہ تمہارا فیصلہ بھی ہوگا۔ لیکن یہ میری خوش نہیں تھی۔“

میں نے دیکھا وہ تھکے ہوئے قدموں کے ساتھ واپس جا رہے تھے اور پھر دوسری صبح کئی دکانیں گھر جانا اور بینک بیلنس چھوڑ کر وہ مر گئے۔ ان کی میت سامنے پڑی ہوئی تھی، ہمیشہ محبت لٹالی دوا آنکھیں اور..... دنیا سے چلی گئی تھیں۔

”لالہ آپ نے کوئی خوشی نہیں دیکھی اور یوں اچانک چلے گئے۔“ راحت پھوپھو سینہ کوٹ کوٹ کر بین کر رہی تھیں گل جانا ابا کی چار پائی کے پاؤں کی طرف سر جھکائے بیٹھی رو رہی تھی۔

”ہائے میرا بھائی دل میں سارے ارمان لے گیا۔“ پھوپو نے سرخ متورم آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا میں نے کان بند کر لیے تھے۔ مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا نہ ماں کے خوابوں کی سسکیاں اور نہ ہی باپ کے ارمانوں کی ہچکیاں۔ میں کیا کرتا؟ میرا دل پری کی طرف مڑ کر دیکھتا تو پھر کا ہو جاتا تھا اور پھر احساس سے عاری ہوتے ہیں

میں نے باپ کا جنازہ کندھے پر اٹھاتے ہوئے دیکھا پھوپو کی آنکھوں میں میرے لیے ملامت کے جذبات تھے۔ رفتہ رفتہ میں محبت کرنے والے سارے رشتے کھوتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

”تم کسی اور سے شادی کر لو گل جانا۔“ ابا کے چہلم پر سب اکٹھے تھے وہ بھی پھوپو کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔ رات کو سب سو چکے تھے۔ مجھے نیند بہت کم آتی تھی۔ سچ ہی تھا کہ قاتل احساس جرم کی صورت میں موت سے زیادہ اذیت اپنے دل پر سہہ لیتے ہیں۔ نیند کے ساتھ ہی خواب بھی آ جاتے تھے۔ اس لیے میں تو سوتے جاگتے دونوں صورتوں میں اذیت ہی سہتا رہتا تھا۔ اس لیے زبردستی سونے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ کون سا نیند کے ساتھ ہی آرام بھی آ جاتا تھا یہ ہی سوچ کر میں باہر لان میں آ گیا۔ اوائل اکتوبر میں رات اچھی خاصی خنک ہو گئی تھی میں نے لان کے کونے میں نیم تاریک ماحول میں کرسی پر بیٹھے ہولے کے قریب پہنچ کر کھنکھارتے ہوئے اپنی طرف متوجہ کیا تو وہ بڑے اطمینان سے سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”شاید آپ بھی رات دیر تک جاگنے کے عادی ہیں؟ ہم میڈیکل والے تو ساری ساری رات جاگ کر پڑھنے کی عادت نہیں چھوڑ پاتے۔“ تب ہی میں نے ایک دم سے اسے شادی کا کہا تو بہت پرسکون انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”عامر تمہارے خیال میں شادی کیا ہے؟“ اس کے سوال پر میں شپٹا سا کیا۔  
”ظاہر ہے کسی گودل اور خوشی سے قبول کرنا ہی شادی کہلاتا ہے۔“

میں نے اس کے چہرے پر پھیلے سکون کے احساس سے مرعوب ہوتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا دی۔  
”اگر کسی کو خوشی اور دل سے قبول کرنا ہی شادی ہے تو وہ میں کب کی کر چکی ہوں“ میں ہنسنے لگا



اسے دیکھ رہا تھا۔

”میں اس قابل نہیں ہوں گل کہ کوئی میرے لیے اپنی ساری زندگی برباد کر دے“ میں نے صاف اور واضح بات کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔

وہ ہنسنے لگی اور اتنا ہنسی کہ ہنستے ہنستے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

”یہ اب بتا رہے ہو، اتنے سالوں کے بعد؟“

”تم بہت اچھی لڑکی ہو، بہت پیاری۔ اور قابل ترین۔ میں اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ کئی لوگ تمہاری راہ میں اب بھی اپنے وجود کا کشکول لیے کھڑے ہیں کہ تم ہاں کا سکھ ان کے کشکول میں ڈال کر انہیں مالا مال کر دو اور..... یہ جان لو کہ میں ان لوگوں میں کبھی بھی شامل نہیں تھا۔“

میری وضاحت پر وہ مجھے دیکھ کر اداسی سے بولی۔

”کسی بات سے بھی انجان نہیں ہوں۔“

میں نے حیرانی سے اسے دیکھ کر دھیمے لہجے میں پوچھا۔

”جب سب کچھ جانتی ہو تو جانتے بوجھتے کیوں خود پر ظلم کر رہی ہو؟“

”آپ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ ہم غیرت مند لوگ ہیں۔ کسی کو قبول کرتے ہیں تو دل سے اور کسی کو رد کرتے ہیں تو وہ بھی دل سے۔ جب آپ مرد ہو کر اپنا دل نہیں بدل سکتے تو میں عورت ہو کر کیسے اپنا دل بدل دوں؟“

اس کے لہجے میں بے بسی تھی۔

میں لا جواب سا ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

”ہم دونوں بے بس ہیں۔ جب میں آپ کو مجبور نہیں کر رہی تو آپ مجھے کیسے مجبور کر سکتے ہیں کسی بھی بات کے لیے؟“

”میں مانتا ہوں کہ میں بے بس ہوں گل۔“

”اور میں عورت ہوں عامر! ہم دونوں کے جملوں کا ایک ہی مطلب ہے۔“

اس سے پہلے کہ میں اس کی بات کا جواب دیتا

اندر سے پھوپھو پونے آواز دے کر اسے بلا لیا وہ اٹھ کر اندر جانے لگی۔

”پھر بھی سوچ لو گل! ابھی وقت ہے۔ کل کو چھٹانے کے لیے بھی وقت نہیں ہوگا۔“

وہ جاتے ہوئے بغیر مڑے مستحکم لہجے میں بولی۔

”سوچنے کا کام دماغ کا ہوتا ہے اسی لیے آپ سب دماغ سے سوچ رہے ہیں مگر میں دل سے سوچتی ہوں اسی لیے تو سب سے الگ بھی ہوں اور الگ لوگوں کے ساتھ یہ بڑی ٹریجڈی ہوتی ہے کہ لوگ ان سے الگ رہنا پسند کرتے ہیں۔“ میں اس کی بات سن کر خاموش ہو گیا۔

وہ اندر جا چکی تھی اور میں نے حیرانی سے دیکھا۔ اس کی نازک کمر پر لمبی سنہری چوٹی مل کھا رہی تھی۔ یادوں کے درپے پر اک نازک سی لڑکی کی آواز نے دستک دی۔

”مجھے بہت برے لگتے ہیں لڑکیوں کے لمبے لمبے بال گھوڑے کی دم سر پر سجائے یوں بالوں کو جھٹکے دے رہی ہوتی ہیں جیسے ہر منٹ میں دو تین جھٹکے بجلی کے لگتے ہیں۔“ وہ اپنے باب کٹ ریشمی بالوں کو کانوں کے پیچھے کرتے ہوئے بولی تو میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”کس قدر غیر شاعرانہ تشبیہ دی ہے تم نے۔ لڑکیوں کی لمبی لمبی کالی زلفیں ہی تو انہیں نسوانیت بخشی ہیں۔ کیا خواہ مخواہ ہی شاعروں نے ہزاروں لاکھوں اشعار زلفوں پر لکھ مارے ہیں۔“

وہ کیا زبردست شعر کہا ہے میں نے بھی اس موضوع پر۔ عرض کیا ہے کہ.....

جدا ہک ہک دال کروڑاں دا  
آدی گت دی قیمت کہہ ہونسی ؟  
سب ہی کز نز وادہ واہ کرنے لگے اور وہ بنا داد کے منہ بنائے بیٹھی تھی۔

”قسم سے زندگی میں کرنے کے لیے اس سے بہت بڑے اہم اور ضروری کام بھی ہیں۔“



جتنی دیر میں لمبے بالوں کی چٹیا کھول کر بالوں میں کنگھی کی جاتی ہے اتنی ہی دیر میں ایک لڑکی کوئی تعمیری کام کوئی فلاحی کام یا کوئی تعلیمی و فضاہی علمی و ادبی کام بھی کر سکتی ہے۔“

”مجھے تو اپنی ہونے والی بیوی کے لمبے بال ہی اس رشتے میں باندھے رکھ سکیں گے۔“ میں نے تصور میں اک حسینہ کی مازک کر یا پر لہراتی موٹی سی چٹیا کو دیکھتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہا تو گل جاناں نے برا سامنہ بنالیا۔

”میرا ماننا یہ ہے کہ اگر کوئی مرد اس بنیاد پر عورت کو پسند کرے کہ اس کے بال لمبے ہیں تو اس عورت کو ایسے مرد پر لعنت بھیج کر کنواری زندگی گزار لینی چاہیے کیونکہ شادی کے بعد کسی بھی وقت عورت کے بال گر سکتے ہیں کسی بیماری میں ختم ہو سکتے ہیں جل سکتے ہیں تو پھر وہ شوہر کیا کرے گا؟ ظاہری سی بات ہے، طلاق دے کر دوسری عورت سے شادی ہی کرے گا جس کے بال لمبے ہوں گے۔“

سب کزنز اس کے لیے تالیاں بجانے لگے تھے۔

اور میں بڑی ناگواری نخوت سے اسے گھورتا رہا۔ ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے میں ماضی کی بھول بھلیوں سے خال کے رستے میں واپس آیا۔ میں نے ساری رات وہیں بیٹھ کر گزار لی تھی۔ اسی لیے اس کے جاتے ہی میں نے سگریٹ کی ڈبیہ نکال لی تھی اور دھو میں کے مرغولوں میں اپنی من پسند فلم دیکھنے لگا۔

☆☆☆

اس دن میں نے اکیلے پن سے گھبرا کر سامان ادھر ادھر سیٹ کرنا شروع کر دیا۔

کئی برسوں بعد جی چاہا کہ الماری صاف کروں میں نے الماری صاف کرتے ہوئے۔ اپنی پرانی سم نکالی اور جانے کیون مو باکل میں واپس ڈال دی یہ وہ سم تھی جس سے میں نے پری کی سہیلی کو فون کیا تھا۔ کچھ عرصے بعد میں نے نیٹ ورک تبدیل کر

کے سم بدل دی تھی کیونکہ اس نے مجھے کہا تھا کہ یہ ہماری آخری گفتگو ہے اور اس کے بعد میں کبھی اسے فون نہ کروں میرے پاس بھی کوئی سوال نہیں بچا تھا جس کے لیے میں اس سے بات کرتا۔ سم ڈالنے کے پندرہ بیس دن بعد ہی ایک فون آیا۔ دوسری طرف ایک مشہور سنی ٹوریم سے کوئی نرس بات کر رہی تھی۔ میں اس کے تعارف پر حیرانی سے یاد کرنے لگا کہ یہ کون ہو سکتی ہے۔

”مسٹر عامر آفریدی بول رہے ہیں؟“

”جی محترمہ! میں عامر ہی ہوں“

اس نے کہا کہ ہمارے ہاں انتہائی نگہداشت والے وارڈ میں ایک خاتون ایڈمٹ ہیں جنہوں نے آپ کا نمبر دیا ہے۔ ان کا نام ثریا ہے اور وہ بیماری کی بالکل آخری اسٹیج پر ہیں۔ وہ خاتون چند دن کی مہمان ہیں ان کا پیغام ہے کہ مرنے سے پہلے آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ آپ کا نمبر دے کر انہوں نے التجا کی ہے کہ فقط آدھے گھنٹے کے لیے ان سے مل لیں اس نے اسپتال کا ایڈریس مجھے دے کر جلدی آنے کی درخواست کی۔

”محترم اگر آپ جلدی آجائیں تو ملاقات ہو سکتی بصورت دیگر ان کی آخری خواہش تشنہ رہ جانے کا افسوس میرے ساتھ آپ کو بھی ہمیشہ رہے گا۔“

مجھے یاد آ گیا تھا کہ میری مرحومہ پری کی اسی دوست کا نام ثریا تھا۔ جس سے میری بات ہوئی تھی۔ پری کبھی کسی اور کا ذکر نہیں کرتی تھی ثریا کا نام بھی شاید کہیں بے خیالی میں اس کے منہ نکل گیا تھا۔

”میں کل ہی پہنچتا ہوں، فکر نہ کریں۔“ میں نے الجھنوں سے دامن چھڑاتے ہوئے کہا۔

”وہ تو ٹھک ٹھاک صحت مند لڑکی تھی، اسے ایسی بیماری کیسے ہو گئی؟“

میں افسوس سے سر ہلاتے ہوئے مسلسل سوچے جا رہا تھا۔

”جو بھی ہوا ہو۔ مجھے کس لیے بلارہی ہے؟ کیا پری کے متعلق کوئی بات کرنی ہوگی؟“



لیکن موت کی دہلیز ریٹھی لڑکی اپنی مرحومہ سہیلی یا اس کے محبوب سے متعلق کچھ بھی کیوں بتائے گی؟

جسے سامنے موت نظر آرہی ہو وہ زندگی سے کیا مانگتی ہے؟

اگر بیماری کی شروعات میں وہ مجھے بلاتی تو میں سمجھتا کہ اسے میری مالی مدد کی ضرورت ہوگی۔

لیکن اب تو وہ ہر قسم کی امداد سے دور جا رہی ہے۔۔۔ پھر مجھے پشاور سے کیوں بلایا ہے اور وہ بھی آخری خواہش کے طور پر؟“

میں الجھا ہوا تھا

اسی وقت جلدی جلدی۔۔۔ سامان پیک کیا اور میں بس اڈے پہنچا اور صبح ہوتے ہی میں اسپتال پہنچ چکا تھا۔ اسی نرس کا نمبر ملا یا۔

”سسٹر! میں عامر آفریدی بات کر رہا ہوں۔ آپ کے ہاسپٹل کے ٹران میں بیٹھا ہوں۔ مجھے ان محترمہ سے ملنا ہے جن کا ذکر آپ نے کیا تھا۔“

”جی مسٹر عامر! میں باہر آرہی ہوں آپ پلیز سامنے آجائیں۔ چند لمحوں میں وہ سامنے آکر گھوجتی ہوئی نظروں مجھے ڈھونڈ رہی تھی۔

قدرے فریبی مائل جسامت اور چھوٹے سے قد کی مالک یہ نرس شاید بہت ہمدرد دل کی مالک تھی اسی لیے تو میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے مجھے ایک وارڈ میں لے گئی۔

اندر جانے سے پہلے اس نے خود بھی اور مجھے بھی ماسک پہنا دیے تھے۔

”آپ ثریا ہونا؟ میں ثریا کے سامنے بیٹھا اسے ہمدردانہ انداز میں دیکھ رہا تھا۔ وہ ٹی بی کی آخری سٹیج پر کھڑی اپنا الوداعی کریکٹر ادا کر رہی تھی میں نے اس کی آنکھوں کی رنگت سے اسے پہچانا اور نہ تو اس کی پہچان اس کے نین نقش سب اک ڈھانچے میں بدل چکے تھے میں خطر تھا کہ وہ کچھ بولے لیکن وہ مجھے اپنی بجھتی ہوئی آنکھوں سے فقط دیکھے ہی جا رہی تھی۔

میرے کھنکھارنے پر اس نے نرس کے سہارے ٹکیوں سے فیک لگا کر بیٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کچھ کہا۔ کمزوری آواز بمشکل اس کے لبوں سے رہائی پا کر میری سماعتوں تک پہنچی تھی۔

”عامر بھائی! میرے دل و دماغ پر اک بہت بھاری بوجھ ہے جسے میں قبر میں ساتھ نہیں لے جا سکتی بلکہ صراط کا سفر سامنے ہے میرے اور گناہوں کی گھڑی بہت بھاری ہے۔ میں کسی اور کے گناہ کی شریک بن کر اس بوجھ میں بہت اضافہ کر چکی ہوں۔ مگر اب آخرت کا خوف سچ بولنے کی ترغیب دے رہا ہے۔“

اس کی سانس یوں پھول چکی تھی جیسے پیدل بھاگتے ہوئے آئی ہو۔ میری آنکھوں میں حیرانی تھی۔

میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ یہ ہی سوچ کر رہ گیا کہ آخری وقت میں لوگ ہڈیاں بکنے لگ جاتے ہیں۔ مگر اک مرنی ہوئی عورت کے احترام میں چپ چاپ سب سنتا رہا۔

”میں جو کہنے والی ہوں، وہ بڑے تحمل سے سننے گا۔ بات بہت بڑی ہے۔ اتنی بڑی کی اس پر یقین کرنا ناممکن لگے گا لیکن بات سچ ہے سو فیصد سچ۔“

میں نے اس کے ہونٹوں پر جی پیاس کو دیکھا وہ بار بار ہونٹوں کی خشکی زبان کی گہلی سے مٹانے کی کوشش کر رہی تھی میں نے قریب رکھے گلاس میں چند گھونٹ پانی ڈال کر اسے پکڑانے کی کوشش کی تو اس کے ہاتھوں کی جگہ موجود سوکھی ہڈیاں لرزنے لگیں۔

”آپ بولیں، میں سنوں گا بھی اور یقین بھی کروں گا۔“ میں نے اس کی حالت پر افسوس سے سر ہلاتے ہوئے کہا تو وہ آنکھیں بند کر کے سانسوں کی ناہمواری پر ایک بار پھر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔

”عامر بھائی! پروین مری نہیں ہے بلکہ زندہ



ہے۔“ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں؟

”زور زور سے ہنسون؟

رونے لگ جاؤں؟

خوشی سے پاتے لگوں؟

یا پھر بے یقینی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھوں  
کہ ”تم پہلے جھوٹ بول رہی تھیں یا اب؟“ لیکن اس  
سے پہلے کہ میں کچھ بھی کہتا، وہ بول پڑی۔

”وہ لڑکی جو کئی سالوں تک آپ سے محبت کا  
کھیل کھیلتی رہی، نہ صرف زندہ ہے بلکہ خوش و خرم بھی  
ہے۔ اپنے گھر میں شوہر اور اپنے تین بچوں کے  
ساتھ۔“

وہ پھر سے بکھرے سانس سنبھالنے لگی۔ وہی  
نرس اب ہمارے پاس آچکی تھی میں ساکت سا اسے  
دیکھنے لگا۔

نرس نے اسے تکیے نیچے کرتے ہوئے لٹا دیا  
اور اس کے سینے کو نرمی سے ملنے لگی۔

ثریا کے چہرے کی زردی سفید دوپٹے کے  
بالے میں بہت نمایاں تھی جبکہ میرے دل کی حالت  
بھی میرے چہرے سے واضح تھی۔

”مسٹر عامر آفریدی! اس وقت مریضہ کی بات  
بغور سن لیں یہ ایسی حالت میں جو کہہ رہی ہیں وہ سو  
فیصد سچ ہے۔“

”مگر..... مگر.....؟“ میری زبان گنگ ہو چکی تھی  
میں نے تھوک نگلتے ہوئے کچھ پوچھنا چاہا لیکن کیسے  
پوچھتا؟ اور کیا پوچھتا؟

”یہ سب کیوں اور اور کیسے؟“

میں نے بوجھل لہجے میں پوچھا۔

”وہ بہت شاطر ہے۔ ایک ایسی کھلاڑی جو  
مخالف کو اپنی مرضی سے کھلانے اور جیتنے کا فن بخوبی  
جانتی ہے۔ اس نے سارا کھیل آپ سے جان  
چھڑانے کے لیے کھیلا اور اس کھیل میں مجھے بھی  
استعمال کیا۔“

وہ پھر تھک گئی تھی۔ نرس نے اس کے سوکھے  
ہونٹوں کو چمچ بھر پانی سے تر کیا اور گلاس اور چمچ ہاتھ

میں پکڑے ہوئی۔

”ثریا بی بی جو کہتا ہے جلدی پولیس پلیز یہ نہ ہو  
بوجھ رہ جائے۔“

وہ شاید سننے کی صلاحیت سے محروم ہو چکی تھی۔  
ایک بل کے توقف سے میری آنکھوں میں سے  
جھانکتے سوال کے جواب میں بولی۔

”میں بہت مجبور تھی اور میری مجبوری یہ تھی کہ  
میرے لیے اس نے اپنے خاندان میں رشتہ ڈھونڈ  
رکھا تھا اسی رشتے کی بدولت آج میں بستر مرگ پر  
پڑی زندگی کے دن کاٹ رہی ہوں۔“

وہ چپ ہوئی تو میں نے بمشکل تمام خشک حلق  
سے کوشش کرتے ہوئے ایک کمزوری آواز نکالی۔

”مگر..... مگر..... وہ پشاور سٹیشن وہ اس کا  
میرے لیے سب کچھ چھوڑ کر اکیلے آتا؟“

میرے سوال پر اس نے مندمی ہوئی آنکھوں  
سے مجھے دیکھا اور طنزیہ سی ہنسی اس کے خشک لبوں پر  
پھیل گئی۔ جو اس کے امتیاس کے پھول جیسے چہرے  
پر بہت اجنبی سی لگ رہی تھی۔

”عامر بھائی! یہ سب جھوٹ تھا بلکہ سب کچھ

ہی جھوٹ تھا۔ اور مجھے افسوس ہے کہ ان سارے  
جھوٹوں میں وہ اکیلی نہیں تھی بلکہ میں بھی تھی اسی کا تو نام  
بھی پروین نہیں بلکہ ثروت ہے جس وقت آپ سے

ملی۔ اس کی مٹنی اس کی پسند سے ہو چکی تھی اور ہم اس  
کے منگیترے ملنے باریک آئے ہوئے تھے۔ اس دن  
بھی پشاور سٹیشن سے نہیں بلکہ گھر سے فون کیا تھا اس

نے کیونکہ وہ جانتی تھی کہ آپ کی بہن کی بارات آنے  
والی ہے۔ آپ اور آپ کی کیمیلی کسی صورت اسے گھر

نہیں آنے دو گے اور جیسا اس نے چاہا بالکل دیا  
ہوتا رہا۔“

”لیکن کیوں کیا اس نے یہ سب؟“ میں بے  
اختیار تڑپ کر بولا تو نرس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر  
مجھے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

”کیونکہ اس دن اس کی شادی کی تاریخ طے  
ہوئی تھی وہ اس تعلق سے جان چھڑانا چاہتی تھی کیونکہ



کیا ہو بے چارہ عاشق نامراد۔ یہ بھی کہتی کہ قسم سے اس سچے عاشق برترس کھا کر اس سے شادی کر ہی لیتی دل پر پھر رکھ کر اگر ممکن نہ ہوئی ہوتی۔“

میرے کانوں سے جیسے دھواں نکل رہا تھا۔ سماعتوں میں پکھلا ہوا سیسہ اٹھایا جائے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

میں نے اک آہ بھری اور اسپتال کی چھت کی طرف دیکھتے ہوئے سب سے پہلے ماں کو یاد کیا جنہیں میری نفرت دیمک کی طرح اندر ہی اندر سے چاٹتی رہی اور ایک دن وہ قبر کی ہو گئیں۔

میرا باپ میرے سر پہ سہرا سجانے کا اپنی آئندہ نسل کو دیکھنے کا ارمان دل میں لے کر دنیا چھوڑ گیا۔ میری بہنیں آج بھی میری وجہ سے سسرال میں شرمندہ سی رہتی ہیں۔

میں نے اس مرتی ہوئی عورت کو دیکھا جس نے اپنے لرزتے ہوئے سوکھے کالے ہاتھ جن پر چڑا ڈھیلا ہو کر لٹک رہا تھا، بمشکل جوڑے ہوئے تھے۔

”اللہ کی خاطر مجھے معاف کر دینا تاکہ کچھ بوجھ کم ہو سکے سکون سے مرنا تو نیک لوگوں کو نصیب ہوتا ہے میں گناہ گار بس مرتے ہوئے یہ بوجھ نہیں اٹھا سکتی تھی اسی لیے آپ کو تکلیف دی کہ آپ سچے انسان ہیں معاف کرنے کا ظرف رکھتے ہیں یقیناً معاف کر دیں گے۔ میں نے جیتے جی ناکردہ گناہوں کی بڑی سخت سزا میں جھیلی ہیں اس لیے اب اس جہاں ہلکی پھلکی ہو کر جانا چاہتی ہوں یہاں سے تو وہاں چلی جاؤں گی لیکن ادھر سے کدھر جاسکتی ہوں؟“

اسی وقت نرس نے مجھے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے اٹھتے ہوئے اسے دیکھا وہ بہت تکلیف میں تھی۔ سانس گلے میں انگی ہوئی تھی اور آنکھیں باہر نکل آئی تھیں میں اس کی حالت دیکھ نہیں پارہا تھا۔

”صرف یہ بتا دو کہ وہ میرے ساتھ اتنے سال تک کھیل کیوں کھیلتی رہی؟“ مجھے اپنی ہی آواز

تاریاں کرتے ہوئے وہ مزید آپ سے رابطے میں نہیں رہ سکتی تھی جبکہ اس کا منگیتر بھی شاپنگ کے دوران اس کے ساتھ ہی ہوتا تھا۔ وہ آپ کو شرمندہ کر کے تعلق ختم کر رہی تھی کہ کل کو آپ اسے تنگ نہ کر دے بلکہ میل نہ کر سکو۔ جب میں نے اس کے مرنے کی خبر آپ کو دی تھی۔ تب وہ شوہر کے ساتھ دہائی گئی ہوئی تھی لٹ اپنی مون ستانے۔ وہ مجھے سب سمجھا گئی تھی اس دھمکی کے ساتھ کہ اگر میں نے کسی بھی طرح کی گڑبڑ کر دی تو وہ میرے منگیتر سے کہہ کر کسی بھی وقت میری منگنی تڑوا دے گی۔ بڑی مشکلوں سے میرا رشتہ طے ہوا تھا۔ ہوتا بھی کیسے؟“

وہ سکنے لگی نرس کی آنکھیں بھی اس کے درد پر بھیگ گئی تھیں۔

”میں ایک غریب چھابڑی فروش کی بیٹی ہوں میرے باپ کے پاس جہیز کے لیے پیسے نہیں تھے وہ میری مددچیوں سے کر کے میری وفاداریاں خرید چکی تھی۔ اس کے احسان تھے بہت۔ جو وہ ہر وقت جتانی بھی رہتی تھی۔ دوئی جاتے ہوئے وہ مجھ سے کہہ کر گئی تھی کہ جو چال میں نے چلی ہے اس کے بعد عامر آفریدی شرمندگی کے مارے رابطہ ہی نہیں کرے گا اور اگر تمہارے نمبر پر کال کر بھی لے تو اسے میرے مرنے کی خبر سنا دینا۔ مگر..... یہ خبر سنانا ایسے کہ اسے ذرا بھی شک نہ ہو اور میں جو حکم کی غلام تھی میں نے بالکل ایسا ہی کیا۔ وہ بہت طاقت ور ہے کل بھی ایسی ہی تھی اور ہمیشہ ایسی ہی رہے گی جسے چاہے اپنی انگلیوں پر کھ چلیوں کی طرح نچا سکتی ہے آج بھی شوہر کے دل پر راج کرتی ہے سسرال میں سر آنکھوں پر بٹھا کی جاتی ہے۔ اسے ابھی تک کوئی دکھ ملا ہی نہیں کہ وہ اس تکلیف سے آشنا ہو کر دوسروں کا درد سمجھ سکتی۔ جو چیز کبھی چکھی ہی نہ ہو وہ اس کا ذائقہ کیسے جان سکتی ہے؟ آپ سے تعلق اس کے سارے انیروز میں۔ سے سب سے زیادہ ٹائم چلا تھا اور وہ اکثر آپ کا مذاق اڑاتی اور ہنس کر کہتی۔

”احساس گناہ کی آگ میں جل جل کر مر رہی نہ



اجنبی سی لگ رہی تھی۔

”وہ ایک نفسیاتی مریضہ ہے، آپ واحد شکار نہ تھے اس کا وہ۔ توجہ کی بھوک تھی ڈاکٹر اس بیماری کے مریضوں کو اٹینشن سیکر کہتے ہیں اور..... اور اس بھوک نے کئی لوگوں کی زندگیوں کو چاٹ لیا ہے۔ آپ کے ساتھ لمبا ریلیشن آپ کی سچائی اور محبت کی وجہ سے چلا۔ وہ بہت پہلے ہی آپ کو چھوڑنا چاہتی تھی مگر آپ اسے سچے دل سے چاہتے ہیں۔ یہ تو وہ بھی مانتی تھی اسکول، کالج، یونیورسٹی سب ہی جگہ، وہ لڑکوں کے جذبات سے کھیلتی رہتی تھی کسی کی آنکھیں اچھی لگ جاتیں کسی کی دولت اسے دوستی پر مجبور کرتی اور کسی کا خاندانی پس منظر۔ اٹریکٹ کرنا لیکن جلد ہی وہ اکتا جاتی تھی۔

کئی لڑکوں سے دوستیاں کر رکھی تھیں اس نے ایک ہی وقت میں۔ لیکن اتنی ہوشیاری سے کہ دوسرے کو کچھ خبر ہی نہیں ہوتی تھی۔ آہ اللہ۔ میرے اللہ۔“

بولتے بولتے اس کی سانس رک سی گئی۔ میں نے گھبرا کر نرس کی طرف دیکھا جو اس کا سینہ مل رہی تھی۔ وہ یوں تڑپ رہی تھی جیسے کسی نے اس کا گلا دبا رکھا ہو۔ نرس نے اگلے ہی لمحوں ڈاکٹر کو بلا لیا تھا اور اب اس ہڈیوں کے ڈھانچے کو دہان سے آئی سی یو میں شفٹ کیا جا رہا تھا

جانے کتنا ہی وقت گزر گیا تھا۔ جب میں اسپتال کی سیڑھیوں کی ٹھنڈی سطح ٹانگ پر بیٹھا اس کے ہوش میں آنے اور اس چڑیل کا پتا پوچھنے کا منتظر تھا تب اسپتال کے برآمدے میں کھڑی دو نرسوں کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ وہ مر چکی ہے۔

”ثریا نصیر کو اللہ نے اذیت سے نجات دے دی۔“

وہ رجسٹر میں کچھ دیکھ کر بولی تو دوسری ساتھی نے اک آہ بھرتے ہوئے زندگی بھری آواز میں کہا۔

”اس بد نصیب کی کہانی بالکل میری بڑی بہن کی کہانی ہے۔ پہلے غربت میں آنکھ کھولی پھر بچپن

میں ماں مر گئی۔ سوتلی ماں کے ظلم سہتی رہی۔ شادی ہوئی تو شوہر زانی اور شرابی نکلا۔ سرال والوں کی زیادتیاں اور شوہر کی عیاش فطرت کو برداشت کرتے کرتے بالآخر بی بی کا شکار ہو گئی اور جب خون تھوکنے لگی تب اسے مرنے کے لیے سرکاری اسپتال کے دروازے پہ پھینک دیا گیا۔ اس کی اور میری آپا کی کہانی اتنا فرق ہے کہ انہیں کینسر ہو گیا تھا اور انہوں نے میری یعنی کہ اپنی بہن کی گود میں آخری سانسیں لی تھیں۔“

میری سماعتوں میں نرس کی سسکیاں درد بن کر اتر رہی تھیں۔ میں نے ثریا کے حق میں دعا کرتے ہوئے اسے معاف کر دیا تھا اور اب مجھے اس کے ورثاء کا انتظار تھا کہ شاید کوئی مجھے اس جھوٹی اور چال باز عورت کا پتا بتا سکے اب تو اس کا اصل نام بھی معلوم ہو چکا تھا۔ یقیناً ثریا کے گھر والے اس سے اچھی طرح واقف ہوں گے۔ بقول ثریا کے اس کا رشتہ اسی نے کرایا تھا۔

میری نظریں اسپتال کے بیرونی گیٹ پر پکی ہوئی تھیں میرے پوچھنے پر جب نرس نے کہا کہ وہ لاوارث ہے۔ اتنی مدت میں کوئی اس کا حال پوچھنے نہیں آیا نہ ہی ثریا نے بار بار پوچھنے پر اپنے گھر والوں کے بارے میں کچھ بتایا۔ بس ہر بار یہ ہی جواب دیتی تھی کہ میرا کوئی نہیں ہے اور جو ہیں بھی وہ میرے لیے نہیں ہیں۔ میں جانتی ہوں اگر سوتلی ماں کا نمبر دوں تو وہ مسکرا ہو جائے گی کہ اس کے شوہر کی ایک بیٹی بھی تھی۔

نرس نے ادا سی سے کہا۔

”سر! اس کے وارث ہوتے تو وہ اس حالت تک نہ پہنچتی میڈیسن تو وہ باقاعدگی سے لے رہی تھی لیکن کوئی ایسا تھا ہی نہیں جس کے لیے وہ موت سے لڑ کر زندگی جیت لیتیں۔“

تب میں لاوارث لاش کا وارث بن کر اسے دفنا کر اس شہر سے واپس لوٹ آیا جس نے مجھ سے میرا سب کچھ پھین لیا تھا۔



وجود آنسوؤں میں بہہ گیا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ سجدہ مرہم ہے ہر زخم کے لیے۔ مجھے کیا خبر تھی کہ سجدہ شفا ہے ہر مرض کی۔ مجھے کیا خبر تھی کہ سجدہ عطا ہے اس نئی کی جو دیتا ہی رہتا ہے۔ وہ دے رہا تھا اور میں جھولیاں بھر رہا تھا۔

☆☆☆

”ارے تم؟ اتنی صبح کیسے؟“ وہ شاید کچن سے نکلی تھی کیونکہ ٹاٹے کی ٹرے اس کے دونوں ہاتھوں میں تھی۔ نکھری نکھری صبح جیسی حسین اور کھلی کھلی سی۔ ڈاکٹر گل جاناں حبیب اللہ۔

”سوچا تمہارے ساتھ مل کر ناشتہ کر لیتا ہوں اس لیے داک سے سیدھا اوپر آ گیا۔“ وہ مسکراتے ہوئے بے یقین نظروں سے مجھے دیکھنے لگی ٹرے ٹیبل پر رکھ کر تھرماس سے دو پیالیوں میں چائے انڈیلی اور ایک کپ مجھے پکڑاتے ہوئے بولی۔

”پتا ہوتا تو تمہاری پسند کی چائے بنا لیتی۔ زیادہ دودھ زیادہ پتی زیادہ چینی والی چائے۔“ اسے میری پسند اب بھی یاد تھی۔ میں نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

”اب تک میری پسند تمہاری پسند ہوا کرتی تھی لیکن اب تمہاری ہر پسند میری پسند ہوگی۔“ وہ حیرانی سے مجھے تنگنے لگی بے یقینی اس کی آنکھوں سے عیاں تھی۔

”مجھے خبر ہے پھر کوئی رشتہ لائے ہوں گے میرے لیے۔ آپ کیوں مان نہیں لیتے کہ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں ہے کہ میں شادی نہیں کر رہی۔ یہ میرا اپنا چنا ہوا رستہ ہے ورنہ آپ نے تو کبھی کوئی امید کوئی آس نہیں دلائی جس کا سہارا لے کر میں انتظار کی منزل طے کروں۔“

وہ سچی کھری لڑکی مجھے ہر بار کی طرح پچھتاوے کے بوجھ سے آزاد کر رہی تھی۔

”گل جاناں!“

”ہوں۔“ وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھتی

اب میری باقی کی زندگی بھی احساس گناہ میں موت سے بدتر گزرے گی۔ مجھے اک عورت کی بھیگی ہوئی آنکھوں کی حسرت ہمہ وقت رلا رہی اور یہ عورت کوئی اور نہیں میری ماں ہے جس سے میں نے نفرت کی ایک دھوکے باز لڑکی کی خاطر۔ مجھے ماں کی وہ نظریں نہیں بھولیں جب وہ بولنے سے قاصر تھی لیکن آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے کہہ رہی تھیں۔

”اپنا خیال رکھنا عامر! ایسا نہ ہو خیال رکھنے والی چلی جائے اور تم رل جاؤ۔ عامر میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں۔ مجھے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ مجھ میں اور دروسہ کی طاقت نہیں رہی۔“

میں رو رہا تھا تنکے کو ماں کا سینہ سمجھ کر اس کے نرم گرم وجود میں سر چھپا کر سسک رہا تھا۔ مجھے لگا شاید آنسوؤں کے ذریعے میرے اندر کی گھٹن کچھ کم ہو جائے گی لیکن بعض دکھ اور تکلیفیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ خون کے آنسو بھی کم نہیں کر سکتے۔ میرے یہ پچھتاوے کے آنسو ایسے تھے کہ جیسے پلیریا کے لیے برقان کی دوا کھائی جائے۔ میرے مرض کی سچ دوا تو کہیں اور تھی اور وہی مسیحا جو مجھ سے خفا تھا شاید اسے میرے حال پر ترس آ گیا تھا وہ مجھے اپنی طرف بلا رہا تھا۔ میں نے اس کے سامنے اک مدت سے جھکنا چھوڑ دیا تھا شاید وہ مجھے اصلیت دکھا رہا تھا۔ ہر رشتے کی اور اصلیت جان لینے کے بعد یہ احساس کہ اس کے سوا کوئی مسیحا کا ذمہ نہیں لے سکتا۔ میں اس کی طرف لوٹنے لگا شرمندگی کا احساس مجھے یہ یقین دلا رہا تھا کہ معافی مل رہی ہے۔ توبہ کی پہلی سیڑھی احساس شرمندگی اور معافی کی کوئی سیڑھی توبہ کے بغیر نہیں چڑھی جاسکتی۔ میں نے پہلا قدم اٹھایا اور منزل کئی گام قریب آ گئی۔ آج معلوم ہوا تھا کہ بعض اوقات مسافر کی لگن منزل کے لیے دیکھ کر اللہ فاصلے گھٹا دیتا ہے منزلیں مسافروں کے طے کرنے کی رفتار سے زیادہ تیزی سے قریب آنے لگتی ہیں۔

میں نے لرزتے کانٹے وجود کے ساتھ وضو کیا اور پیشانی سجدے میں رکھ کر اتار دیا کہ میرا سارا



# محبنا خانا

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

لاہور

مارچ 2020 کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

مارچ 2020 کے شمارے کے ایک چمک

## ہو گورو کے لیے ماحول خانا

☆ "آپے عشقِ نثار کرنا" شبنم اختر کا ناول

☆ "وہ محبت کے موسم" رشما احمد کا ناول

☆ "دل دریا اور سمندر" ریحانہ آفرین کا ناول

☆ "ولہی" مریم امجد کا ناول

☆ "سات موسم دھیان میں رکھنا" ثوبہ نواز الحق کا ناول

☆ "سنواتِ جیت ہو" نورین جویان کا ناول

☆ "سیمابنتِ عالم" عزیزین ابدال، شاکتول، حنفیہ شاہ

اور غزالہ جلیل راء کے افسانے

☆ "اسیرِ عشق" سدرۃ الحسنی کا سلسلے وار ناول

☆ "امیدِ صبحِ جمالی" ام مریم کا سلسلے وار ناول

معتمدی

سارے کے علاوہ

پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں، انشاء نامہ،

عید کے پکوان، مہندی کے رنگ اور وہ تمام مستقل

سلسلے جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں

کا شمار آج ہی اپنے قریبی

مارچ 2020

بک اسٹال سے طلب کریں

رہی۔

"کچھ بھی تو نہیں مجھ میں۔ پھر کیوں میرے جیسے ناشکرے انسان کے لیے یہ جوگ لے رکھا ہے؟"

"یہ سب اپنے بس میں تھوڑی ہوتا ہے۔" اس نے جھکی نظروں اور دھیمے لہجے میں کہا۔

"اگر میں کہوں میرے لیے اب صرف تم ہی تم ہو۔"

میں بھی نہیں ہوں کہ میں نے بہت کچھ چھین لیا ہے اور اب اس میں، کے لیے میں اس پیاری لڑکی کو نہیں کھوسکتا۔ میں ہار مانتا ہوں تمہاری محبت کے سامنے اور اب ہتھیار بھی ڈال رہا ہوں۔"

وہ فٹ چہرے اور بے یقین نظروں سے چند بل مجھے دیکھتی رہی۔

"مجھے خوش فہمیاں اچھی لگتی ہیں۔ نہ ہی انہوئیاں۔ اس لیے زمین زادی کو فلک پر نہ چڑھا میں۔"

وہ نظریں اپنی ہتھیلیوں کی لکیروں پر جما کر بولی تو میرا دل چاہا اسے سب کچھ بتا کر ہلکا پھلکا ہو جاؤں اس کی اوڑھنی کے کونے میں اپنے سارے اشک بہا کر محبت کے جگنو ان ہی بے خواب آنکھوں میں بھر لوں۔ لیکن اس دکھ کو میں نے اب اکیلے ہی سہتا تھا کہ اپنے پیاروں کو میرے اس دکھ نے پہلے ہی بہت دکھ دیے ہوئے تھے اب میں انہیں مزید دکھی نہیں کر سکتا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہیں؟" وہ شاید کچھ سننا چاہ رہی تھی

"مجھ سے شادی کر دو گی؟"

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا تو وہ بے اختیار مسکرا کر نفی میں سر ہلانے لگی۔

لیکن اس کی آنکھوں کی چمک اور گالوں کی لالی نے اقرار قبولیت کر لیا تھا اور اس کی مسکراہٹ نے سارے ماحول کو منور کر دیا تھا۔



## غزالہ نگار



پر اس سارے قہے میں صاحبزادہ ایاز کا کیا تصور.....؟ وہ تو اللہ تعالیٰ نے کرم کیا مجھ پر..... جو ایاز جیسا مخلص دوست دیا ہے۔ اتنا خوب صورت..... اتنا ہمدرد..... ایسا انسان جس میں بہت سی خوبیاں ہیں۔

اسی نے تو اپنی پر خلوص رفاقت سے مجھے سر اٹھا کر چلنے کا حوصلہ دیا ہے۔ جب میں جذباتی طور پر بالکل فنا ہو چکی تھی۔ ہاں یہ ہے زین حیدر..... کہ اب تم اس کے لیے بے حد ناپسندیدہ آدمی بن چکے ہو..... اور وہ تمہیں صرف میرے لیے برداشت کرتا رہا ہے۔

”تم نے زندگی میں بلند رزتو بے شمار کئے ہوں گے۔ میرا حسن! لیکن یہ غلطی ناقابل معافی ہے۔“ وہ اکثر کہتا ہے۔

شاید ایک گھنٹہ قبل اس نے تمہیں میرے آفس سے نکلتے نہیں دیکھا..... ورنہ فوراً آتا..... اور مجھے اپنے ساتھ لے جاتا۔ تمہارے جانے کے بعد اس نے مجھے بھی تنہا نہیں چھوڑا۔ پڑھ لیتا ہے میرے چہرے کو..... میری روح کے ایک ایک زخم کو..... جان لیتا ہے ہر دکھ کی خاموش آوازیں..... شاید اتنا تو میں بھی خود کو نہیں جانتی..... ہاں یہ وہی کار دارد ہے جو تم نہ کر سکے کبھی.....

وہ میری توجہ بٹانے کے لیے جب اپنے ڈراموں کے لیے میرے مشورے مانگتا ہے۔ تو مجھے بھی اچھی طرح علم ہوتا ہے کہ اسے میرے مشوروں کی کوئی ضرورت نہیں..... میں تین سال اس کی اسٹنٹ رہی ہوں اور مجھے پتا ہے۔ ٹی وی کا سینئر پروڈیوسر کتنا ذہین ہے۔

شیشوں پر گرتے ٹپ ٹپ بارش کے قطرے (میرے دل کے اندر ہوتی بارش کی طرح) تاریخی کے شگوفوں سے اٹھتی مدھم سی مہک کافی کی ٹھنڈی پیالی کی مٹی تلخ خوشبو

ایک بار پھر، ایک ساعت کو میرے سارے دیگر احساسات مٹ سے گئے ہیں۔ جب تمہاری روشن چمکتی مسکراتی آنکھیں یاد آتی ہیں۔ اس طرح کہ میرے وجود پر چمکی سی طاری ہونے لگی ہے۔ اور تمہاری خوشبو اپنے آس پاس محسوس ہونے لگی ہے۔ شاید کسی اسٹوڈیو کا بند دروازہ کھلا ہے۔ بل بھر کے لیے سازوں اور کسی مغنیہ کی پرسوز آواز کانوں سے نکرائی ہے۔

دل کی بستی میں تمناؤں کے سائے بھی نہیں اور اگر اس وقت صاحبزادہ ایاز نے میرے آفس میں جھانکا تو مجھے یوں سگریٹ نوشی کرتے دیکھ کر بہت ناراض ہوگا۔

”میرا! بہت گندی بچی ہو تم..... پھر وہی حرکت..... اور کس قدر غیر اہم شخص کے لیے پھونک رہی ہو تم خود کو.....!“

غیر اہم شخص..... زین حیدر..... میں تو اتنے سالوں میں بھی فیصلہ نہ کر سکی۔ کہ تم میرے لیے کس قدر اہم رہے..... اور دوسروں کے لیے کتنے غیر اہم ثابت ہوئے۔ لیکن دوسرے کب میری طرح دل کے صراطِ مستقیم سے گزرے ہیں بھلا؟ کب میرے جیسا عذاب کاٹا ہے انہوں نے..... برسوں آس کے نازک تار پر چلنے کاٹے ہیں میں نے..... اذیت کبھی ہے کتنے موسموں کی۔



پر بھی تو وہ ڈھکے چھپے طریقے ہیں۔ جس سے اس نے بڑے بڑے آرٹس دریافت کیے ہیں۔۔۔۔۔ اور میرے مرتے وجود میں ہر بار ایک نئی روح پھونکی ہے۔  
اب تو وہ بھی سوچ رہا ہوگا کہ میں اپنی نئی ڈاکو میٹری کے اسکرپٹ پر کام کر رہی ہوں۔ جو آثار قدیمہ پر ہے اور میں سوچ رہی ہوں۔ میرا دل بھی کیا کسی موہن جوداڑو، کسی ٹیکسلا سے کم ہے۔ ایسا کھنڈر۔۔۔۔۔ ایسا پرہول، ایسا شکتہ کہ کوئی میری آنکھوں میں جھانک پائے۔۔۔۔۔ تو اس کی روح بھی لرز اٹھے۔

اور میں ابھی وہ سگریٹ بھی الٹش ٹرنے سے نکال کر سنبھال لوں گی جو تم نے کچھ دیر پہلے اس آفس میں بیٹھ کر پئے تھے۔





بڑا خزانہ ہے میرے پاس، زین حیدر! وہ ماچس کی تیلیاں، جن سے تم اپنے سگریٹ جلاتے تھے۔ سگریٹ سب بے کار بنس جو تم انگلیش ٹرے میں ملتے تھے۔ وہ چند ایک کاغذ جن پر تم اپنے پروگرامز کے نوٹس لیتے تھے۔ وہ ویڈیو ٹیپس تمہارے کامیاب اور مقبول پروگراموں کے۔ اور یہ شکستہ محل سرائے دل کی..... جس پر سوائے ایاز کے کسی کی نظر نہیں پڑی۔

سنو زین حیدر.....! ابھی اپنے بے شمار مریضوں کی آنکھیں دیکھتے، میری آنکھیں بھی دیکھی ہوتیں شاید تھیں، دیکھو گے..... جب یہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گی۔

ابھی اپنے مریضوں کے دل کی دھڑکن سنتے سنتے میری دھڑکیں بھی محسوس کرتا۔ وہ وقت آنے سے پہلے۔ جب یہ تھک کر ہمیشہ کے لیے رک جائیں گی۔

لیکن تم تو ساری دنیا سے ایسے بے زار رہے زین حیدر! کہ تم نے مجھ سے بھی انصاف نہ کیا۔

سوچتی ہوں..... واقعی صوفیہ بد قسمت عورت تھی جس نے تمہاری رفاقت چھوڑنے میں بہتری جانی یا تم زیادہ بد قسمت ہو..... جس نے اس سمت دیکھا ہی نہیں کہ جدھر سے محبتوں کے، دائمی خوشیوں کے سورج طلوع ہو سکتے تھے۔ تمہارے لیے بھی، میرے لیے بھی..... ایک روشن افق بھی ہوتا ہے، زین حیدر!

ہم سب کی زندگی میں لیکن ایسے یہ ہے کہ ہم سب پیٹھ موڑے، بے خبر، اندھیروں کی سمت محسوس کرتے ہیں۔ اور پھر رفتہ رفتہ ہماری پیٹھ پیچھے چمکنے والے سورج، چاند، ستارے سب غروب ہو جاتے ہیں۔ اور روشن افق تاریکیوں میں ڈوب جاتے ہیں۔ صوفیہ دنیا کی آخری عورت نہیں تھی زین۔ تم نے اس سے ناتا ٹوٹنے کے بعد ہر عورت کو ایک ہی عینک سے ایک ہی زاویہ نظر سے دیکھا۔ اور بے حد غلط رنگ میں دیکھا۔

کیا یہ تم جیسے بڑھے لکھے آدمی کی جہالت نہ تھی؟ جب آپس میں نہ بنے۔ تو خوشی سے ایک

دوسرے کو آزادی دینا کیا بہتر عمل نہیں۔ بجائے اس کے کہ خود کو باندھ کر بھی رکھا جائے۔ اور ناخوش رہا جائے۔

تمہارے پیروں میں بچوں کی زنجیر بھی نہ تھی اور بقول تمہارے صوفیہ تمہیں پسند بھی نہ آ سکی۔ پھر کیا وہ روایتی مرد کی انا نہ تھی۔ جس نے تین سال تک تمہیں اور صوفیہ کو ایک بے مقصد مقدمے میں الجھائے رکھا۔ جس کے انجام کا تمہیں بخوبی علم تھا۔ کہ صوفیہ کے حق میں ہوتا ہے۔

اور جب میں اپنے بارے میں سوچتی ہوں تو اپنی بے بسی اور بے چارگی پر بہت ترس آتا ہے۔

یہ میرا حسن جیسی باتوں کی لڑکی کی بے بسی نہیں تو اور کیا ہے؟ کہ دل کے مقدمے کی پیروی کرنے

اور اپنا مقدر اندھیروں میں ڈوبنے سے بچانے کے لیے اس کے ہونٹوں سے ایک حرف تک نہ نکلا۔ وہ

یوں تو اپنی تقریروں سے بڑے بڑے ایوان ہلا کر رکھ دیا کرتی تھی۔ پر یہ دل کل میدان شاید ہر سورما کا

وائر لو ثابت ہوتا ہے۔ محبت کیسی انوکھی شے ہے۔ یہ خانہ بدوش چپکے سے آکر دل میں ڈیرہ ڈال دیتی

ہے۔ اور اپنے خوابوں کی طنائیں ایسی مضبوطی سے باندھتی ہے کہ کوئی آندھی کوئی طوفان اس خیمے کو اکھاڑ نہیں سکتا۔ زمین دل اجڑ جاتی ہے۔ بنجر ہو جاتی ہے۔

پر یہ آکاس نیل اس زمین سے نہیں ہتی۔ اس کا مضبوط پنچہ نہیں ہٹتا اعصاب سے۔

تم نہیں ہوتے۔ لیکن میری آنکھیں تمہیں دیکھتی ہیں۔ تم نہیں ہوتے پر تمہاری خوشبو محسوس کرتی

ہوں۔ اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ تمہاری آواز میری سماعت میں وہ خواب بد بن کر بولنے لگتی ہے۔ جن کی تعبیر میری پتھر آنکھیں کبھی نہ دیکھ پائیں گی۔

میری محبت دیوانگی کی حدود کو چھو۔ نے لگی ہے زین حیدر اور مجھے اس دیوانگی سے خوف آتا ہے۔

آخری تباہی بے حد خوفناک ہوگی اور کون سی قیامت آئے گی بھلا.....؟ آخری قیامت تو اسی روز آتی ہے



وی سی آر روم میں بند ہر شام یہ سوچے گزار دیتی کہ کس فریکوئنسی پر میری روح کی آواز تم تک پہنچے گی؟ فیض کی پوشنگ کے بعد یہ پروگرام میں تنہا ہی پروڈیوس کرتی رہی۔ پر بڑا لیا دیا سارو یہ رہا ہمارا۔ بڑا رکھ رکھاؤ والا لعلق..... نہ تم جان سکے نہ میں کہہ سکی۔ یہاں تک کہ بتائی دل کی پہلی شام آئی۔ میں اور صاحبزادہ ایاز ایک نئے پروگرام کے پائلٹ کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ تم میرے آفس میں آئے۔ اور ایک کارڈ میرے سامنے رکھ دیا۔

میں نے استفہامیہ نگاہوں سے تمہیں دیکھا۔ ”میری شادی ہے اگلے ہفتے..... اور میرا! تم ضرور آؤ گی۔“ تم نے بڑی سادگی اور بڑے اصرار سے پہلا خیر میرے دل میں اتار دیا۔ میں تمہاری صورت دیکھتی رہ گئی۔ ”کیسی بد اخلاقی ہے میرا جی..... تمہیں مبارک باد تو دینی ہی چاہیے تھی ڈاکٹر حیدر کو.....“ ایاز نے نرمی سے کہا۔

تب مجھے احساس ہوا، تم جا چکے تھے۔ کتنی ساعتیں گزر چکی تھیں۔ اور ان اذیت ناگ، بے نام لمحوں نے میری روح کے سارے بند درایاز کے لیے کھول دیے تھے۔ میرا دکھ..... عرماں ہو گیا تھا۔ اور وہ بڑے غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا تھا..... ناکام ہو گئی تھی۔

ایاز نے بڑے پیار سے میرا ہاتھ تھاما..... اور آہستہ سے بولا۔

”ایسے موقعوں پر چپ ہی رہتے ہیں لڑکی..... کچھ نہیں کہتے، خاموشی سے سہتے ہیں۔ دنیا کا ظرف اتنا بلند نہیں ہے۔“

اس شام ایاز نے مجھے گھر پہنچایا تھا۔ میری گاڑی چلاتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ ”میرا! جو ڈرامے ہم اسکرین پر دیکھتے ہیں نا۔ کبھی کبھار زندگی میں ہمارے ساتھ بھی پیش آ جاتے ہیں۔ بہادر بنو میرا! تمہیں اس ساری صورت حال کو

اور اس کے بعد ہر خواب ہر امید کا بدن، ہر آس کا چہرہ فنا ہو جاتا ہے۔ جب اجڑ جاتی ہے ساری کائنات اور کچھ باقی نہیں رہتا۔ پر ایاز کہتا ہے۔ اس مرحلے سے آگے قرار ہی قرار ہے۔ سکون ہی سکون ہے اور سکون کیا ہوگا؟ موت کا دوسرا نام۔

پر میں تو سو سو بار مری ہوں۔ ہاں اس شخص..... ایاز نے مجھے فن نہیں ہونے دیا۔ اتنا جھوڑا ہے کہ میری جڑیں تک مل گئی ہیں۔ ڈانٹا ہے۔ سمجھایا ہے..... بلکہ زندگی کی طرف ہاتھ پکڑ کر کھینچا ہے۔

بڑا امنیہ زور ہے۔ یہ ایاز، ارم کی موت کے بعد شاید قسم کھالی تھی اس نے کہ اور کسی طاقت سے شکست نہیں کھائے گا۔

یہ جواتنے ملکی اور غیر ملکی اعزازات سجے ہیں میرے آفس میں۔ ان میں صرف میرے ٹیلنٹ کا ہاتھ نہیں۔ میرے کندھے پر تو ہمیشہ ایاز کا مشفق ہاتھ رہا ہے میرے ساتھ اس کے روشن کردہ چراغ رہے۔ جنہوں نے میری راہ متعین کی۔

جس دن تم ہارون فیض کے ساتھ اپنے پہلے پروگرام کی کمپیئرنگ کے لیے اسٹوڈیو نمبر چار میں داخل ہوئے تھے۔ تبھی میری روح کو اپنا کھویا ہوا نصف بہتر اپنے آس پاس محسوس ہوا تھا۔ اور دوسرا ہٹ کے اس احساس پر جی چاہا تھا۔ کسی کلاسیکی دھن یہ کوئی کلاسیکی گیت گاؤں اور ہواؤں کو پکار کر بتاؤں کہ یہ ملن کی شام ہے۔ اور پھر کوئی بے حد مدھر، جادو گر ناچ ناچوں..... اور کائنات میری ہمراہی میں ناچے..... کہ محبت کا نغمہ بھی کائنات کا پہلا نغمہ ہے۔ اور یہ ہفت گئی زندگی کے ہر سر میں رچی بسی ہے اور چاہت کا رقص بھی اس آفاقیت کا حصہ ہے۔ اس دنیا کا سب سے قدیم اور مقدس رقص ہے۔ جس کی تال ابدی اور لافانی ہوا کے بدن میں، اس کے انگ انگ میں پوشیدہ ہے۔

لیکن ہوا یہ کہ تم کیمرے کی آنکھ کو دیکھتے، اسکرین پر اپنے مہمانوں کو متعارف کراتے اور میں



برداشت کرنا ہے اور کوئی راستہ نہیں ہے کوئی پتاہ گاہ نہیں ہے۔“

اس نے ایک ماہ کی چھٹی لے کر مجھے آرام کرنے پر مجبور کیا تھا اور جب چھٹی گزاز کر، بڑی حد تک خود کو سنبھال کر، میں لی وی واپس آئی تھی۔ تو میرا کمرہ سویٹ میز سے ہلک رہا تھا اور میری میز پر ایک کارڈ سجا تھا۔

”ویلم ہوم.....ایاز۔“

میری آنکھوں سے تشکر کے آنسو بہہ نکلے تھے۔ اسی شخص نے تو اس پورے مہینے میں بیٹھ کر میرے دکھ سکھ سنے تھے۔ میرے آنسو پونچھے تھے۔ مجھے تسلیاں دی تھیں اور مجھے کتھارس کی ہمت دی تھی۔ اب میں ہلکی تھی۔ کیونکہ میرے سارے بھاری دکھ اس نے اپنے کاندھوں پر اٹھا لیے تھے۔

میری چھٹیوں میں رشیدہ لطیف میرا پروگرام پروڈیوس کرتی رہی تھی۔ اور میں نے خود اس سے درخواست کی تھی کہ وہ یہ پروگرام جاری رکھے۔ کیونکہ تمہارا ایک مرتبہ پھر سامنا کرنا میرے لیے بلی صراط سے ٹھنک مرحلہ تھا۔ پر ایاز نے مجھے پروگرام واپس لینے پر مجبور کر دیا۔

”یہ دنیا ہے میرا حسن! کہاں جاؤ گی تم بھاگ کر..... کسی نہ کسی موٹر پر زین حیدر کا سامنا تو تمہیں کرنا ہی ہوگا۔ اس سے کوئی فرار نہیں.....“

وہ پریس کلب کے لان میں بیٹھ کر مجھے سمجھاتا رہا۔ اور میں اپنے آنسو پتی رہی۔

”یہ زندگی زہر کا پیالہ بھی ہے میرا۔ سقراط نے تو ایک ہی مارا اپنی رکیں سیراب کر لی تھیں نا..... ہمیں تو قطرہ قطرہ گھونٹ گھونٹ اپنے ہونٹ تر کرنے پڑتے ہیں۔ اپنے پوزے محسوسات کے ساتھ موت کو اپنی رگوں میں اتارنا پڑتا ہے۔ ہم محبتوں کے زخم خوردہ لوگ حقیقتاً اتنے خوش قسمت بھی نہیں میرا..... لیکن یہ بھی ہے کہ تمہیں ہمیں نہا یوگیوں اور زشیوں سے زیادہ کٹھنائیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔“ مجھے سمجھاتے سمجھاتے وہ خود نہ جانے کہاں کھو گیا تھا۔ پہلی بار میں

نے اس کے چہرے پر ٹھکن جاگتی، لہرائی دیکھی تھی۔ اور بالآخر مجھے ہتھیار ڈالنے ہی پڑے تھے۔ کیونکہ میرا محافظ صف آرا تھا۔ وہ پسپا ہونے والوں، ہتھیار ڈالنے والوں میں سے نہ تھا۔

پھر تم سے ملاقات ہوئی تھی۔ تم نے میرا حال پوچھا تھا۔ صحت یابی کی مبارک باد دی تھی۔ پر یہ نہیں پوچھا کہ مجھے بیماری کیا تھی؟ حالانکہ تم ڈاکٹر تھے اور میں دو سال سے تمہاری پروڈیوسر..... شاید تم مجھ سے خفا بھی تھے کہ میں تمہاری شادی میں شریک نہ ہوئی تھی۔ پر اس وقت اس بات کی تمہارے نزدیک کیا اہمیت کہ تم خود ان ابتدائی ایام میں بے حد خوش تھے۔ اور تمہیں اس بات کا گمان بھی نہ تھا کہ میں اندر سے کرچی کرچی ہوئی جاتی تھی۔

زندگی کی پھر وہی پرانی ڈگر..... وہی معمولات.....

یہاں تک کہ میں نے تمہاری آنکھوں میں جھانکتی پریشانیاں دیکھیں۔ تمہیں بے تحاشا سگریٹ پھونکتے دیکھا۔ تمہیں ذہنی طور پر غیر حاضر دیکھا۔ پر یہ پوچھنے کی ہمت نہ پیدا کر سکی کہ کیا ہوا تھا؟ کیوں ہوا تھا؟ مجھے تمہارے ذاتی معاملات کو کریدنے کا کون سا حق ملا تھا بھلا؟

پرایک دن تم خود ہی آتش نشاں کی طرح پھٹ پڑے تھے۔

وہ ریکارڈنگ سے پہلے اسکرپٹ کوری فجز دینے کی شام تھی اور رات کے دس بج گئے تھے کام کرتے کرتے۔ تمہیں کافی پنا کر دیتے ہوئے میں نے سرسری انداز میں بات کی تھی۔

”سگریٹ بہت مہنے لگے ہوزین!“

تم نے اپنی سرخ آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

”جن حالات سے میں گزر رہا ہوں میرا حسن کوئی اور ہوتا تو تمہا کو سے نہیں..... ہیروئن سے خود کو پھونک ڈالتا۔“

میرا وجود برف ہونے لگا۔ کون سے حالات تھے تمہارے؟ کیا میری عذاب ناک زاتوں اور



سنگار خانوں سے زیادہ شدید تھے؟

پھر دفعتاً تم میز پر آگے کی طرف جھکے۔ ”ایک بات بتاؤ میرا! یہ درکنگ دو من کس گھنٹہ میں ہوتی ہیں آخر؟ کیا دنیا انہی کی کمائی پر چلتی ہے فقط؟ اور میں تم سے اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ تم خود بھی ایک درکنگ دو من ہو۔“

میں ساکت و صامت تھیں دیکھتی رہ گئی۔ راتنا خیال مجھے ضرور آیا تھا کہ تم صوفیہ کی فل ہائیم ڈاکٹری سے خود کو ہم آہنگ نہیں کر پائے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ تم سے زیادہ سختی ڈاکٹر تھی۔

تم نے ایک ٹاپے کو گردن موڑ کر مجھے دیکھا اور میرا چہرہ دیکھ کر بولے۔ ”معاف کرنا، میں بہت تنہا ہو رہا ہوں آج کل۔ میری زندگی غیر متوازن ہو رہی ہے۔“ تم اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”شادیاں توڑنے کے لیے نہیں ہوتیں میرا۔! اور میں بھی ایسا ہونے نہیں دوں گا۔“

تم آفس سے باہر نکل گئے۔ میرا دل چیخ اٹھا تھا۔ ”بے شک شادیاں توڑنے کے لیے نہیں ہوتیں زین حیدر! لیکن دل بھی تو توڑنے کے لیے نہیں ہوتے۔ یہ مقدس بارگاہیں۔“

کسی نے دروازے سے جھانکا تھا۔ ”اپنی دن ایٹ ہوم۔؟“ یہ ایاز تھا۔ دنیا کا واحد منہ جوئی دی کو اپنا گھر سمجھتا تھا اور اپنا گھر تو اس کے لیے سرائے بھی بس۔

”تم آدمی ہو یا جن! کسی بھی وقت ٹپک پڑتے ہو۔“ میں نے قدرے سختی سے کہا۔ اور اپنی ریوالتنگ کھڑکی کی طرف موڑ لی۔

جانے کیوں اس وقت مجھے اس کی آمد اچھی نہیں لگی تھی۔ شاید میں تمہارا دکھ صرف خود اپنے ساتھ شیر کرنا چاہتی تھی۔ کسی اور کو ایک جھلک نہیں دکھانا چاہتی تھی۔

پرایا ز نے میرے لہجے میں غصہ، مایوسی اور آنسوؤں کی نمی سبھی کچھ محسوس کر لی تھی۔

”زین حیدر باہر کوریڈور میں ٹپک رہا ہے اور کانی پریشان دکھائی دیتا ہے۔“

اس نے بہت آہستہ سے کہا۔ میں نے کوئی

جواب نہیں دیا۔ میرے پاس تھا کیا کہنے کو۔ میں نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔

”کچھ لوگو۔ کیا ایسا کرنے سے تم اپنی حالت عانی کیفیت چھپا لو گے؟“ ایاز نے بڑے پیار اور نرمی سے کہا۔

”جانے یہ شخص کب تک پریشان کرے گا مجھے یا اس عذاب کا کوئی اختتام ہی نہیں۔؟“ ایسا کہتے ہوئے مجھ اپنی ہی آواز اچھی لگی۔

ایاز نے میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”میرا جی! تم نے خود ہی اپنی محبت کو جی کا عذاب بنا رکھا ہے۔ تم نے اس شخص کو اپنے حواسوں پر بری طرح مسلط کر لیا ہے۔ حالانکہ محبت ایسی اذیت ناک نہیں ہوتی۔ ارے بیوقوف لڑکی۔ تم اس شخص سے توقعات وابستہ کیے بیٹھی ہو جس کے اپنے احساسات جامد ہیں۔ حالانکہ محبت کی خوشبو تو فوراً چاروں سمت پھیل جاتی ہے۔ اس فریب آرزو سے نکلو میرا! اگر تمہاری شادی اس شخص سے ہو بھی جاتی تو تم کبھی خوش نہ رہتیں۔ وہ ایک مختلف مٹی سے کھنٹا ہوا ہے۔ تمہاری ٹاپ نہیں ہے وہ۔“

میں خاموشی سے روٹی رہی۔ ایک عورت کا بس سوائے اپنے آنسوؤں کے کس پہ چلا ہے زین حیدر۔؟

اور مجھے علم تھا کہ تم نے اس شادی کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ اور یہ ایک روایتی مرد کی سوچ تھی۔ ایک تعلیم یافتہ ڈاکٹر کی ہیں۔

مجھے بے حد دکھ ہوا۔ ایاز غلط نہیں کہتا تھا۔ تمہارا خیر جانے کس مٹی سے اٹھا تھا۔ در نہ صوفیہ بھی نظر بنا بڑی لڑکی نہیں تھی۔ مسئلہ جی ہم آہنگی کا تھا۔ اور قسمت نے اسے جانے کس عجیب چکر میں تم سے باندھ دیا تھا۔

مقدمہ تین سال تک چلا رہا۔ اور صوفیہ تم سے خلع حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

اس دوران تمہارا پردگرام بھی ختم ہو چکا تھا۔ اور اب تم شادی دکھائی دیتے تھے۔

ایک دن کلب کے تہولا میں تم سے ملاقات ہو گئی۔ تم بے حد افسردہ اور خاموش تھے۔



”میرا دیکھ رہی ہو اس شخص کو..... یہ صوفیہ سے نفرت کرتا تھا اور اس لیے ناخوش ہے۔ کہ وہ آزاد اور مطمئن کیوں ہے۔“ ایاز نے بڑی سخت آواز میں کہا۔

میں سوچتی رہی۔ آخر کب تک چلے گا یہ سب؟ کب تک میں ہر رشتے میں مین میکھ نکال کر انکار کرتی رہوں گی۔ ایاز سمیت سبھی میری اس روش سے ناخوش تھے۔ کیونکہ دو چار رشتے ایسے بھی تھے۔ جو ان کے نزدیک میرے لیے بے حد مناسب تھے۔

”تم بے حد غلط فیصلے کرتی رہی ہو میرا! تمہیں مکمل اختیارات ملنے ہی نہیں چاہیے تھے۔ آخر کیا کرو گی تم اپنی زندگی کے ساتھ.....؟“ ایاز مجھے اکثر ڈانٹتا۔

اور ایک شام طارق روڈ پر پھر ایک اسٹیک بار میں تم سے ملاقات ہو گئی۔ اور بات اسی پرانے موضوع پر چلنے لگی۔ تم نے ورکنگ دو مین کو خوب خوب برا بھلا کہا۔

”تم انڈرا سٹیٹ کر رہے ہو ورکنگ دو مین کو زین..... اور صرف چند عورتوں کی وجہ سے، صرف اپنے ذاتی تلخ تجربے کی وجہ سے اور یہ انصاف نہیں ہے۔“ زندگی میں پہلی بار مجھے تم پر بے حد غصہ آیا۔

”میں غلط نہیں کہتا میرا! پڑھی لکھی لڑکیوں کو نیکیل ڈالنا واقعی مشکل ہو جاتا ہے۔ اپنی مثال لو کیوں شادی نہیں کی تم نے اب تک؟ مجھے معلوم ہے۔ تمہارے لیے اچھے سے اچھا پروپوزل موجود تھا اور آج بھی ہیں۔ لیکن بات یہی ہے تاکہ اس مکمل آزادی کو کسی دوسرے شخص کے لیے قربان نہیں کرنا چاہتیں۔“ تم نے بڑی جی سے کہا۔

اور یہ تم نے کیا کہہ دیا تھا زین حیدر؟ مصلوب کر ڈالا تھا مجھے اپنی ہی وفا کی صلیب پر..... ایک کیل اور گاڑ ڈالی تھی میرے دل میں اپنی بے مروتی سے..... ساری کائنات چند ساعتوں کے لیے مٹ گئی تھی..... اور اس خلا میں پکار پکار کر میں خود سے پوچھ رہی تھی کیوں شادی نہیں کی میں نے اب تک؟ کیوں شادی نہیں کی میں نے اب تک.....؟

بمشکل تمام میں کہہ سکی۔ ”زین حیدر! یہ آزادی بالکل بے معنی ہے میرے لیے۔ تم غلط سمجھے مجھے۔“

کیونکہ ایک فلامی ایسی بھی ہوتی ہے۔ جو انسان بڑی خوشی سے، بڑی چاہ سے قبول کرتا ہے۔ بشرطیکہ تمہارے ساتھ تمہارا دل بھی اسیر ہو۔“

تمہیں وہیں حیران چھوڑ کر میں چل پڑی تھی۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا۔ درحقیقت تم بے حد کمزور اور بودے آدمی ہو۔ تم کسی عورت کو احساس تحفظ نہ دے سکو گے۔ تم اپنی بیوی کے دوست، غمگسار، ہمدرد بلکہ شریک بھی نہ بن سکو گے۔

اور آج شام جب میں موہن جوداڑو پر اسکرپٹ مکمل کر رہی تھی۔ تم ایک بار پھر آ گئے۔ ”میں اپنی ان پڑھ کزن سے شادی کر رہا ہوں۔ کم از کم اس کا دماغ اتنا خراب تو نہ ہوگا۔ جتنا تعلیم یافتہ عورتوں کا ہوتا ہے۔“

تمہارے لہجے کی جی نے میرے آفس کا مہکتا ماحول بھی مسموم کر کے رکھ دیا۔

عجیب بات ہے میرے ہیرو..... یہ سن کر مجھے ایسا قاتل دکھ نہیں ہوا۔ حالانکہ میں ایک بار پھر رو رہی ہوں۔ اس لیے نہیں کہ بہت سے چہروں سے نقاب کتنی دیر سے ہٹتے ہیں..... ہم اپنی بیش قیمت چاہتیں کن پتھروں کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں یہ لازوال جذبے جنہوں نے سلطنتوں کو ٹھوکر ماردی۔ کسے کسے بے قدرے لوگوں پر ضائع ہو جاتے ہیں۔ اور یہ تحض تمہاری خوش فہمی ہے کہ تمہاری ان پڑھ کزن بے زبان بھی ہوگی۔

پہلی بار تو تم ہار گئے تھے۔ زین حیدر! اور زندگی کا یہ اگلا محاذ آسان نہیں۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے۔ وہ اگلا آنے والا تم سے اپنی بساط سے بھی بڑھ کر مانگے۔ اور جب تمہیں ہوش آئے گا۔ بہت دیر ہو چکی ہوگی۔ کچھ بھی باقی نہ ہوگا۔

رات کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں کسی دیے کے سہارے (کہ تمہارے پاس نہ محبت کا نور ہے، نہ خلوص کی روشنی) اپنی گمشدہ جنت تلاش شو گے۔ یا انا کے انہی پر غرور پہاڑوں سے سر ٹکرا کر مر جاؤ گے۔





## زارا ہنجرا



”داؤد نے مجھے طلاق دے دی ہے..... طلاق دے دی ہے۔“ اس کی آواز اتنی تو بلند تھی گویا آسمانوں پر بھی سن گئی ہوگی۔  
رومانہ کو لگا تھا کہ ان کی ساعتوں پر کسی نے ایٹم بم گرایا ہو، اتنے زور کا دھماکا ساعت مفلوج ہو گئی اور بصارت بھی چھین گئی کچھ بل کے لیے تو رومانہ کو واقعی نہ کچھ سنائی دیا نہ سمجھائی۔ سارا منظر ہی دھندلا گیا۔  
محسن کا بڑا گیٹ پورا کھلا تھا۔ کچھ آدمی اندر داخل

”اما جان سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ کچھ بھی نہیں بچا..... میرا گھر اجڑ گیا ماما..... میں برباد ہو گئی۔“ روئل روتی پینتی آئی تھی اور ماں سے لپٹ کر پاگلوں کی طرح چلا رہی تھی۔ بوکھلائی سی رومانہ کے ذہن میں کسی انہونی کے ہو جانے کے خدشے نے سر اٹھایا تھا۔  
”کیا ہوا میری بچی..... روئل..... کیا ہوا؟“  
بوکھلاہٹ میں بیٹی کو خود سے الگ کرنے کی سعی کرتی رومانہ کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔



پہلے میں سر کیوں نہیں گئی۔ میرے اللہ تجھے بھی مجھ پر ترس نہیں آیا میری محسوس کی اجڑ گئی۔ ”وہ زار و قطار دوری تھیں صدے کی شدت سے ان کی حالت غیر ہو رہی تھی۔“  
 ”ایک نظر اپنی زندگی برڈالورمانہ بیگم تو نہیں یاد آئے گا کہ تم نے لوگوں کی ہستی بستی زندگیوں میں کیسے دکھ بھرے تھے۔ اور اب جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا ہے۔ وہ تمہارے اعمال بد کا نتیجہ ہے اور یقیناً اسے مکافات عمل کہتے ہیں۔“

☆☆☆

رومانہ ان عورتوں میں سے تھیں جنہیں میکہ اور سسرال دونوں جگہوں میں مستحکم حیثیت حاصل تھی۔ ماں، باپ کے گھر بڑی بیٹی اور سسرال میں بڑی بہو یعنی قدرت نے اسے حکمرانی کا خوب موقع فراہم کیا تھا۔ شوہر بہت شریف النفس تھے۔ انہوں نے گھر کے تمام تر اختیارات بیوی کو سونپ دے تھے۔ کیونکہ بظاہر وہ ایک سکھڑ اور عقل مند عورت تھیں مگر ان کا اصلی چہرہ تو اجد کو بڑی در بعد نظر آیا تھا۔ جب احمد ان کے چھوٹے بھائی کی دہن گھر آئی تھی۔ پہلے پہل تو وہ دیور کی شادی کو بکسر نظر انداز کیے ہوئے تھیں ساس بھر بھی اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ نندیں بھی کچھ سادہ لوح تھیں اور رہتی بھی اتنی دور تھیں کہ کئی کئی مہینے میسے نہ جھانکتیں۔ مگر بھائی کی شادی کو لے کر جب دونوں نندیں فکر مند ہوئیں تو رومانہ نے بڑی چالاکی سے یہ بیڑا اپنے سر لے لیا اور ایک جگہ دیور کا رشتہ طے کرادیا۔ یوں سب کی نظروں میں بھی اچھی ہو گئیں۔

سحرش توقع سے زیادہ سکھڑ، سلیقہ شعار، خوش گفتار اور معاملہ فہم ثابت ہوئی، جس نے جلد ہی سب کے دلوں میں گھر کر لیا۔ اس نے شادی میں آئی نندوں کو درستی کچھ دن روک لیا اور تمام گھریلو امور میں بھی پیش پیش تھی رومانہ کو یہ گوارا نہ تھا سوندوں کے جانے کے بعد انہوں نے سحرش کو ہر کام سے دستبردار کرتے ہوئے صرف اس کے کمرے تک محدود کر دیا۔ خود تمام کام صبح سویرے کر لیتیں اور سحرش کو کام کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔ سب لوگوں کو وہ یہ بتاتیں کہ چار دن سب کے آگے آگے ہو

ہوئے تھے۔ پیچھے ایک ٹرک سامان سے لدا ہوا۔ روٹل دھب سے صوفے پر گر گئی تھی۔ رومانہ لڑکھرائی ہوئی لاؤنج کے دروازے پر آئی تھیں۔ منٹوں میں تمام گھر فرنیچر سے بھر گیا تھا۔ وہ لوگ جاچکے تھے۔ اجد صاحب جھکے کندھوں کے ساتھ آئے تھے اور لاؤنج کے دروازے پر کھڑی اپنی شریک حیات پر ایک قہر آلود نظر ڈالی تھی۔ باپ کو دیکھ کر روٹل پھر چلانے لگی تھی۔

”میں بہت روٹی تھی اس کے آگے، کتنے واسطے دیے تھے کہ مجھے طلاق مت دو۔ مگر۔۔۔ اس نے میری ایک نہیں سنی۔“

بیٹی کی چیخ و پکار رومانہ کو ہوش میں لائی تھی۔ سب کچھ واضح ہو گیا تھا۔ ان کی تمام تدبیریں جو انہوں نے اپنی بیٹی کا گھریبانی کے لیے آزمائی تھیں سب بے کار اور رائیگاں گئی تھیں۔ بیٹی کی خوب صورتی بھی کام نہ آئی اس کی اعلا یونیورسٹی کی حاصل کردہ ڈگری بھی قیل ٹھہری اور مال و دولت بھی بیٹی کا گھر نہ بچا سکے۔

کتنا مان تھا انہیں اپنی بیٹی کی خوب صورتی پر، خوب سیرتی پر، ذہانت پر، تعلیم، دولت اور خود اپنی ذات پر کہ جس نے ہمیشہ جو سوچا وہ کر دکھایا جو چاہا پایا۔ انہیں لگتا تھا ساری دنیا ان کی منگی میں ہے۔ وہ اپنی عقل استعمال کریں اور جس سے چاہیں جو بھی فائدہ اٹھائیں۔ میکہ ہو یا سسرال۔ بھائی بیویا دیور ہر جگہ ان کی شہ زوریاں چلتی تھیں ان کا شاطر ذہن ہر جگہ کارگر ثابت ہوتا تھا۔

لیکن اب ایسا کیا ہو گیا تھا۔ سب کچھ الٹ پلٹ سا گیا تھا جس جگہ دوسروں کی جانی کا سامان کیا جاتا تھا۔ وہ گھر خود ہی جانی کی نذر ہو گیا تھا۔ جہاں دوسروں کی بربادی پر قہقہے گونجتے تھے وہ جگہ اب ماتم کدہ بن گئی تھی۔ ”یہ سب کیا ہو رہا ہے اجد۔۔۔۔۔ آپ نے خاموشی سے بیٹی کو اجڑتے دیکھ لیا؟“

وہ شوہر کا گریبان پکڑ کر رو رہی تھیں۔  
 ”بیٹے کا دکھ کم تھا جو ظالموں نے میری بیٹی کو ماں نہ بننے کی اتنی بڑی سزا دے دی۔ یہ سارے دکھ دیکھنے سے



کے سب کی نظروں میں اچھا بن رہی تھیں۔ انہوں نے تمام لوگوں کے دلوں میں غلط فہمی کے بیج بکھیر دیورانی کے لیے سب کا دل کھٹا کر دیا۔

دو سال تک جب احمد کی اولاد نہ ہوئی تو رومانہ کے دل میں خوش فہمی نے سر اٹھایا زبردستی دیورانی کو ڈاکٹر کے ہاں لے گئیں۔ یہ سحرش کی بد قسمتی تھی کہ ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کر کے بتایا کہ اس کے ماں بننے کا امکان دس برسٹ ہے۔ علاج کرانے سے ممکن ہے کچھ بہتری آجائے، رومانہ کے ہاتھ اس کی کمزوری آگئی انہوں نے اسے بانجھ منجوس کہہ کر دیور کا دل بھی اس سے کھٹا کر دیا اور تندرلوں کو بھی اکسایا کہ بھائی کی دوسری شادی کر دیں۔

سحرش اور احمد کے درمیان جھگڑے بڑھنے لگے اور ایک دن احمد نے غصہ میں آکر اسے طلاق دے دی۔ رونی جتنی سحرش نے احمد کے ہاتھ جوڑے، واسطے دیے مگر بھابی کی شہ پر اس نے بے چاری سحرش کی کوئی فریاد نہ سنی۔

انہوں نے دیور کا دوبارہ رشتہ کرنے میں کوئی جلدی نہ کی اور اسی طرح دو سال گزر گئے احمد کو بلڈ کینسر ہوا اور تشخیص کے دو ماہ بعد وہ چل بسا۔ یوں رومانہ کا ہر راستہ صاف اور کھلا تھا۔

سحرش کی بربادی اور احمد کی موت پر ان کے چہرے پر کینسی کی خوشی دیکھ کر اسجد صاحب کو وہ ڈانٹ لگنے لگی تھیں مگر وہ اپنے بچوں کی خاطر انہیں گھر سے نہ نکال سکے۔

☆☆☆

”تم نے اس بے ضرر عورت کی محرومی کو تماشا بنا کر اسے ذلیل کر کے گھر سے نکلوا دیا تھا۔ تو دیکھو، قدرت کا انصاف آج وہی سب ہماری بیٹی کے ساتھ ہو گیا۔ تم میرے بھائی کو بے نام و نشان دیکھنا چاہتی تھیں اور تمہاری نحوست سے وہ بے نام و نشان ہو گیا اور پھر اللہ نے تمہارا بیٹا تم سے چھین کر تمہیں بے وارث کر دیا۔ دیکھ لو رومانہ بیگم تم نے ایک کینسی کی خوشی اور ہر چیز پر اپنی ملکیت حاصل کرنے کے لیے کسی کا گھر برباد کیا تھا تو آج تمہارے ساتھ بھی

بالکل وہی ہوا ہے۔ یہ حقیقت تم ایک ڈانٹ ہو جس کی وجہ سے اس گھر میں بنائی آئی اور آج بھی تمہارے اعمال کا نتیجہ میری اولاد کی بنائی ہے۔“

اسجد کے لیوں پر بڑی تلخ مسکراہٹ تھی جبکہ آنکھوں میں نمی تھی اور رومانہ نے اپنا انجام اس دنیا میں ہی دیکھ لیا تھا۔

”انسان جب کسی کو بلا وجہ دکھ دیتا ہے تو پھر کچھ وقت کے بعد بھول جاتا ہے اور خود کو بہت راست باز سمجھنا شروع کر دیتا ہے لیکن ایک ذات ایسی ہے جو اپنے بندوں کے ساتھ ہوئی زیادتی کبھی نہیں بھولتی۔ اگر وہ گناہ گار کو گناہوں کے باوجود سب کچھ نوازتا رہتا ہے تو یہ اس کی طرف سے ڈھیل ہوئی ہے وہ سب کچھ دے کر آزماتا ہے کہ بھلا انسان کیسے اس کی دی ہوئی چیزوں کو استعمال کرتا ہے۔

اگر وہ اپنی طاقت اور مرتبے کو کسی کمزور کو گرانے میں صرف کر دیتا ہے اپنی دولت کو دوسروں کی بربادی کے لیے استعمال کرتا ہے تو پھر ایک دن وہ اس کی رسی کھینچ لیتا ہے اور اس کی گرفت سے بچنے کے لیے نہ عقل کام آتی ہے نہ شکل نہ دولت نہ حیثیت جس نے جیسا بویا ہوتا ہے ویسی فصل تیار ہو جاتی ہے۔

☆





## فرح بھٹو

# سحر گرد و دریا

وہ اکیڑی کے گیٹ سے باہر نکلی اور اپنی کلاس فیلوز کو ہاتھ ہلاتی بائیں جانب کھڑی اپنی سفید کردلا کار کی طرف بڑھی اور پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔

”اف آج تو گرمی کی حد ہے۔ ذرا اے سی کا نمبر تو بڑھا میں اکرم چاچا۔“ منال نے ڈرائیور سے کہا تو اس نے فرماں برداری سے سر ہلایا۔

”آج واقعی گرمی بہت ہے بی بی جی۔“ ڈرائیور نے بھی تصدیق کی۔ منال کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ تھوڑی ہی دیر میں گاڑی ایک جنگل کے کھلے گیٹ کو عبور کرتی پورچ میں کھڑی ہو گئی۔ منال باہر نکلی۔

”من مال۔“ برآمدے کا دروازہ وا ہوا اور گلابی فرائک میں ملبوس ایک بے حد خوب صورت

صحت مند تین سالہ بچی تیزی سے دوڑتی منال کی طرف آئی۔

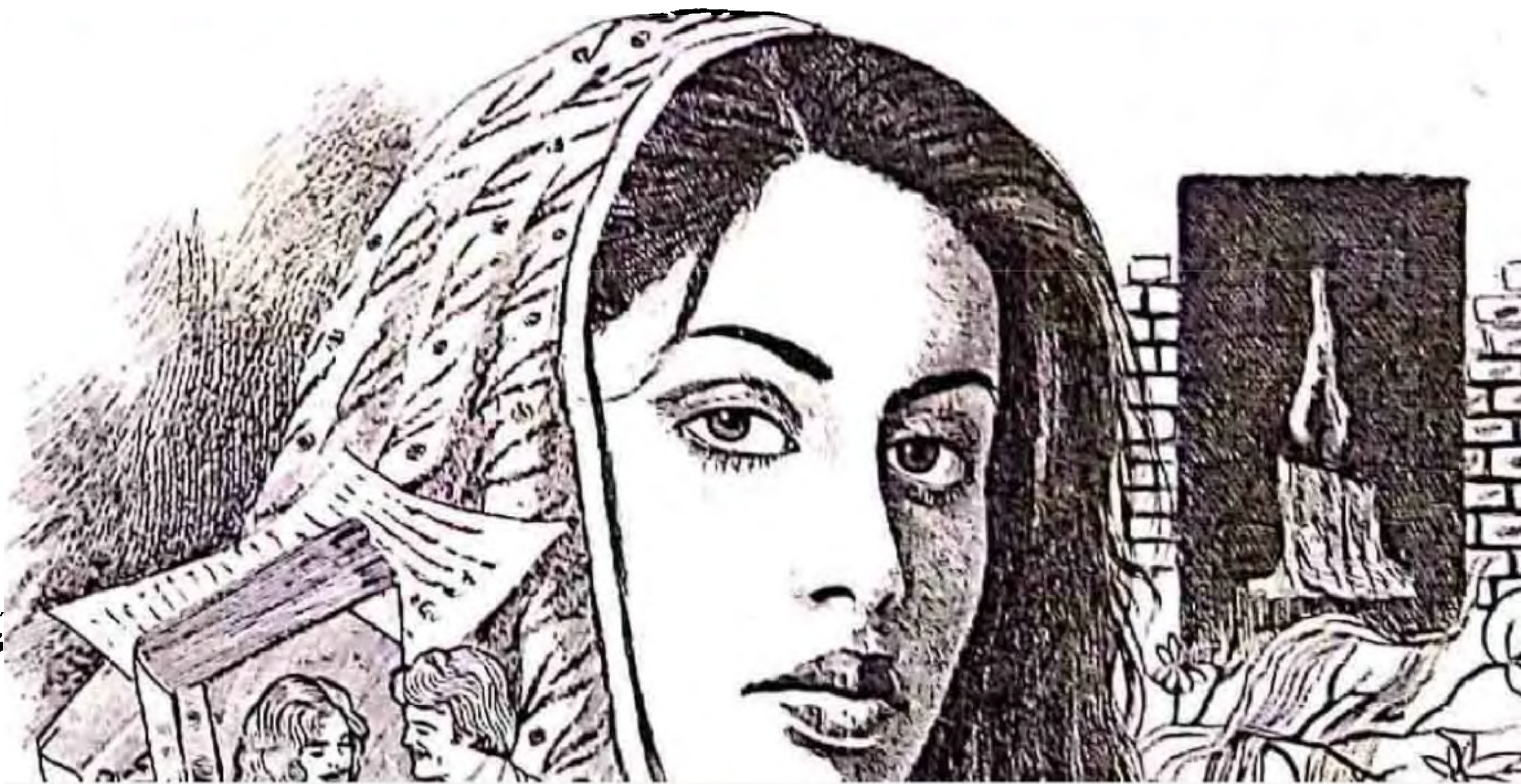
”ارے آرام سے۔“ اس کے پیچھے اس کی آیا دوڑی تھی۔ منال بچوں کے بل زمین پر چبھی اور اپنی بائیں کھول دیں۔ نیمل فور اس کی بائیں میں آسائی۔

”میلا جالو بچہ۔ من مال کو مس کیا۔“ منال نے تو تکی زبان میں پوچھا تو نیمل نے زور زور سے سر ہلایا۔ منال نے بے اختیار اس کے سرخ رخسار چوم لیے اور نیمل کو بائیں میں اٹھا کر کھڑی ہوئی۔

”آپ نے لُچ کیا نیمل؟“ منال نے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”آپ گندی بچی ہو۔“ منال نے خفگی

## مکمل ناول





دکھائی۔ نیکل نے سر پھر دائیں بائیں ہلایا اور منہ میں انگلی ڈال دی۔

”کوئی نہیں ڈالتے منہ میں۔“ مثال نے فوراً اس کا ہاتھ پکڑ کر نیچے کیا اور اندر آئی۔  
”آئیں بیٹا۔“ شمسہ آٹنی لاؤنج میں بیٹھی تھیں۔

”جی۔“ مثال نے بیک کتھ سے اٹار کر صوفہ پر رکھا اور خود بھی نیکل کے ساتھ وہیں بیٹھ گئی۔  
”منہ ہاتھ دھو لو تو کھانا لگواؤں۔“ انہوں نے کہا تو مثال نے کستی سے سر ہلایا۔

”بالکل تم پر پڑی ہے نیکل۔ جیسے تمہیں عادت ہے ہر بات میں سر ہلانے کی ویسے ہی اسے بھی ہے۔“ انہوں نے محبت سے دونوں کو دیکھا۔  
”ہاں تو خالہ پر نہیں تو کس پر جائے گی لڑیا۔“ مثال نے اس کو اپنے بازوؤں میں جھنجھکیا کر سہارا کیا۔  
”سارا دن من، مال من مال کرتی رہتی ہے۔ اسے اسکول میں داخل کروادو تو اس کا دل بہلے۔“ ان کے مشورے پر مثال نے تکی میں سر ہلایا۔

”ابھی تو بہت چھوٹی ہے۔ اس کو اپنا بچپن جینے دیں۔ پھر تو ویسے ہی زندگی کے رنگ دیکھنے ہیں اس نے۔“

”خدا کرے زندگی اس کو اپنے خوب صورت رنگ ہی دکھائے۔“ انہوں نے بے اختیار عادی تو مثال نے فوراً آئین کہا۔

”جیم تو اللہ کی خاص رحمت کے سائے میں ہوتے ہیں۔“ وہ مزید بولیں تو مثال کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

”کتنا چاہتی تھیں ایسا اسے۔ دائر بھائی کی بھی جان تھی اس میں۔ اور ماما ان کو تو اپنی اکلوتی نواسی سے عشق تھا۔ کہتی تھیں، بالکل مجھ پر پڑی ہے۔“ نیکل کے سنہرے بالوں کو سنوارتے وہ گہن گم ہوئی۔  
”کنہا۔ نہ وہ موتی جیسے لوگ رہے نہ ان کی جاتیں۔“ شمسہ آٹنی کرب سے آہ بھر کر کچن کی طرف

ہلی گئیں۔ مثال کتنی ہی دیر اپنے آنسو روکنے کے لیے آنکھیں جھپکتی رہی۔

”من مال۔“ نیکل نے اس کے اچھے گالوں سے پھسلا آنسو کا قطرہ اپنی انگلی سے چھو لیا۔  
”نیکل! میری جان۔“ مثال نے اس کے ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لگائے۔

”تم جانتی ہو، تم میری زندگی ہو۔ نیکل۔ میری ایسا کی آخری نشانی۔ تمہاری ممانے آخری سانس لینے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھ سے تمہارے لیے ایک وعدہ لیا تھا کہ میں تمہیں ہمیشہ اپنے دل سے لگا کر رکھوں۔ ہمیشہ خوش رکھوں۔ میں اپنا وعدہ نبھاؤں گی ان شاء اللہ۔“

وہ سرگوشی میں کہہ رہی تھی اور نیکل نے ایسے سر ہلایا جیسے سب سمجھ رہی ہو۔ مثال بے ساختہ سکرادی۔

☆☆☆

”پھر کیا سوچا تم نے مثال؟“ فیب راجا کی آواز موبائل کے اسپیکر سے ابھری۔

”ابھی میں خود کو تیار نہیں کر پار ہی ہوں اس چیز کے لیے فیب!“ مثال نے بے بسی سے کہا۔

”مثال! سوچ لو۔ ایک بڑا پروڈیکٹ ہاتھوں سے نکل جائے گا۔ تمہارا ماڈلنگ کیریئر جو گھٹنوں پر چلتا شروع ہوا ہے ایک دم دوڑنے لگے گا۔“ فیب راجا نے جیسے اسے اکسایا۔

”تم سمجھ نہیں رہے فیب! ابھی اس حادثے کو گزرے عرصہ ہی کتنا ہوا ہے۔ میں خود کو یہ مشکل روٹین ورک پر آمادہ کر پائی ہوں۔ سچ کہوں تو نیکل کو چھوڑ کر اکیڈمی جانے کا بھی دل نہیں کرتا۔“ مثال کی بات پر فیب خاموش سا ہوا۔

”مثال! تم جاگیر دار یا صنعت کار فیملی سے تو ہو نہیں۔ تمہارا تعلق میڈیا اینڈ سٹری سے ہے۔ تمہاری مٹی اور ایسا نے زندگی میں جو کچھ بنایا اپنے اسی کام سے بنایا۔ ایک اسٹیشن سیٹ کیا اپنی لائف کا۔ اب تمہیں اسی لائف اسٹائل کو رن کرنے کے لیے دوبارہ میڈیا میں قدم رکھنا ہو گا ورنہ کھرچلانا تمہارے



لیے آسان نہیں رہے گا۔ وہ بھی ان سہولیات سمیت جن کی تم عادی ہو چکی ہو۔“ فیب راجا نے رمان سے سمجھایا تو منال نے لب بھینچ لیے۔

”ابھی ایک ہفتہ ہے تمہارے پاس۔۔۔ خوب سوچ سمجھ لو۔ جلدی کوئی نہیں۔“ اس نے فیصلے کا بار منال کے کندھوں پر ڈالا۔

اور وہ جونی الحال کچھ سوچنا سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔ منجھے میں پڑ گئی۔ ٹھک تو کہہ رہا ہے فیب۔ تمی اور اپنا کے جانے کے بعد گھر کو معاشی لحاظ سے اسی لیول پر چلانے کے لیے مجھے کچھ ہاتھ پیر مارنے ہوں گے۔ اب تو نیشنل کی ذمہ داری بھی مجھ پر ہے۔ کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔ منال نے ایک سانس بھر کر سوچا۔

☆☆☆

”شاور لغاری! میری بات سنو۔“ اماں میٹھی نے اپنی نحیف آواز میں اسے متوجہ کیا۔ وہ کم ہی بیٹوں کو ان کے مکمل نام سے بلاتی تھیں۔

”جی اماں میٹھی! حکم کریں۔“ وہ موبائل جیب میں ڈال کر فوراً ان کی طرف متوجہ ہوا اور ان کا جھریوں زدہ ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔

”حکم کیسا بیٹا۔ بس ایک التجا ہے۔“ انہوں نے اپنی بوڑھی آنکھیں شاور پر نکا دیں۔ شاور فوراً ہی سمجھ گیا۔

”میری بات نہیں مانے گا۔“ شاور کی گرفت ان کے ہاتھ پر ڈھیلی پڑی تو انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”وہ میرے دائر کی آخری نشانی ہے۔“ انہوں نے دل سوزی سے فقط ایک جملہ کہا۔

”وہ ہمارا اپنا خون ہے۔ بچے۔ تیرا دل ماننا ہے کہ وہ غیر ہاتھوں میں رہتی رہے۔“ ایک اور دل چیرتا جملہ۔ شاور نے لب بھینچ لیے۔

”میں مرنے سے پہلے اسے اپنے پاس دیکھنا چاہتی ہوں۔ اس کو گلے لگا کر اسے دائر کی خوشبو محسوس کرنا چاہتی ہوں۔“ اماں میٹھی کی اگلی بات نے شاور کو بھونڈ کر رکھ دیا۔

”اماں میٹھی۔ آپ کو اللہ لمبی حیاتی دے، آپ اس طرح مت بولیں۔ بابا سائیں کے جلفے کے بعد آپ ہی ہماری چھپر چھاں ہیں۔“ شاور نے ان کے ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگائے۔

”تو پھر اپنی چھپر چھاں کی بات مان۔ میری بچی کو میرے پاس لے آ۔“ اماں میٹھی پھل کر بولیں تو شاور نے بغور ان کے بچتے چراغ جیسے وجود کو دیکھا۔

”آپ فکر مت کریں اماں میٹھی! میں دائر بھا کی نشانی آپ کے پاس ضرور لے کر آؤں گا۔“ شاور نے مضبوط لہجے میں ہامی بھری۔ اماں میٹھی نے بے اختیار اس کو اپنے سینے سے لگالیا۔

”خوش رہو شاور۔۔۔ آباد رہو۔“ وہ لرزتی آواز سے دعائیں دینے لگیں اور شاور کی سوچ میں گم تھا۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے

بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

زرد موسم راحت جبین 1000/-

حساب دل رہنے دو نبیلہ عزیز 400/-

محبت من محرم سمیرا حمید 400/-

ایک تھی مثال رخسانہ نگار عدنان 500/-

یہ گلیاں یہ چوہ بارے فائزہ افتخار 400/-

دست میجا نگہت سیما 400/-

گل کہسار فرح بخاری 400/-

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی



☆☆☆

منال نے سیل سے ایک نمبر ڈائل کیا۔ پہلی ہی بیل پر فون اٹھالیا گیا۔

”ہاں منال! بولو کیا بات ہے۔“ عمیمہ کی مصروف آواز سنائی دی۔

”اس طرح بات کرتے ہیں۔ نہ سلام نہ دعا۔ بس منہ اٹھا کر بولو منال۔ جیسے میں ہی تم سے بات کرنے کو مری جا رہی ہوں۔“ منال نے دانت پیس کر کہا تو موبائل سے ایک قہقہہ برآمد ہوا۔

”یار! پیک ٹائم ہے۔ کسٹمرز کا رش لگا ہوا ہے۔ یقین کرو، دونوں ہاتھ مصروف ہیں اور تمہاری بات سننے کو سیل کندھے کے سہارے کان سے لگایا ہوا ہے۔“ عمیمہ نے توجہ پیش کی۔

”ہاں جی۔ بہت مصروف سستی ہو تم۔ دن کے جو بیسوں کھٹے تمہارے ہاتھ بھر گر، پڑا اودن میں رکھتے نکالتے گزرتے ہیں۔ ابھی تم چاٹ بنا رہی ہوتی ہو کبھی گول گپے اور.....“

”بس بس کیا بکے جا رہی ہو۔ میرے ساتھ میرے ہیلپر ز بھی کام کرتے ہیں۔ یونو میں ڈیشس ڈیلز کی آنر ہوں۔“ عمیمہ نے منال کی چلتی زبان کو بریک دے کر فخر سے کہا۔ ”اب جلدی سے کہو، کیا کام ہے۔ ٹائم نہیں میرے پاس۔“ پھر وہ اتر کر بولی۔

”اوہ..... ڈیشز ڈیلز کی مہارانی۔ یاد رکھو، تم ایک ابھرتی ہوئی مستقبل قریب کی مشہور ماڈل منال سے مخاطب ہو اس لیے اپنا لہجہ ذرا ہلکا رکھو۔“ منال نے ایک ادا سے کہا تو عمیمہ حیران ہوئی۔

”کیا تم نے اپنے ماڈلنگ کیریئر کو دوبارہ سے اشارت کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

”ہم..... ارادہ تو کچھ یہی بن رہا ہے۔“ منال کی بات پر عمیمہ اچھل پڑی۔

”واؤ۔ بہت اچھا فیصلہ۔ اس خوشی میں ڈیشس ڈیلز ڈیل پر آؤ۔ تمہیں اپنا اسٹیشنل بیک کر کے کھلاؤں۔“ اس نے کشادہ دلی سے آفر کی تو منال

مسکرائی۔

”ابو کے۔ میں نکلتی ہوں۔ بس شرط یہ ہے کہ تم سکون سے مجھے ٹائم دو گی۔“

”ارے آؤ تو..... ٹائم ہی ٹائم ہے تمہارے لیے۔“ عمیمہ نے محبت سے کہا تو منال نے وال کلاک پر نظر ڈالی اور وارڈروب سے اپنا ڈریس نکال کر واش روم چلی گئی۔

اگلے دس منٹ میں وہ گاڑی میں بیٹھی عمیمہ کی طرف جا رہی تھی۔ دالمان مال پہنچ کر وہ کپسول لفٹ میں چڑھی اور سیکنڈ فلور میں واقع فوڈ کورٹ کی طرف چلی آئی۔ منال ریسیپشن پر کھڑے اسٹاف سے ہیلو ہائے کرتی دروازہ کھول کر چلی آئی۔ عمیمہ حسب توقع مصروف دکھائی دی۔

”ہیلو ہیلو.....“ منال نے اودن پر جھکی عمیمہ کو کندھوں سے پکڑ کر کان میں زور سے کہا۔ عمیمہ اچھل پڑی۔

”بد تمیز منال!“ پھر اس نے منال کے گال سے گال ملا کر مصنوعی خفگی دکھائی۔

”جی تمیز دار اور سکھڑ عمیمہ!“ منال کھلکھلائی۔ عمیمہ نے پیزا نکال کر سلیب پر رکھا۔ گرم گرم پیزا دیکھ کر منال کے منہ میں پانی آ گیا۔

”چلو آؤ، پیزا اڑاتے ہیں۔“ وہ دونوں ہاتھ ایک دوسرے میں رگڑتی آگے بڑھی۔

”اونہوں۔ یہ کسی کا آرڈر ہے۔“ عمیمہ نے فوراً ٹوکا۔ منال برا سامنہ بنا کر رہ گئی۔

”دو منٹ صبر کرو۔ ہم بھی انجوائے کرتے ہیں۔“ عمیمہ منال سے کہہ کر جلدی جلدی کام نمٹانے لگی۔ منال کچھ دیر اس پارہ صفت لڑکی کو ادھر ادھر چکراتے دیکھتی رہی پھر بور ہو کر باہر کاؤنٹر پر آ کر کھڑی ہو گئی جہاں مخصوص یونیفارم پہنے لڑکے لڑکیاں آرڈر لے اور دے رہے تھے۔

”یہ دینا ذرا، دیکھوں تو کیسی لگتی ہے۔“ منال نے ایک لڑکی کی کیپ اتار کر اپنے سر پر پہن لی اور خود کو شوکیس کے شیشے میں دیکھا۔



گلابی رنگت۔ تیکھے کھڑے نقوش اور سنہرے بالوں پر براؤن کپ پہنے وہ مغربی لک دیتی نظر آ رہی تھی۔ خود کو آئینے میں بار بار اور بہانے بہانے سے دیکھنا اس کا دل پسند مشغلہ تھا۔ لیکن یہ بات کچھ ماہ پہلے کی تھی۔ اب تو وہ کتنے ہی دن آئینہ ہی نہ دیکھتی تھی۔ مئی کے بقول وہ مغل شہزادیوں کے جیسے حسن کی مالک تھی۔ اور فیض راجا کا کہنا تھا کہ ”منال میں اسکرین بیوی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے یہ براہ راست جتنی خوب صورت نظر آتی ہے۔ اسکرین کے پردے پر اس سے دو گنی حسین دکھائی دیتی ہے۔“ مئی فیض راجہ کی باتوں پر فخر سے مسکراتی تھیں۔ منال کو شیشے میں مئی کی پرچھائیں مسکراتی نظر آئی۔ منال کی آنکھیں بھگ سی گئیں۔ وہ ایک دم پیچھے ہٹی۔

”ایسکویزی مس!“ ایک بھاری آواز نے اسے متوجہ کیا۔ منال نے کاؤنٹر کے دوسری طرف نگاہ کی۔ ایک دراز قد وجہ بندہ سامنے کھڑا تھا۔

”جی۔“ اس نے تیزی سے پلکیں جھپکا کر آنکھوں سے بہتا پانی اندر دھکیلا۔

”یہ ڈیل چاہیے۔“ اس بندے نے اسے بغور دیکھتے منال کے پیچھے چلتی اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔ منال نے مڑ کر تھوڑا سا اٹھا کر دیکھا پھر واپس پلٹی۔

”اچھا۔“ اس نے اپنی کپ اتار کر کاؤنٹر پر رکھی اور اپنے سنہرے شولڈر کٹ بال ہاتھ سے سنوارنے لگی۔

”غالباً اس کپ کی وجہ سے یہ مجھے سرونگ کر ل سمجھ رہا ہے۔“

”مس! جلدی کریں۔ رسید (پرچی) کاٹیں۔“ وہ اس کی بے نیازی پر چیں بہ جیں ہوا۔ منال نے دائیں طرف نظر کی۔ اسٹاف کے لڑکے لڑکیاں دوسرے کسٹمرز کو ڈیل کرتے نظر آئے۔

”آپ دیت کریں۔ حراپلیز ان کو ڈیل کرو۔“ وہ ایک لڑکی سے کہہ کر خود ادھر سے باہر نکل آئی اور سامنے پڑی ایک خالی میز کی کرسی بچھ کر بیٹھ گئی۔

”عمیمہ کے بھی طریقے ہیں مجھے بلوا کر خود مصروف ہو جاتی ہے۔“ منال نے کہنی میز پر رکھ کر اپنی کھوڑی ہتھیلی پر ٹکادی۔ وہ بندہ مڑ کر اسے دیکھ رہا تھا۔ منال کے نقوش تن سے گئے۔ پھر وہ اجنبی غالباً اپنا آرڈر نوٹ کروا کر چلتا ہوا اس طرف آیا اور منال کے پاس والی میز منتخب کر کے بیٹھ گیا۔ اب بھی اس کی نگاہ منال پر تھی۔

دیکھنے میں تو تہذیب یافتہ لگتا ہے۔ دیکھ کیسے رہا ہے۔ بدتمیز۔ منال نے غصے سے سوچا۔

”تاخیر کی معذرت۔“ عمیمہ کی آواز پر وہ ادھر متوجہ ہوئی۔ عمیمہ ایک لے کر سامنے کھڑی تھی۔

”یہ زیرہ اور بادام اسٹیشنل ایک ہے۔ خاص تمہارے لیے۔ تمہارے کیریئر کی دوبارہ شروعات کی خوشی میں۔“ وہ ایک میز پر رکھ کر کرسی پر بیٹھی۔

”اب کھاؤ گی، منہ کیوں بنایا ہوا ہے۔“ عمیمہ نے ایک پیس کاٹ کر اسے پیش کیا۔

”کھا رہی ہوں۔“ منال نے پیس منہ میں ڈالا۔ ایک کاذا نقہ لا جواب تھا۔

”ایک تو زبردست بنایا ہے۔“

”آخر دوست کی محبت میں بنایا ہے۔“ عمیمہ فوراً بولی تو منال مسکرا دی پھر سامنے نظر گئی تو مسکراہٹ کٹی۔

اجنبی بندہ دلچسپی سے دیکھے جا رہا تھا۔

”کچھ لوگ کتنی دل جمعی سے کھورتے رہتے ہیں۔ شرم نہیں آتی۔“ منال بڑبڑائی تو عمیمہ نے اس کی نظروں کا پیچھا کیا۔

”دیکھنے دو، تمہیں کیا۔ تمہیں تو ایز آ ماڈل اب سارا زمانہ ہی دیکھے گا۔“ پھر عمیمہ نے کندھے اچکائے تو منال کو برا لگا۔

”کیا مطلب ہے۔ اسکرین کے پیچھے اور براہ راست پاگلوں کی طرح دیکھنے میں کوئی فرق نہیں ہے کیا۔“

”غلط نہیں کہہ رہی۔ ایک تو صورت حسین پھر ڈرینک سینس اس پر میڈیا پر سنائی۔“ وہ وضاحت



کرتی مزید بولی تھی۔

”خیر میڈیا پر سنائی تو فی الحال نہیں ہوں۔ دو ایڈ کر لینے سے کون یاد رکھتا ہے۔“ منال نے کیک کا ایک اور پیس چکھا۔

”دو اور کر لو، دیکھنا کیسے مشہور ہوتی ہو۔ تم میں بیوٹی بھی ہے اور ٹیلنٹ بھی۔“ عیسہ کی بات پر منال خاموش رہی۔

”میں ڈیسا نڈ نہیں کر پار ہی کہ مجھے میڈیا میں دوبارہ اثر ہونا چاہیے یا نہیں۔“ پھر وہ ابھٹکن زدہ انداز میں چمچہ پلیٹ میں گھمانے لگی۔

”ارے کیوں نہیں اثر ہونا چاہیے۔ تمہاری تو فیملی ہی اتنی فیس ہے، منٹوں میں کام بھی ملے گا اور مشہوری بھی۔ ہوتی کوئی عام بندی تو جوتے جٹھانے پڑتے کام کے لیے۔“ عیسہ نے فوراً کہا۔ منال ہونٹ کاتے ہوئے بدستور سوچ میں ڈوبی رہی۔

”ویسے یہ بندہ بھی دیکھنے کے قابل ہے۔ اس کو بھی میڈیا میں چانس دلوا کر اس کا بھلا کر دو۔ بے چارہ تمہیں دیکھتا بھی رہے گا اور مشہور بھی ہو جائے گا۔“ عیسہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے مذاقاً بولی۔

منال نے نظر اٹھائی۔ وہ اجنبی اب بھی اسے دیکھ رہا تھا۔ منال نے نگاہ پھیر لی۔ وہ خوب صورت تھی اور سنائی نظروں کی عادی بھی۔ مگر اس اجنبی کا دیکھنا اسے نجانے کیوں بے چین کر رہا تھا۔

”اب اس سیڈ فیر سے نکلو ڈیر۔“ عیسہ نے منال کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دیا۔

”ہم۔“ منال نے ایک گہرا سانس لیا۔

”تم کہاں چلیں۔ تمہیں تو مجھے کہنی دینی ہے۔“ وہ عیسہ کو غلت میں دیکھ کر بولی۔

”ہاں مگر پاپا کی انٹری ہو گئی ہے۔ وہ مجھے اب اطمینان سے بیٹھا دیکھیں گے تو غصہ ہوں گے۔“ وہ دھیمی آواز میں اشارہ کر کے بولی تو منال نے دیکھا اس کے پاپا خراماں خراماں آتے دکھائی دیے۔

”آف۔ تم بھی نا۔ کس قدر انکل سے ڈرتی ہو۔ میں جاری ہوں بس۔“ منال نے منہ پھلا کر

پرس اٹھایا اور کھڑی ہوئی۔

”ارے کیک تو صبح سے کھا کر جاؤ یا پیک کر دو دوں، گھر لے جاؤ۔“ عیسہ نے سہیلی کو ناراض دیکھ کر پریشانی محسوس کی۔

”نہیں، بس کھالیا جتنا کھانا تھا اور اب میں ادھر نہیں آؤں گی، تم خود میرے گھر آنا۔ یہاں تو تمہیں کبھی فراغت نہیں ملنی۔“ منال نے اس کے گال سے گال مس کیا اور خدا حافظ کہتی تیز قدم اٹھا کر وہاں سے نکل آئی۔

☆☆☆

”الف انب (آم) ب بدک (بلخ) ب۔۔۔۔۔ ب بھاجائی۔“ مہراں نے قاعدہ ہاتھ میں پکڑ کر مل مل کر سبت یاد کر رہا تھا جیسے ہی سامنے نظر پڑی چالاکی سے الفاظ بدل دیے۔

”ب بھاجائی۔“ سوہائی کے قریب آنے پر اونچی آواز سے پھر بولا تو وہ لب دبا کر مسکرا دی۔

”جل ہٹ شریر۔“ وہ مل کھا کر اپنے رنگ برنگے پراندے کو اٹکیوں میں لپیٹنے لگی۔

”جی سوہائی ادی۔ اس گھر میں تو آپ ہی چلتے پھرتے جیتی ہو۔ وہ فرنگی اڈی تو بالکل اچھی نہیں لگتی۔“ مہراں نے فوراً مسکھ لگا یا تو سوہائی کھلکھلائی۔

”اس کا ساگ ادھر گئے گا بھی نہیں۔ سارا وقت چہرے کو پالش کرتی رہتی ہے یا سوناگل پر انگوٹھا نچالی ہے۔ بانی کسی کی ذرا جو فکر ہو۔“ سوہائی نے ناک چڑھا کر کہا۔

”نہ ادی! اس دن ادا کے لیے کچن میں کھس کر کیا حرنے مڑے کی بدلی ڈشیں بنائی تھیں۔ جی بہت سوادہ تھیں۔“ مہراں کی بات پر سوہائی چونکی۔

”کب بنایا کھانا اس نے۔ مجھے خبر کیوں نہ ہوئی۔“

”ادی آپ جب ٹنڈو آدم گئی ہوئی تھیں تب فرنگی ادی نے رسوئی سے لال دین کو نکال کر ساری کوکک خود کی۔“ مہراں نے آنکھیں نچا کر مزید بتایا۔



”شاور نے اس چڑیل کے ہاتھ کا پکا کھایا  
کیا۔“ سوہائی کے سوال پر مہراں کھلکھلایا۔

”نا صرف کھایا بلکہ بہت تعریف بھی کی۔“  
”ہائے میری ماں۔“ سوہائی نے دل پر ہاتھ  
رکھا۔

”بے خیال کے! یہ تو مجھے آج بتا رہا ہے۔“ وہ  
مہراں پر غصہ ہوئی۔

”دیکھو ادی! میرے کو کچھ مت کہو۔ ایک تو  
آپ کی مدد کرتا ہوں قدم قدم پر، پھر بھی مجھے سنا  
ہو۔ جاؤ میں نہیں بولتا۔“ مہراں نے بازی پلٹتے دیکھ  
کر منہ پھلایا۔

”ارے تو تو میرا سوہنا ہے۔ مجھے تو حینا مینا پر  
تپ چڑھ رہا ہے۔ بڑی آئی فرنگن۔ بال رنگے اور  
پٹر پٹر انگریزی بولنے سے کوئی انگریز نہیں ہو جاتا۔“  
وہ منہ بنا کر بولی۔

”وہ آسٹریلیا میں رہتی ہیں ادی۔ وہیں پلی  
بڑھی ہیں۔ انگریز تو ہو میں نا۔“ مہراں کی بات پر  
سوہائی نے اس کو ایک دھپ لگائی۔

”چل ہٹ۔ خاندان تو یہی ہے۔ پیدا تو  
گاؤں میں ہوئی تھی۔ اب بھلا ماضی کون دیکھتا ہے  
ادی۔“ مہراں نے مدِ تجربہ بن کر کہا۔

”اس کا خواب ہے شاور کو اپنے ساتھ بدلیں  
لے جانا جو بھی پورا نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنی زمین، اپنی  
جڑوں سے جتنی محبت کرتا ہے۔ ہمیشہ کے لیے اپنا  
دیس چھوڑ کر کہیں نہیں جاسکتا۔“ سوہائی نے ایک  
آنکھ سنکڑ کر فخر سے کہا۔

”لو آپ جانتی بھی ہو ادی! پھر بھی حینا ادی  
سے جلتی ہو۔“ مہراں بے ساختہ بول کر چھتایا سوہائی  
نے اسے کڑی نظر سے گھورا۔

”جلتی ہے میری جتنی۔ مجھے تو اس کی حرکتوں پر  
اعتراض ہے۔ یہ جو آگے پیچھے پھرتی ہے نا اس کے۔  
یہ کس حساب میں۔“

”چلو دل نہ جلاؤ آپ۔ شاور ادا کہہ چکے  
ہیں۔ چاچی کا خصوصی خیال رکھنا ہے۔ ان کو دوا اور

پر ہیزی کھانا وقت پر دینا ہے۔“

”ہاں جی۔ کام کے وقت ان کو سوہائی مادرہتی  
ہے ہک ہا۔ دیے ۱۰ گئے کہاں ہیں۔“ سوہائی نے  
پوچھا تو مہراں نے کندھے اُچکائے۔

”شاید کسی ضروری کام سے شہر گئے ہیں۔“

”تب تک حد شہزادی کیا کرے گی۔ کمرہ بند  
کر کے بیٹھی رہے گی۔ بقول اس کے ہمارے گاؤں  
کی ہوا اسے اس نہیں۔ اسکن خراب ہوتی ہے الرجی  
لگتی ہے نوابی بیگم کو۔ اتنا دکھاٹھا کر پھر رہنا کیوں۔  
دفع دور ہونا ادھر سے۔“ سوہائی نے ناک چڑھا کر  
کہا۔

”جانے دوا دی! بس آپ خوش رہو۔ پتا ہے  
پریشانی کرنے سے چہرہ بوڑھا دکھنے لگتا ہے۔“  
مہراں کی ایک اور ماہرانہ بات پر سوہائی نے جھرجھری  
لی۔

”ایسا کیا۔“  
”اور کیا۔ آپ بھی زیادہ نہ سوچا کرو الٹا سیدھا  
پھر پریشان ہو جاتی ہو نا۔“ مہراں کی ہمدردی پر  
سوہائی قربان سی ہو گئی۔

”نہیں سوچوں گی اب۔ آجا میرا راجا بھائی  
میں تجھے اپنے ہاتھوں سے بسری بنا کر کھلاؤں۔“ وہ  
دلار سے بولی تو مہراں قاعدہ رکھ کر خوشی سے کھڑا  
ہو گیا۔

☆☆☆

”گریٹ! تو تم تیار ہو ماڈلنگ کے لیے۔“  
”فیب راجا کی چہکتی ہوئی آواز اسپیکر سے ابھرنی۔“  
”ہمم۔۔۔ سوچا تو ہے۔“

”ارے سوخنے میں وقت ضائع نہ کرو۔ ایک  
مشہور موبائل سم کمپنی کے لیے ایڈ تیار کرنا ہے۔ ان کا  
مینگ ڈائریکٹر فریش اور ٹیلنڈ فی میل ماڈل کی  
تلاش میں ہے۔ میں تمہاری ملاقات کروادیتا ہوں اس  
بندے سے۔ اگر تم پسند آگئیں تو قسم سے دو تین سال  
کے لیے سمجھو بک ہو گئیں ان کے ایڈز کی ماڈلنگ کے  
لیے۔“ فیب نے حسی انداز میں کہا۔ ”پھر کب سنگ



ارتج کرواؤں؟“ وہ سرسوں جمانے کو بے چین تھا۔  
”اس دیک اینڈ پر رکھ لیتے ہیں۔“ منال گہرا  
سانس لے کر بولی۔

”جھجک کیوں رہی ہو یار! بچپن سے تو  
انڈسٹری اور اس کا ماحول دیکھ رکھا ہے۔ کچھ نہ کچھ کام  
بھی کر رکھا ہے۔“ بالآخر وہ اس کی جھجک بھانپ گیا  
تھا۔

”میں نے ایز آئیڈونچر کام کر لیا تھا اور نہ تم اچھی  
طرح جانتے ہو، ماما میرے میڈیا میں انٹر ہونے سے  
کتنی خفا ہوئی تھیں۔ ان کا ارادہ مجھے میڈیسن  
پڑھانے کا تھا۔“ منال نے وضاحت کی۔

”ہاہا..... میڈیسن پڑھ کر کیا کرو گی بے بی۔  
اپنا حسن اور جوانی ان پانچ سالوں میں گنوا دو گی۔  
یہی وقت ہے جب تمہاری ڈیماٹڈ ہو سکتی ہے۔ پھر  
کئی عمر میں کون پوچھے گا۔“ وہ قہقہہ لگا کر بولا تو اس کی  
بات منال کو انتہائی ناگوار گزری۔

”میری اپیا کا کیریئر پندرہ سال چلا تھا وہ  
حیات ہوئیں تو اب بھی پاکستان کی موسٹ فیورٹ  
اینڈ ڈیماٹڈ ماڈل ہوئیں۔“ منال نے چیخ کر کہا۔

”ارے وہ ٹین ایتج سے اس فیلڈ میں آئی اور  
اپنا ایک مقام بنالیا۔ ظاہر ہے ایسی بندی کو کون بیٹ  
کر سکتا ہے۔ تم تو آنا ہی نہیں چاہتیں اس طرف.....

ابھی سے کام کرو گی تو نام بنے گا نا۔ پھر جو میڈیسن  
کر کے ناکام ہاتھ لیتی آؤ تو کون پوچھے گا۔“

”تو کس نے کہا، میں میڈیسن میں ناکام ہو کر  
ہاتھ ملوں گی۔“ منال زچ ہوئی۔

”یار! یہ تمہاری فیلڈ ہی نہیں ہے۔ تمہیں اس  
میں پیر جمانے میں سالوں لگ جائیں گے۔ تم وہ  
فیلڈ اپناؤ جس میں تمہاری فیملی کامیاب ہو چکی

ہے۔ اور اسی حوالے سے تمہیں بھی بہترین چانس مل  
سکتے ہیں۔“ منیب راجا بھی اکتا کر بولا۔

”اوکے اس دیک اینڈ پر دیکھوں گی۔“ منال  
نے بے نیازی سے کہا۔

”کیا دیکھو گی۔ وہ بندہ کوئی فارغ ہے جو

تمہاری ملاقات کے آسرے پر بیٹھا رہے گا۔“ منیب  
کا ضبط ختم ہوا۔

”اچھا ارتج کروا لو میٹنگ۔“ منال کچھ سوچ  
کر بولی تو منیب راجا ایک دم خوش ہوا۔

”یہ ہونی نا بات۔ کمنگ سنڈے شام پانچ  
بجے ٹھیک رہے گا۔“ وہ چہکا۔

”اوکے۔“ منال نے کہہ کر فون کاٹ دیا۔  
☆☆☆

شناور نے گیٹ پر کھڑے کھڑے سر ہونچا  
کر کے دیکھا۔ بنگلہ بہت خوب صورت اور جدید طرز  
کا بنا ہوا تھا۔ اس نے کال بیل پر انگلی رکھی۔ کچھ دیر

بعد گیٹ سے ملحقہ کھڑکی سے سر نکال کر چوکیدار نے  
اس کا نام اور آنے کا مقصد پوچھا۔

”مجھے منال حسن سے ملنا ہے۔ ان سے کہو  
داور لغاری کا بھائی شناور آیا ہے۔“ وہ مضبوط لہجے میں  
بولا تو چوکیدار نے کھڑکی بند کر دی۔ کچھ ہی دیر بعد

گیٹ وا ہوا۔  
”آجائے۔“ ایک نو عمر لڑکا اسے لے کر  
آراستہ و پیراستہ ڈرائنگ روم میں چلا آیا۔

شناور نے صوفہ پر بیٹھ کر چاروں طرف نظر  
دوڑائی۔ سامنے ہی دیوار پر بڑی داور بھائی اور نوال کی  
شادی کی ان لارج تصویر اس کی نظروں کی گرفت

میں آئی تو شناور کا دل دکھ سا گیا۔ اس تصویر کے برابر  
میں ایک اور قد آدم تصویر ایک پروتار اور حسین عورت  
کی تھی جو غالباً منیرہ حسن تھیں۔ اپنے دور میں فلم

انڈسٹری پر راج کرنے والی ایک خوبصورت  
اداکارہ۔ شناور نے قدموں کی آہٹ پر گردن  
موڑی۔ منال کے قدم وہیں ٹھہر گئے۔

”السلام علیکم۔“ شناور نے سلام کرنے میں  
پہل کی۔

”وعلیکم السلام۔“ منال کی پیشانی پر ہلکی سی  
سلوٹ ابھری۔

یہ تو وہی بندہ تھا جو اس دن ڈائریکٹر ڈیل پر نظر آیا  
تھا۔



”جی کہیے۔“ وہ صوفہ پر بیٹھتی فارل انداز میں بولی۔

”میرا نام شاور لغاری ہے۔ میں مرحوم دادر لغاری کا چھوٹا بھائی ہوں۔“ شاور نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہم۔“ منال نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

”میری اکلوتی بھتیجی نیمل آپ کے پاس ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ لے جانے آیا ہوں۔“ شاور نے بغیر لگی لپٹی کے کہا تو منال کی پیشانی کے بل مزید بڑھے۔

”کس حق سے آپ اسے لینے آئے ہیں۔“ اس کا لہجہ تن گیا۔

”حق تو بڑا ہے منال بی بی! سگا چچا ہوں میں اس کا۔“ شاور نے جواب باز وردے کر کہا۔

”اوہ۔ اب یاد آیا ہے آپ کو نیمل اور اپنے درمیان کا یہ سو کا لڈ رشتہ۔“ منال کا طنزیہ لہجہ شاور کو چبھا۔

”نیمل اور میرے درمیان یہ مضبوط رشتہ ہے اور رہے گا۔ رہی بات یاد آنے کی تو میرے بھائی کی وفات کے بعد وہ غیر ہاتھوں میں آگئی ہے اسی لیے مجھے اسے اپنی تحویل میں لینے یہاں آنا پڑا۔“ شاور نے مضبوط لہجے میں جتایا تو منال سلگ اٹھی۔

”کون سے غیر ہاتھ۔ میں سگی خالہ ہوں نیمل کی۔ اس نے آنکھ ہی اس گھر میں کھولی ہے۔ یہیں اپنی بڑی اور ملی ہوئی ہے۔ آپ لوگوں نے اس کے باپ کو ہی اپنی زندگی سے بے دخل کر دیا تو اب اس پر کیا حق جتانے آئے ہیں۔“

”وہ لغاری خاندان کا خون ہے منال بی بی! اس بات سے آپ انکار نہیں کر سکتیں۔“ شاور کی بات پر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آپ مہربانی فرما کر یہاں سے چلے جائیں۔ آپ کو اندر بلوا کر عزت سے اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھانے کا یہ مطلب نہیں کہ آپ کی ہر بات

مان لی جائے۔“ منال نے درشتی سے کہا تو شاور کا چہرہ سرخ ہوا۔

”مجھے عزت اللہ نے پہلے ہی سے دی رکھی ہے۔ آپ کے ڈرائنگ روم میں بیٹھنے سے قبل بھی میں عزت دار تھا۔“ وہ بھی اپنی نشست سے اٹھا اور دو قدم آگے بڑھا۔

”نیمل کو تو میں اپنے ساتھ اس کے اصل گھر لے ہی جاؤں گا۔ چاہے اس کے لیے مجھے عدالت سے کیوں نہ رجوع کرنا پڑے۔“ منال کے کانوں میں صور پھونک کر وہ دروازے کی طرف بڑھا۔

”من مال۔ من مال۔“ اچانک نیمل اپنے مخصوص انداز میں اسے پکارتی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی دروازے سے اندر آئی۔ عجلت ایسی تھی جیسے آیا سے جان چھڑا کر بھاگی ہو۔ شاور نے چونک کر اس پیاری سی بچی کو دیکھا۔

”نیمل! میری جان۔“ منال نے جھٹ اسے گود میں اٹھانے آگے بڑھی۔

”نیمل۔“ اس سے پہلے شاور نے جھک کر نیمل کو بانہوں میں اٹھالیا۔ وہ ہو بہو دادر کی کاپی تھی۔ شاور نے بے اختیار اس کے گال کو چوم لیا۔ دوسری طرف نیمل ایک اجنبی کی گود میں بے آرام ہو کر رونے لگی۔

”نیمل! ادھر آؤ میری جان۔“ منال نے جھپٹ کر نیمل کو شاور کی گود سے لیا۔ اس کا لہجہ پاکر نیمل خاموش ہو کر منال سے لپٹ گئی۔

”آپ اب حاسکتے ہیں۔“ منال نیمل کو تھمکتی شاور کو کڑی نظر سے دیکھ کر بولی۔

”فی الحال جارہا ہوں۔ پر کل پھر اپنے وکیل کے ساتھ آؤں گا۔“ شاور کا لہجہ دھمکی آمیز تھا۔

”میری نیمل کو مجھ سے ٹھہرنے کو تو دکھاؤ۔“ منال اس کی دھمکی پر بھراٹھی۔

”میری والدہ بیمار ہیں اور بستر پر پڑی ہیں۔ ان کو اپنے مرحوم بیٹے کی نشانی کو اپنے سینے سے لگانا ہے۔ اس لیے یاد رکھو، زیادہ سے زیادہ آج کی رات



نیمل تمہارے پاس ہے۔ کل ہر حالت میں اسے میرے ساتھ جانا ہے۔“ شاد نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

”خواجہ! آپ کی والدہ نے بیٹے کو بھلا دیا تو پتی کو کیوں یاد کر رہی ہیں۔ آپ بس جائیں یہاں سے۔ نیمل کہیں کسی کے ساتھ نہیں جائے گی۔“ منال نے نیمل کو خود سے بچھین کر سختی سے کہا۔

”منال! کیا بات ہے بیٹا۔“ شمسہ ان کی اونچی آوازوں پر بوکھلا کر اندر آئیں۔

”آئی! یہ داور ججو کے بھائی ہیں۔ ججو کے جانے کے بعد ان کی محبت بچہ کی لیے اہل کر نکلی ہے۔ یہ ادھر نیمل کو ہم سے ہمیشہ کے لیے چھین کر لے جانے آئے ہیں۔ مجھے قانون کی دھمکیاں دے رہے ہیں حضرت۔“ منال نے طنزیہ انداز میں ان کو بتایا۔

”نیمل کو تو میں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔“ شاد نے قطعی لہجے میں کہا۔

”اچھا۔ لے جا کر تو دکھائیں۔“ منال چیخ کر بولی۔ شمسہ آنٹی نے گھبرا کر دونوں کو دیکھا۔

”بے فکر رہو، تھرڈ پراپر چیمل نیمل اپنے دو حمال جائے گی۔ دنیا کا کوئی قانون اسے تمہارے پاس نہیں رہنے دے سکتا جبکہ اس کی دادی اور چچا موجود ہوں۔“ شاد نے جتایا۔

”ارے بیٹا ٹھنڈے رہو۔ آؤ ادھر بیٹھو۔“ شمسہ نے شاد کو کہا۔

”جی نہیں شکریہ۔“ شاد خشک لہجے میں کہہ کر ڈرائنگ روم سے نکل گیا۔

”بیٹا! بات تو سنو۔“ وہ لپکتی ہوئی شاد کے پیچھے گئیں۔

”جی کہیے۔“ شاد پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر یرہم تاثرات سے رکا تھا۔

”بیٹا! منال بچی ہے اس کی باتوں سے دل برا مت کرنا۔ وہ بہت پیار کرتی ہے نیمل سے، اپنی جان سے، بڑھ کر عزیز ہے اسے۔ وہ اس بچی سے

جدا کی تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اسی لیے جذباتی ہو گئی ہے۔ ماں، بہن، بہنوئی اتنے قیمتی رشتوں کو کھویا ہے۔ اب تو صرف نیمل ہی اس کے جینے کا سہارا ہے۔“ شمسہ روانی سے بولتی چلی گئیں۔ شاد رسپاٹ چہرہ لیے ایسے کھڑا تھا جیسے یہ باتیں اس کے لیے بے معنی ہوں۔

”بیٹا! ٹھنڈے دل سے یہ باتیں سوچو تو آپ کو منال کا جذباتی پن برا نہیں لگے گا۔ بچی آپ کا خون ہے، آپ کی ہی رہے گی۔ مگر اس طرح چھین کر لے جانا مناسب نہیں ہے۔“ شمسہ آنٹی رساں سے بولیں تو شاد کے تنے اعصاب کچھ ڈھیلے پڑے۔

”میری ماں کینسر جیسے موذی مرض سے لڑ رہی ہیں آنٹی۔ ان کی خواہش ہے کہ داور بھائی کی نشانی آخری وقت میں ان کے پاس ہو۔ اور مجھے اپنی ماں کی خواہش کا احترام ہر حال میں کرنا ہے۔ میں کسی انتہا تک خود نہیں جانا چاہتا۔ بہت مناسب لفظوں میں منال سے میں نے نیمل کو لے جانے کی بات کی مگر وہ بھڑک اٹھیں۔“ شاد نے اس بار نرم لہجے میں تو ہیرہ دی تو شمسہ نے سر ہلایا۔

”اللہ آپ کی ماں کو صحت دے۔ زندگی دے۔ وہ دادی ہیں، بہت بڑا حق ہے ان کا نیمل پر۔ آپ بے فکر ہیں، میں منال کو سمجھا بچھا کر نیمل کو آپ کے ساتھ دادی سے ملنے بھجوا دوں گی۔“ شمسہ نے بھرپور یقین دلایا تو شاد نے ایک سانس سچھی۔

”مگر بیٹا! آپ اس کو کچھ وقت کے لیے لے جاؤ گے یا ہمیشہ کے لیے؟“ پھر انھوں نے جھجک کر پوچھا۔

”آف کورس ہمیشہ کے لیے نیمل ہمارے پاس رہے گی۔ ادھر کون رہ گیا ہے اس کا۔“ شاد نے گندھے اچکا کر کہا تو شمسہ کا منہ اتر گیا۔

”منال اس کی سگی خالہ ہے۔ نیمل کی ماں نے وصیت کی تھی کہ نیمل کو اب تم نے ہی سنبھالنا ہے۔“ وہ دھیمی آواز سے بولیں تو شاد کے ماتھے پر سلوٹ



پڑی۔

”اور منال کی شادی کے بعد نیکل کا کیا ہوگا۔  
وہ اپنی فیملی بنائے گی یا نیکل کی کیئر کرے گی۔“ شاد اور  
کی بات میں دم تھا۔ شمسہ جیسی ہو گئیں۔

”بہر حال آپ منال کو سمجھا دیں، کل میں  
نیکل کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا، اوکے۔“ شاد نے  
عجلت سے کہہ کر قدم آگے کی طرف بڑھائے۔

پچھے شمسہ تذبذب کا شکار ہو کر کھڑی رہ گئیں۔

☆☆☆

”کیا کہا۔ کل وہ میری نیکل کو مجھ سے چھین  
کر لے جائے گا۔ اتنی ہمت اس کی۔“ منال تو سنتے  
ہی ہتھے سے اکھڑ گئی تھی۔

”بیٹا! دھیرج رکھو۔ دھیال کا بڑا حق ہے۔ تم  
خالہ ہو، آج کنواری کل بیای۔ قانون تمہیں بہن کی  
پہچانی رکھنے نہیں دے گا اس صورت جبکہ نیکل کے  
دھیال کی خواہش اس کی پرورش کی ہو۔“ شمسہ نے  
منال کو سمجھایا۔ ”تم کسی صورت دادی اور چاچا کے  
مضبوط رشتے کے آگے مزاحم نہیں ہو سکتیں۔ اسی لیے  
میری بات مانو، یہ کورٹ پچھری کے معاملے میں  
پڑنے کے بجائے نیکل کو اپنے چچا کے ساتھ جانے  
دو۔ ویسے بھی آخری فیصلہ تو ان کے حق میں ہونا  
ہے۔“ انھوں نے مزید کہا تو منال کی مٹھیاں بکھج  
گئیں۔

”میں ایسا نہیں کر سکتی شمسہ آئی۔ نوال باجی  
نے مجھے نیکل کو اچھے سے سنبھالنے کی وصیت کی  
ہے۔“

”کیا تمہارے پاس وہ وصیت کا تندی صورت  
میں موجود ہے؟“ شمسہ کے سوال پر منال نے نفی میں  
سر ہلایا۔

”قانون ثبوت مانگتا ہے بیٹا! تمہاری ماں کے  
ساتھ پچیس سال بتائے ہیں۔ اس کی زندگی کے آثار  
حڑ حارہ میں اس کے ساتھ رہی ہوں۔ اتنی سیانی تو  
ہو گئی ہوں کہ معاملات کو گہرائی میں پرکھ سکوں۔ اس  
معاملے میں ہماری تمام تر مزاحمت بے کار جائے

گی۔ نیکل جن کا خون ہے، ان کو ہی سوچنی ہوگی۔“  
”شمسہ آئی! آپ مجھے نیکل کو اس کے

دھیال کے حوالے کرنے کا کہہ رہی ہیں۔“ منال  
نے جیسے صدے میں گھر کر انھیں دیکھا۔ ”آپ نے  
خود کہا کہ میری ماما کے ساتھ زندگی گزاری ہے آپ  
نے۔ ہمارے گھر کی ہر بات سے واقف رہی ہیں۔  
نوال باجی کو کس طرح داور بھائی کے بابا نے ڈس  
اون کیا تھا۔ کتنی بے عزتی کی تھی ان کی۔ داور بھائی  
نے پھر مڑ کر اپنے خاندانی طرف نہیں دیکھا۔ وہ  
ہمیشہ کے لیے ادھر اس گھر میں نوال باجی کے ساتھ  
بس گئے۔“ وہ ذرا۔ سانس لینے کو رکھی۔

”انھوں نے اپنی فیملی سے ہر طرح کا تعلق توڑ  
لیا تھا۔ آپ نے کبھی ان کو اپنے خاندان کے کسی فرد  
کے بارے میں بات کرتے دیکھا۔ نہیں نا۔ پھر  
اب ان کے جانے کے بعد ہم ان سٹی اٹھب انسانوں  
کو ان کی بیٹی سوئپ دس؟ وہ اگر زندہ ہوتے تو کبھی  
ایسا نہ کرتے۔“ منال کی آواز پھٹ سی گئی، اس کی  
آنکھوں میں پانی تیر رہا تھا۔ شمسہ نے بے اختیار  
لسے گلے سے لگایا۔

”میں سب جانتی ہوں بیٹا۔ ہر جہ سے واقف  
ہوں۔ پر داور کے جانے کے بعد اس کے بابا کا  
استعمال ہو گیا ہے۔ جو اس شادی کے سب سے بڑے  
خالف تھے اور اس کی ماں سرطان جیسے موذی مرض  
سے لڑ رہی ہے۔ اس کی آخری خواہش نیکل کو اپنے  
پاس دیکھنے کی ہے۔“ انھوں نے رساں سے تفصیل  
بتائی تو منال کی آنکھیں چمکیں۔

”وہ نیکل کو ناراضی طور پر لے جاتا چاہتا ہے۔  
مطلب اپنی ماں سے طوا کر واپس کر دے گا۔“ منال  
کے مصوم سے سوال پر شمسہ آئی نے ایک سانس  
بھری۔

”نہیں۔ وہ نیکل کو ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ  
لے جائے گا۔“

”کیا۔ ٹھیک ہے پھر میں اپنا وکٹس بائر کرتی  
ہوں۔ وہ اگر قانون کے ذریعہ نیکل کو مجھ سے چھینا



ماہتا ہے تو میں بھی قانون کے ذریعہ نیکل کو جیتوں گی۔“ منال ہل کر بولی۔

”ارے اتنی دیر سے یہی تو سمجھا رہی ہوں بیٹا۔۔۔ کہ ان کا حق نیکل پر ہم سے زیادہ ہے اور عدالت بھی ان کے حق میں فیصلہ دے گی۔“ شمسہ نے منال کے جذباتی پن پر سر ہنسا۔

”خواتنخواہ۔ میں آخر تک نیکل کے لیے لڑوں گی۔“ منال ضدی لہجے میں بولی۔

”تم ابھی کم عمر اور نا تجربہ کار ہو منال۔ یہ دنیا بہت کالیاں ہے۔ ہماری پوزیشن اب پہلی سی نہیں رہی۔ وہ بااثر جاگیردار لوگ ہیں۔ ہم ان سے لڑ نہیں سکتے پگھی۔ پیسے کا ضیاع الگ اور جھل خواری الگ۔ نوال اور داد اور لغاری کی لو میرج اور بعد کے بگڑتے حالات کی کوریج جس طرح میڈیا نے کی تھی۔ مہینوں تک اس کے چٹخارے لیے گئے۔ نیزہ آپا کتنا پریشان ہوئی تھیں۔ یاد ہے نا تمہیں۔ ان کے حاسدین کیسے خوش ہوتے تھے۔ اب پھر سے تم اس کی وجہ سے دنیا کی نظروں میں آ جاؤ گی۔ پھر سے وہی خواری جھپٹنی پڑے گی۔ تمہارے کیریئر پر بھی برا اثر پڑے گا جو ابھی ٹھیک سے شروع بھی نہیں ہوا۔“ شمسہ آنٹی نے یاد دلایا تو منال کچھ دیر کو خاموش رہ گئی۔

”میں اپنی نیکل سے کسی صورت دست بردار نہیں ہو سکتی۔“ اب کے وہ بولی لہجہ کمزور اور بھیگا ہوا تھا۔

”وہ نیکل کے سگے رشتہ دار ہیں۔ کوئی دشمن تو نہیں منال۔ نیکل وہاں خوش رہے گی۔“ شمسہ آنٹی کی بات پر وہ تڑپ اٹھی۔

”نہیں۔ میرا دل بالکل راضی نہیں۔ میں نیکل کو کسی صورت خود سے علیحدہ نہیں کر سکتی۔“ منال اس بار روتے ہوئے اونچی آواز میں چلائی گئی۔ شمسہ آنٹی نے تاسف سے اسے دیکھا۔

☆☆☆

اگلے دن شاد پھر اسی ڈرائنگ روم میں موجود

تھا۔ آج اس کے ساتھ ایک وکیل صاحب بھی بیٹھے تھے جو شمسہ آنٹی سے کچھ بات کر رہے تھے تب ہی منال نے اندر قدم رکھا۔ وکیل صاحب خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگے۔ منال آہستہ سے چلتی دائیں طرف رکھے صوفہ پر بیٹھ گئی۔ شاد نے ایک جانچتی نگاہ اس پر ڈالی جو اپنی متورم قد رے سرخ آنکھیں اس پر جمائے غصے میں نظر آ رہی تھیں۔ اس کا حلیہ معمول سے ہٹ کر بھرا ہوا سا تھا۔

”آپ کو وکیل صاحب کو زحمت دینے کی قطعاً ضرورت نہیں تھی بیٹا! منال بیٹی نیکل کو آپ کی کسٹڈی میں دینے کو تیار ہے۔“ شمسہ آنٹی نے اس خاموشی میں ایک پتھر پھینک کر منال کو بے چین کیا، اس نے ایک خفگی بھری نظر ان پر ڈالی۔

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ وکیل صاحب نے لب کشائی کی۔

”تو آنٹی! دیر کس بات کی۔ آپ نیکل کو بلوائیں۔ ہمیں جلدی لگتا ہے۔“ شاد نے سیل فون پر نظر ڈال کر بہ غلٹ کہا۔ منال نے اس کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

”ہاں بیٹا! میں اسے ابھی لے کر آتی ہوں۔“ شمسہ آنٹی اٹھ کر باہر جانے لگیں۔

”زکے شمسہ آنٹی!“ منال کی آواز پر ان کے قدم رک گئے اور انہوں نے پریشانی سے منال کو دیکھا۔ شاد بھی چونک گیا تھا۔

”میں نیکل کو لے کر آتی ہوں۔“ اس کی اگلی بات پر شمسہ آنٹی نے اطمینان کا سانس لیا۔

”ہاں بیٹا! جاؤ تم ہی لے آؤ۔“ وہ مسکرا کر اپنی نشست پر واپس بیٹھیں۔ منال کمرے سے باہر نکل گئی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ گود میں نیکل کو اٹھائے اور ہاتھ سے ایک سفری بیک گھسیٹی کمرے میں داخل ہوئی۔ شاد راٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وکیل صاحب نے بھی اس کی تھلید کی۔

”آؤ نیکل۔ چاچا کے پاس۔“ پھر اس نے آگے بڑھ کر منال سے نیکل کو لینا چاہا۔



”یہ جارہی ہے آپ کے ساتھ، اتنا کافی ہے۔  
باقی میرے علاوہ یہ کسی کی گود میں جانا پسند نہیں  
کرتی۔“ منال نے نیمل کو بانہوں میں نہتی سے بھینچ  
کر ترخ کر کہا تو شاد نے ناگواری سے اسے دیکھا۔  
”منال۔ بیٹا۔“ شمسہ آنٹی نے اسے روکنا  
چاہا۔

”آنٹی! میں اپنی نیمل کو ایک بالکل اجنبی  
ماحول میں اکیلا نہیں بھیج سکتی۔ نوال اپنا سے کیا  
پراس مجھے یاد ہے۔ اسی لیے میں نے فیصلہ کیا ہے  
کہ نیمل کے ساتھ میں بھی جاؤں گی۔“ منال کی  
بات پر شاد اور شمسہ دونوں چونکے۔  
”یہ کیا کہہ رہی ہو منال!“ شمسہ آنٹی بے چین  
ہو کر منال کے پاس آئیں۔

”شمسہ آنٹی! نیمل تین سال ہمارے پاس  
رہی ہے۔ وہ ہمارے ساتھ ملی ہوئی ہے۔ ایک دم  
سے یہ حضرت اس پر حق جانے تو طے آئے ہیں پر کیا  
یہ اس چھوٹی سی بچی کی روشنی، اس کی نیچر، اس کی  
عادات سے واقف ہیں؟“ منال نے ترش لہجے میں  
کہہ کر شاد کو دیکھا۔

”کسی نرم و نازک پودے کو جڑ سے اکھاڑ کر  
اس کی زمین سے نکال کر نئی جگہ لگایا جائے تو وہ بھی  
مر جھا جاتا ہے یہ تو پھر ایک چھوٹی بچی ہے۔ یہ مسٹر  
اپنی طاقت کے زعم میں اس بات کو فراموش کر بیٹھے  
ہیں کہ بچی ایک دم ایک ماحول سے نکل کر ایک بالکل  
اجنبی ماحول میں کیا محسوس کرے گی۔ اس کا نازک  
دل کتنا گھبرائے گا۔“ اس بار منال کی آواز بھیگ  
ہوئی تھی۔

”آپ صحیح فرما رہی ہیں بیٹا! بچے واقعی نازک  
ہوتے ہیں۔ آپ کا ساتھ ہونا بچی کو نئے ماحول میں  
ایڈجسٹ ہونے میں مدد دے گا۔“ وکیل صاحب  
بے اختیار بولے اور شاد کو آنکھوں ہی آنکھوں میں  
کچھ اشارہ کیا تو شاد کی پیشانی پر پڑے بل کچھ کم  
ہوئے۔  
”مگر منال.....“ شمسہ آنٹی کچھ کہتے کہتے رک

گئیں۔

”اوکے۔ آپ بھی چلیں۔“ شاد نے قدم  
آگے بڑھاتے کہا۔  
”منال! یہ کیا کر رہی ہو۔ آج تو تمہارا خب  
راجا کے ساتھ ملاقات کا پلان تھا۔“ شاد اور وکیل  
کے کمرے سے نکلتے ہی شمسہ آنٹی نے منال کا بازو  
پکڑا۔

”بھاڑ میں جائے خب راجا۔ مجھے اپنی نیمل  
سے بڑھ کر کچھ عزیز نہیں۔“ منال نے بھاری لہجے  
میں کہا۔ شمسہ نے ایک گہری سانس بھری۔  
”میرا اتنا سمجھانا ضائع کیا۔ خیر کب تک لوٹو  
گی۔“

”پتا نہیں۔ نیمل کو اس کی دادی سے ملوا کر،  
ان کی ساری حسرتیں پوری کر کے نیمل کے ساتھ  
والیں آجاؤں گی۔“ منال نے پُر عزم لہجے میں کہا تو  
شمسہ کو اس کی بے وقوفی پر تاد آیا۔

”تم خواجواہ جذباتی ہو رہی ہو منال! وہ نیمل  
کے سگے رشتے ہیں، دو چار دن لگیں گے وہ ان سے  
بھی مل جائے گی۔ ساتھ لے جا رہے ہیں تو  
سنبھالیں گے بھی۔ انہیں جانے دو۔ تم اپنے فوج  
کے بارے میں سوچو۔“

”شمسہ آنٹی! مجھے مت سمجھائیں۔ پلیز۔“  
منال نے فوراً ٹوک کر قدم آگے بڑھائے۔  
شمسہ جُپ رہ گئیں۔ جانتی تھیں، یہ کم عمر جذباتی  
لڑکی نہیں مانے گی۔

☆☆☆

”سن مال! ہم کا جارے اس۔“ نیمل کی  
مصوم سی آواز کار کے خاموش ماحول میں گونجی تو  
کھڑکی سے باہر دیکھتی منال اس کی طرف متوجہ  
ہوئی۔

”ہم نیمل کو اس کی دادی جان سے ملوانے  
لے جا رہے ہیں گڑیا۔“ ڈرائیونگ کرتے شاد نے  
رخ موڑ کر جواب دیا تو منال کا منہ بن گیا۔ وہ تقریباً  
ڈیڑھ گھنٹے کی اس ڈرائیونگ سے اکتا گئی تھی۔ نیمل



بھی بے چین ہو رہی تھی۔ مسلسل ایک ہی سوال اس کے لبوں پر تھا۔ منال گول مول جواب دیتی بھی خاموش رہی۔ آخر شادور سے رہا نہ گیا اور اس بار اس نے نیمل کو جواب دیا۔

”مگر جانا اے۔۔۔“ نیمل نے منال کا دوپٹا کھینچا۔

”جل رہے ہیں نیمل! جگ مت کرو۔“ اس بار منال نے جھنجھلا کر کہا۔

”بس دس منٹ کی مزید ڈرائیو ہے۔“ شادور نے بتایا تو منال نیمل کو کندھے سے لگا کر تھکنے لگی۔ دفعتاً اس کا سِل بجتے لگا۔ منال نے بیک سے فون نکالا فیب راجا کی کال تھی۔ کچھ سوچ کر منال نے لبس کا بٹن دبایا۔

”منال کہاں ہو یار! پندرہ منٹ سے اوپر ہو گئے ہیں فواد بدرا کو آئے۔ تم ہو کہ آ کر نہیں دے۔ یونودہ کیلکولیٹڈ بندہ ہے۔ کچھ تو خیال کرو۔“ فیب فوراً چڑھ دوڑا تو منال نے ایک سانس بھری۔

”فیب! دراصل بات یہ ہے کہ مجھے بہت ضروری کام سے آؤٹ آف شئی جانا پڑ رہا ہے سو میں آج نہیں آسکتی۔“

”کیا۔۔۔ دماغ تو ٹھکانے ہے تمہارا۔ عین وقت پر آنے سے معذرت کر رہی ہو۔ میں فواد بدرا کو کیا جواب دوں گا۔ وہ کوئی قاتل تو بندہ نہیں ہے، اپنا وقت نکال کر تمہارے لیے بیٹھا ہے۔“ حسب توقع فیب راجا بھڑک اٹھا۔ اس کی آواز اتنی اونچی تھی کہ گاڑی کے خاموش ماحول میں گونج رہی تھی۔ منال نے کال کا دالیم کم کیا۔

”ایسی کوئی قیامت نہیں آگئی کہ تم اسے منع کرنے پر مجھے باتیں سنا رہے ہو۔ آج نہیں تو کسی دن اور کسی۔ میں کام کرنے سے انکار تو نہیں کر رہی۔“ منال نے ہلکی آواز سے بات کی۔

”واہ جی۔ تم ایٹی ٹیوڈ تو ایسے دکھا رہی ہو جیسے پاکستان کی ٹاپ ماڈل ہو۔ دہلی بی! ابھی تمہارا کیرئیر ٹھیک سے شروع بھی نہیں ہوا۔ یہ ہیر و نیوں دانے

نخرے تب کے لیے اٹھا رکھو۔“ فیب کے الفاظ میں تسخّر تھا۔ منال کو اس کا انداز بے حد برا لگا۔

مئی اور نوال کے گزرنے کے بعد اس کا رویہ نجانے کیوں منال کے ساتھ بہت تضحیک آمیز ہو گیا تھا۔

”شٹ اپ۔“ منال نے غصہ میں کہہ کر کال کاٹ دی۔ پھر سِل کو بیک میں رکھ کر نظریں اٹھائیں تو شادور کو بیک ویو مرر سے خود کو دیکھتا پایا۔

”اپنی پرابلم۔“ اس نے پوچھا تو منال خفت زدہ سی ہوئی۔

”تھنک۔“

”اوکے۔“ شادور نے کندھے اچکائے۔

”آگے اور کتنا سفر ہے۔ آپ کا گاؤں کب آئے گا۔“ نیمل نیند میں بھی بے چین تھی۔ منال نے اس کو تھکتے بیزاری سے پوچھا۔

”بس پندرہ منٹ کی مزید ڈرائیو۔“ شادور نے کہا۔

منال کھڑکی سے باہر نظر آتے مناظر دیکھنے لگی۔ ہری بھری نصلوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ سہ پہر ڈھل رہی تھی سو آفتاب پھیکا سا دکھائی دے رہا تھا۔

کچھ دیر بعد گاڑی ایک کشادہ اور دیدہ زیب حویلی کے آگے آ کر رک گئی۔ ہارن دیتے ہی چوکیدار نے دروازہ کھول دیا۔ شادور نے تیزی سے گاڑی پورچ میں لا کر کھڑی کی۔

”آئیے پلیز۔“ وہ گاڑی سے اُترا اور منال بھی باہر نکلی۔

”صابر! ڈنگی کھول کر سامان اندر پہنچاؤ۔“ شادور نے پاس کھڑے ملازم کو چابی دی اور آگے بڑھا۔ منال شادور کے پیچھے چلتی بڑے سے لاؤنج میں داخل ہوئی۔

”ادا شادور آگئے۔“ مہراں نے دیکھتے ہی نعرہ لگایا اور آ کر شادور سے لپٹ گیا۔

”کیسا ہے مہرا۔“



”بالکل اے دن۔“ وہ منال کو حیرت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”ادا! یہ آرہی کون ہے۔“

”یہ ہماری سچی نینل ہے مہراں۔ اور یہ نینل کی خالہ ہیں۔“ شادور کے تعارف پر اس کی آنکھیں مزید پھیلیں۔

”ادا داور کی بیٹی۔ لکھ لکھ خوش آمدید چھوٹی ادی۔“ اس نے نینل کا ننھا سا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ جو نینل نے ناخوشی سے چھڑوا لیا۔

”مہراں! اماں میٹھی آرام میں ہیں یا جاگ رہی ہیں۔“

”جی جاگ رہی ہیں۔“

”ادکے۔ آپ آئے میرے ساتھ۔“ شادور کہہ کر لاؤنج کے درمیان گول کشادہ میز میوں کی طرف بڑھا۔ منال نے اس کی تقلید کی۔

وہ خاصی بیزار اور تھکی ہوئی نظر آرہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا فریش ہو کر آرام کرے پر شادور کا ارادہ نینل کو فوراً ہی دادی سے ملوانے کا لگ رہا تھا۔ اوپر آکر وہ ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ جہاں بڑی سی مسہری پر ایک کمزور سی خاتون تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں اور ایک ملازمہ ان سے غالباً دوا کھانے پر اصرار کر رہی تھی۔

”ننل کھانی مجھے کڑوی سیل دوائیں۔ مرنا تو ویسے ہی ہے۔ کیوں یہ بد مزہ گولیاں کھلا کر جتے جی مار رہے ہو۔“ وہ ملازمہ کا ہاتھ جھٹک کر بولی تھیں۔ منال وہیں دروازے پر رک گئی۔

”اماں میٹھی!“ شادور تیزی سے آگے بڑھا اور ان سے لپٹ گیا۔

”میرا شادور آگیا۔ جیتا رہ بیٹا۔“ انہوں شادور کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ ”میری بچی کو لائے ہو۔“ پھر ایک آس سے پوچھا تو شادور نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ادھر آ میں منال۔“ اس نے مڑ کر منال سے کہا۔ وہ چھوٹے قدم اٹھا کر بیڈ کے پاس آئی۔ اماں میٹھی منال کو دیکھ کر اچنبھے کا شکار ہوئیں۔ منال نے

آہستہ سے انھیں سلام کیا۔

”یہ لیجیے آپ کی پوتی۔“ شادور نے نینل کو منال کی گود سے لے کر دادی کے پاس کیا۔ انہوں نے فوراً نینل کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تمام کر پیار کیا۔

”میرے داور کی نشانی۔۔۔۔۔ میری بچی۔“ ان کی آواز بھگی ہوئی تھی۔ نینل شادور کی گود میں رونے لگی۔

”من مال۔۔۔۔۔ من مال۔“ وہ منال کی طرف ہنسنے لگی۔ منال نے آگے بڑھ کر اس کو شادور سے لیا۔ نینل فوراً چپ ہو گئی۔

”یہ نوال بھابھی کی چھوٹی بہن ہیں اماں!“ اماں میٹھی کی سوالیہ نظروں کو بھانپ کر شادور نے بتایا۔

”ماشاء اللہ۔ بہت ملتی ہے نوال سے۔ ادھر آؤ بیٹی۔“ انھوں نے بلایا تو منال جھجک کر ان کے قریب ہوئی۔ اماں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بہت نرمی سے اس کا ماتھا چوم لیا۔

”جیتی رہو۔ خوش رہو۔“ ان کے لمس اور دعا میں نجانے کیا تاثیر تھی کہ منال کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

”بہت بڑا صدمہ آن بڑا بیٹی۔ جوان بیٹے کی ناگہانی موت کا غم اور پھر اس کی صورت آخری وقت تک نہ دیکھ سکے کا دکھ۔ پھوڑے کی طرح دل سے درد رہتا ہے۔“ وہ چہکوں ہیکوں رونے لگیں۔

”اماں میٹھی! بس کریں۔ آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔“ شادور بے چین ہوا۔

”مٹی میں مل گیا میرا داور۔ میں کیوں زعمہ ہوں۔“ ان کے رونے میں شدت آ گئی۔ ”ہائے مجھے آخری بار دیکھنے دیا ہوتا داور کا چہرہ۔ میں اپنے بچے کو پیار تو کرتی۔ داور کے بابا! بڑا حکم کمایا آپ نے۔“ ان کی آواز غم میں ڈوبی ہوئی تھی۔

”اماں! مت روئیں۔ دیکھیں آپ کے رونے سے نینل پریشان ہو رہی ہے۔“ شادور نے



ان کا دھیان بٹانے کو کہا۔ انھوں نے چونک کر نینل کو دیکھا جو اماں کے رونے سے ہم کر مثال سے لپٹ گئی تھی۔

”داور ادا نہیں تو کیا ہوا، ان کی آخری نشانی تو آپ کے پاس ہے۔“ شاور نے ان کو مزید بہلایا اور وہ بالکل چپ ہو گئیں۔

”ہاں، اب میرے داور کی نشانی آگئی ہے میرے پاس۔ اس کو میں سینے سے لگا کر رکھوں گی۔“ وہ بھگی آواز سے بولیں۔

”آپ کا تو بیٹا گیا اماں۔ میری تو ماں اور بہن بھی داور بھائی کے ساتھ چلی گئیں۔“ مثال نے بے اختیار اپنا دکھ بتایا تو اماں میٹھی گیلی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگیں۔

”ساف کرنا بیٹا۔ میں تو بھول ہی گئی کہ تمہاری عزیز ہستیاں بھی تم سے چھن گئیں۔ شاید سب کو اپنا دکھ بڑا لگتا ہے۔ اللہ تمہیں بھی صبر، حوصلہ دے اپنے پیاروں کے بغیر جینے کا۔“ وہ ہلکی آواز میں بول کر ہانپنے لگیں۔

”اماں میٹھی! آپ کو زیادہ بات کرنے سے ڈاکٹر نے منع کیا ہے۔ پلیز۔“ شاور نے یاد دلایا تو وہ اداسی سے مسکرائیں۔

”ڈاکٹر نے سانس لینے سے منع نہیں کیا۔ یہ

بھی کہہ دیتا تو آسانی ہو جاتی۔“

”کیسی باتیں کرتی ہیں اماں میٹھی۔ اللہ آپ کو جاتی دے۔“ شاور نے ماں کا کمزور ہاتھ تھام کر سہلایا۔

”اب آپ نے کوئی مایوسی کی بات کی تو میں آپ سے ناراض ہو جاؤں گا۔ میں نینل کو آپ کی خواہش پر اس لیے تو نہیں لایا کہ آپ اس کو دیکھ کر اداس ہو جائیں۔“ پھر وہ ناراضی سے بولا۔

”تو نے میرا دل ٹھنڈا کیا ہے بیٹے! اللہ تجھے آباد رکھے۔“ انھوں نے جذبہ سے دعا دی۔ مثال نے رشک سے شاور کو دیکھا جو ماں کی دعا کی چھاؤں میں تھا۔ وہ خود تو جیسے تپتے صحرا میں کھڑی

تھی۔ اس کا دل جاہا ان سے اپنے لیے بھی ڈھیروں دعا میں لے۔ پر جھک آڑے آگئی۔

”اچھا اماں میٹھی! اب آپ آرام کریں۔ نینل بھی لیے ستر سے بے آرام ہو گئی ہے۔“ شاور نے کہا تو اماں میٹھی نے اثبات میں سر ہلایا۔

”میری بونی کو ادھر شہزادیوں کی طرح رکھنا شاور! کسی چیز کی کوئی کمی نہ ہونے دینا۔“ انھوں نے ہدایت کی۔ ”میں خود بھلی چنگی ہوتی تو تجھے نہ کہتی۔“

”آپ ان شاء اللہ جلد بھلی چنگی ہو جائیں گی۔“ شاور نے تسلی دی تو وہ پھیکا سا مسکرایا۔

”آئیے آپ۔“ شاور نے مثال سے کہا۔ وہ اس کے پیچھے چلی آئی۔ شاور نے راہداری کے بائیں طرف والا ایک کمرہ کھولا۔

”آپ یہاں آرام کریں۔ پھر ڈنر پر ملے ہیں۔“ شاور اس کے ساتھ ایک اچھے میزبان والا برتاؤ کر رہا تھا۔ پہلے وہالی تندی لہجے سے عتاب بھی۔

مثال نے ایک لمبی سانس بھری اور نینل کو بیڈ پر لے کر بیٹھ گئی۔

☆☆☆

”ادا اپنی بھتیجی کو گھن آئے (لے آئے ہیں)۔ ساتھ اس کی ماسی بھی آئی ہے۔“ مہراں نے پھولی سانسوں سے سوہائی کو آ کر اطلاع دی تو وہ چونکی۔

”کیا ادا اور کی بیٹی۔ شاور اس کو لے آئے۔“

”جی بڑی ہی سوہنی بچی ہے ادی۔ بالکل انگریز دھتی ہے۔“ مہراں نے مزید بتایا۔

”ہاں وہ تو ہوگی ہی۔ اس کی ماں بھی تو گھنی سوہنی تھی۔ ادا اور ایسے ہی تو نہیں پھسلے۔ اپنی اچھی بھلی منگ چھوڑ دی اس چڑیل کے پیچھے۔“ سوہائی نے زہریلے لہجے میں کہا۔

”اس کی ماسی جو ساتھ آئی ہے، وہ بھی راج کے سوہنی ہے۔“ مہراں نے آنکھیں نیچائیں۔ اس بار سوہائی کے کان کھڑے ہوئے۔

”ماسی کون۔“

”ار بے ادی۔ اس بچی کی خالہ۔“



”تو خالہ بولوتا۔ میں سمجھی کوئی آیا ساتھ آئی ہے۔“ سوہائی غصہ ہوئی۔

”ہم تو خالہ کو ماسی ہی کہتے ہیں ادی۔“ مہراں نے زور دے کر کہا۔

”وہ کیوں آئی ہے اس کا کیا کام۔“ سوہائی نے منہ بنا کر پوچھا۔

”اب یہ تو شادور ادا کو چاہوگا۔“ مہراں بربک بخور دے کر اب ہلکا پھلکا تھا جبکہ سوہائی ابھی خاصی بے چین ہو چکی تھی۔

☆☆☆

ڈزٹیل پر بیٹھی منال، نیمل کوچنگ سے چادل کھلاتی انتہائی کوفت کا شکار تھی۔ سامنے بیٹھی دو خواتین اور ایک لڑکی اس کو عجیب نظروں سے گھورے جارہی تھیں۔

”یہ سوٹ ڈش لیں۔ نیمل کو پسند آئے گی۔“ شادور نے منال کو میٹھا پیش کیا۔ وہ سچی کو قریب ہوتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ منال نے تھوڑا میٹھا پلیٹ میں نکالا۔ سوہائی نے منہ بنا کر ماں کو دیکھا۔

”من مال..... بش۔“ نیمل نے مزید کھانے سے انکار کرتے تھا سا ہاتھ اٹھایا۔

”او کے میری جان بس۔“ منال نے اس کا منہ ٹٹو سے پونچھا۔

”اتنی جلدی بس ہوگئی۔“ شادور حیران ہوا۔

”یہ اتنا ہی کھاتی ہے۔ ابھی کچی ہی تو ہے۔“ منال نے اس کی حیرت پر کہا اور ایلسکیو زکر کے کرسی سے اٹھی۔

”یہ تو بچی ہے، مان لیا۔ آپ نے بھی بہت کم کھایا۔“ شادور نے میزبانی نبھائی۔ سوہائی نے ماں کو دیکھا۔

”جتنی بھوک ہوگی، اتنا ہی کھائے گی نا۔ تم کیوں پریشان ہوتے ہو بیٹا۔“ سوہائی کی ماں کہہ اٹھیں۔ منال ان کی عجیب سی نظروں سے پہلے ہی خائف تھی، اب ان کی بات پر نیمل کو اٹھائے ڈائننگ روم سے باہر نکل آئی۔

”پھوپھو! آپ تو ابھی میزبان ہیں پھر آج ایسی بات کیوں کی۔“ شادور کو ان کا انداز عجیب لگا۔

”بیٹا! میزبانی بھی خاندانی لوگوں کی جاتی ہے۔“ ان کی بات میں گہرا طنز تھا۔

”سمجھیں کیا پڑی کہ اس لڑکی کی بہن کو مہمان بنا کر لے آئے جس کو بڑے ادا نے اپنے گھر کی چوکھٹ بھی لائگئے نہ دی۔“ پھوپھو نے غصے سے مزید کہا۔

”پہلی بات تو یہ کہ مہمان کی اچھے سے میزبانی کرنے سے مہمان کے نہیں میزبان کے خاندان کا پتا چلتا ہے پھوپھو! دوسری بات نوال بھابھی مرحومہ میرے بھائی کی بیوی تھیں، اسی لحاظ سے میرے لیے محترم ہیں اور ان سے بڑے کسی رشتے سے مجھے کوئی عناد نہیں ہے۔ بابا کے فیصلے یک طرفہ اور شدت پسند تھے۔ ان کے فیصلوں کا کتنا جذباتی نقصان میری ماں اور خود انھیں سہنا پڑا، یہ آپ جانتی ہیں۔ میں اس کو دہرانا نہیں چاہتا۔ بھابھی کی بہن وقتی طور پر ہماری مہمان بنی ہیں۔ ان سے اخلاق سے پیش آنا ہمارا فرض ہے۔ باقی میں اپنی سچی کے لیے کسی کے دل میں جلن یا حسد برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ اس خاندان کا خون ہے۔“ شادور نے مضبوط لہجے میں کہا تو پھوپھو کو اپنا اٹھتا غصہ دبانا مشکل ہو گیا۔

”پر بیٹا! تم اپنے خاندان کے بڑے ہو اب۔“ پشیمانی پگ تمہارے سر پر رکھی گئی ہے۔ وہ کام کرو جس سے خاندان کی عزت ہو ورنہ دشمنوں کو ہنسنے کا موقع ملے گا۔“ انہوں نے بظاہر نرم لہجے میں سمجھایا۔

”آپ فکر مند نہ ہوں پھوپھو! اپنے خاندان کی عزت رکھنا مجھے آتا ہے۔“ شادور کی فراخ پیشانی پر تل پڑ گئے تھے۔

”مگر سچے! ابھی تمہارے سب چاچے مامے لاعلم ہیں۔ اکیلے ہی نیمل کو ادھر لانے کا فیصلہ لے لیا تم نے۔ ان سے مشورہ تو کرتے۔“ وہ اس کا خراب موڈ دیکھ کر پھر نرمی سے بولیں۔

”مجھے اپنی سچی کو اس کے اصل گھر لے کر آنے



میں کسی سے مشورہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی پھر بھی اماں۔ اس گھر میں آکر بسا اس کا حق ہے۔ ادا کے حصے کی جائیداد اسی کی ہے۔“ شادور دو ٹوک بولا تو ان کا منہ اتر گیا۔ انھوں نے چپ رہنے میں ہی عافیت جانی۔

”بڑا ہی مت زور ہو گیا ہے یک پہن کر۔ اس کے باپ دادا حیات ہوتے تو دیکھتی کیسے ان ڈرامہ فلموں میں فنکاری کرنے والیوں کو ہمارے سر پر بٹھاتا ہے۔ پہلے داور نے جو خاندان کو ہار پہنائے وہ بھولے نہیں جھولتے کہ اب یہ بھی اسی راستہ چلا ہے۔“ شادور کے جاتے ہی فرحین بیٹی کے آگے پھٹ پڑی۔

”اماں! یہ سارا کیا دھراما میٹھی کا ہے۔ وہ ہی شادور سے روز کتنی تھیں میری پوتی کو دابیں لاؤ۔“ سوہانی نے منہ بنا کر بتایا۔

”یہ بھا جائی بھی نا۔ اب کیا کہوں۔ سکون سے قبر میں جائیں تو کچھ ہمیں بھی سکون ہو۔“ فرحین نے جل کر کہا۔

”اماں! مگر میرے ساتھ تو دیکھیے ہو کیا رہا ہے۔ پہلے ہی میں اس دیسی فرنگن سے تنگ آئی ہوئی ہوں، اب یہ ہیر دینوں کی نسل بھی میرا امتحان لینے چلی آئی ہے۔“ سوہانی نے روہاسی ہو کر دہائی دی۔

”داور کی نام نشانی کی وجہ سے یہ بھی گھر میں کھس آئی ہے۔ تو فکر نہ کرو، میں بندوبست کروا دی ہوں دونوں کو ادھر سے نکالنے کا۔“ انھوں نے روٹی بیٹی کو تسلی دی اور گہری سوچ میں گم ہو گئیں۔

☆☆☆

”اماں میٹھی! اب تو خوش ہیں نا آپ۔“ شادور نے ان کو اپنے ہاتھوں سے سوپ پلاتے ہوئے پوچھا تو وہ مسکرا دیں۔ ان چہرہ دونوں میں وہ مرجھائی کیفیت سے باہر نکل کر کچھ مسکرا نے بھی لگی تھیں اور یہ نیمل کی دید کا اچھا ز تھا۔ شادور کو پہلے پتا ہوتا کہ پوتی ان کو اتنا خوش کر دے گی تو پہلے ہی نیمل کو ان کے پاس لے آتا۔

”اللہ کا شکر ہے، مرنے سے پہلے داور کی نشانی کو دیکھ لیا۔ سینے سے لگا لیا۔“ ان کی بات پر شادور نے ناراضی سے انھیں دیکھا۔

”اب تو کم از کم ایسی باتیں نہ کریں اماں۔“ ”اچھا اچھا نہیں کرتی۔“ وہ مسکرا کر بولیں۔

”یہ ہوئی نا بات۔“ شادور نے سوپ کا پیالہ ایک طرف رکھا اور ان کا منہ ٹٹو سے صاف کیا۔

”نیمل اب آپ کے پاس رہے گی اور آپ کی مسکراہٹ ہمیشہ قائم رہے گی ان شاء اللہ۔“ شادور نے کہا تو وہ سوچ میں پڑ گئیں۔

”نیمل اپنی خالہ سے بہت مانوس ہے شادور! وہ چلی گئی تو چچھے بھی مشکل سے پہلے گی۔ اس کو سنبھالنے کے لیے کتنی مخلص عورت کا انتظام کیا ہے تم نے۔“ ان کے سوال پر شادور خاموشی سے انھیں دیکھنے لگا۔

”جی جی۔ سسلی نے خولہ نام کی بیوہ عورت بھجوائی ہے۔ کوشش تو یہی ہے کہ جلد اس سے مل جائے تاکہ مثال کا جانا محسوس نہ کرے۔“ وہ سوچ کر بولا۔

”مگر لگتا نہیں کہ مثال اس کو یہاں چھوڑنے پر راضی ہے۔“ اماں میٹھی کی اگلی بات اسے چونکا گئی۔ ”آپ سے کس نے کہا۔“

”مجھ سے کس نے کہا ہے۔ بس محسوس یہی ہوا۔“ وہ جہانگیرہ عورت تھیں، یہ مسلم تھا۔ شادور نے گہری سانس بھری۔

”اس کے راضی ہونے نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ نیمل ہمارا خون ہے، اس کو ہمارے پاس ہی رہنا ہے۔ خیر، آپ خواہ مخواہ پریشان نہ ہوں۔ یہ آپ کے سوچنے کی باتیں نہیں۔ آپ بس اپنی پوتی کو دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کریں۔“ وہ ان کی کمر کے نیچے سے گریہ ہٹا کر ان کو آرام دو حالت میں لٹانے لگا۔

☆☆☆

دو نیمل کو لے کر برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی تھی۔ ان کو ادھر آئے آج تیسرا دن تھا۔ ان تین



دلوں میں وہ نیمل کی خاطر اس بالکل مختلف ماحول اور عجیب لوگوں کے درمیان رہ کر بہت بور ہوئی تھی۔ یہاں سوائے اماں میٹھی کے اسے کچھ اچھا نہ لگا تھا۔ اماں میٹھی ایک نہایت محبت کرنے والی خالص عورت تھیں۔ منال کو ان سے اپنی ماما کی خوشبو آتی تھی حالانکہ دونوں عورتوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ کہاں منیزہ فلمی دنیا کی معروف اداکارہ اور کہاں اماں میٹھی گاؤں کی سیدھی سادی زندگی گزارنے والی۔ پر ماما کی حلاوت دونوں کے وجود میں ایک جیسی موجود تھی۔ ان کی یہی کشش منال کو اپنی جانب کھینچتی تھی۔

”ماما! آپ نے جانے میں بہت جلدی کی۔“ منال نے سانس بھر کر سوچا۔ پھر نیمل کو دیکھا جو اس کا اسٹول اپنے سر پر لیٹ کر عجیب ہی کھیل کھیل رہی تھی۔ اس کی ماما نے تو دنیا سے جانے کی جلدی میں میری ماما کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ وہ سوچ کر مزید افسردہ ہوئی۔

”آجاؤ نیمل بے بی! میرے پاس آؤ۔“ چادر کی بکلیں میں چھپی وہ عورت پھر سے اس کے سر پر آدھمکی تھی۔

”یہ میرے پاس آرام سے بیٹھی ہوئی ہے۔ آپ کے پاس کیوں آئے بھلا۔“ منال نے انتہائی بیزاری سے اس عورت کو دیکھا۔ ”ادی! میں بھلاؤں گی۔ پینگھے (جھولے) پر جھلاؤں گی۔ آپ ہر وقت گود میں لے کر بیٹھی ہو تھک جاتی ہوگی۔“ عورت نے رٹے رٹائے جملے بولے۔

”بوری نہیں اٹھائی جو تھک جاؤں گی۔ نازک سی بچی اٹھا رکھی ہے میں نے۔ آپ پلیز ہمیں ڈسٹرب نہ کریں۔“ منال کو اب غصہ آنے لگا تھا۔ وہ سب سمجھتی تھی۔ اس آیا نما عورت کو شاد نے ہدایت کی ہے کہ نیمل کو خود سے مانوس کرے تاکہ بچی با آسانی ادھر ایڈجسٹ ہو سکے۔

”آپ کی نیمل کو یہاں رکھنے کی خواہش

ادھوری ہی رہے گی مسٹر شاد!“ منال سلگ کر سوچا۔ ”جاؤ اب۔“ وہ عورت بدستور سر پر سوار تھی۔ منال جھنجھلا کر خود ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسی اثناء میں ٹیٹا سیل فون کان سے لگائے انتہائی عجلت میں منال کے پاس سے گزری۔ سرخ ہائی ہیلوں کی ٹک ٹک ماحول پر چھاسی گئی۔ بلیک ٹائمس اور ریڈ ٹاپ پر ڈل گولڈن اسٹریٹ بالوں کو ایک ہاتھ سے جھٹکتی وہ انگریزی میں کسی سے بحث میں اُبھرتی تھی۔ منال نے اس کو سرسری نظر سے دیکھ کر نگاہیں پھیر لیں۔ اس خاندان میں ایسی ماڈرن لڑکی اس کے لیے اچھے کا باعث تھی۔ یہاں بہت کچھ ایسا تھا جس کا تصور منال نے نہیں کیا تھا۔ نوال کوئی وی انڈسٹری سے جڑے ہونے کے بنا پر مسترد کرنے والے منال کی سوچ میں بہت ہی قدامت پسند تھے۔ وہ ان کو پردے اور ریتی رواج کا سخت پابند سمجھتی آئی تھی۔ مگر اس کی سوچ غلط تھی۔ داور بھائی کے اکثر رشتہ دار آسٹریلیا اور انگلینڈ میں سکونت پذیر تھے اور کافی آزاد خیال تھے۔ یہ معلومات اسے مہراں سے ملی تھیں۔ مہراں ان کا قیمتی رشتہ دار تھا جس کے سر پر شاد نے ہاتھ رکھ کر اپنے گھر میں رکھا ہوا تھا۔ ”ادی! کیا سوچ رہی ہو؟“ مہراں کی آواز پر منال اپنے خیالوں سے چونکی۔

”چھوٹی شہزادی! آؤ میرے پاس۔“ مہراں نے نیمل کو سہولت سے اٹھالیا۔ نیمل منال کے علاوہ صرف اس کے پاس جاتی تھی۔

”میرے سے مل گئی ہے نیمل ادی۔“ وہ خوش ہو کر چکا۔ منال مسکرا دی۔

”تمہیں اور کوئی کام نہیں چاہا ہم ہوں، آجاتے ہو۔“ منال کے سوال پر وہ کھلکھلایا۔ ”آپ پر نظر رکھنی ہے ادی۔“ اس کی بات پر منال چونکی۔

”کیوں؟“

”ارے مذاق کیا۔“ مہراں فوراً سنبھلا۔ ”ویسے آپ کب تک ادھر ہوا دی؟“ اس کے



سوال پر منال نے کندھے اچکائے۔  
 ”چند دن مزید۔ پھر میں اپنی نینل کے ساتھ  
 واپس چلی جاؤں گی۔“ منال نے زور دے کر کہا۔  
 ”نینل ادی کو لے کر؟“ مہراں حیران ہوا۔  
 ”اور کیا تمہیں دے کر جاؤں گی؟“ منال نے  
 اسے گھورا۔

”نن..... نہیں..... میرا مطلب..... ادا شناور  
 تو کہہ رہے تھے چھوٹی ادی ہمیشہ کے لیے ادھر رہے  
 گی۔“

”یہ تمہارے بھائی کی غلط فہمی ہے۔ نینل  
 میرے پاس رہے گی ہمیشہ۔“ منال نے نینل کو اس  
 سے لے کر خود میں بھیج لیا تو مہراں کی آنکھیں پھیل  
 گئیں۔ منال اندر کی طرف بڑھ گئی اور وہ سر پٹ  
 دوسری جانب بھاگا۔ سوہانی کو تازہ خبر سے آگاہ جو  
 کرنا تھا۔

☆☆☆

”مجھے اب واپس جانا ہے۔“ اگلے ہی دن وہ  
 شناور کے سامنے کھڑی تھی۔ جو اس وقت اپنے کمدار  
 کے ساتھ زمینوں کے حساب کتاب میں مصروف  
 تھا۔

”یہ کاغذات چھوڑ جاؤ۔“ شناور نے ہنوں کو  
 جانے کا اشارہ کیا۔ وہ مودب انداز میں سلام کر کے  
 چلا گیا تو شناور اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”آپ کو روکا کس نے ہے۔ جب چاہیں چلی  
 جائیں۔“ اس نے اطمینان سے کہا۔

”مجھے نینل کو ساتھ لے کر واپس جانا ہے۔“  
 وہ جتا کر بولی۔

”نینل تو آپ کے ساتھ نہیں جاسکتی۔ ہاں  
 آپ اکیلی جب چاہیں تشریف لے جاسکتی ہیں۔“  
 جواب میں اس نے بھی جتایا۔

”نینل میرے بغیر کہیں نہیں رہ سکتی۔“ منال  
 نے غصے سے کہا۔

”یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ نینل اپنے باپ دادا  
 کے گھر میں آپ کے بنا بھی آرام سے رہے گی۔“

آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ وہ ہاتھ  
 میں پکڑی قائل کھول کر دیکھنے لگا۔ منال کو اس کے  
 جھکے سر پر پتھر مارنے کا دل چاہا۔ اس وقت وہ سفید  
 شلوار قمیض میں ملبوس، کاندھوں پر اجرک ڈالے  
 مغرور زمین دار نظر آ رہا تھا۔ داور بھائی سے قطعاً  
 مختلف اور کٹھنور بندہ ہے۔ منال نے سلگ کر سوچا۔  
 ”میں اپنی بھانجی کو لیے بنا ادھر سے ہوں گی  
 بھی نہیں۔“ منال ضدی پن سے بولی تو شناور نے  
 جھک کر اس اٹھارہ انیس سال کی نازک سی لڑکی  
 کو دیکھا جو عجیب سر پھری سی تھی۔

”پھر تو آپ کو اپنی باقی ماندہ زندگی یہیں تمام  
 کرنی ہوگی۔ کیوں کہ میں تو اپنے بھائی کی نشانی  
 آپ کو سوچنے والا نہیں۔“ شناور لطف لے کر مسکرایا تھا  
 کم از کم منال کو یہی لگا۔ وہ جل اٹھی۔

”میں کسی قیمت پر اپنی بھانجی ادھر نہیں رہنے  
 دوں گی مسٹر شناور!“ وہ ادنیٰ آواز میں بولی۔

”اور میں کسی قیمت پر اسے آپ کے ساتھ  
 نہیں جانے دوں گا منال میڈم۔“ شناور نے ایک دم  
 موڈ بدلا تھا۔

”اور ہاں..... یہاں آواز نیچی کر کے بات کیا  
 کریں۔ یہ آپ کا ڈرائنگ روم نہیں، ہمارا ڈیرہ  
 ہے۔“ وہ قائل میز پر ٹخ کر کھڑا ہوا۔

”مجھے نینل کے ساتھ واپس جانا ہے۔“ منال  
 اپنی ضد پر اڑی تھی۔ شناور نے بغور اس کا سرخ ہوتا  
 چہرہ دیکھا۔

”منال! ایک بات واضح طور پر سمجھ لو۔ نینل  
 ہمارا خون ہے۔ اسے اب ہمارے ساتھ رہنا ہے۔“

دیش اسٹ۔ میں زیادہ بحث پسند نہیں کرتا۔ خود کو  
 مشکل میں مت ڈالو۔ میں گاڑی ڈرائیور تیار کروانا  
 ہوں جس وقت یہاں سے جانا چاہو، مجھے بتا دینا۔

اوکے۔“ شناور نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا  
 اور منال کے پہلو سے نکل کر باہر چلا گیا۔ پیچھے وہ  
 بھری آنکھیں لیے اسے دل میں برا بھلا کہتی رہی۔

☆☆☆



”منال! واپس آ جاؤ اب۔ اتنی دور جا کر بیٹھ گئی ہو، میں پریشان ہو رہی ہو بیٹا۔“ شمسہ آنٹی نے چھوٹے ہی فون پر اصرار کیا۔

”نہیں آؤں گی نیکل کے بغیر۔ کبھی نہیں۔“

منال کی آواز بھگ گئی۔ شمسہ آنٹی بے چین ہوئیں۔

”منال! کتنا سمجھاؤں تمہیں۔ ایک ہی ضد پر اڑی ہو۔ ارے جن کا خون ہے ان کو سنھالنے دو۔

پتا ہے تمہارے پیچھے فیب راجا دس چکر گھر کے لگا چکا ہے۔ بار بار تمہاری واپسی کا پوچھتا ہے۔“ ان کی بات پر منال کے اندر کڑواہٹ پھیلی۔

”کیوں اس کو کیا فکر پڑی ہے میری۔ آپ جانتیں نہیں، کتنی بد تمیزی سے اس دن مجھ سے بات کر رہا تھا۔“

”بیٹا! وہ تو وقتی غصہ آیا تھا اسے۔ تم نے بھی تو عین وقت پر ملنے سے انکار کیا۔ باقی وہ دل کا برا نہیں ہے۔ تمہاری ماما کے جانے کے بعد میں کتنی محتاط ہو گئی ہوں۔ کتنے انڈسٹری کے لوگ ہیں جن سے تمہیں

خبردار رہنے کا کہتی ہوں۔ مجھے پتا ہے نا۔ وہ تمہارے لیے میزہ کے بعد اچھے ثابت نہیں ہو سکتے۔ مگر فیب راجا ان سب سے الگ اور اچھا

ہے۔ وہ تمہاری تنہا زندگی کا فائدہ نہیں اٹھائے گا۔ مخلص اور کھرا شخص ہے۔“ شمسہ نے حسب توقع

فیب کی طرف داری کی۔ ”مجھے نہیں پتا۔ میں نیکل کو اپنے ساتھ لے کر ہی آؤں گی۔ جسٹ وائچ اینڈ ویٹ۔“ منال نے

کہہ کر فون ہی آف کر دیا۔

”آپ پریشان لگ رہی ہو ادی۔“ مہراں کی آواز پر منال نے اسے دیکھا۔ ”آپ کی آنکھیں

بہت سرخ ہو رہی ہیں، رو کر بیٹھی ہو۔“ وہ اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔

”رو کر بیٹھو یا ہنس کر۔ تمہیں کیا۔“ وہ

نروٹھے پن سے بولی۔

”آپ نیکل ادی کو واپس لے جانا چاہتی ہیں۔“ اس کے سوال پر منال نے چونک کر دیکھا۔

”بتائیں نا ادی! آپ جانا چاہتی ہو چھوٹی ادی کو لے کر اور ادا شاور راضی نہیں۔“ مہراں کی باخبری پر وہ حیران ہوئی۔

”اسے راضی ہونا ہوگا۔ میں نیکل لے کر ہی جاؤں گی۔“ منال غصہ سے بولی۔

”پھر تو آپ کبھی ادھر سے نکل نہیں سکتیں۔“ مہراں نے سردائیں بائیں ہلایا۔

”نہیں نکل سکتی مائی فٹ۔ میں ابھی اسی وقت نیکل کو لے کر جا رہی ہوں۔“ وہ جذباتی ہو کر اٹھی۔

”آپ کیا سمجھتی ہو، آپ کو گیٹ سے نکلنے دیں گے۔“ مہراں ہنسا۔

”کیوں؟ کون روکے گا مجھے۔“

”منال ادی! آپ کو نہیں پتا، ادھر ادا شاور کا حکم چلتا ہے۔ گیٹ پر بیٹھے چوکیدار آپ کو نہیں

جانے دیں گے۔“ مہراں کی بات پر وہ خاموش سی ہو گئی۔

”لیکن فکر نہ کریں۔ آپ کے نکلنے میں ہم آپ کی مدد کر سکتے ہیں۔“ مہراں نے قریب کھسک کر ہلکی آواز سے کہا تو وہ بے طرح چونکی۔

”ہم کون؟“

”مطلب میں اور سوہائی ادی۔“ مہراں کی آواز مزید دہمی ہوئی۔

”وہ بد تمیز لڑکی۔ جس کو مہمانوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں۔“ منال نے ناگواری سے کہا۔

ان چار دنوں میں سوہائی کا رویہ اسے سخت برا لگا تھا۔

”نہیں ادی تو بہت اچھی ہے۔ پر اس کی ہر کسی سے نہیں بنتی۔“

”ہر کسی سے یا کسی سے نہیں بنتی۔“ منال نے تسخر سے کہا۔

”اچھا چھوڑیں اس بات کو۔ آپ کو تو ادھر سے لکھنا ہے نا۔ سمجھیں، آپ کا کام وہ با آسانی کر سکتی ہیں۔“

”لیکن تم دونوں میری مدد کیوں کرو گے؟“

منال مٹھکوک ہوئی۔



”اس لیے کیونکہ.....“ مہران کچھ گڑبڑ لایا۔  
”کیونکہ آپ کو اورادی نیمل کو سوہائی ادی پسند نہیں کرتیں۔ اس لیے وہ چاہتی ہیں آپ دونوں یہاں سے چلی جائیں۔“ وہ انگ انگ کر بولا۔ منال کو بے حد برا لگا پردہ ضبط کر گئی۔

”آپ آئیں تا میرے ساتھ۔“ مہران نے اصرار کیا۔

”میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں جس کو آنا ہے، ادھر آجائے۔“ منال کہہ کر اٹھ کر چل دی۔

☆☆☆

”حویلی کے پچھلی طرف ایک پھانک ہے جو کبھی استعمال نہیں ہوتا۔ اس سال خوردہ دروازے پر تالا ڈال رکھا ہے۔ میں انکل کر کے اسے کھلوا دوں گی۔ تم نیمل کو لے کر وہاں سے باہر نکل جانا۔ کسی کو ہتا نہیں چلے گا۔“ سوہائی نے اپنا آئیڈیا پیش کیا۔

”پھانک کے دوسری طرف ہے کیا؟ مطلب میں باہر نکل کر سواری وغیرہ کا انتظام کیسے کروں گی۔“ منال کے سوال پر مہران اور سوہائی نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

”حویلی کی پچھلی طرف کچے کا علاقہ ہے۔ کچھ ناقابل کاشت زمینیں۔ تمہیں کافی دیر چلنے کے بعد تانگہ وغیرہ مل جائے گا۔ اس میں بیٹھ کر ریلوے اسٹیشن چلی جانا۔ ٹکٹ میں مہران سے منگوا کر تمہیں دے دیتی ہوں۔“ سوہائی نے اطمینان سے بتایا۔

”تانگہ ملنے تک مجھے کچے کا کچا راستہ کون پار کروائے گا۔“ منال نے پوچھا تو سوہائی نے منہ بنا لیا۔

”مجھے لگتا ہے، تم ادھر سے لکھنا ہی نہیں چاہتیں۔ میں یا مہران تمہارے ساتھ گئے تو ہماری شامت پکی ہے۔ آپ ہی ہمت کرو۔ سیدھا سادا راستہ ہے جہاں ختم ہوگا، تانگہ مل جائے گا۔ پکی سڑک پر سارے تانگے کھڑے ہوتے ہیں۔ بانی تمہاری مرضی۔“ سوہائی نے بے نیازی دکھائی۔

”میں نے یہ کچے کے راستوں کا نام بھی پہلی بار سنا ہے۔ تمہاری طرح گاؤں گوٹھ کی پیداوار نہیں ہوں۔ تمہیں یا مہران کو مجھے گائیڈ تو لازمی کرنا ہوگا۔“ منال کو غصہ آیا۔

”اچھا ادی! میں آپ کو گ بے گائیڈ بھی کر دوں گا بس آپ ت سے تیاری پکڑو۔“ مہران نے جوش سے کہا تو باوجود غصے کے وہ سکرادی۔

”چلو تو پھر کل پکار رکھ لیتے ہیں۔ شاد رنج کوٹھڈو آدم جا رہا ہے۔ اس کے جاتے ہی ہم تمہیں روانہ کر دیں گے۔ پر خیال رہے، یہ جو پکڑے تم پہنتی ہو وہ بدل کر شلوار قمیص پہن کر چادر اوڑھ لیتا۔“ سوہائی نے اس کی جینز اور شرٹ کو دیکھ کر ہدایت کی۔

”میرے پاس نہیں ہے شلوار قمیص۔“ منال نے فوراً کہا۔

”میں دے دوں گی اپنی۔ ٹھیک ہے۔“ اس نے پیش کش کی تو منال نے برا سامنہ بنایا۔

”اوکے۔“ سوہائی اور مہران اس کے کمرے سے خوشی خوشی باہر چلے گئے۔

☆☆☆

اگلے دن سوہائی نے دوپہر کے کھانے کے بعد حسب وعدہ حویلی کے پچھلے گیٹ سے اسے باہر نکلنے کا راستہ دیا۔ چادر کی بگل مارے نیمل کو گود میں چھپائے وہ احتیاط سے پھانک سے باہر نکلی اور وہیں رک کر بغور ماحول کا جائزہ لیا۔ حد نظر تک اجاڑ سا منظر نظر آیا۔ خود رو پودے، جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔

”جلدی قدم بڑھاؤ۔ دیکھ کیا رہی ہو۔“ سوہائی کی آواز پر اس نے آگے چلنا شروع کیا۔ پیچھے پھانک بند ہونے میں ایک منٹ لگا تھا۔ منال نے قدموں کی رفتار بڑھائی۔ نیمل سوئی ہوئی تھی۔ اس لیے وہ بھاگ نہیں سکتی تھی ورنہ دل تو چاہ رہا پلک جھپکتے میں یہ راستہ باز کر لے۔ مگر راستہ بھی جھاڑیوں بھرا تھا۔ ان سے بچتی بچائی وہ احتیاط سے چلنے پر مجبور تھی۔



”کیا ہو جاتا اگر مہران میرے ساتھ چلا آتا۔  
کتنا مشکل ہے، بچی گود میں اٹھا کر چلنا۔“ منال نے  
سر سے پھسلتی چادر سنبھالی۔

”اف۔ نیکل کو اٹھاؤں یا خود کو چھپاؤں۔“ وہ  
جھنجھلا گئی۔ ”یہ تو دن کا وقت ہے کہ چلنا اتنا مشکل  
ہے، رات ہوتی تو کیا ہوتا۔“ اس نے جھنجھری لی۔

آگے کا راستہ اور دشوار ہو رہا تھا۔ ہمیں کہیں  
زمین بہت نرم تھی۔ وہ اس سے پرے ہٹ کر چلتی تو  
جھاڑیوں سے جا ابھرتی۔ تھوڑی دیر میں ہی منال کا  
سانس پھولنے لگا۔ بے آرامی سے نیکل بھی جاگ  
گئی تھی اور حیران آنکھوں سے خالہ کو دیکھ رہی تھی۔  
اس کے لیے منال کا چادر میں چھپنا حیرت انگیز تھا۔

”من مال۔“ وہ اس کی چادر کھینچ کر پکاری۔

منال کے پاس جواب دینے کی فرصت نہ تھی۔ وہ اس  
کچے سے جلدی نکلنے کے لیے کوشاں تھی۔ کافی دور پکی  
سڑک نظر آرہی تھی۔ منال کو تسلی سی ہوئی۔ اس نے  
اپنے چلنے کی رفتار بڑھائی۔ دائیں بائیں جھاڑیوں کو  
ہاتھ سے پرے کرتے وہ نیکل کو ممکنہ طور پر زخمی  
ہونے سے بچا رہی تھی کہ اچانک اس کا پاؤں رپٹا اور  
وہ دھڑ سے ان ہی جھاڑیوں کے بیچ جا گری۔ ایک  
کانٹے دار جھاڑ اس کی چہرے پر آگرا اور اس کا  
نوکدار کاٹنا منال کی دائیں آنکھ میں چھ گیا۔

”اللہ..... ماما.....“ منال نے اذیت سے چیخ  
ماری اور جھاڑ کو چہرے سے دور ہٹایا۔ نیکل گھبرا کر  
رونے لگی۔ منال اپنی آنکھ پر ہاتھ رکھ کر بہ مشکل  
اٹھی۔ نیکل اس کے اوپر گری تھی مگر محفوظ تھی۔

”ماما! میری آنکھ.....“ وہ اپنی بے بسی پر رونے  
لگی۔ اب دونوں خالہ بھانجی زور و شور سے رو رہی  
تھیں۔ دفعتاً قدموں کی واضح آہٹ ہوئی۔ کوئی  
جھاڑیاں پرے ہٹا تا ان تک پہنچا تھا۔

”منال.....“ شادور نے جھٹک کر نیکل کو گود  
میں اٹھایا تو منال رونا بھول گئی۔ اس کا دل ایک دم  
سکڑ کر پھیلا تھا۔

”یہ کیا حرکت کی ہے۔ نیکل کو لے کر بھاگ

رہی تھیں۔ تمہیں کیا لگا، یہ بات آسان ہے۔“ وہ  
سخت لہجے میں مخاطب تھا۔ منال پھوٹ پھوٹ کر رو  
دی۔

”اب رو رہی ہو جب پکڑی گئیں۔“ شادور اور  
سخت ہوا۔

”مم..... میری آنکھ..... میں اندھی ہو گئی  
ہوں۔“ اس کی اطلاع پر شادور نے دھیان سے اسے  
دیکھا جو اپنا ہاتھ دائیں آنکھ پر رکھے ہوئے تھی۔

”کیا ہو گیا ہے آنکھ کو۔“ وہ تھوڑا جھکا۔  
”جھاڑی گھس گئی ہے۔“ منال رو ہانسی ہو کر  
بولی۔ شادور نیکل کو اٹھائے بچوں کے مل زمین پر  
بیٹھا۔

”آنکھ کھولو، دکھاؤ مجھے۔“ اس نے منال کا  
ہاتھ ہٹانے کی کوشش کی۔

”نن..... نہیں۔“ آئی بال باہر نکل آئے گا۔“  
منال نے خوف زدہ ہو کر بدکی تو توبہ جو دغصے کے  
شادور کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی۔

”نہیں نکلے گا باہر۔ وہ تو پھوٹ چکا ہوگا۔“ پھر  
وہ سنجیدگی سے بولا تو منال اور ڈر گئی۔  
”ماما.....“ وہ سسکی تھی۔

”اچھا آنکھ سے ہاتھ ہٹاؤ۔ مجھے دیکھنے تو دو۔“  
شادور نے اس بار زبردستی اس کا ہاتھ ہٹا دیا۔ منال  
نے آنکھ میچ رکھی تھی۔

”اف او۔ اب آنکھ تو کھولو۔“ شادور نے جھنجھلا  
کر کہا۔ منال نے روتے روتے پوٹا ذرا سادا کیا۔  
اس کی آنکھ بے حد سوز ہو رہی تھی۔

”بند مت کرو، پوری کھولو۔“ شادور نے اپنی  
انگلیوں سے اس کی بند ہوئی آنکھ کھولی۔ خون آنکھ  
میں ابھرا ہوا برنجند نظر آ رہا تھا۔ اس نے اچھی طرح  
جائزہ لیا آنکھ کی پکی محفوظ تھی۔

”تم اچھے سے دیکھ سکتی ہو۔“ شادور کی بات پر  
منال نے بے بسی سے آنکھ جھپکی۔

”ہاں مگر بب..... بہت ہی دھندلا سا۔ کیا  
اب میں ہلائنڈ ہو جاؤں گی۔“ اس نے بے حد



تشویش سے پوچھا تھا۔

”چلو آؤ میرے ساتھ۔“ شاد نے جواب دینے کے بجائے اٹھ کر اس کا ہاتھ پکڑا۔ منال اس کے سہارے یہ مشکل اٹھی۔ اس کی چادر جھاڑیوں میں پھنس چکی تھی۔ چہرے پر بھی کھردھیں پڑی ہوئی تھیں۔ دائیں آنکھ خون رینگ رہی تھی۔ سنہری بال اچھے بکھرے تھے۔ روایتی شلوار قمیص میں ملبوس وہ اس کا ہاتھ پکڑے گھبرائی کھڑی تھی۔ شاد نے اس سے نظر پھیر کر جھاڑیوں میں پھنسی اس کی چادر چھڑائی اور اس کے کندھے پر ڈال کر قدم آگے بڑھائے۔

نیمل کو گود میں اٹھائے منال کا ہاتھ پکڑے وہ ٹاک کی سیدھ میں چلتا جا رہا تھا۔ اسی راستے پر جس پر چلنا کچھ دیر قبل منال کے لیے دشوار تھا۔ پکی سڑک پر شاد کی جیب کھڑی تھی۔ اس نے منال کے لیے فرنٹ ڈور کھولا، وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔ شاد نے نیمل کو اس کی گود میں دیا اور دوسری طرف سے گھوم کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھا اور جیب اشارت کر دی۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ منال کے سوال پر شاد نے اسے دیکھا۔

”اسپتال۔“ یک لفظی جواب دے کر جیب کی رفتار تیز کی۔

☆☆☆

اسپتال میں پہنچ کر شاد نے اس کو ایک مینج پر بٹھایا اور خود ریسپشن پر چلا گیا۔ وہاں سے پلٹا اور سیدھا ڈاکٹر کے کیمین میں چلا گیا۔ ڈاکٹر غالباً اس کی جان پہچان والا تھا۔ کافی مریضوں کو روک کر منال کو اندر بلوایا گیا تھا۔ وہ اندر داخل ہوئی تو شاد ڈاکٹر کے ساتھ خوش گیموں میں مصروف تھا۔ اسے آتا دیکھ کر سیل فون پر مصروف ہو گیا۔ ڈاکٹر فاران نے اس کی آنکھ کا اچھی طرح سے چیک اب کیا۔ پھر آنکھ کی صفائی انتہائی احتیاط سے کر کے منال کو ایک انجکشن لگایا۔ وہ درد سے تڑپ گئی۔

”آنکھ کی پتلی نقصان سے بال بال بچ گئی ہے۔ یہ شکر کریں اور آئندہ کسی بھی قسم کے ایڈونچر

سے پرہیز کیجیے گا مس منال۔“ ڈاکٹر کی بات پر منال نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”ایڈونچر۔“ وہ بڑبڑائی۔

”جی جھاڑیوں میں خواجواہ کھس کر سیلفی لیتا اور کیا کہلاتا ہے۔“

”سیلفی؟“ منال کی حیرت بڑھی۔

”بس فاران! کیا کہیں، یہ آج کل کی جزیشن سیلفی ایڈیکلڈ بن چکی ہے۔“ شاد نے موبائل جیب میں رکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

”اور یہ جزیشن اس سیلفی لو کے پیچھے کتنا نقصان اٹھاتی ہے۔ آئے دن ناگہانی اموات ہو رہی ہیں، دنیا میں اس نشے کے باعث۔ ٹرین کے آگے۔ پل کے اوپر۔ جہاز سے لٹکتے۔ بلڈنگ سے چھلانگ لگاتے۔ مطلب ایک انوکھی تصویر کھینچنے کے لیے جان جیسی قیمتی چیز گنونا کہاں کی عقل مندی ہے یار۔“

فاران نے کاغذ پر قلم کھینچتے افسوس سے کہا۔ منال کو اب کچھ سمجھ میں آ رہا تھا کہ شاد نے اس کے ساتھ ہوئے حادثہ کو دوسرا رنگ دیا ہے۔

”او کے فاران! پھر چکر لگا لگا تا حویلی کا۔“ شاد نے پر جوش معانقہ کر کے دوست کو آفر دی۔

”ان شاء اللہ ضرور۔“ فاران نے خوش دلی سے خدا حافظ کہا۔ باہر نکل کر شاد نے وہیں ایک میڈیکل اسٹور سے دوا میں لیں اور ان دونوں کو لے کر واپس حویلی آ گیا۔

واپس کے راستے میں اس نے منال سے پوچھا تھا کہ حویلی کا پھانگ کھول کر اس کی باہر نکلنے میں مدد کس نے کی۔ منال جواب میں چپ رہی۔ وہ کچھ دیر اسے منتظر نظروں سے دیکھتا رہا پھر نگاہیں پھیر لیں۔

”ویسے مجھے اندازہ ہے کہ یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے۔“ وہ بڑبڑایا تھا۔ منال کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

”دوبارہ نیمل کو لے کر حویلی سے نکلنے کا سوچا بھی تو میں بہت بری طرح پیش آؤں گا۔ یہ بات



ذہن نشین کرلو۔“ اس کی تنبیہ منال نے ناگواری سے سنی تھی اور اب وہ بیڈ پر نیم دراز صبح سے خود پریتے واقعات کو سوچ رہی تھی۔ وہ اگر جھاڑیوں سے الجھ کر نہ گرتی۔ شادور اگر عین وقت پر وہاں نہ پہنچتا تو۔۔۔ تو وہ نیمل کو لے کر شہر اپنے گھر چلی گئی ہوتی۔

نجانے قسمت میں کیا لکھا ہے۔ اچھا خاصا وقت گزر رہا تھا کہ اچانک انہونی ہو گئی۔ ماں، بہن، بہنوئی سب ایک ہی وقت میں ختم ہو گئے۔ سگے رشتے کے نام پر صرف یہ سخی پر پی ساتھ رہ گئی۔ اس کے وجود کی بدولت وہ پھر سے سانس لے سکی تھی ورنہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ تین لوگ اپنے ساتھ اس کی سانسیں بھی لے گئے ہیں۔ جینا کتنا دشوار ہو گیا تھا۔ ابھی زندگی لڑکھڑا کر اٹھی ہی تھی کہ یہ بندہ اچانک نمودار ہو گیا۔ نیمل کا حق دار بن کر۔ وہ نیمل کو اس سے جدا کرنا چاہتا تھا۔ نیمل جو منال کی ذات کا محور تھی اس کے گرد ہی تو منال کی حیات گھومتی تھی۔ اس کے بغیر بھلا جینے کا کوئی مقصد رہتا۔

”نیمل میرے وجود کا اٹوٹ حصہ ہے اس کو میں کسی کو نہیں سوپ سکتی۔ کبھی نہیں سوپ سکتی۔“ منال نے تکیہ پر سر رکھ کر پاس ہی بے خبر سوئی بھانجی کا چہرہ نم آنکھوں سے چوم لیا۔

☆☆☆  
”یہ گرلڈ چکن ہے اتنی زیادہ اسپاؤسی۔ ادھاڑ میرا منہ جل گیا ہے۔“ شینا کی چیخ و پکار سن کر شادور چکن میں چلا آیا۔ وہ سوہائی کے سر پر کھڑی برس رہی تھی اور سوہائی مزے سے دیکھی میں ڈوٹی گھمائی یوں ظاہر کر رہی تھی جیسے شینا کی اور سے مخاطب ہو۔  
”شینا! اماں میٹھی آرام کر رہی ہیں۔“ شادور نے تبہہ کی۔

”شادور اٹس ٹوچ اسپاؤسی۔“ شینا نے پلیٹ اٹھا کر شادور کے سامنے کی۔ چکن پر کٹی سرخ مرچوں کی بھرمار تھی۔

”سوہائی کیوں ڈالی ہیں مرچیں۔ تم جانتی ہو شینا لال مرچ سے اوائڈ کرتی ہے۔“ شادور سختی سے

مخاطب ہوا تو سوہائی بے نیازی چھوڑ کر ڈھٹائی سے ہنسنے لگی۔

”بھول گئی تھی شادور! کہ ہماری دسکی میم کو مرچوں سے الگ ہے۔“

”وہاٹ کا سنڈ ڈ آف دس بی ہیو یور۔ مسٹیک کر کے ہستی ہو۔ سلی اسٹوپڈ گرل۔ شادور میں آج ہی کراچی واپس جا رہی ہوں۔ پھر تین دن بعد واپس آسٹرلیا۔ یہاں اس لڑکی جیسے جاہل ریلیٹیو زاب مجھ سے بدداشت نہیں ہوتے۔“ شینا چلائی۔ شادور نے سوہائی کو غصے سے دیکھا۔

”کول ڈاؤن شینا۔“ پھر وہ شینا سے مخاطب ہوا۔

”نو اٹس انیف۔“ شینا نے پیر چٹا۔ ”اب صرف تم آسٹرلیا آؤ گے۔ میں دوبارہ کبھی نہیں آؤں گی۔ نہ یہ وجہ مجھے سوٹ کرتا ہے نہ اس جیسی ان ایجوکیٹڈ کزنز۔“ وہ حسی انداز میں کہہ کر چکن سے نکل گئی۔ شادور غصے سے سوہائی کی طرف پلٹا۔

”سوہائی! تم اپنی حدود سے نکل رہی ہو۔ اماں میٹھی کی عیادت کرنے ہماری کزن اتنی دور سے آئی ہے اور تم اس کو مسلسل زچ کر رہی ہو۔“ شادور کی بات پر اس کے نقوش تن گئے۔

”اماں میٹھی کی عیادت کرنے آئی ہے۔ دو منٹ کبھی ان کے کمرے میں رکی ہے؟ نواب زادی کو دواؤں کی بو سے بھی الگ ہے۔ ادھر کی مٹی سے الگ ہے، ماحول سے الگ ہے، کھانوں سے الگ ہے۔ بس الگ ہی الگ ہے۔“ سوہائی لڑا کا عورت کی طرح ہاتھ نچا کر بولی تو شادور کو اور تازہ چڑھا۔

”منال کو حویلی کا پچانک تم نے کھول کر دیا۔“ اس کے اچانک سوال پر سوہائی کے چہرے کا رنگ اڑا۔

”کک۔۔۔ کون سا پچانک۔“

”اچھا اب یادداشت بھی عائب ہو گئی۔“ شادور طنز اُٹھا۔

”کچی شادور! مجھے ایک لفظ پلے نہیں پڑا۔ تم



نجانے کیسا الزام مجھ معصوم پر لگا رہے ہو۔ میری وہ کون سی گورڈی سبکی ہے جو میں اس کی مدد کروں گی۔ اداکارہ، فنکارہ وضع دور کہیں کی۔“ سوہائی نے مظلوم منہ بتالیا۔

”اب زیادہ ٹانگ مت کرو۔ تم دن بدن سر چڑھتی جا رہی ہو۔ میں بھوپھو کو کہتا ہوں، اپنی لڑکی کو کنٹرول کریں ورنہ کسی دن میرے ہاتھوں فوت ہو جائے گی۔“ شناور نے آنکھیں دکھا کر دمکی دی اور کچن سے باہر نکل گیا۔

”ہاتھ لگائے بنا ہی فوت کر دیا ہے ظالماں۔“ سوہائی نے ایک بڑی سی سانس بھری پھر ہڑبڑا کر چلتے ہوئے ساکن کی طرف متوجہ ہوئی۔

☆☆☆

رات کو اسے سونے میں بہت دقت ہو رہی تھی آنکھ میں جھین ہی جھین تھی۔ درد کی گولیاں لیں پر آرام نہیں آیا تھا۔ وہ نیند سے بے حال جاگنے پر مجبور تھی۔ کروٹ بدل بدل کر آخروہ اٹھ بیٹھی۔ پاس ہی نیمل میٹھی نیند سو رہی تھی۔ منال آہستگی سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ یہاں بھی ہوکا عالم تھا۔ سب اپنے اپنے کمروں میں جھین کی نیند سوئے تھے۔ منال دل گرفتہ سی طویل راہداری کے دائیں بائیں بنے کمروں کے بند دروازے دیکھ کر چلتی رہی۔ اور آکر اماں میٹھی کے کمرے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس کا دل چاہا، اماں میٹھی کے کمرے میں جائے اور ان کو اپنی تکلیف بتائے۔ اماں میٹھی سے شفقی دلا بے کنی امید ضرور تھی۔ پر وہ کس منہ سے ان کے پاس جانی۔ بھلا ان کو اپنی اس حالت کی وجہ کیا بتاتی کہ ان کی جان سے عزیز پونی کو لے کر حویلی سے فرار ہو رہی تھی۔ ان کو یقیناً سن کر دکھ ہوتا۔ وہ سوچ کر وہیں ٹھہر گئی۔

”مگر ان کے دکھ کا سوچ کر کیا میں اپنی نیمل کو ادھر چھوڑ کر چلی جاؤں۔“ منال نے خود سے سوال کیا۔

”افب۔“ ایک دم آنکھ میں ٹیس اٹھی تھی۔ وہ

درد سے دوہری ہوئی۔ اس دقت اسے ماما شدت سے یاد آئیں۔

”مما! آپ کی بیٹی تکلیف میں بہت اکیلی ہے۔ آپ مجھ سے اتنی دور ہیں کہ میں آپ کو پکار بھی نہیں سکتی۔“ وہ بے اختیار رو پڑی۔ آنکھ میں پانی جمع ہوا تو تکلیف مزید بڑھ گئی۔

”اد میرے خدا۔“ وہ سسکنے لگی۔ اور وہیں دیوار سے ٹیک لگا کر ٹھنڈے فرش پر بیٹھ گئی۔ خاموش ماحول میں اس کی ہلکی ہلکی سسکیاں گونج رہی تھیں۔ دفعتاً اماں میٹھی کے کمرے کا دروازہ ذرا سدا ہوا اور روشنی کی ایک لکیر راستہ بناتی منال پر پڑی۔ دروازہ پورا کھل گیا تھا۔ شناور تیز قدموں سے گھٹنوں میں منہ چھپائے بیٹھی منال کی طرف بڑھا۔

”کیا ہوا ہے۔ کیوں رو رہی ہو؟“ وہ جھک کر پوچھ رہا تھا۔ منال کی سسکیوں میں اضافہ ہوا۔ وہ اتنی رات کو اس طرح بیٹھی رو رہی تھی، شناور پریشان سا ہوا۔

”منال! پلیز بتاؤ مجھے، کیا ہوا ہے؟“ شناور نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو وہ ایک دم چپ ہوئی۔ ”میری آنکھ دکھ رہی ہے۔“ وہ دھیمی آواز میں بولی پر سر نہ اٹھایا۔

”اوہ۔ اچھا ادھر سے تو اٹھو۔ کرتے ہیں کچھ تمہاری آنکھ کا۔“ شناور نے اس کا بازو تھام کر کہا تو ناچار منال کو اٹھنا پڑا۔ وہ اسے ساتھ لے کر اس کے کمرے میں داخلہ آیا۔

”اب بتاؤ کیا بات ہے۔“ شناور نے پوچھا۔ ”میری آنکھ بہت درد کر رہی ہے۔“ منال نے بھاری آواز سے کہا۔

”میڈیسن لی تھی۔“ اس کے سوال پر منال نے ناک رگڑتے سر اثبات میں ہلایا۔

”بھئی اب رونا تو بند کرو۔ آنکھ ضائع کر دو گی اپنی۔“ وہ جھنجھلا کر آگے بڑھا اور منال کی آنکھ کو بغور دیکھا جو رونے کے باعث مزید خون چھلکا رہی تھی۔ ”مجھے بہت زیادہ تکلیف ہو رہی ہے۔ میں کیا



کروں؟“ منال نے بے بسی سے کہا تو وہ فکر مند ہوا۔

”درد کی ایک اور ٹیبلٹ لے لو۔ اتفاق ہو جائے گا۔ اس وقت تو فاران بھی آرام کر رہا ہوگا۔“ شاور نے بالوں میں ہاتھ پھنسا کر گھڑی کی طرف دیکھا جو رات کے تین بج رہی تھی۔ منال نے فوراً میڈیسن باکس سے درد کی ٹیبلٹ نکال کر کھالی۔

”گڈ۔“ شاور نے اسے ٹیبلٹ لیتے دیکھ کر کہا۔

”اب کچھ درد کم ہو تو بتانا۔ صبح چلتے ہیں پھر ہسپتال۔“ اس نے تسلی دی تو منال نے اسے دیکھا جو الجھے بکھرے بالوں اور نیند سے بوجھل آنکھوں سمیت تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔

”آپ اماں میٹھی کے کمرے میں تھے، خیریت تو ہے۔“ منال کو اچانک دھیان آیا۔

”خیریت..... پتا نہیں۔“ وہ صوفہ پر ٹنڈا حال سا بیٹھ گیا۔

”کیا مطلب..... وہ ٹھیک تو ہیں۔“ منال بے چین ہوئی۔

”کینسر کا یہ اسٹیج کیمو تھراپی کا متقاضی ہے اور اماں میٹھی اس بار کیمو تھراپی پر آمادہ نہیں۔ تکلیف سے بے حال ہیں مگر مانتی نہیں۔“ وہ تھکے لہجہ میں بتانے لگا۔

”ادہ۔ یہ تھراپی بہت اذیت ناک مگر بہت ضروری ہوتی ہے۔ میری کزن بھی بلڈ کینسر کا شکار تھی۔ اس کی بھی ہوتی تھی۔“ منال نے سادگی سے بتایا۔

”تھی..... مطلب اب وہ حیات نہیں۔“ شاور نے پوچھا۔

”جی وفات ہو گئی اس کی۔“ منال اداسی سے بولی۔

”کینسر بہت جان لیوا مرض ہے۔ اپنی کزن کی وفات کے وقت مجھے یہی لگا کہ یہ مرض ہی زندگی چھینتا ہے۔ لیکن زندگی بیماری نہیں قسمت چھینتی ہے۔“

مقدر میں لکھا ہو تو ہنسنے کھیلنے صحت مند لوگ بھی مر جاتے ہیں۔ جیسے میری ماما بہن اور داور بھائی چلے گئے۔“ منال کی آوازیات کرتے مکمل بھیگ گئی تھی۔ شاور کا دل مٹھی میں آ گیا۔ وہ روتی ہوئی منال کو اس بار ٹوک نہ سکا۔

”خدا کرے اماں میٹھی حیات رہیں۔ ماں کی کمی اولاد کو توڑ دیتی ہے شاور۔ جس طرح میں اور نیمل ٹوٹ چکے ہیں۔“

منال کی اگلی بات مزید دل چیرتی ہوئی تھی۔ اس وقت اپنی باتوں سے یہ کم عمری لڑکی شاور کو چونکا رہی تھی۔ ڈیشیز ڈیل پر نظر آنے والی قدرے لا پرواہ اور اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں نظر آنے والی ضدی لڑکی سے قطعاً مختلف۔ ایک حساس اور ستم رسیدہ لڑکی دکھائی دے رہی تھی۔ کمرے میں اداس سی خاموشی پھیل گئی۔ منال روتے روتے خود ہی چپ ہو گئی اور اب شاور کے سامنے اپنے دکھ کے اظہار پر بچھتا رہی تھی۔ دوسری طرف شاور کسی سوچ میں کم تھا۔

”میرا خیال ہے، تمہارا درد کچھ کم ہوا ہے۔ اب تم آرام کرو۔ صبح ناشتے کے بعد فاران کے پاس چلیں گے، اوکے۔“ وہ ایک لمبی سانس بھر کر اٹھا اور نرمی سے کہہ کر باہر نکل گیا۔

☆☆☆

”ہائے اور با۔ اسماں کو لووڈی بھل ہو گئی سی۔ اے کڑی تے بھاگنے کی کوشش کے بعد شاور کے اور قریب آ گئی ہے۔“ سوہائی نے کھڑکی سے نیچے دیکھتے دہائی دی۔

”ادی! اس کی آنکھ پ سے پھوٹ گئی ہے تو اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا تو ضروری ہے۔“ مہران نے کھڑکی سے اچک اچک کر آخردیکھ ہی لیا کہ شاور منال کو گاڑی میں بٹھا کر لے جا رہا تھا۔

”نا تو روز روز کدھر جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر کو تو کل دکھا آئے۔“ سوہائی کو تسلی نہیں ہوئی۔

”ادی۔ میں سیڈی آنکھ وچ بخ سے خار ڈالتا



ہوں پھر دیکھتا ہوں کتنے ج سے چکر اسپتال کے لگاتی ہو۔“ مہراں کی بات پر سوہائی نے اس کے سر پر چپت ماری۔

”تو میرا سب سے بڑا دیری (دشمن) ہے۔“  
”ادی۔ ایسا نہ آکھ۔ میکو دکھ ہوندا اے۔“  
مہراں سر ہلاتا بولا۔

”اونہوں۔ دکھ ہوتا ہے۔ میں ہی چڑی ہوں جو تجھے دل کا احوال بتا دیتی ہوں۔“ وہ مسہری پر بیٹھ گئی۔

”نہ ماموں حق نواز اللہ کو پیارے ہوتے نہ شادور کو بیک ملتی۔ نہ وہ اتنا زور آور ہوتا کہ میرا شیوں ادا کاروں کی لڑکیاں ادھر لے آتا۔“

”ادی! میرا ادا کار کہاں کی۔ میں نے تو ٹی وی پر ایک بھی ڈرامہ منال ادی کا نہیں دیکھا۔ نہ وہ کسی وقفے میں دکھائی دی۔“

”آتی ہوگی ٹی وی پر۔ تو کون سا ہر وقت ٹی وی دیکھتا ہے۔“ وہ منہ بنا کر بولی۔

”سارنگ ماموں باہر کے ملک بس گئے۔ حق نواز ماموں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ بدراج ماموں بس جھگڑے فساد میں الجھے ہیں۔ اماں کا تو میکہ عی عجیب ہو گیا۔“ سوہائی نے آہ بھری۔

”بدراج مامے کا کس بات کا جھگڑا ہے ہمارے سے۔“ مہراں نے بھول پن سے پوچھا۔  
”ہم سے نہیں، حق نواز ماموں اور شادور سے۔“

بدراج ماموں بھولتے نہیں، داور ادا نے ان کی بیٹی کا ہاتھ چھوڑ کر اس منال کنال کی بہن سے شادی کر لی تھی سو آج تک خفا ہیں حالانکہ حق نواز ماموں نے داور اور نوال کو حویلی سے نکال باہر کیا تھا شادی کے بعد۔ اور پھر دوبارہ بیٹے کی شکل نہ دیکھی پر پھر بھی بدراج ماموں کو چین نہ پڑا۔“ سوہائی نے تفصیل سے بات بتائی۔ مہراں نے جیسے اکتا کر سر ہلایا۔

”اچھا سب چھوڑو ادی: مانو بوا کے ہاتھ کی ب سری کھاتے ہیں۔“ اس نے سوہائی کا ہاتھ پکڑا تو وہ ناچاہتے ہوئے بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

”تم نے اب آنکھ کو بالکل ٹیچ نہیں کرنا۔ نہ ہی بلا وجہ رونے دھونے کی ضرورت ہے۔“ فاران کی ہدایات پر پوری طرح عمل کرو۔ میڈیسن وقت پر لو اور ڈراپس بھی جیسے ہدایت دی ہے ویسے ڈالا کرو۔“ شادور نے اس کو ہاسپٹل سے واپس آتے ہی سمجھانا شروع کیا منال نے جواب میں سر ہلایا۔

”میڈیسن تو میں وقت پر لیتی ہوں۔ رونا تو کل رات درد کی وجہ سے آگیا تھا اور ڈراپس.....“ وہ کہتے کہتے رکی۔

”ڈراپس ڈالتی ہوتا۔“ شادور نے پوچھا تو منال نے نفی میں سر ہلایا۔

”کوشش کرنی ہوں ڈراپس ڈالنے کی مگر آنکھ بند ہو جاتی ہے۔“ وہ لب کاٹ کر شرمندگی سے کہتی ہوئی شادور کو بہت دلچسپ لگی۔

”لاؤ، میں ڈال دیتا ہوں۔“ اس نے رسان سے آفر کی تو منال ہجکی۔

”نہیں۔ میں ڈال لوں گی۔ آہستہ آہستہ پریکٹس ہو جائے گی۔“

”جب تک پریکٹس ہوگی تب تک آنکھ کا کباڑہ ہو چکا ہوگا۔ یہاں صوفہ کی بیک پر سر رکھو۔“ شادور نے ڈراپس کا ڈھکن کھول کر کہا تو منال صوفہ کی بیک سے کمرٹکا کر چہرہ اونچا کر کے بیٹھ گئی۔ شادور نے اس کی پیشانی سے سنہری بال پیچھے کیے پھر آنکھ کو اپنی انگلیوں سے پورا کھولا اور دو ڈراپس ڈال دیے۔

منال کے منہ سے سی نکل گئی۔  
”کسا ہوا؟“

”جلن۔“ منال نے لب کاٹے۔

”وہ تو ہوگی۔“ شادور سامنے صوفہ پر بیٹھ گیا۔  
”ویسے تم نوال بھابھی کی بہن لگتی نہیں ہو۔“ اس کی غیر متوقع بات پر منال چونکی۔ وہ اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

”کیسے نہیں لگتی۔ لوگ تو کہتے ہیں، میں ان کی ڈیٹو کا پی ہوں۔“ وہ جرات مان کر بولی۔



”چہرے کی بات نہیں کر رہا۔ عادت کی بات کر رہا ہوں۔“ اس نے رمان سے وضاحت کی۔

”لو! ال کے مقابلے میں تم بہت معصوم اور سادہ ہو۔ میڈیا انڈسٹری سے تو تمہارا تعلق بالکل محسوس ہی نہیں ہوتا۔“ وہ صاف کوئی سے بولا۔

”ممانے مجھے میڈیا سے انچ ہونے نہیں دیا۔ میں نے پندرہ سال کی ایجنسی میں ضد کر کے دو کمرشل کر لیے تھے۔ ممانے پر بہت ناراض ہوئی تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ میں ایک کامیاب ڈاکٹر بنوں۔ لیکن ان کا یہ خواب ان کی آنکھوں کے ساتھ ابدی نیند سو گیا۔“ منال سادگی سے بتاتے ہوئے ابدیدہ ہوئی۔ شاور لگاری اس کے صبح چہرے پر پھیلتے حزن کے سائے دیکھ کر بے چین ہوا۔

”نہ نہ..... اب رونا شروع مت کر دینا۔ ورنہ پھر سے فاران کے پاس جانا پڑے گا۔“ اس کی بات پر منال بے ساختہ مسکرائی۔ شاور سمرائز سا ہوا۔

”تمہاری یہ معصومیت، یہ سادگی بہت انمول ہے منال۔ تم اسے کبھی کھونے مت دینا۔“ شاور لگاری نے نچانے کس جذبہ کے تحت کہا۔ منال کی دھڑکن تیز ہوئی۔

”نہیں کھونے دو گی نا۔“ اس کا لہجہ اصرار بھرا تھا۔ منال نے دھڑکنوں کے شور کے درمیان اثبات میں سر ہلایا۔ شاور کی آنکھوں میں چمک لہرائی اور اس کے لب مسکرائے۔

☆☆☆

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں شمسہ آنٹی۔“ منال نے بے کل ہو کر پہلو بدلا تھا۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں منال۔ حاتم اور جی دونوں کل رات سے ہمارے بنگلے پر آئے بیٹھے ہیں۔“

”آپ نے ان کو ادھر رہنے کیسے دیا جبکہ میں بھی گھر میں موجود نہیں ہوں۔“ منال نے بے چینی سے اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیا۔

”اب میں کیا کر سکتی ہوں۔ حاتم کیسا بھی سہی

پر میزہ کا شوہر ہے۔ وہ حق رکھتا ہے اس گھر میں رہنے کا۔ میں دروازے بند کر دیتی تو وہ تڑوا کر اندر چلا آتا۔ مجھ سے پوچھتا، تم ہوتی کون ہو مجھے روکنے والی تو بتاؤ میں کیا جواب دیتی۔ تم گھر کی اصل مالکین ہو۔ تم یہاں موجود ہو تم تو بات دوسری تھی۔ مگر تم پر تو نیمل کی کسڈی کا بھوت سوار ہے۔“ شمسہ آنٹی کی بات پر منال نے لب بھینچ لیے۔

”وہ می کے ہی ضرور ہیں مگر ان سے اپنے سب تعلقات توڑ کر بیرون ملک بیٹھے تھے۔ ان کی وفات پر بھی نہیں آئے۔ اب اچانک کیوں ان کو ہمارا خیال آ گیا۔“ وہ سچ کر بولی۔

”بیٹا! اس کو کسی کا خیال نہیں آیا۔ وہ کسی اور چکر میں ادھر آیا ہے۔ میں حاتم کی خود غرض اور لالچی طبیعت کو اچھے سے جانتی ہوں۔ دونوں باپ بیٹا مل کر کوئی نیا جال بچھانے آئے ہیں۔ بس تم اب آج ہی یہاں آ جاؤ منال۔ میں بہت پریشان ہو گئی ہوں۔“ شمسہ آنٹی نے کہا تو وہ سوچ میں پڑ گئی۔

”آج.....“

”تو اور کتنے دن لگاؤ گی۔ نیمل کو اس کی دوھیال کے حوالے کرو اور نکل آؤ۔ میں بتا رہی ہوں منال! حاتم کے ارادے ٹھیک نہیں۔ اس نے تمہارے بیڈ روم تک پر قبضہ جمالیا ہے۔“ شمسہ آنٹی کی تنبیہ پر وہ بے چین ہوئی۔

اپنے حویلی سے چھپ کر نکلنے والے کارنامے سے ان کو بے خبر رکھا تھا۔ سو وہ اس کی آنکھ کے زخمی ہونے سے بھی ناواقف تھیں۔ عام حالات میں وہ واپس شہر جانے کا ابھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی پر اب حاتم انکل کی آمد کے بعد اس کا اپنے گھر پر موجود ہونا ضروری ہو گیا تھا۔ منال سچ سچ منہ سے کا شکار ہو گئی۔

”میں دیکھتی ہوں۔ نکلتی ہوں۔“

”ہاں ہاں جلدی نکلو اور نیمل کو وہیں رہنے دینا۔ دلو اور حاتم کے آپسی کشیدہ تعلقات تو تمہیں پتا ہی ہیں۔ کہیں وہ اس کی بچی کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرے۔ سمجھ رہی ہو نا منال۔“ شمسہ نے



ایک بار پھر باور کروایا۔

”جی آنٹی۔ ادا کے اللہ حافظ۔“ اس نے کہہ کر کال کاٹ دی۔

شناور کو تلاش کرتی باہری بیٹھک تک آئی۔ وہ اس وقت حسب توقع کمدا سے فصل کا حساب کتاب لے رہا تھا۔ منال وہاں آکر دروازے پر ہی رک گئی۔ شناور کی نظر ایک دم اس پر پڑی تھی۔

”ٹھیک ہے دل مراد! یہ لے جاؤ۔“ اس نے کمدا کو وہاں سے ٹھلایا۔ منال آہستہ قدم اٹھاتی اس کی طرف آئی۔

”کیسی ہو منال!“ وہ دوستانہ لہجہ میں بولا۔

”ٹھیک ہوں۔“ منال نے آہستہ سے کہا۔ وہ کہنے کے لیے دل میں الفاظ ترتیب دے رہی تھی۔

”کیا بات ہے منال! اپنی پرالیم۔“ اس نے منال کی پریشانی بھانپ لی تھی۔

”وہ..... شناور..... مجھے..... ابھی گھر جانا ہے۔“ منال نے اپنا مدعا بیان کیا۔

”گھر..... کیوں؟“ شناور نے پوچھ کر لب بھینچے۔

”بہت ضروری کام پڑ گیا ہے۔“ وہ اصل بات چھپا گئی۔ ”نیمل کو آپ کے پاس چھوڑ کر جاؤں گی۔ اس کا خیال رکھیے گا۔“ منال نے بہ دقت کہا تو شناور نے بغور اسے دیکھا۔

”نیمل کی فکر مت کرو منال۔ وہ میری بیٹی ہے۔ جتنا خیال مجھے رکھنا چاہیے، اس سے زیادہ ہی رکھوں گا۔ مگر تم نے اچانک واپس جانے کی کیوں ٹھان لی۔ آئی مین تمہاری آنکھ تو ابھی ٹھیک نہیں ہوئی۔“ اس کے سوال پر وہ خاموش رہی۔ شناور کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔

”ادا کے۔ اپنا بیگ وغیرہ لے آؤ۔ میں بھی شہر کی طرف جا رہا ہوں، تمہیں ڈراپ کر دوں گا۔“

شناور کی بات پر وہ وہیں کھڑی رہی۔

”آپ ایک وعدہ کریں۔“

”کیسا وعدہ؟“ شناور حیران ہوا۔

”آپ نیمل کا بہت خیال رکھیں گے۔ وہ مجھ سے بہت اچھا ہے۔ نجانے کیسے رہ پائے گی میرے بغیر۔ میری مجبوری نہ ہوتی تو میں اس کو چھوڑ کر اس طرح بھی نہیں جاتی۔“ منال نے اضطراری انداز میں انگلیاں چٹختائیں۔

”منال! میں نے کہا تھا فکر مت کرو۔ میں نیمل کا اچھے سے خیال رکھوں گا اور اب تو اس نے ادھر ہی رہنا ہے۔“ شناور کی آخری بات منال کو ناگوار گزری پر وہ خاموشی سے واپس پلٹ گئی۔

☆☆☆

ڈرائیونگ کرتے وہ منال پر گاہے بے گاہے نظر ڈال رہا تھا جو اپنی سرخ متورم آنکھ کے نچلے کونے کو ٹشو سے سہلاتے پریشان نظر آرہی تھی۔ نجانے کیا پریشانی تھی اسے۔ شناور نے سوچا۔ دفعتاً منال کا فون بجا۔ شمسہ آنٹی کال پر تھیں۔

”جی شمسہ آنٹی۔“

”بیٹا! وہاں سے نکل گئی ہو؟“ انہوں نے فوراً پوچھا۔

”جی آنٹی۔ میں آرہی ہوں۔ آپ فکر مت کریں۔“

”ہاں جلدی آؤ۔“ انہوں نے کہہ کر فون بند کر دیا۔

منال نے فون بیک میں ڈالا اور آنکھیں بند کر کے سیٹ کی پشت سے کمر نکا دی۔

”وہاں جا کر کسی اچھے آئی اسپیشلسٹ سے ضرور کنسلٹ کرنا۔ آنکھ کا معاملہ ہے۔ ادھر تو عجلت میں دکھانا پڑا۔“ شناور نے کہا تو منال نے بند آنکھوں سے سر ہلا دیا۔ باقی کا راستہ خاموشی سے کٹا۔ اس کے گھر کے آگے گاڑی جھٹکے سے رکی تو منال نے آنکھیں کھولیں۔

”گھر آ گیا کیا؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔ شناور مسکرایا۔

”سوری مجھے شاید خیند آگئی۔“ منال کچھ شرمندہ ہوئی۔



”سوری فار وہاٹ۔ دو تین راتیں آنکھ کی تکلیف میں جاگی ہو، اچھا ہے نیند پوری کر لی۔“ وہ نرمی سے بولا تو وہ مسکرا دی۔

پچھلے کچھ دنوں سے شنادر کا رویہ اس کے ساتھ کافی دوستانہ ہو گیا تھا۔

”اوکے، اللہ حافظ۔“ ہارن بجانے پر گیٹ کھلا تو منال نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔

”اللہ حافظ۔“ شنادر نے گاڑی اسٹارٹ کی۔  
”شنادر.....“ وہ گاڑی سے اترتے ہوئے رکی اور مڑ کر شنادر کو دیکھا۔

”کیا ہوا؟“ شنادر کی آنکھوں میں سوال اتر ا۔  
”نیمل کا بہت خیال رکھیے گا۔“ منال نے بے قرار لہجے میں کہا۔

”ڈونٹ وری منال! تم نیمل کی طرف سے بے فکر ہو جاؤ۔“ شنادر نے یقین دلایا تو منال خاموشی سے گاڑی سے اتر گئی۔۔۔ شنادر اس کو اندر جانے تک دیکھتا رہا۔

☆☆☆

گھر میں داخل ہوتے ہی برآمدے میں بے چینی سے ٹپکتی شمسہ آنٹی اس کی طرف تیزی سے بڑھیں۔ وہ ان سے لیٹ گئی۔

”بیٹا شکر ہے، تم جلدی آئیں۔“ انہوں نے اس سے الگ ہوتے ہوئے کہا پھر منال کا چہرہ دیکھ کر چونک گئیں۔

”یہ تمہاری آنکھ کو کیا ہوا ہے۔“

”وہ..... ایسے ہی انفیکشن ہوا ہے۔ آپ یہ بتائیں، حاتم اکل اور جی کہاں ہیں۔“ منال نے نظر چرائی اور اندر داخل ہو کر پوچھا۔

”ادھر ہی ہیں۔ کہاں ہوں گے۔ ساری رات چائے کافی بنوا بنوا کر اوپر بھجوائی رہی۔ دروازہ بند کر کے بیٹھے تھے اوپری پورشن کا۔ تھوڑی دیر کے لیے چائے پانی کے لیے کھولتے پھر دھڑسنے بند۔“ شمسہ نے منہ بنا کر بتایا۔

”اوگاڈ۔ آپ جانتی ہیں، اوپر میرا کمرہ ہے اور

اس کمرے میں.....“ منال نے گھبرا کر کہا اور سٹرکیوں کی طرف دوڑ لگائی۔ شمسہ اس کے پیچھے نکلیں۔ اوپر لاؤنج کا دروازہ بند تھا۔ وہ ہتھیلی سے بجانے لگی لیکن جواب ندارد۔ وہ کافی دیر بجاتی رہی۔  
”شمسہ آنٹی! نیچے دراز سے ایک سڑا چایاں تو لائیے گا۔“ اس نے پلٹ کر نیچے کھڑی شمسہ آنٹی سے کہا۔

”او مائی بے بی۔ ہاؤ آر یو۔“ پیچھے دروازہ کھلنے کے ساتھ ہی اسے اپنی پشت پر حاتم کی آواز سنائی دی۔ پھر دو مضبوط ہاتھ اس کے کندھوں پر آدھرے۔ منال کرنٹ کھا کر پلٹی۔ حاتم ایک دم ہی چونکا تھا۔

”واؤ منال بے بی! آپ تو بڑی ہو گئی ہیں۔ اتنا سادہ دیکھا تھا آپ کو۔“ حاتم نے کہا تو منال کی آنکھوں سے ناگواری چھلکی۔  
”تین سال پہلے کی بات ہے۔ آپ ویانا سے کچھ دن پاکستان رہنے آئے تھے۔“

”ہا ہا..... اچھا۔ تین سال..... صرف تین سال میں آپ بچی سے ایک خوب صورت دوشیزہ بن گئیں۔ واہ جناب۔ بہت جلدی کی۔“ حاتم عجیب انداز میں ہنسا تھا۔ وہ غصہ دہانی اپنے کمرے کی طرف بڑھی جس کا دروازہ ادھ کھلا تھا۔ نیم اندھیرے میں اس کو اپنے بستر پر اونڈھا لیٹا ہوا جی نظر آیا۔ منال نے کمرے کی لائٹس جلا لیں اور بیڈ کے قریب آئی۔

”اٹھو میرے بیڈ سے۔“ اس نے جھک کر اونچے پورے جی کو کندھوں سے جھنجھوڑا۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

”اسے نیند لینے دو۔ کیوں ڈسٹرب کر رہی ہو بے بی۔“ حاتم اندر چلا آیا۔

”یہ میرا ذاتی کمرہ ہے آپ کیوں ادھر سوئے۔ نیچے گیٹ روم ہے نا۔“ منال نے جھنجھلا کر حاتم کو دیکھا۔

”گیٹ کہہ کر ہمیں پرایا تو نہ کرو۔ یہ گھر ہمارا



اپنا ہے بے بی۔“ اس نے اسی مسکراہٹ سے کہا تو منال کا غصہ بڑھا۔

”یہ گھر آپ کا نہیں۔ آپ جائیں یہاں سے۔“ وہ چیختی۔

”کول ڈاؤن بے بی۔ بالکل نوال کی طرح چنتی ہو۔ باپ کا احترام کرنا نہ اسے آیا نہ تمہیں۔“ حاتم نے اسے چڑایا۔

”نہیں ہیں آپ میرے پاپا۔ آپ صرف می کے شوہر تھے۔ اب وہ رشتہ بھی ٹوٹ چکا ہے۔“ منال جذباتی ہو کر بولی۔

”ڈیڈ! یہ اپنی منال ہے۔ بھی اس کو زبان مل گئی گریٹ۔“ جمی نے اٹھ کر ایک بھر پور انگریزی لی اور مصنوعی حیرت سے باپ سے پوچھا۔

”وہی میں بھی دیکھ رہا ہوں بیٹا۔ بالکل نوال کی طرح بی ہو کر رہی ہے۔ خود تو بے چاری دوسری دنیا چلی گئی۔ مگر کل سسٹر کو زبان دے گئی۔“ حاتم نے بیٹے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ کر کہا تو دونوں نے قہقہہ لگایا۔

”آپ ابھی کے ابھی نکلیں میرے روم سے۔“ منال اب روہانسی ہو کر بولی تھی۔

”نہ نکلیں تو؟“ جمی بیڈ سے اتر کر ہاتھ سے الجھے بال سنوارتا منال کے مقابل آگیا۔ منال کو اس کے انداز سے خوف سا آیا۔ وہ گزرے سالوں میں جسامت اور ڈیل ڈول کے لحاظ سے منال سے دوگنا بڑا نظر آ رہا تھا۔

”یہ گھر اب ہمارا ہے منال ڈیر! اور یہاں رہنے سے ہمیں کوئی نہیں روک سکتا۔ آپ جتنی جلدی یہ بات سمجھ جائیں اچھا ہے۔“ اس نے منال کی ٹھوڑی اپنی انگلی سے اٹھا کر سرد لہجے میں کہا تھا۔ منال سراپمہ ہو کر دور ہوئی۔

”ڈیڈی! آپ نیچے جا کر ناشتہ تیار کروائیں، میں فیریش ہو کر آتا ہوں۔“

جمی نے منال کے خوف کو بھانپ کر لطف انداز لینے والے میں باپ سے کہا اور واش روم میں

چلا گیا۔ حاتم نے دروازے پر ساکت کھڑی شمسہ کو ایک طرف دھکیلا اور باہر نکل گیا۔

منال اس کے جاتے ہی جیسے ہوش میں آئی اور تیزی سے اپنی الماری کی طرف بڑھی۔ الماری کا لاک کھلا ہوا تھا۔ وہ زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھی اور جھک کر سب سے نچلے اور خفیہ خانے کو دیکھا۔ اور دھک سے رہ گئی۔ اس خانے کا لاک بھی کھلا ہوا تھا۔ منال نے بے کل ہو کر خانے کو ہاتھ سے ٹوننا شروع کیا۔ لیکن وہ بالکل خالی تھا۔ اس کو چکر سے آگئے۔ اس بیگلے کے کاغذات سمیت ساری اہم دستاویز غائب تھیں۔ منال کا دل چاہا وہیں پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دے۔

”کیا ہوا منال؟“ شمسہ نے ساکت بیٹھی منال کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”حاتم انکل اور جمی نے سارے کاغذات چرا لیے آنٹی۔“ منال کی رنگت اڑی ہوئی تھی۔

”ہائے میرے اللہ۔“ شمسہ نے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔ اتنے میں واش روم کا دروازہ کھول کر جمی گنگناٹا ہوا باہر نکلا۔

”کہاں ہیں میری اہم فائلز۔ تمہاری ہمت کیسے ہوئی میری الماری میں ہاتھ ڈالنے کی۔“ منال جمی کو دیکھ کر بھراٹھی اور اٹھ کر اس کا گریبان دبوج لیا۔

”کون سی فائلز ڈیر سسٹر۔“ اس نے اداکاری دکھائی۔

”اپنی گندی زبان سے اس مقدس رشتے کا نام مت لو۔ کچھ نہیں لگتے تم میرے۔“ وہ چلائی تھی۔

”شمسہ آنٹی۔ اس کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں لگتا۔ بات بات پر چیخ چلا رہی ہے۔ لگتا ہے منیرہ آنٹی اور نوال کی موت کا صدمہ دل پر لے لیا ہے۔“ جمی نے اپنا گریبان اس کے ہاتھوں سے چھراتے طنزیہ انداز میں کہا۔

”میری ساری فائلز واپس کرو۔ بتاؤ، مجھے کہاں چھپائی ہیں۔“ منال ایک بار پھر اس پر چبھتی۔



”شمسہ آنٹی! اس کو منع کریں ورنہ میں کچھ کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔“ جمی نے اس بار منال کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں جکڑ کر دھمکی دی۔

”منال! بیٹا چھوڑو۔ ادھر آؤ۔“ شمسہ نے منال کو کھینچ کر جمی سے دور کیا۔

”آنٹی! اس سے کہیں میرے پیپرز واپس کرے۔“ وہ شمسہ کی بانہوں میں پھل رہی تھی۔

”ہا ہا ہا..... بھول جاؤ اب ہر چیز کو۔ اب سے سمجھو، یہ بنگلہ بھی ہماری ملکیت ہے۔ بہتر یہی ہے شام تک یہ گھر خالی کر دو۔ اگر یہاں سے سلامت جانا چاہتی ہو تو ورنہ کم عمری میں ہارٹ اٹیک آنا آج کل عام بات ہے۔“ جمی کے لہجے کی سفاکی نے شمسہ کو ہولا دیا۔

”کیا کہہ رہے ہو بیٹا۔ کچھ خدا کا خوف کرو۔ منال کو اس کے ہی گھر سے بے آسرا کر رہے ہو۔ یہ منال کا گھر ہے۔“

”کیا ثبوت ہے آپ کے پاس؟“ وہ دانت پر دانت جما کر پوچھ رہا تھا۔

”یہ گھر میری کمی کا ہے..... میرا ہے۔ تم نے پیپرز چرا لیے ہیں۔ میں کورٹ میں جاؤں گی۔ دیکھنا کیسے حاصل کرتی ہوں دوبارہ اپنا گھر۔“ منال کی بات پر جمی قہقہہ لگا کر ہنسا اور ہنستا ہی چلا گیا۔

”ہا ہا ہا..... ایف خالی پیٹ میں ملے پڑ گئے۔ بہت فنی باتیں کرتی ہو منال۔“ وہ کچھ دیر بعد چپ ہوا۔

”کورٹ میں بھی چلی جانا۔ کہیں حسرت نہ رہ جائے۔ شمسہ آنٹی! آپ اس کی سیکورٹی کا خاص انتظام کر لیں۔ کورٹ میں جانے سے پہلے یہ کہیں اور ڈرٹ نہ چلی جائے۔“ جمی کے تاثرات ایک دم سخت ہوئے تھے۔ شمسہ کا دل پھر حلق میں آیا۔

”میرا مخلصانہ مشورہ مانیں آنٹی! اس ٹین ایجر جذباتی لڑکی کو ادھر سے لے کر چلی جائیں ورنہ بہت نقصان اٹھائیں گی آپ بھی اور اسے سمجھائیں۔ ہم سے بچنے لینے کا خیال دل سے نکال دے ورنہ وہ نوال کی بیٹی کیا نام ہے اس کا..... ہاں نیمل.....

نیمل کہیں ماں کے بعد اپنی اکلوتی خالہ سے بھی نہ محروم ہو جائے۔“ جمی سخت لہجے میں کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ منال کا چہرہ سفید پڑ چکا تھا۔

”منال..... ادھر سے نکل چلو بیٹا۔ یہ باپ بیٹا بہت ظالم ہیں۔“ شمسہ سرسراہی آواز میں بولی تھیں۔

”میں اپنا گھر چھوڑ دوں آنٹی۔“ منال کرلا کی تھی۔

”اس کے سوا چارہ نہیں منال۔“ وہ ہار کر بولیں۔

”حاتم سے شادی میزہ کی سب سے بڑی غلطی تھی جس کا خنیاڑہ اس نے ساری زندگی ادا کیا ہے۔ تمہارے بابا کی ناگہانی موت کے بعد میزہ کی زندگی میں یہ شیطان نجانے کہاں سے چلا آیا۔ بہت سمجھایا تھا میں نے میزہ کو۔ پر اس کی آنکھیں حاتم کی ہمدردی اور فریبی محبت نے باندھ دی تھیں۔ حاتم سے نکاح کر کے اس نے ایک عذاب مول لیا۔ یہ مکار لڑکا بھی باپ کے ساتھ میزہ کا جینا اجیرن کرنے چلا آیا۔ دونوں نے جی بھر کر زچ کیا میزہ کو۔ دنیا گھوٹے ہیں میزہ کے پیسوں سے۔“ شمسہ نے افسردگی سے آہ بھری۔

”ساری زندگی اسے بلیک میل کیا حاتم نے۔ نوال کی شادی کے بعد کہیں سلسلہ رکا۔ داد نے ان دونوں کو ایسا سبق سکھایا کہ تین سال تک ادھر کا رخ نہ کر سکے نہ کوئی مطالبہ کیا۔ پر قسمت نے اس کی بھی عمر کم لکھی تھی۔“

ان کی باتوں پر منال کی آنکھیں بھر آئیں۔

”میں اس دن چلی جاتی تھی اور نوال کے ساتھ۔ کیوں رہ گئی گھر پر..... نہ میں زندہ ہوتی نہ اکیلے یہ پر اہل مزہ دیکھنے پڑتے۔“ اس کے شکوے پر شمسہ نے بے اختیار اسے گلے لگایا۔

”اللہ نہ کرے۔ کیسی باتیں کر رہی ہو۔ اللہ تمہیں لمبی اور سکون والی زندگی نصیب کرے۔“ انہوں نے دعا دی۔

”اچھا۔ اب اپنی ضروری چیزیں سمیٹو اور ادھر



سے نکل چلو۔“ شمسہ کی اگلی بات پر منال نے بے بسی سے لب کچلے۔

”یہ میرا گھر ہے آنٹی۔“

”مصلحت کا تھا ضابطہ ہی ہے بیٹی کہ فی الحال ہم اپنی جگہ چھوڑ دیں۔“ ان کی بات منال نے بڑے ضبط سے سنی۔

☆☆☆

”اف..... یہ کیا ہو گیا۔ حاتم انکل اور جی تو بہت مکار نکلے۔“ عمیمہ نے افسوس سے سر ہلایا۔

”وہ دونوں ہمیشہ سے عیار، مکار رہے ہیں بیٹا۔ حاتم نے منیزہ کا جینا دو بھر کر رکھا تھا۔ نوال کی شادی کے بعد کچھ سکون ملا۔ داور نے اچھے سے ہینڈل کیا ان کو۔ مگر آہ..... قسمت۔“ شمسہ ٹھنڈی سرس بھر کر خاموش ہوئیں۔

”پاپا ترکی گئے ہوئے ہیں ورنہ وہ ضرور کچھ ہیلپ کرتے۔ کم از کم کورٹ میں کیس تو ہم بھی دائر کر سکتے ہیں۔“ عمیمہ نے منال کو دیکھا جو خاموش بیٹھی تھی۔

”حاتم بہت خطرناک ہے اور منال کل کی بچی۔ بنا کسی مرد کی سپورٹ کے بالکل تنہا۔ کہاں تک لڑ پائے گی ان سے۔ بینک میں جو روپیہ پیسہ رکھا ہے اسی سے کام چلائیں گے۔ زمین جائیداد لے جائے اپنے ساتھ قبر میں۔ ظالم۔“ شمسہ آنٹی نے خدشہ ظاہر کر لیا۔

”مگر اس طرح اپنا حق ان دونوں کو کیوں سونپ دے۔ منال کو کیس لڑنا چاہیے۔“ عمیمہ جذباتی ہوئی۔

”ارے بچی۔ کس برتے پر کیس لڑے۔ کوئی سائیں سر پر نہیں، کوئی سہارا ساتھ نہیں۔ وہ شقی مرنے مارنے کی دھمکی دے رہا ہے۔“ شمسہ آنٹی نے عمیمہ کو سمجھایا۔

”ہم ہیں نا منال کے ساتھ، میں اوز پاپا۔ ہم سپورٹ کریں گے اس کی۔“ عمیمہ نے مضبوط لہجے میں کہا تو اس کی محبت پر منال کی آنکھیں جھللا

گئیں۔

”اللہ تمہیں سلامت رکھے، بہت پیارے دل کی بچی ہو۔ میرا مطلب یہ تھا کہ منال کی شادی ہو جائے، کوئی اچھا ہمسفر اسے مل جائے تو بھلے لڑتی رہے اپنے حق کے لیے سوکیں۔ ابھی یہ اس پوزیشن میں نہیں بیٹی! تم اور بھائی صاحب بے شک ساتھ دو گے مگر اس کا شوہر اس کی ڈھال بنے گا، اس کو ڈھارس ملے گی۔“ شمسہ کی بات پر عمیمہ افسردگی میں بھی ہنس پڑی۔

”شمسہ آنٹی! بظاہر آپ ماڈرن برادر سے بالکل مشرقی عورت ہیں۔ مطلب اب منال کو مضبوط سہارے کے لیے اتنی سی عمر میں شادی کرنی ہوگی اور شادی کے بعد اگر مل گیا کوئی حاتم جیسا بندہ تو..... اس کی ڈھال بنے گا یا ریگ مال۔ جس کا کام اس کی مال و دولت کھرچنا ہوگا۔“

”اللہ نہ کرے۔ کیسی باتیں کرتی ہو عمیمہ!“ شمسہ دہل گئی۔

”چھوڑیں شمسہ آنٹی! منال کو خود پر بھروسہ کرنے دیں۔ اسے یہ سمجھنے دیں کہ اپنے مسائل ہم خود حل کر سکتے ہیں، کوئی دوسرا بندہ نہیں اور شوہر حاتم انکل جیسے بھی نکل سکتے ہیں۔“ عمیمہ کی بات شمسہ نے خفگی سے سنی۔

”بیٹا! اچھی امید رکھنا ہمارا کام ہے اور اسے پورا کرنا اللہ کا کام۔ شوہر داور جیسا بھی ہوتا ہے جس نے نوال کی محبت میں اپنا سب کچھ چھوڑ دیا۔ اپنی بیوی کو مکمل سپورٹ کیا۔ منیزہ کا بچ بچ کا بیٹا بن کر دکھایا۔“

”نوال لکی تھی آنٹی! اللہ کرے منال کو بھی داور بھائی جیسا شوہر ملے۔“ عمیمہ نے دل سے دعا دی تو منال کے تصور میں شناور کا مضبوط سراپا ابھرا گیا۔

”شناور بھی تو داور جیسا ہے۔ توجہ محبت دینے والا۔ فکر کرنے والا۔ بظاہر سخت اندر سے نرم۔“

”آمین۔“ شمسہ کی آواز پر وہ اپنے خیال سے چونکی اور چور نظر دونوں پر ڈالی۔



”یہ میں کیا سوچ رہی ہوں۔“ پھر خود کو سرزنش کی۔  
”چلیں جانے دیں ان پریشانی والی باتوں کو۔  
میں آپ کو اپنے ہاتھ کا اچھا سا برگر بنا کر کھلاتی ہوں۔“ عیمہ نے ہلکے پھلکے انداز میں بات کا رخ بدلا۔

☆☆☆

”السلام علیکم۔“ اس نے دھیمی سی آواز میں سلام کیا۔  
”منال۔“ شادور ہڑبڑا کر کچی نیند سے جاگا اور موبائل کو کان سے قریب کیا۔  
”خیریت تو ہے، اتنی رات گئے۔“ اس نے فکر مند ہو کر پوچھا۔

”خیریت ہی ہے۔ بس نینل کی بہت یاد آ رہی تھی۔ اسے دیکھنے کو دل چاہ رہا تھا۔ سوچا اس وقت سو رہی ہوگی تو ویڈیو کال کر کے اس کا چہرہ دیکھ لوں۔“ منال کے انداز میں بے قراری تھی۔  
”آ۔ ہاں کیوں نہیں۔ تم فون رکھو، میں نینل کے پاس جا کر تمہیں ویڈیو کال کرتا ہوں۔“ شادور بستر سے نکل کر باہر آیا۔ نینل کے کمرے کا دروازہ آہستگی سے کھولا۔ اندر نائٹ بلب کی نئی روشنی پھیلی تھی۔ سنگل بیڈ پر نینل کبل میں لیٹی بے خبر سو رہی تھی۔ اس کے برابر میں صوفہ کم بیڈ پر خولہ سوئی ہوئی تھی۔ شادور نے ویڈیو کال ملائی۔ منال نے فوراً ریسیو کی۔ اس کا گلابی چہرہ موبائل کی اسکرین پر ابھرا تو شادور مبہوت سا ہوا۔

”نینل کو دکھائیں نا۔“ منال نے بے تابانہ سے کہا تو شادور جیسے چونکا۔

”ہاں دیکھو۔“ اس نے نینل کے اوپر پڑا کبل تھوڑا نیچے کر کے کیمرا اس پر سیٹ کیا۔ تھی پری فلیش لائٹ پڑنے سے کچھ کسمائی تھی۔ منال نے اتنے دنوں بعد بھانجی کا چہرہ دیکھا تو بے اختیار رو پڑی۔

”میری نینل! خالہ کی جان..... مائی ہول

ورلڈ۔“ وہ بے قرار ہو کر پکاری۔ اس ہلکی بھگی آواز میں کوئی جادو تھا۔ نینل نے ایک دم آنکھیں کھولیں۔ شادور نے فوراً موبائل کمرے کے پیچھے کر لیا اور دور ہٹا۔ نینل نے نیند کے غلبے سے آنکھیں دوبارہ بند کر لیں۔  
”دیکھ لیا۔ بس!“ شادور نے پلٹ کر موبائل آنکھوں کے آگے کیا۔

”نن۔۔۔ نہیں۔ میرا دل نہیں بھرا۔“ منال کی روئی روئی صورت سامنے تھی۔  
”وہ یہاں بہت مشکل سے ایڈجسٹ ہوئی ہے منال۔“  
”تو میں کیا کروں۔ مجھے اپنی نینل سے بات کرنی ہے، اسے جی بھر کر دیکھنا ہے۔“ منال چیخ کر بولی۔

”تو میں نے کب منع کیا ہے۔ تم اسے مس کر رہی ہو تو ملنے آسکتی ہو۔ فون پر تو وہ تمہیں دیکھ کر صرف بے چین ہوگی۔“ شادور نے رمان سے سمجھایا۔

”بہت شکریہ۔ آپ کا احسان ہے کہ ملنے کی اجازت دی۔“ منال کی خشکی ہنوز تھی۔  
”میں نے تمہیں جانے کا بھی نہیں کہا تھا۔ اچانک خود ہی چلی گئیں۔“ شادور لغاری نے مسکرا کر اس کا چہرہ دیکھا۔

”نینل آپ کے پاس میری امانت ہے۔ میں اپنے مسائل حل کر لوں تو آپ سے واپس لے لوں گی۔“ منال نے ضدی پن سے جتایا۔

”اچھا سائیں۔“ وہ بدستور مسکراتا رہا۔  
”آپ میری بات کو ہلکا مت لیں شادور لغاری!“ وہ جھنجھلائی۔

”میں کہاں ہلکا لے رہا ہوں۔ ایسا کرو نینل کے ساتھ تم بھی میری حویلی میں ہمیشہ کے لیے رہنے آ جاؤ۔“ شادور نے ایک دم کہا تو منال نے چونک کر اس کو دیکھا۔ اس کے لیوں کی تراش میں مسکراہٹ تھی۔

”اے۔ کون ہے۔“ عیمہ چپکے سے آکر منال



سے لگ کر بیٹھی تھی پھر اسکرین پر نظر پڑی تو چوکی سی گئی۔

”اماں میٹھی کیسی ہیں۔“ منال نے اپنی منتشر دھڑکنوں کو سنبھالا۔

”بس ویسی ہی ہیں۔ جیسی تم چھوڑ کر گئی تھیں۔“ شادور نے جواب دیتے غمیرہ کو دیکھا۔

”یہ میری دوست غمیرہ ہے۔“ منال نے اسکرین غمیرہ کی طرف کی۔

”السلام علیکم! کیسی ہیں؟“ شادور نے مہذب انداز میں پوچھا۔

”وعلیکم السلام۔ الحمد للہ۔ کافی جس گے؟“ غمیرہ نے بجاپ اڑانا کپ سامنے کیا تو شادور ہنسا۔

”کپ ہاتھ میں لے سکتا تو ضرور پیتا۔“ اس کی بات پر دونوں ہی مسکرائیں۔

”اوکے منال۔ ڈونٹ وری۔ نیکل یہاں بالکل مزے میں ہے۔“ شادور نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا تھا۔

”اوکے، آپ کی نیند خراب کی۔ اس کے لیے سوری۔“ منال نے سادگی سے کہا۔

”ارے نہیں۔ کبھی بھی کسی بھی وقت۔ جب نیکل کی یاد آئے تم بے ججک کال کر سکتی ہو۔“

”تھنک یو۔“

”اوکے گڈ نائٹ۔“ شادور نے نرمی سے کہا کہ کال کا قطع کر دی۔

منال نے سیل سائیڈ پر رکھ کر تکیہ درست کیا اور نیم دراز ہوئی۔

”کافی انڈر اسٹینڈمگ ہو گئی ہے نیکل کے انکل سے۔“ غمیرہ نے بغور اسے دیکھا۔

”جی نہیں۔ میں نے نیکل کی وجہ سے کال کی تھی۔“ منال نے وضاحت کی۔

”یہ وہی ہے نا جو اس دن تمہیں مال میں گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔“ غمیرہ کی یادداشت کمال تھی۔

”ہاں وہی ہے۔ اسے شاید مجھ میں نوال اپنا کی مشابہت نظر آرہی ہوگی۔ ورنہ مارلی اتنا نظر باز تو

نہیں۔“ اس نے فوراً شادور کی صفائی پیش کی۔

”ہم.....“ غمیرہ نے گردن ہلائی۔ ”ویسے یہ شادور لغاری کبھی اپنے بھائی کی طرح ڈھنگ ہے۔“ غمیرہ نے رائے دی۔

”ان کی طرح لوگ اور کیڑمگ بھی ہے۔“ منال بے ساختہ کہہ کر پچھتائی۔ غمیرہ معنی خیز نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”بہت جان گئی ہوا سے چند دنوں میں۔“

”نن..... نہیں تو..... بس یونہی۔“ منال گڑبڑائی۔

”اچھا۔ مجھے سونے دو۔“ پھر کبل اوڑھ کر لیٹ گئی۔

”تو سو جاؤ کس نے منع کیا ہے۔ میں تو تمہارے کمرے کی جلتی لائٹ دیکھ کر چلی آئی تھی۔

سوچا نہ جانے کیا مسئلہ ہے پر آگے سے.....“ غمیرہ نے جان کر جملہ ادھورا چھوڑا۔

”غمیرہ! میں سوری ہوں۔“ منال نے سر تک کبل تان لیا۔

”سو جاؤ سو جاؤ۔“ غمیرہ نے ہنستے ہوئے لائٹ آف کی اور کمرے سے نکل گئی۔

☆☆☆

”اس وقت تمہاری سب سے بڑی ضرورت اپنے پیروں پر کھڑے ہونا ہے تاکہ تم حاتم اور جی کا مقابلہ کر سکو۔ اگلے پانچ سال تک اگر تم اسی طرح

کالج گرل بنی رہیں تو وہ تو تمہیں یوں سل دیں گے۔“ فیب راجا نے اپنی انگلیوں سے جھتی سگریٹ کو مسلاتو منال نے جھرجھری سی لی۔

”یہ پروجیکٹ تمہیں راتوں رات شہرت کے ساتویں آسمان تک پہنچا سکتا ہے منال! میں تمہارا فیوچر نوال سے بھی زیادہ براٹھ دیکھ رہا ہوں اور

فیب راجا کی پریڈیکشن کبھی غلط نہیں ہوتی۔“ ایک قفاخز سے کہتے فیب نے منال کا چہرہ بغور دیکھا جس پر ساٹ تاثر تھا۔

”تمہاری خوش نصیبی ہے کہ یہ پروجیکٹ ابھی



تک التوا کا شکار ہے۔“ اس نے مزید لپٹا۔

”مجھے ماڈلنگ کرنے کا کوئی شوق نہیں اور نہ ہی میں اس فیلڈ میں انٹرسٹ رکھتی ہوں۔“ منال نے بے لچک انداز میں کہا۔ فیب نے خود کو بھڑکنے سے بمشکل روکا۔

”دماغ خراب ہے تمہارا۔“ اس نے دانت پیسے۔

”عمیمہ..... ذرا اپنی دوست کو سمجھاؤ۔ کیوں اپنا مستقبل تاریک کر رہی ہے۔“ فیب راجا نے چائے کے لوازمات میز پر رکھتی عمیمہ سے کہا۔

”منال یارا! کیا پر اہلم ہے۔ اتنی اچھی آفر آئی ہے۔ کیوں بے وجہ انکار کیے جا رہی ہو۔“ عمیمہ اتنی دیر سے فیب راجا کا سر کھپانا اور منال کا انکار سن رہی تھی۔

”بس۔ مجھے اس فیلڈ میں نہیں جانا۔“

”میڈلسن پڑھنی ہے۔“ فیب نے لقمہ دیا۔

”نہیں، مجھے میڈلسن بھی نہیں پڑھنی۔ میرا ذہن منتشر ہے، اب مجھ سے کچھ نہیں پڑھا جائے گا۔“ منال نے سر جھکا کر کنسیاں سہلا میں تو فیب اور عمیمہ نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

”آپ کچھ دن رہنے دیں۔ یہ فی الحال ڈسٹرب ہے، اس سیشن سے باہر نکلے گی تو خود ہی راضی ہو جائے گی۔“ عمیمہ نے فیب کو تسلی دی۔

”میں نے کہا نا، میں اس فیلڈ میں جانا ہی نہیں چاہتی۔“ منال نے جھٹکے سے سراٹھایا۔ ”کیوں آپ دونوں مجھے انسٹ کر رہے ہیں اس بات کے لیے۔ مجھے ماڈلنگ نہیں کرنی تو نہیں کرنی۔“ وہ غصے سے اٹھی اور کمرے سے واک آؤٹ کر گئی۔ عمیمہ نے فیب راجا کو دیکھا جو غصے میں نظر آ رہا تھا۔

”منال کے نخرے اب میری برداشت سے باہر ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ آخری چانس ہے۔ تم اسے جتنا جلدی مناسکتی منالو عمیمہ۔ اس کے بعد میں کوئی آفر لے کر کبھی نہیں آؤں گا۔“ وہ اپنی نشست سے اٹھا اور عمیمہ کو وارننگ دے کر چلتا ہوا۔

عمیمہ سرعت سے اٹھ کر منال کے کمرے میں گئی۔

”منال! کیوں اتنی شدت سے انکار کر رہی ہو۔ تمہیں پتا ہے فیب کتنا غصہ ہو کر یہاں سے گیا ہے۔“ عمیمہ نے گھٹنوں میں سر دیے بیڈ پر بیٹھی سہیلی کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”بھاڑ میں جائے وہ۔“ منال نے بھاری آواز سے کہا۔

”بی ہیو یور تنگ منال۔ اس طرح بولتے ہیں کسی کو۔“ عمیمہ نے ٹوکا۔

”جب مجھے ماڈلنگ کرنی ہی نہیں تو بات ختم نا۔ یہ روز مجھے منانے کیوں آ جاتا ہے۔“ منال نے سراٹھایا تو اس کی آنکھیں بھگی ہوئی تھیں۔

”پہلے تو تم راضی تھیں۔ اب ایسا کیا ہو گیا ہے جو شدت سے انکاری ہو۔“ عمیمہ نے بغور اس کو دیکھا۔

”جب سے تم نیمل کو گاؤں چھوڑ کر آئی ہو، میں تم میں کافی تبدیلی دیکھ رہی ہوں۔“ عمیمہ کی زیرک نگاہی کا منال نے دل میں اعتراف کیا۔

”تمہارے ماڈلنگ سے انکار کی وجہ کیا شاور لغاری ہے۔“ اس نے سنجیدگی سے پوچھا تو منال نے نظریں جھکا لیں۔

”منال۔ یارا! تم اتنی باگل ہو سکتی ہو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔“ عمیمہ نے سر پکڑ لیا۔

”شاور لغاری داور سے بہت مختلف سوچ رکھتا ہے، اس کی مینٹل اپروچ خالص سرداروں جیسی ہے۔ یہ ٹوٹال کے الفاظ ہیں منال۔ اس نے ایک بار مجھے بتایا تھا اور اب تم اسی بندے سے دل لگا بیٹھی ہو، نا صرف دل لگایا ہے بلکہ اپنا فیوچر بھی اس کی خاطر تباہ کر رہی ہو او گاؤ۔“ عمیمہ نے اسے افسوس سے دیکھا۔

”کیا وہ بھی تم سے محبت کرتا ہے؟“ عمیمہ کے سوال پر منال لب کاہتی رہی۔

”ہاں نہیں۔“

”یا خدا۔ یک طرفہ پاگل پن۔“ عمیمہ دبا دبا



چلائی۔

”باز آجاؤ منال۔ یہ راہ کانٹوں سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں صرف خار تھارے دامن سے لپٹیں گے۔ ابھی بھی وقت ہے واپس پلٹ آؤ۔ یہی عقل مندی کا تقاضا ہے۔“ عیسہ نے اس کو کندھوں سے پکڑ کر سمجھایا تو وہ اس کے گلے لگ کر رو پڑی۔

”مجھے وہ اچھا لگتا ہے عیسہ! تم یقین کرو، وہ بہت اچھا ہے۔ مہم..... میری آنکھ زخمی ہو گئی تھی وہاں۔ اس نے اتنے پیار، اتنے احساس سے میرا خیال رکھا۔ وہ بہت ہمدرد اور پیارا انسان ہے عیسہ!“ منال نے بھیگی آنکھیں رگڑتے معصومیت سے کہا تو عیسہ کو اس پر پیار سا آیا۔

”ہوگا ہمدرد اور پیارا انسان۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم اسے چاہنے لگو۔“

”دل پر کس کا اختیار ہے عیسہ!“ منال نے بے بسی سے سانس بھری۔

”یہ بے اختیاری تمہیں نقصان دے گی۔“ عیسہ نے ڈرایا۔

”محبت نفع نقصان سے بے نیاز ہوتی ہے۔“ منال کی بات پر عیسہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ منال کے چہرے پر محبت کے سارے رنگ جمع تھے اور ان رنگوں میں سب سے گہرا رنگ بے نیازی کا تھا۔ حال سے بے نیازی مستقبل سے بے نیازی۔

☆☆☆

”شاور سائیں! نیمل بے بی سیڑھیوں سے گر گئی ہیں، آپ جلدی آئیں۔“ ملازم لڑکے کے بتانے پر اماں جی بھی کابی پی آپریشن وہیں بیڈ پر رکھ کر وہ ہڑبڑا کر باہر بھاگا۔ سیڑھیوں کے آخری قدم پر نیمل گری ہوئی تھی۔ شاور نے سرعت سے اسے اپنی بانہوں میں اٹھایا۔ نیمل کی پیشانی سے خون نکل رہا تھا اور وہ بے ہوش تھی۔

”نیمل میری جان۔“ شاور نے اس کی پیشانی پر اپنا رومال رکھا۔

”اف خدایا۔ کیا ہو گیا ساڈی بچی کولوں۔“

اتنے میں خولہ دوڑی آئی اور نیمل کو لینا چاہا۔

”یہ سنجال رہی ہو تم بچی کو۔ غافل عورت۔ ہٹو ایک طرف۔“ شاور نے اسے ڈانٹ دیا۔

”میڈاقصور نہیں جی۔“ اس نے نجانے کیا کہا

شاور ان سنی کرتا باہر آیا۔

”شوکت..... کرم داد سے کہو، گاڑی نکالے۔

ہمیں ابھی اسپتال پہنچنا ہے۔“ وہ نیمل کو گود میں لیے تیز قدموں سے گاڑی کی طرف بڑھا اور پچھلا

دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے کار اشارٹ

کردی تھی۔

☆☆☆

منال ایک جھٹکے سے نیند سے جاگی تھی۔ دل کی

دھڑکن تیز اور ہاتھ پیر سینے سے بھٹکے ہوئے تھے۔

کیسا عجیب سا خواب دیکھا تھا۔ نیمل اونچائی سے

زمین پر گری اور..... اس نے جھرجھری سی لی۔

”نہیں..... وہ خیریت سے ہوگی۔ یہ محض ایک

خواب تھا۔“ پھر خود کو تسلی دی پر بے چینی ختم نہ ہوئی تو

اس نے پاس پڑا موبائل اٹھایا اور شاور کو کال

ملائی۔ چوتھی بیل پر کال ریسیو کر لی گئی۔

”السلام علیکم۔“

”وعلیکم السلام! کیسی ہو منال۔“ شاور کی گیسیر

آواز منال کے دل کی دھڑکن مزید تیز کر گئی۔

”میں ٹھیک ہوں۔ نیمل کیسی ہے۔ مجھے اسے

دیکھنا ہے۔“ وہ بے چینی سے بولی۔

”بات یہ ہے منال! کہ نیمل بہت مشکل سے

سوئی ہے تو ابھی ویڈیو کال اسے ڈسٹرب کرے گی۔“

شاور نے سوچ کر کہا۔

”میں آواز بالکل نہیں نکالوں گی۔ بس اس کو

ایک نظر دیکھنا ہے۔“ منال کا لہجہ التجائیہ ہو گیا۔

”منال! بات کو سمجھو۔ ابھی ممکن نہیں ویڈیو

کال..... کل میں تم سے بات کروادوں گا۔“ شاور

نے رمان سے کہا۔ منال کا چہرہ اتر گیا۔

”اچھا آپ اس کا صدقہ نکال دیجئے گا۔ میں

نے بہت برا سا خواب دیکھا ہے۔“ منال کی بات پر



وہ چونکا۔

”اچھا، ٹھیک ہے۔ تم پریشان مت ہو۔ میں صدقہ دے دوں گا۔“

”اماں میٹھی کیسی ہیں؟“ منال نے پوچھا تو شادور نے اماں میٹھی کو دیکھا جو اسی کی طرف متوجہ تھیں۔

”دعا کرو منال! اللہ ان کو صحت دے۔“ شادور نے اماں کا کمزور سا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔

”اللہ ان کو صحت کاملہ عطا کرے، آمین۔“ منال نے دل سے دعا کی۔

”اچھا اللہ حافظ۔“ شادور نے موبائل آف کر کے جیب میں ڈالا۔

”منال کیا کہہ رہی تھی؟“ اماں میٹھی نے پوچھا۔

”نیمل کو دیکھنا چاہ رہی تھی۔ میں نے منع کر دیا۔“ نیمل کی حالت دیکھ کر اس نے رو پڑنا تھا۔

”بہت پیار کرتی ہے نیمل سے۔“ شادور کی بات پر اماں میٹھی نے اس کا چہرہ بغور دیکھا۔

”شادور لغاری ایک بات مانو گے؟“ اماں نے مخصوص انداز میں بیٹے کو مخاطب کیا۔

”کہیے اماں میٹھی! آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔“ شادور نے ان کا لرزنا بڑھاتا ہوا۔

”منال سے شادی کرلو۔“ ان کی بات پر وہ بری طرح چونکا۔

”یہ آپ کہہ رہی ہیں اماں میٹھی!“

”ہاں۔ یہ میں کہہ رہی ہوں شادور! منال بہت پاری اور معصوم بچی ہے۔ ماں بہن کے جانے سے بالکل تنہا بھی ہو گئی ہے۔ اس کو بھی کسی مضبوط سہارے کی ضرورت ہے اور ہماری نیمل کو بھی کسی

امتا بھری گود کی۔ وہ نیمل کو دل و جان سے چاہتی ہے۔ دونوں ہی ایک دوسرے کے بٹا نہیں رہ سکتیں۔“ اماں میٹھی نے رک رک کر بات مکمل کی اور پھر اپنی سانسیں سنبھالنے لگیں۔ شادور خاموشی سے ان کو دیکھ رہا تھا۔

”تم دیکھ رہے ہو نا، یہاں نیمل کا بچن کوئی نہیں۔ آج سوہائی نے اس کو سیڑھیوں سے دھکا دیا ہے، کل نہ جانے کیا کرے۔“ اماں میٹھی کی اگلی بات پر شادور کا خون کھول اٹھا۔

”نیمل کو سیڑھیوں سے گرانے کی مذہبوم حرکت سوہائی نے کی تھی؟“ وہ نیمل کو اسپتال سے پانچ ٹانگے لگوا کر واپس آیا تو خولہ سے سختی سے باز پرس پر اس نے یہ بتایا کہ ”مجھ سے سوہائی بی بی نے

نیمل کو گود میں لیا اور مجھے کسی کام سے کچن میں بھیج دیا۔“

شادور اس کے بیان پر کھٹک گیا اور اس نے اسی وقت حویلی کے اندرونی حصے میں لگے کیمروں کی فوئج منگوا کر دیکھی۔ جس میں واضح نظر آیا کہ سوہائی نے لاؤنج کی سیڑھیوں کے اوپری حصے میں نیمل کو کھڑا کر کے زور سے دھکا دیا اور وہاں سے بھاگ گئی۔ نیمل بری طرح لڑھکتی ہوئی نیچے گری اور اس کا سر پھٹ گیا۔

کسی کام سے گزرتے نو عمر ملازم لڑکے نے نیمل کو دیکھ کر چیخ ماری اور شادور کو بتانے بھاگا۔ یہ فوئج شادور کو اشتعال دلا گئی اور اس نے سوہائی کے سر پہنچ کر اسے خوب سنائیں مگر اس کے چہرے پر شرمندگی کی لکیر تک نہ آئی۔ پھوپھو نے الگ واویلا مچایا اور نیمل کی ماں، نانی سے لے کر سب کو برا بھلا کہا۔ شادور ان کی بدزبانی پر انگشت بٹا رہ گیا۔

انہوں نے اسی برس نہیں کیا بلکہ ناراض ہو کر سوہائی کا ہاتھ پکڑا اور حویلی سے یہ کہہ کر نکل گئیں کہ میری بیٹی تمہاری ماں کی ملازمہ نہیں جو اپنا گھر چھوڑ کر یہاں خدمت کے لیے بیٹھی ہے۔

”سوہائی کو میں نے بچپن سے اپنے ساتھ اپنی بیٹی بنا کر رکھا اور اس کا مجھے یہ صلہ ملا۔“ اماں میٹھی کی بھکی آواز پر وہ اپنے خیال سے لکلا۔

”اماں میٹھی! آپ پلیز مت ردئیں۔ شکر کریں اس چالاک لڑکی کی اصلیت کھل گئی ورنہ نجانے آگے ہماری نیمل کو کیا کیا نقصان پہنچاتی۔“



زہر بھرا ہے معصوم بچی کے لیے ان ماں جی کے دل میں۔“ شادور نے نئے سرے سے سلا۔

”اللہ نے خیر کی۔ بچی کی جان بچ گئی۔“ انہوں نے ٹنڈا سانس بھرا۔

”تم میری بات پر غور کرنا بیٹا۔ نہ جانے زندگی کی کتنی سانسیں باقی ہیں۔ مرنے سے پہلے میں تمہیں ہنسنا دیکھنا چاہتی ہوں۔ داور کی اکلوتی نشانی اسی حویلی میں پھلے پھولے تو ہو سکتا ہے وہ اپنی مجبور ماں کو قیامت کے دن معاف کر دے کہ تمہارے بابا کی سخت طبیعت کے آگے میں چپ رہ گئی اور اپنے لعل کو خود سے جدا کر دیا۔“ اشک قطرہ قطرہ اماں چٹھی کی آنکھوں سے نکل رہے تھے۔

”میں نے پہلے کبھی آپ کی کسی بات کو ٹالا ہے اماں میٹھی! جواب انکار کروں گا۔ آپ جیسا چاہتی ہیں ویسا ہی ہوگا۔ بس آپ وعدہ کریں آئندہ کبھی نہیں روئیں گی۔“ شادور نے ان کے آنسو زری سے پونچھ کر کہا تو وہ ایک دم خوش ہو گئیں۔

”جیتے رہو بیٹے۔“ ان کا لڑتا ہاتھ شادور کے سر پر ٹھہر گیا۔

☆☆☆

اور اب وہ پورے دس دن بعد نیمل کو لے کر منال کے بچنے پر کھڑا تھا۔ ان دن دنوں کے دوران اس نے ایک دو بار منال کو نیمل کی آواز سنوادی مگر ویڈیو کال نہیں کرنے دی تھی۔ اب نیمل کچھ بہتر ہوئی تو وہ منال سے ملاقات کو چلا آیا۔

”جی منال بی بی تو یہاں سے چلی گئی ہیں۔“ گارڈ نے اطلاع دی تو وہ حیران ہوا۔

”کہاں چلی گئیں؟“

”اپنی دوست کے گھر شفٹ ہو گئیں۔“ گارڈ شادور سے متعارف تھا پھر نیمل کو اس کی گود میں دیکھ کر با آسانی عیمہ کے گھر کا ایڈریس بتا دیا۔

وہ ڈیڑھ فیروزن نے مار تھنا ظم آباد آنے تک شدید الجھن کا شکار رہا۔ دروازہ عیمہ کے ملازم نے کھولا اور ان دونوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چلا

گیا۔ دو منٹ بعد ہی عیمہ ڈرائنگ روم میں آگئی۔ ”السلام علیکم۔“ شادور کو سلام کر کے وہ نیمل کی طرف لپکی۔

”میمہ.....“ نیمل با آسانی اس کی گود میں چڑھ گئی۔

”کیسے ہیں آپ شادور۔“ وہ نیمل کو لے کر صوفہ پر بیٹھی۔ ”الحمد للہ۔“

”منال کہاں ہے۔“ شادور نے بے چینی سے پوچھا۔

”مارٹ گئی ہے، آتی ہوگی۔“ عیمہ نے نیمل کو کھلاتے بتایا۔

”وہ آپ کے گھر کیوں شفٹ ہوئی ہے؟“ شادور نے ذہن میں کلبلا تا سوال کیا۔

”کیونکہ اس کے گھر پر اس کے اسٹیپ فادر اور اسٹیپ برادر نے قبضہ کر لیا ہے۔“ عیمہ نے گہری سانس کھینچ کر بتایا۔

”کیا..... کب کیا قبضہ؟ منال نے مجھے بتایا نہیں۔“ شادور حیران ہوا۔

”اس نے تو آپ کو اور بہت کچھ بھی نہیں بتایا۔“ عیمہ کی معنی خیز بات پر شادور نے اچھبے سے اسے دیکھا۔

”مثلاً کیا.....؟“ ”مثلاً یہ کہ اس کو ماڈلنگ کرنے کی آفرز آرہی ہیں اور وہ ان آفرز کو صرف اور صرف آپ کی وجہ سے ٹھکرا رہی ہے۔“ عیمہ نے شادور کو بغور دیکھ کر کہا۔

”میری وجہ سے؟“ وہ بڑبڑایا۔

”جی۔ صرف آپ کی وجہ سے۔ آپ نے نجانے کب اسے اس کام سے منع کیا اور اس نے یہ بات گرہ سے باندھ لی۔“ عیمہ کی بات پر شادور کو منال سے کی گئی اپنی بات یاد آئی۔

”آپ کے دل کا حال میں نہیں جانتی شادور۔ مگر میری نادان سی دوست آپ کو چاہنے لگی ہے۔“ عیمہ نے سنجیدگی سے کہا تو شادور خوش گوار سے



احساس میں گھر گیا۔

”اگر آپ اس کے لیے دل میں محبت کے جذبات محسوس نہیں کرتے تو پلیز اس کو اس نادانی سے نکالیں۔ وہ بہت نازک احساسات کی لڑکی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ اس راہ پر وہاں تک چلی جائے جہاں واپسی ناممکن ہو۔ آپ اسے یہیں پر روک دیں ورنہ.....“ عمیمہ کی بات منہ میں بھی کہ اس کا موبائل بجنے لگا۔

”ایکسیکویزی۔“ عمیمہ نے کہہ کر سیل کان سے لگایا۔

”ہاں کہو منال! اس کام کو ابھی رہنے دو۔ تم گھر آؤ۔“ وہ منال سے مخاطب تھی۔

”ایک گھنٹہ..... ارے اتنا ٹائم میں ڈلیشز ڈیل کو بھی نہیں دیتی جتنا تم اپنے ریسٹورینٹ کو دے رہی ہو۔ بس جلدی گھر آؤ، ایک سر براؤز ہے۔“ اس نے کہہ کر سیل آف کیا پھر شاور کو دیکھا جو اسی کی طرف متوجہ تھا۔

”منال نے ایک ریسٹورنٹ کھولا ہے۔“ عمیمہ نے انکشاف کیا۔

”ریسٹورنٹ؟“ شاور نے اچھبے سے اسے دیکھا۔

”جی ریسٹورنٹ۔ میرے پاپا سے پارٹنرشپ کی ہے اس نے۔ اپنی تقریباً ساری انویسٹمنٹ اسی میں لگادی ہے۔ بہت پرجوش ہے اس ریسٹورنٹ کو چلانے میں۔ کہتی ہے ایک بار پوری طرح اسٹیمبلش ہو جائے تو نیمل کو آپ سے لے کر اپنے ساتھ رکھے گی..... اور پھر عمر بھر شادی نہیں کرے گی کہ کہیں آپ نیمل کو اس سے اس بہانے چھین نہ لیں۔“ عمیمہ نے تفصیل بتا کر ایک سانس بھرا۔

”میں نے بتایا تھا کہ وہ بہت ضدی اور نادان سی ہے۔“ اس نے جتا کر کہا اور خاموش ہو گئی۔ شاور کی گہری سوچ میں گم ہوا۔

”آپ مجھے اس ریسٹورنٹ کا ایڈریس بتائیں گی۔ ہم وہیں جا کر منال سے مل لیں گے۔“ چند

منٹ بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور عمیمہ سے نیمل کو لیا۔  
”شیور۔“ عمیمہ نے ایڈریس سمجھایا۔ شاور وہاں سے رخصت لے کر نکل آیا۔

☆☆☆

شہر کے پوش ایریا میں بیسٹ فوڈز کے نام سے نیا کھلا یہ ریسٹورنٹ شاور کو دیکھتے ہی اچھا لگا۔ ریسٹورنٹ کا اندرونی ماحول آرام دہ اور انٹیریئر لاجواب تھا۔ سہ پہر کا وقت تھا اس لیے لوگ کم نظر آرہے تھے۔ شاور بغور دیکھتا رہا۔ سیشن کی طرف چلا آیا۔ جہاں دو لڑکیاں کھڑی تھیں۔

”گڈ آفٹرنون سر۔“ ان میں سے ایک نے چہرے پر مسکراہٹ سجالی۔

”گڈنون۔“ مجھے یہاں کی آئرس منال سے ملتا ہے۔“ شاور نے مدعا بیان کیا۔

”میم وہاں ہیں۔“ ایک نے دائیں طرف اشارہ کیا۔ شاور وہاں چلا آیا۔ منال پلین بلو کرتی اور بلو پینٹ میں ملبوس کندھوں پر اسٹولر لپیٹے پیٹھ موڑے کھڑی اسٹاف سے الجھ رہی تھی۔

”منال۔“ شاور نے نرمی سے پکارا تو وہ بری طرح چونک کر پلٹی۔

”شاور آپ..... نیمل.....“ وہ اسے اچانک ان دونوں کو سامنے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی۔

”من مال.....“ نیمل خالہ کو دیکھ کر پھٹی۔

”نیمل۔ میری جان۔“ اس نے فوراً بچی کو شاور سے لے کر اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ نیمل بھی بے ثباتی سے اس سے پلٹی تھی۔

”کتنے دنوں بعد اپنی جان کو دیکھا ہے۔ خالہ کو یاد کیا تھا نیمل۔“ وہ بھیگی آواز میں پوچھ رہی تھی۔

نیمل نے سر زور سے اثبات میں ہلایا۔

”میری جان۔“ منال نے اسے چوم لیا۔ وہ بیک وقت رو بھی رہی تھی اور ہنس بھی رہی تھی۔

”میم! آپ گیسٹ کو لے کر اندر بیٹھ جائیں۔“ اسٹاف میں سے ایک نے کہا تو منال کو احساس ہوا۔



”آئیے شادور۔ ادھر آ جائیں۔“ خود کو سنبھالتی وہ آگے بڑھی تو شادور نے اس کی تھلید کی۔

”پلیز بیٹھے۔“ وہ انہیں ایک کیمین میں لے آئی جہاں ایک میز اور چند کرسیاں پڑی تھیں۔ شادور کرسی پر بیٹھا تو وہ بھی نیمل کے ساتھ سامنے کرسی پر ٹک گئی۔ اب اس کی ساری توجہ نیمل پر اور شادور کی اس پر تھی۔

”یہ کیا ہوا ہے نیمل کو۔“ منال نے نیمل کے سر پر پہنی کیپ ہٹائی تو اس کا زخم دیکھ کر پریشانی سے پوچھا۔

”چوٹ لگ گئی تھی۔“ شادور نے محتاط لہجے میں کہا۔

”کب..... کیسے.....“ وہ بے چین ہوئی۔

”چند دن پہلے۔“

”اللہ! اتنے ٹانگے لگے ہیں میری نیمل کو۔“ وہ بغور دیکھ کر پریشان ہوئی۔

”ہاں وہ بس.....“ شادور گڑ بڑایا۔

”آپ سے ایک چھوٹی سی بچی نہ سنبھالی گئی۔“ منال نے حفاکشی سے اسے دیکھا۔

”واقعی نہیں سنبھال سکا۔“ شادور نے اعتراف کیا۔

”تو لے کیوں گئے تھے۔“ وہ اسی ٹون میں بولی۔

”میں صرف نیمل کو تو نہیں لے گیا تھا۔ ایک اور ضدی لڑکی بھی میرے ساتھ چلی آئی تھی جو پھر خود ہی ہمیں چھوڑ کر شہر آ گئی۔“ شادور نے اس کا ناراض چہرہ دیکھا۔

”کچھ مسائل کی وجہ سے شہر آنا پڑا۔ ورنہ میں نیمل کو ایسے چھوڑ آتی، ناممکن تھا۔“ منال نے نیمل کے سنہری بال سلجھائے۔

”تم نے مجھے ان مسائل کے متعلق آگاہ کرنا بھی پسند نہیں کیا۔“ شادور کے لہجے میں گلہ تھا۔ منال نے چونک کر اسے دیکھا۔

”میرے مسائل مجھے خود ہی حل کرنا تھے۔ اسی

لیے سوچا، دوسروں کو کیوں پریشان کروں۔“ وہ دھیمی آواز میں بولی۔

”چلو سائیں! ہو گئی بات ختم۔ میں دوسروں میں شمار ہوتا ہوں۔“ اب کے شادور نے ناراضی سے کہا۔

”تو پھر آپ میرے ہیں کون؟“ منال نے سادگی سے پوچھا۔

”یہ تو تم اپنے دل سے پوچھو..... کہ میں تمہارا کون ہوں۔“ شادور نے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھا تو منال نے ایک دم نظریں جھکا لیں۔

شادور مسکرا دیا۔

”تمہارے سارے مسائل، ساری پریشانیاں اب صرف تمہاری نہیں منال! میری بھی ہیں۔ جن سے دل کا رشتہ جڑ جائے تا پھر ان کے دکھ سکھ اپنے ہو جاتے ہیں۔“ اس نے آگے بڑھ کر منال کا نازک ہاتھ تھام لیا تو وہ سرخ ہوئی۔

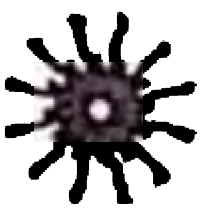
”مجھ سے اپنی زندگی اور زندگی کے سارے مسائل شیر کر دو گی نا۔“ اس نے اصرار کیا تو منال نے جھکی نگاہیں اٹھائیں۔ وہ پر شوق نظروں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ منال نے دوبارہ نظر جھکا لی۔

”کچھ تو کہو منال!“ وہ بے تابی سے بولا۔

”نیمل! اپنے چاچو سے کہو آپ کی خالہ اپنی زندگی اپنے پر اہلزم سمیت ان کے ساتھ شیر کرنے پر تیار ہیں۔“ منال نے شرمیلی سی مسکان کے ساتھ گود میں بیٹھی نیمل کو مخاطب کیا تو شادور سرشاری سے مسکرا دیا۔

”نیمل! اپنی خالہ سنے کہو، یہ بات وہ براہ راست آپ کے چاچو سے بھی کہہ سکتی ہیں۔“ شادور نے شرارت سے نیمل سے کہا۔

”نیمل! اپنے چاچو سے کہو، آپ کی خالہ کو بہت شرم آتی ہے۔“ منال نے کہہ کر نیمل کے سنہرنے بالوں میں چہرہ چھپا لیا تو شادور نے بے ساختہ قہقہہ لگایا تھا۔







اس کے روشن دن بھی ایسی سیاہ اندھیری رات بن چکے تھے کہ جہاں روشنی کے واسطے جگنو کی جھمکی جگمگاہٹ بھی میسر نہ تھی۔ وہ یہاں وہاں دیکھتی رہتی، پر اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جو منظر پچھلے بائیس سالوں سے اس کی آنکھوں میں بس کر روشنی بن بیٹھا تھا، وہ سراب ہوا تو اس کی آنکھیں دیکھنے سے قاصر ہو گئیں۔

نہ اسے اپنی معصوم بچیاں دکھائی دیتیں، نہ اپنی جوانی۔ اس نے اپنے شوہر کا آخری دیدار ایسے کیا تھا کہ اب کچھ بھی دیکھنے کی تمنا باقی نہیں رہی تھی۔

اس کے کانوں میں آج بھی اچانک ہی بیٹھے بیٹھے وہ آواز گونجتی تو وہ تڑپ اٹھتی، آواز کا تعاقب کرتی۔ لیکن پکارنے والا تو منوں مٹی تلے جا سویا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر سب کو افسوس ہوتا۔ رئیس تو اسے چھوڑ کر جا چکا تھا۔ لیکن اس کی محبت۔۔۔ آہ۔۔۔ وہ محبت۔۔۔ مہر و کے ہونٹوں سے سسکیاں لپٹی

## عنبرین ولی

جیالہ گنگالہ تم پر مہر و

UUNOVELS.COM

گئی۔ رئیس اس وقت چار سال کا تھا لیکن جان گیا کہ یہی اس کی جیون ساتھی ہے۔ سب کہتے رئیس کی دلہن آگئی۔ ”رئیس کی دلہن۔“ وہ خود بھی یہی کہنے لگا۔ بچہ تھا تو سب ہنس دیتے۔ لیکن بڑے ہو جانے کے بعد بھی اس کی یہ عادت نہ گئی۔ ماں کو برا لگتا، ٹوک دیتیں۔

”ابھی اسے تیری دلہن بنے میں بہت وقت ہے، ایسے مت پکارا کر، برا لگتا ہے۔ لوگ جتے ہیں اور مہر و کو تنگ کرتے ہیں۔ ابھی وہ بہت چھوٹی ہے۔“

رہتیں۔ دو معصوم جڑواں بچیاں جن کی عمر بمشکل دو سال تھی، ماں ماں کرتیں اس کو ہوش کی دنیا میں لائیں، انہیں دیکھ کر وہ کچھ اور بھی دیوالی ہو جاتی۔ کیا کچھ تھا جو اسے یاد نہیں آتا تھا۔

محبت کے وہ حسین لمحے، جب رئیس رئیس نہ رہتا اور مہر و، وہ تو اس دنیا کی ہی نہ رہی تھی۔ اتنی محبت بھی کیا کوئی کرتا ہوگا۔ جتنی اسے اپنے رئیس سے تھی اور رئیس کو اس سے۔

پیدا ہوتے ہی وہ اس کے نام سے جوڑ دی



”میں نے ایک حل سوچا ہے۔ ہو سکتا ہے اس طرح وہ زندگی کی طرف واپس آجائے۔“ سب بوڑھے باپ کی طرف دیکھنے لگے جو بیٹے کو کھونے کے بعد اب بہو کے لیے پریشان تھا۔

”اس کی دوسری شادی کی بات بھی مت کرنا رئیس کے ابا۔ وہ مر جائے گی لیکن کبھی راضی نہیں ہوگی۔“

”وہ رئیس کو یاد کر کے بھی مر ہی جائے گی۔“ ان کے جملے پر وہ چپ رہ گئیں۔ سچ ہی تو کہہ رہے تھے۔

مہرو نے سنا تو اس نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ روئی، چیخی چلائی لیکن رئیس کے ابا نے اس کی ایک نہ سنی۔

”رئیس مر گیا ہے مہرو۔“ انہوں نے خود پر قابو رکھتے ہوئے سچ دہرایا۔

”میں بھی مر جاؤں گی۔“ اس کی آنکھوں میں سرخی تیرنے لگی۔

”میں یہ نہیں چاہتا۔ اسی لیے تو تیرا نکاح کروانا چاہتا ہوں۔ یہ دو معصوم زندگیاں۔ اس سب میں ان کا کیا قصور۔ وہ چلا گیا تو بھی مر جا اور یہ..... یہ رل جائیں۔ برباد ہو جائیں۔ جانتی ہے نا بن ماں باپ کے بچوں کا کیا حال ہوتا ہے؟ تجھے اپنی وہ سہیلی یاد ہے جس کی ماں بھی اپنے شوہر کے مرنے کے بعد تیری طرح دیوانی ہوئی تھرتی تھی، پھر ایک روز کنوئیں میں جا گری۔ اور پھر اس کے بعد اس بچی کے ساتھ کیا کیا ہوا۔ کھانا تک تو وہ تیرے ساتھ، تیرے گھر کھاتی تھی۔ اسے تو کھانا مل گیا۔ تیری بچیوں کو کون پوچھے گا؟ کون ہے یہاں جو انہیں کھانا دے گا؟“ وہ بولنے پر آئے تو بولتے چلے گئے۔

مہرو بالکل چپ تھی۔ انہیں لگا ان کی باتوں نے اس پر شاید کوئی اثر دکھایا ہے لیکن اگلے ہی روز اس نے سامان باندھ لیا۔

”میں واپس جا رہی ہوں۔ اپنے گھر۔“ مہرو کا اہل لہجہ ان کا خون کھولا گیا۔

جب بڑی ہو جائے گی تو خود اپنے ہاتھوں سے سجا کر اسے اس گھر میں لاؤں گی۔“ وہ کچھ اور خوش ہوتا۔ آہستہ آہستہ اس نے میری دلہن کہنا چھوڑ دیا۔ اور پھر ایک دن وہ بڑی بھی ہوگئی۔ اب جب کبھی وہ اسے اکیلے میں دکھائی دیتی تو ضرور ہی دوڑ کر اس کے کان کے پاس دھیمی آواز میں پکارتا۔

”میری دلہن۔“ مہر دسرخ ہو جاتی۔ اور ایک پتھراٹھا کر اسے مارتی، وہ ہنستا ہوا چلا جاتا۔

اب رئیس کام بھی کرنے لگا تھا اور شادی کے لیے سب گھر والے پیسے جوڑنے لگے تھے۔ یہاں بھی، وہاں بھی۔

پھر یوں ہونے لگا کہ وہ کام میں مصروف ہوتی، اچانک اس کی نگاہ اپنی چارپائی پر پڑتی تو کبھی سرخ پھول، کبھی سرخ چوڑیاں وہاں دھری ہوتیں۔ ان پر نگاہ پڑتے ہی گھر کا کچا برآمدہ کچانہ رہتا، مٹی کی سوندھی خوشبو گلاب کی خوشبو میں ڈھل جاتی اور وہ پور پور مہک اٹھتی۔ اسے یوں لگتا کہ وہ بادلوں پر قدم رکھ رہی ہے اور دنیا گواہ ہے کہ رئیس نے اس کے لیے اس جہان کو پریوں کا جہان بنا دیا تھا۔ مہرو کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں ستاروں کی سی چمک اتر آتی تھی۔ اماں ان دونوں کو دیکھتیں، بلائیں لیتی نہ تھکسین۔

یہ کچا پکا گھر، نازک سی مہرو۔ بظاہر تو سب عام تھا لیکن ان کے دل۔ وہ ایسے جڑے تھے جیسے۔ جیسے ایک ہوں۔ جیسے ایک ہی دل کے دو حصے کر کے دو جسموں میں ڈال دیے گئے ہوں۔ لیکن اب..... ایک زمین تلے دفن ہو گیا تھا اور دوسرا..... وہ سب مل کر اسے دفن کرنے کی تیاریوں میں تھے۔

☆☆☆

”مہرو کی حالت دیکھ کر میرا دل بند ہونے لگتا ہے۔ جتنی بھی کوشش کر لوں، وہ اس غم سے باہر نکلنے کا نام ہی نہیں لے رہی۔“ یہ اس کی ساس تھی۔ بیٹا تو انہوں نے بھی کھویا تھا۔ اپنے یاد کر کے کلیجہ منہ کو آتا تھا لیکن جی رہی تھیں۔ کھاتی پیتی ہنستی بولتی لیکن بیٹے کے لیے تڑپتیں، پھپک پھپک کر رونے لگیں۔



”ٹھیک ہے جاؤ۔ لیکن بچیاں ساتھ نہیں جائیں گی۔ یہ میرے رئیس کی ہیں۔ اسی کے گھر میں رہیں گی۔“ انہوں نے بھی لہجہ بدل لیا اور بچیوں کو پکڑ لیا۔

”آپ..... آپ ایسا کیسے کر سکتے ہیں۔“

”تم تجھی تو یہی کر رہی ہو مہر۔“

”ابا خدا کا واسطہ! مجھے اور اذیت مت دیں۔“

”تو جا اپنے بھائی کے گھر۔ لیکن یہ بچیاں نہیں

جائیں گی۔“ مہر دان کی ضد کے آگے ہار گئی۔ سامان

وہیں پھینکا اور زور زور سے رونے لگی۔ رات کو ساس

اس کے کمرے میں آئیں۔ جہاں وہ لکڑی کے پلنگ

سے ٹیک لگائے سوچی آنکھوں سے چھت پر لگے پتھے

کو گھور رہی تھی۔

”مہر! ہماری بات سمجھ۔ مان جا شادی کے

لئے۔ رئیس کے ہوتے تو، تو سردار کی بھابھی تھی لیکن

بھائی مرتا ہے تو اس کے ساتھ اس دنیا میں جوڑے

گئے رشتے بھی مرجاتے ہیں۔ رئیس کی اولاد اس کی

بھتیجیاں ہی رہیں گی لیکن تو بھابھی نہیں رہی۔ اب تو

اس کی بیوی بن سکتی ہے، وہ نامحرم ہے تیرا۔ رئیس

کے ہوتے تجھ سے کوئی نکاح نہیں کر سکتا تھا لیکن اب

تیرے لیے ہر طرف سے پیغام آئیں گے۔ آرہے

ہیں۔ آنے بھی چاہئیں۔ دوسری شادی تیرا حق ہے۔

اسی لیے ہم چاہتے ہیں کہ تو وقت پر بہتر فیصلہ کر

لے۔ سردار کی بھابھی بھی شادی ہو جائے گی لیکن اس

کی بیوی تجھے اور تیری بچیوں کو قبول نہیں کرے گی۔

تیری بھر جالی جو تیرے غموں پر روتی ہے وہ بھی تجھے

اپنے گھر برداشت نہیں کرے گی۔ ان سب مسائل

سے نمٹنے کا بس ایک ہی حل ہے۔ اور وہ ہے نکاح۔۔

تو مان جا میری بچی۔ ہماری مشکل آسان کر دے۔

اپنی بچیوں کی زندگی آسان کر دے۔ اکیلی عورت

بغیر کنڈے کا دروازہ ہے مہر۔ کبھی بھی کوئی بھی

دبٹک دے بغیر۔ تو سمجھ رہی ہے نا میں کیا کہہ رہی

ہوں؟ وہ سمجھ گئی تھی۔ لیکن دل کا کیا کرتی۔

”اماں! رئیس۔“ اتنا کہہ کر وہ شدت سے

رونے لگی۔

”نا۔ اب اس کا نام نہ لینا۔ اب وہ تیرا شوہر

نہیں رہا۔ نکاح ٹوٹ گیا ہے تیرا۔“ مہر کو یہ سن کر

یوں لگا جیسے کسی نے اسے آسمان سے نیچے پھینک دیا

ہو۔ پیدا ہوتے ہی جو نام اس کے کانوں نے سنا تھا

وہ اب اس کا نہیں تھا۔ کتنی عجیب بات تھی۔ جس مرد

کے لیے اسے پیدا کیا گیا، وہ مر گیا تو وہ اس کی بیوی

بھی نہ رہی۔ اماں ابھی اور بہت کچھ اسے سمجھا رہی

تھیں۔ زمانے کی غلط نظریں، اپنا بڑھا ہوا، وقت کے

تھخنے اور نجانے کیا کیا لیکن وہ دیوار پر لگی رئیس کی

تصویر کو دیکھے جا رہی تھی۔ ایک ٹک۔

☆☆☆

اور پھر وہی ہوا جو عموما ہوتا ہے۔ اس کا نکاح

رئیس کے چھوٹے بھائی سردار سے ہو گیا۔ وہ بھی

خوش شکل تھا۔ اچھا کماتا تھا۔ اس کا خیال رکھتا لیکن

وہ..... وہ تو جیسے بس اس ایک جملے میں قید ہو کر رہ گئی

تھی۔ ”تیرا شوہر مر گیا تو تیرا نکاح اس سے ٹوٹ

گیا۔“ تو کیا اب وہ رئیس کو اگلے جہان میں بھی نہیں

پاسکے گی کیونکہ اس نے کسی دوسرے مرد سے نکاح کر

لیا ہے؟ جب وہ یہ سوچتی تو گھنٹوں چپ رہتی۔

سردار اس سے شکوہ کرتا کہ وہ کیوں پہلے کی

طرح ہنستی بولتی نہیں، باتیں نہیں کرتی، بھتی سنورتی

نہیں۔ جواب اسے پتا تھا لیکن وہ پھر بھی چاہتا تھا کہ

مہر اس کے لیے اتنی ہی دیوانی ہو جائے جتنی بھی وہ

رئیس کے لیے تھی۔ لیکن یہ سب کچھ ایسا تھا جیسے

دیوانے کا خواب۔

ایک روز موسم بہت اچھا تھا۔ خوب ٹھنڈی

ہوا میں چل رہی تھیں۔ سردار گھر واپس آیا تو اس کے

ہاتھوں میں سرخ چوڑیاں تھیں، ان پر نگاہ پڑتے ہی

مہر کی رنگت زرد ہو گئی۔ سردار کو لگا اب وہ پھر بھی

اس کے لیے سرخ چوڑیاں نہیں خرید سکے گا۔ سرخ

چوڑیاں دیکھتے دیکھتے وہ باغی میں کھوی گئی۔ ابے یاد

آیا کہ شادی کے کچھ ہی دن بعد رئیس اس کے لیے

بڑی مہنگی کالج کی چوڑیاں لایا تھا۔



تھی کہ آخر اس نے ایسا کیا گناہ کر دیا کہ وہ یوں آپے سے باہر ہو گیا۔

☆☆☆

سردار کو لگنے لگا کہ اس نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کر دی۔ کیا وہ اس بات سے واقف نہیں تھا کہ مہر و اور رئیس بچپن کے کسی معصوم لمحے میں ایک دوسرے کی محبت میں قید ہوئے تھے اور وہ کچھ امر تھا۔ اسے اب لگنے لگا تھا کہ اس نے مہر و سے نکاح کی ضد کر کے اس کے ساتھ بھی ظلم ہی کیا ہے۔ وہ کم عمر مگر بے حد حسین تھی۔ بھائی زندہ تھا تو وہ اس کی بھابھی ہی تھی لیکن اس کے گزر جانے کے بعد وہ بس مہر و ہو گئی۔ سب سے پہلے ابا نے ہی اس کی نظریں بھانپ لی تھیں۔ اور اس سے پوچھ بھی لیا تھا۔ وہ بھی مکرے بغیر اپنے دل کی بات بول گیا۔

”ابا! اب وہ میری بھابھی نہیں رہی، صرف ایک بیوہ ہے اور میں اس سے نکاح کرنا چاہتا ہوں۔“

اسے لگا تھا کہ عورت کا دل بھی مرد کے دل جیسا ہے۔ یہاں پہلا پنا بھرا، چاہے تو صفی پھاڑ دو یا پلٹ دو۔ کہانی ختم۔ لیکن یہ سردار کی غلط فہمی تھی۔

ابا جانتے تھے کہ سردار اب اس سے شادی کیے بغیر نہیں بیٹھے گا اور مہر و مانے کی نہیں۔ تو وہ جو حربے استعمال کر سکتے تھے، انہوں نے کیے۔ مہر و نے زبان سے اقرار کر لیا لیکن اس کا دل مٹی تلے دفن ہو گیا۔ وہ گھر کے کام کرتی، بچیوں کو سنبھالتی، سب کو وقت پر کھانا دیتی۔ سارے کام نمٹا کر اکیلی بیٹھی رہتی، ایک کونے میں۔ کچھ بڑ بڑا لی رہتی۔ سردار اسے ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے جاتا، بھی وہ اس سے جیت جاتی کبھی اس کا مقابلہ نہ کر پاتی اور جس دن وہ ہارنی، وہ ساری رات اپنی چیخوں کا گلا گھونٹتی رہتی۔ سردار بھی بے چین ہی رہتا۔ رئیس کا بھائی تھا۔ دنیا ہی نرم دل لیکن تھا تو مرد ہی۔ کیا کرتا۔ اس نے بھی وقت باہر گزارنا شروع کر دیا۔ واپس تب آتا جب مہر و سوچ چکی ہوتی۔ برآمدے میں پڑی چار پائی پر ہی سو جاتا۔

اس کھینچا تانی میں کسی کو احساس ہی نہ ہوا کہ مہر و بدلتی جا رہی ہے اور اب تو وہ اکیلی کونے

”جب ہم جنت میں چلے جائیں گے، کیا تب بھی تو مجھے یہ چوڑیاں لا کر دے گا؟“ اس کے اس سوال پر وہ اتنا ہنسا۔ اتنا کہ گھر کے تمام لوگ اس سے اس لطفے کے بارے میں پوچھنے لگے جسے سن کر وہ یوں قہقہے لگا رہا تھا۔

”ارے پاگل! وہاں یہ کالج تھوڑی نا ہوں گے۔ وہاں تو ہیرے ہوں گے، ڈھیر سارے۔ ہر وہ چیز ہوگی جو اس دنیا میں ہم نے کبھی دیکھنا تو دور سوچی بھی نہیں۔ تجھے میں وہاں ہیرے کے گنگن پہناؤں گا۔“ گھر والوں کے جانے کے بعد جب کمرے میں وہ دونوں رہ گئے تو اس نے بے حد محبت سے اس کی چوڑیاں گھماتے ہوئے کہا۔

”رئیس! وہاں ہم دونوں ساتھ ہوں گے نا۔ وہاں پھر سے شادی تو نہیں کرنا پڑے گی، ہمیں۔“ وہ پھر سے ہنسنے لگا۔

”ہاں! اگر میں مرجاؤں اور تو کسی اور سے شادی کر لے تو پھر.....“ لیکن مہر و نے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ وہ تو آدمی بات سن کر ہی رونے لگی۔ زور زور سے۔ رئیس بے چارہ ڈر ہی گیا تھا اور بڑی مشکلوں سے اسے چپ کر دیا تھا۔

وہ ان لمحوں میں کچھ یوں گرفتار تھی کہ اس نے سردار سے یہ سوال پوچھ لیا، وہ بھی تب جب اس نے دن بھر کے تھکے ہارے سردار کے سامنے کھانا لا کر رکھا اور اس کے قریب چار پائی پر بیٹھ کر پکھا جھلنے لگی جیسے وہ رئیس کر جھلا کرتی تھی۔ سردار کا معصوم دل نرم ہونے لگا۔

”جب ہم سب مرجائیں گے اور اپنی سزا کاٹنے کے بعد جنت میں جائیں گے تو..... تو کیا وہاں..... وہاں رئیس ملے گا مجھے؟“ سردار کو لگا جیسے کسی نے اس کے منہ پر تیزاب پھینک دیا ہو۔ اس کی آنکھیں پل میں سرخ ہوئی تھیں اور وہ چوڑیاں جو بڑی محبت سے اس کے لیے لایا تھا، جلتے چونے لہے میں پھینک دیں۔ ہر چیز وہ اٹھا اٹھا کر پھینک رہا تھا اور خوب چیخ رہا تھا۔ جبکہ سامنے کھڑی مہر و یہ سوچ رہی



کھدروں میں بیٹھ کر بڑبڑاتی دکھائی بھی نہیں دیتی۔  
وہ چار پائی پر لیٹی تو لیٹی رہتی۔ تکیے کے غلاف  
میں رئیس کی تصویر چھپا رکھی تھی۔ کچھ دن پہلے تک  
کیسی اذیت تھی جو اس نے چین رکھتی، شرمندگی کا  
احساس، رئیس کو دھوکا دینے کا وہم اور اسے دوبارہ پا  
لینے کی شدید خواہش۔ یہ تین چیزیں دن رات اس  
کے ذہن میں چکراتی رہیں اور وہ اس دنیا سے دور  
ہوتی جاتی لیکن پھر اچانک سب بدل گیا۔ اس کا دل  
اور دماغ ایک ناقابل بیان سکون میں ڈوب گئے۔  
کچھ دن پہلے ہی تو اس نے رئیس کو دیکھا تھا۔  
خواب میں وہ سفید گھوڑے پر آیا تھا۔ سفید ہی لباس  
میں۔ یہ چمکتا بھرا بھرا چہرہ۔ مہر دینے اسے دیکھتے ہی  
چہرہ چادر میں چھپا لیا۔ شرمندگی ایسی تھی کہ اسے اپنا وجود  
زمین کے اندر دفن ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ رئیس گھوڑے  
سے چھلانگ لگا کر اتر اور اس کے پاس آیا، ہاتھ پکڑ کر  
اسے کھڑا کیا اور چہرہ دیکھا اور بولنے لگا۔

”مہر د! جو کچھ بھی ہو وہ تقدیر کا لکھا تھا۔ اس میں  
تمہاری کوئی غلطی نہیں۔ تم کیوں شرمندہ ہو؟ میں تمہیں  
اس حال میں دیکھتا ہوں تو مجھے بہت درد ہوتا ہے۔ مت  
کرو یہ سب۔۔۔ سردار میرا بھائی ہے۔ وہ بھی تکلیف  
میں ہے اور تم..... تم بھی تو اذیت میں ہو۔“

”لیکن میں یہاں بہت خوش ہوں۔ یہ جگہ بہت  
اچھی ہے۔ مگر تمہارے آنسو مجھے بے چین کر دیتے ہیں۔ تم  
بھی خوش رہو نا۔ سردار کے ساتھ۔“ اتنا کہہ کر اس نے مہر د  
کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اور مسکراتا ہوا پھر سے گھوڑے پر بیٹھ  
گیا۔ مہر د اسے دور جانا دیکھتی رہی۔ جب جاگی تو پورا  
بدن پسینے سے بھگا تھا۔ وہ پھر سے لیٹ گئی اور کچھ ہی دیر  
بعد وہ ایک گہری پرسکون نیند کی بانہوں میں گئی۔

☆☆☆

اس سکون کو محسوس کرنے کے بعد اسے علم ہوا کہ  
سردار کئی روز سے کمرے میں نہیں آیا۔ نہ اس نے اس  
کے ہاتھ کا پکا کھانا کھایا ہے۔ اور بچیاں بھی پہلے سے  
کنزور ہو گئی ہیں۔ نیند سے جاگنے کے بعد اس نے غسل  
کیا۔ صاف ستھرا سرخ رنگ کا سادہ سا سوٹ پہنا۔

سردار کی پسند کا کھانا بنایا اور پھر سب کے سو جانے کے  
بعد باہر چار پائی پر آگئی، جہاں تکیے میں اس نے رئیس  
کی تصویر چھپا رکھی تھی۔ اس نے وہ تصویر نکالی تو ساتھ  
ہی ایک اور تصویر بھی گری۔ وہ مہر د کی تصویر تھی۔ جب  
اسے سردار کی دلہن بنایا گیا تھا تب شاید کسی نے چینی تھی  
لیکن وہ اس بات سے لاعلم ہی تھی۔ سردار کے چہرے پر  
خوشی اور دکھ دونوں تھے جبکہ وہ..... وہ زندہ لاش لگ  
رہی تھی۔۔۔ مہر د نے آخری بار اپنے چہرے کو رئیس کے  
نام کے آنسوؤں سے دھو کر دایا اور پھر پاس لگے درخت  
کے نیچے وہ دونوں تصویریں دفنادیں۔ وہ ہاتھ دھو کر آئی  
ہی تھی کہ دروازہ بجا۔ دروازے کے پار سردار تھا۔  
اس نے کانپتے ہاتھوں سے دروازہ کھولا۔۔۔  
سردار اسے دیکھ کر خیران رہ گیا لیکن بغیر کچھ کہے  
سیدھا چار پائی پر جا کر بیٹھ گیا۔  
”کھانا کھاؤ گے؟“

”نہیں! مجھے بھوک نہیں۔“ یہ کہہ کر وہ بازو کا  
تکیہ بنا کر لیٹ گیا۔  
”لیکن مجھے تو بھوک لگ رہی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ اس  
کے قریب بیٹھ گئی۔ سردار حیرت کی شدت سے اٹھ کر بیٹھ گیا  
اور مہر د کو دیکھنے لگا۔ اس نے نگاہیں جھکا لیں۔

”مجھے سچ میں میری فکر ہے یا اماں کے دباؤ  
میں آکر۔“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور  
جواب کا انتظار کرنے لگا۔

”دباؤ میں آکر تو میں نے تجھ سے نکاح کیا تھا لیکن  
اب۔۔۔“ اس نے بھی جملہ مکمل کرنا ضروری نہ سمجھا کہ وہ جانتی  
تھی سردار کو ادھوری باتیں بھی پورا مطلب سمجھا دیتی ہیں۔  
”مہر د..... تو سچ میں میرے ساتھ ہی رہے گی نا؟  
اپنے دل کی رضا مندی سے۔“ اس نے جذبات کی  
شدت سے اس کے ہاتھ تھام لیے اور مہر د نے مسکراتے  
ہونے سرائیبات میں ہلایا۔ سردار کو یوں لگا جیسے اس کے  
برآمدے میں گلاب کے بہت سے پھول اگ آئے  
ہوں اور وہ..... وہ بادلوں پر پاؤں رکھ رہا ہو۔

☆



## سنعہ عمیر



بارش استاد نے مہارت سے لکھتے ہوئے چند ساعتوں کے لیے مڑ کر طالب علموں کو دیکھا اور پر جوش انداز میں کہا۔ ان کا فن ان کی رگوں میں ایک دلوں کی طرح گردش کرتا تھا۔ اپنی کرسی پر بیٹھے مطیب نے اپنے قلم کو ایک بار پھر پینٹ میں ڈبوایا اور اپنے استاد کی تقلید کرنے لگا۔

مطیب اپنے استاد سے بہت متاثر تھا۔ وہ سادہ سے حلے میں رہنے والے ایک دانا آرٹسٹ تھے۔ فن خطاطی میں تو وہ استادوں کے استاد تھے۔ وہ ایوارڈ یافتہ خطاط تھے جنہوں نے بے شمار کتابیں تخلیق کی تھیں۔ ان کی کولیکشن میں ایران، انڈیا اور سری لنکا سے آئے قلم موجود تھے۔ وہ دارچینی کو بھی تراش کر قلم گھڑ لیتے تھے۔ انہیں کاغذ پر لکیریں کھینچنے کی ضرورت نہیں تھی وہ ذہن میں ڈیزائن سوچ کر ہو بہو یا اس سے بہتر ڈیزائن کیونس پر اتار لیتے تھے۔

جب وہ کام میں محو ہو کر فن پارے تخلیق کرتے تھے تو ان کو دیکھنا ہی اپنے آپ میں ایک تفریح ہوتی تھی۔ اسے اپنے استاد میں ایک مذہبی اسکار بھی نظر آتا تھا۔ شاید یہ خطاطی کا فن ایسا ہی تھا جو آرٹسٹ کو اللہ کا نام لکھنا سکھاتے سکھاتے اس کی شخصیت کے ابواب بھی کھول کر دکھانے لگتا ہے۔ اس لیے مطیب کو یہ ہنر سیکھنا عبادت لگتا تھا۔ وہ ایک بار پھر سیاہی میں قلم ڈبو کر استاد کی تقلید کرنے لگا۔ اس کے اندر بھی ایک فطری آرٹسٹ موجود تھا۔ جسے سنورنے کے لیے ابھی کئی مراحل طے کرنے تھے۔ وہ توجہ سے کام

”آرٹ معاشرے کے لیے آئینہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کی تشکیل کرنے کے لیے ایک ہتھوڑی ہے۔“  
(لیون ٹراسکی)

استاد بانس کے بنے کٹے ہوئے قلم سے کیونس پر کوئی آیت لکھ رہے تھے۔ قلم کی مخصوص کھینچنے جانے کی آواز کسی موسیقی کی طرح ہوا میں پھیلتی ساتھ ساتھ کیونس پر خطاطی کے ہوئے الفاظ ابھرتے جاتے۔  
”قلم تو وہ شے ہے جس سے سیکھنے سکھانے کا حکم آیا ہے۔“

## ناؤلٹ





کرنے لگا مگر کچھ کی تھی۔ اسے اپنے سر کے اختتام پر خود میں ایک خطا نظر نہیں آتا تھا۔ اب خدا جانے کہ یہ نظر کا قصور تھا یا دل کا۔

سراسامہ ٹیل پر کینوس رکھ کر اس پر ٹیوب سے رنگ انڈیل رہے تھے۔ نیلا رنگ، آسمانی، فیروزی، گہرا نیلا اور وہ نیلا جس پر سیاہ کا گمان ہوتا تھا۔ مطیب نے انہیں ہمیشہ یہی کہتے سنا تھا کہ مجھے رنگوں سے اتنا پیار ہے کہ لفظوں کی گرفت ہی چھوٹ گئی ہے۔ اب میں رنگوں سے بات کرتا ہوں۔ ان ہی سے بے لفظ قصے سناتا ہوں اور شعر تک کہہ جاتا ہوں۔ مطیب سوچتا تھا کہ یقیناً وہ کوئی ملنگ ہی ہیں جو اتنی قابلیت اور ہنر کے بدلے میں ملنے والی اس سادہ سی زندگی پر مطمئن ہیں۔

یہ تین سالہ آرٹ ڈپلومہ کورس تھا۔ جس میں مطیب کو بڑی جستجو سے داخلہ ملا تھا۔ تک دو سے حاصل کی گئی یہ آرٹ اسکول کی کرسی مطیب کو اب چھینے لگی تھی وہ ہنرمند تھا اور دس سال بعد خود کو عالی شان نہیں مگر پرسکون زندگی گزارتے ہوئے ضرور دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر یہاں اس کے اندر کا آرٹ پر سکون ہونے کے بجائے غیر آرام دہ ہونے لگا تھا۔ مطیب نے سر جھٹک کر سراسامہ کے کام پر توجہ دی۔ سراسامہ اب پانی چھڑک کر ہاتھوں سے کینوس پر رنگ پھیلا رہے تھے۔ کینوس پر ہلکے نیلے سمندر پر چھائی گہری نیلی رات کا منظر ابھرنے لگا تھا۔

☆☆☆

”اتنا سنا کیوں ہے بھائی؟“

مطیب کینٹین میں گرم صم بٹھا تھا جب احمد نے فلمی ڈائلاگ بول کر اس کا کندھا جھنجھوڑا۔

”نہیں تو بس میں ہارون صاحب کے بارے میں سوچ رہا تھا۔“ مطیب نے دوست سے نظریں ملانے کے بجائے نگاہیں ہاف سیٹ چائے کی خالی کیتلی پر ڈالیں۔ سٹیل کی وہ کیتلی آگ پر دھک دھک کر باہر سے کالی ہو چکی تھی۔

”اس میں سوچنا کیا ہے۔ جمعہ کو سب حال

پوچھنے جائیں گے تو تم بھی چلنا۔ اب تو ریکوری میں ہیں۔“ احمد نے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

مطیب نے غیر ارادی طور پر قریب موجود ٹوتھ پک اٹھالی اور اس سے کیتلی کی راکھ کریدنے لگا۔ وہ جہاں جہاں ٹوتھ پک رگڑ رہا تھا وہاں سے کیتلی کا اصل پیلا اور سبز اسٹیل جھلکنے لگا تھا۔ مطیب ایک بار پھر سوچ میں ڈوب گیا۔

آرٹ ڈپلومے کے اس فیصلے پر وہ اس وقت سے نظر ثانی کرنا شروع ہو گیا تھا۔ جب سے اس نے ہارون صاحب کی مجسمہ سازی (sculpture) کی کلاس اسٹڈی کی تھی۔ وہ ہنر جو خطاطی میں عبادت لگتا تھا۔ مجسمہ سازی میں گناہ کبیرہ کی شکل میں نظر آنے لگا تھا۔ اس کے بعد ہارون صاحب کی علالت نے اسے بری طرح جھنجھوڑا تھا۔ انہیں آپریشن کروانا تھا اور ان کے پاس وسائل نہیں تھے۔ ان کے اسٹوڈنٹس نے مہم چلا کر ان کے آپریشن کے لیے پیسے اکٹھے کیے تھے۔

”یار تو پھر اسٹیجو کیوں بن گیا ہے؟“ احمد نے اس کی الجھن بھانپ لی تھی۔ اس لیے اس کے سامنے چٹکی بجائی۔

”یہ اسٹیجو اور اسکلپر کا نام مت لینا میرے سامنے، ہارون صاحب نے ساری عمر مجھے بنا کر کیا کما لیا؟ جب علاج کی ضرورت آئی تو چندہ اکٹھا کرنا پڑا۔“ مطیب بگڑ کر بولا۔ اس کے ہاتھ مزید تیزی سے ٹوتھ پک رگڑ رگڑ کر کیتلی پر پھول بوٹے بنانے لگے۔

”ساری عمر اپنی پسند کا کام سینہ ٹھونک کر کیا۔ خوش باش زندگی گزاری اور جب بیمار پڑے تو سینکڑوں جان نثار موجود تھے ان کی مدد کرنے کے لیے۔“ احمد اس تصویر کا بالکل ہی الگ رخ دیکھ رہا تھا۔

”وہ فلموں میں دکھاتے ہیں نا آرٹ گیلری میں آرٹ نازک سا گلاس پکڑے تعریفیں بٹور رہا ہوتا ہے۔ اصل زندگی میں ایسا کچھ گنے چنے لوگوں کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔“

مطیب کو ایک بڑی ملت لگ گئی تھی۔ وہ راستے کو



بھر پور طریقے سے طے کرنے کے بجائے کام گنتے بیٹھ گیا تھا اور اس لیے ہانپنے لگا تھا۔

”اس سے اچھی تو میرے ابا کی کلرکی والی نوکری ہی ہے۔ خشک فائلوں میں ساری عمر گزاری مگر ہاتھ تو نہیں پھیلائے پڑے۔ عزت سے معاشرے میں جی رہے ہیں۔“ مطیب کی ٹوتھ پک اس کی گرفت سے ٹوٹ گئی تو اس نے دوسری اٹھالی اور پھر کیٹلی کو رگڑنے لگا۔

”بہت اچھے..... بن جاؤ گھڑی کی سوئیوں پر چلنے والے، ملز لگا لو..... انڈسٹری بنالو۔ پھر وہی گرو جو یہ تمام دولت مند کرتے ہیں۔ وہ اپنا تمام پیسہ خرچ کر کے سکون حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے گھروں کو ہارون صاحب جیسے آرٹسٹوں کی تخلیقات سے بھر دیتے ہیں۔ پینٹنگ کے رنگوں میں مجسموں کے خدو خال دیکھ دیکھ کر زندگی کے معنی ڈھونڈتے ہیں۔ وہ لمبی چھلانگ مار کر دنیا فتح کرتے ہیں تو وہ جیت انہیں پرسکون کرنے میں ناکام رہتی ہے۔ وہ پرسکون ہونے کے لیے دوبارہ آرٹ کی ہی گود میں آگرتے ہیں۔ ہم تو خوش قسمت ہیں سب شارٹ کٹ میں حاصل ہے۔“

احمد نے دلیل سے کہا۔ مطیب چند لمحوں کو چپ رہ گیا۔

اس نے ہاتھ روک کر اپنا دل ٹٹولا۔ ضدی دل اب بھی وہی بات کر رہا تھا۔ اس وحشت میں وہ ایک بار پھر کیٹلی کی راکھ کریدنے لگا۔

”پھر شاید میں سچا آرٹسٹ ہوں ہی نہیں جو اتنی جلدی بے سکون اور ناامید ہو گیا ہوں۔“ مطیب نے سنجیدگی سے کہا تھا احمد چند لمحوں کو قائل ہو بھی گیا تھا۔ پھر اس نے مطیب کے ہاتھ میں موجود کیٹلی دیکھی جس پر وہ بڑی مہارت سے نقش و نگار بنا رہا تھا۔

گول پینڈے والی کیٹلی مغلیہ دور کی کسی عمارت کے گنبد کی مانند لگ رہی تھی۔ جس پر سبز اور پیلی مینا کاری ہوئی ہو۔ احمد کو ہنسی آگئی۔

”یہ سب تم باتیں ہی کرتے ہو۔ فارغ بیٹھتے ہو

تو بھی آرٹ کا شاہکار بنا لیتے ہو۔ تم اس فن کو اپنے اندر سے نہیں نکال سکتے۔“ احمد کچھ پرسکون ہو گیا۔

مطیب اپنے ہاتھ میں تھامی کیٹلی دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ وہ تو بے خیالی میں اس پر ڈیزائن بنا چکا تھا۔ اسے تو احساس بھی نہ ہوا، وہ کیا کر رہا ہے۔ اس کی انگلیاں اس کیٹلی پر نقش و نگار کھل کرنے کو بے چین ہو رہی تھیں۔ مگر اس نے ہاتھ روک لیا۔ اسے فیصلہ کرنا تھا۔ اسی لمحے بہت بڑا فیصلہ کرنا تھا۔

”نہیں یار، یہ شوق بہت اچھا ہے۔ مگر میں یہ کورس مکمل نہیں کر سکتا۔ میرا اب اس میں دل نہیں لگتا۔“ مطیب نے ٹوتھ پک توڑ کر ٹیبل پر رکھی فیصلہ ہو گیا تھا۔

”پھر کیا کرو گے؟“ احمد نے مخلصانہ سوال کیا۔ مطیب ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ اس کے پاس جواب ہی نہیں تھا۔

☆☆☆

صوم و صلوٰۃ کی سالوں کی پابندی نے سرفراز نعیم کو ایسی کچی عادت ڈال دی تھی کہ انہیں فجر پر جاگنے کے لیے کسی الارم کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ اذان سے چند لمحوں پہلے ان کی نیند خود بخود ٹوٹ جاتی تھی۔ اس روز بھی وہ عادتاً ہی بستر سے اٹھ کر صحن کی طرف چل پڑے، راستے میں خلاف معمول ایک چارپائی پڑی تھی۔ جس سے انہیں اندھیرے میں ٹھوکر لگی۔

”فاخرہ!“ وہ گھبراہٹ میں بیوی کو پکارنے لگے۔

چارپائی برسوتے ہوئے مطیب کی بھی شور شرابے سے آنکھ کھلی۔ مگر باپ کو سر پر موجود دیکھ کر اس نے آنکھیں سختی سے میچ لیں اور سونے کی اداکاری شروع کر دی۔ صبح صبح پہلا دیدار ابو کا ہوا تھا نہ جانے آج کا دن کیسا گزرنا تھا۔

”دیکھو، اے صاحب زادے کو بیچ صحن میں سو رہا ہے۔“ بیگم کو دیکھتے ہی انہوں نے شکایت کر دی اور رستہ بدل کر آہستہ آہستہ نکلے کی جانب چلنے لگے۔



”آرٹ سکول میں پڑھ رہا ہے۔ جتنے ٹیڑھے  
وتیرے ہوں گے اتنا ہی بڑا آرٹسٹ بنے گا۔“ ماں  
کے پاس بچے کی ہر حرکت کا جواز پہلے سے تیار ہوتا  
تھا۔

مصنوعی سوتے ہوئے مطیب کو جھرجھری آئی۔  
اس نے گھر والوں سے جھوٹ بولا تھا کہ وہ چھٹیوں  
پر گھر آیا ہے۔ جبکہ درحقیقت وہ پڑھائی کو خیر باد کہہ آیا  
تھا۔

”کچھ زیادہ لمبی رخصت نہیں ہوگئی برخوردار  
کی۔“ باپ کی نظر اس کے سوتے وجود پر پڑی تو  
مطیب دم سادھے لیٹا رہا۔ آج تو جیسے راز افشا  
ہونے کا دن تھا۔ وہ رات میں چارپائی پر آ لیٹا تھا اور  
کچھ دیر گانے سنتا، تارے دیکھتا پھر واپس اندر جا کر  
سو جاتا۔ کچھلی رات آنکھ لگ گئی اور برآمدے میں ہی  
سوتا رہ گیا۔

”ناشتے پر اسے بھی اٹھا دینا، پوچھوں گا۔ کیا  
چل رہا ہے۔“ سرفراز نے بہت سنجیدگی سے حکم  
صادر کیا۔

”جی اچھا۔ جگا دوں گی۔“ فاخرہ تابعداری  
سے بولی۔

مطیب تو پہلے ہی جاگ رہا تھا اور باپ کے  
ارادے کو جان کر اس کے ہوش اڑ گئے۔ ناشتے سے  
پہلے ہی وہ گھر سے نکل گیا۔ اس کے آرٹ سکول کے  
دوست پاک بچن کے میلے میں جا رہے تھے۔ وہ بھی  
ان کے ساتھ دریائے ستلج کے کنارے واقع اس  
شہر کو چلا گیا، جہاں کی مٹی پر تاریخ کے کئی بڑے  
جنگبوز اور معلموں نے بھی اپنے قدم ثبت کیے  
تھے۔

☆☆☆

وہ آرٹ کے اسٹوڈنٹس تھے۔ ہر چیز کو اپنے  
انداز سے دیکھتے تھے۔ میلے میں بننے والے بھانت  
بھانت کے پکوان کسی آرٹ کے نمونے سے کم نہیں  
تھے۔ گول گول ڈوبتے سورج کے رنگ کی جلیبیاں  
جنہیں دیکھتے ہی کرشمے کی طرح منہ میں پانی بھر جاتا

تھا۔ سالے سے سجا تجریدی آرٹ جیسا تھا، شیشے کی  
بوتلوں میں سجے رنگارنگ شربت اور پھلوں کے رس۔  
ان کے اندر موجود آرٹسٹوں کو لبھانے کے لیے وہاں  
بہت کچھ تھا۔ ڈھولک کی تھاپ پر دھمال ڈالتے  
مردوں کے رقص کو دیکھ کر ان کے قدم بھی تھرکے،  
انعام کے لالچ میں انہوں نے بھی کئی کھیل تماشوں  
میں نشانے لگائے۔ پھر وہ شہر گھومنے کی نیت سے  
قریبی بازار میں آ گئے۔

”یہ بہت مشہور دکان ہے۔“ حسیب نے  
دائیں طرف اشارہ کیا۔ اس کی اس شہر سے پرانی  
واقفیت تھی۔ مطیب نے رخ موڑ کر دکان کی طرف  
دیکھا۔ وہاں ”عصمت مہندی مرکز“ درج تھا۔

”پہلے یہ پاس والے دربار کی میز میوں پر بیٹھ  
کر مہندی لگاتا تھا۔ اب تو کئی سال سے اپنی دکان  
ہے۔“ حسیب پھر بولا۔

”لگاتا تھا؟“ مطیب کو لگا اس سے صنف سننے  
میں غلطی ہوئی ہے۔

”ہاں آدی ہے۔ یہ تو ستراسی کی دہائی سے  
مہندی لگاتا ہے۔ عرق والی مہندی۔“ مطیب کو بڑی  
کشش محسوس ہوئی۔

”میں ذرا دیکھ کر آتا ہوں۔“ وہ دوستوں کو کہتا  
ہو ا دکان میں داخل ہو گیا۔

”اس کو بڑا شوق ہو رہا ہے زنانیوں میں جانے  
کا۔“ ایک دوست نے کہا اس نے سب ان سنا کر دیا  
اور پردہ سر کا کر دکان کے اندر چلا گیا۔ پہلی نظر میں ہی  
اس کو ایک خوش گواردھچکا لگا۔ وہاں چار پانچ لڑکے  
اپنے استاد کی سرپرستی میں بیٹھے مہندی لگا رہے تھے۔  
سب نے اپنے سامنے میز رکھ کر اس پر ایک ٹیڑھا فوم  
رکھا ہوا تھا۔ لڑکیوں نے اپنے ہاتھ فوم پر رکھے تھے۔

وہ بڑی مہارت سے موٹی چوڑی سی سرخ میں عرق  
بھر کر گاہک کا ہاتھ بنا چھوئے عرق والی مہندی لگا  
رہے تھے۔ ہتھیلیوں پر سرخ عرق بکھرتا دیکھ کر مطیب  
کو ایک عجیب سے سکون کا احساس ہو رہا تھا۔

اس نے جان دار چیزوں سے متاثر ہو کر بتا بے



دنیا بھر میں منتخب معیاری ادب

# عمران ڈائجسٹ

Email: id@khawateendigest.com

مارچ 2020 کے شمارے کی ایک جگہ



عمران ڈائجسٹ

## امتحان لیتی ہے محبت

محبت لیکن دین نہیں ملتی صرف دین دین ملتی ہے۔ محبت میں جو قربانی دینا ہے وہی حکیم کہلاتا ہے۔ سطور سطور کی سطور جنہوں نے محبت کا احسان دیا دیوں نے ہی ایمار کیا۔ حکیم کون رہا؟

ایم الیاس کا تارنیں سے سال

## شامت جاں

کاہلی نہات سے حاصل ملتی ہے یا صیب عذات کی جگہ میں جتنے ملک لاکھ پائونڈ سرکار رساں کا کارنامہ کام کرتے ہوئے بھی کامیاب تھا۔

صدف راشد کی جاسوسی

## زندگی ہزار رنگ

زمین ہزار رنگ ملتی ہے۔

عاصمہ زیدی کی اس کہانی میں آپ کو مختلف نغمہ خراںیں ملے گی

## جرم کی سیاہی

بے وار کی لاشیں پلٹی خرم ہے خواہ کسی اصرار سے ہی نہ۔

شرقی ریڈیو کی قاتل لڑکی کا منہ کا انجام۔

آپ کے ہر دلعزیز صحت جاوید راہی کے گم سے

اس کی حلاوت بیس بیس کی رو میں، مسکین اور تپس سے

بہار شہر و معروف مصنفین کی طبع زار و ترجمہ کتابیں

اس کے علاوہ بیس بیس کی رو میں، مسکین اور تپس سے

بہار شہر و معروف مصنفین کی طبع زار و ترجمہ کتابیں

مارچ 2020 کا شمارہ مارچ کی خیریت

جان آرٹ ہزاروں بار دیکھا تھا۔ لیکن مہندی کے عرق کا ماجرا الگ تھا۔ یہ جان عرق جیسے جان دایر ہتھلی کی جنبش پر مل رہا تھا۔ رقص کر رہا تھا۔ مطیب تجس سے کھڑا دیکھتا رہا۔ ان لڑکوں کو اپنے فن میں اتنی مہارت تھی کہ منٹوں میں ایک ہاتھ لگا کر دوسرے ہاتھ کی طرف بڑھ جاتے تھے۔ کتنا لطیف کام تھا۔ تخلیق کا لطف بھی تھا اور روزگار کا ذریعہ بھی۔

اس نے مزار پر دھمال ڈالتے لوگوں کو دیکھا تھا۔ اب جیسے اس پر بے خودی طاری ہو رہی تھی۔ اس کی خالی انگلی مہندی کی سرخ کے طرز پر پلنے لگی، جیسے دل سے ہاتھ کا براہ راست تعلق جڑ گیا ہو۔

☆☆☆

مطیب کی وہ صبح اپنے ابو کی صورت دیکھ کر ہوئی تھی اس روز اسے انکشاف کرنے والا کوئی درس کیسے نہ ملا۔

”اس کی بے ڈھنگی حرکتوں کو آرٹسٹ کا روپ کہہ کر سراہتی تھیں۔ اب اثر دیکھو۔ اب تو اس کو بے ڈھنگے پن کا ہی ڈپلوما ملے گا۔“ بیٹے کے منہ سے انکشاف سن کر سرفراز صاحب کی امیدوں کا قافلہ لٹ گیا تھا۔

”جب سے بڑے کالج میں داخلہ ملا تھا جیرہ بھی سیدھے منہ بات کرنے لگی تھی۔“ فاخرہ نے دوپٹے سے خشک آنکھیں کیں ان کی نند جیرہ کا ٹیڑھا منہ تب ہی سیدھا ہوا تھا جب سے انہیں فاخرہ میں متوقع سمدھن نظر آنے لگی تھی۔

”سب خواب غارت کر دیے اس نے، اتنی مشکل سے داخلہ ملا تھا۔ سب چھوڑ چھاڑ کر آ گیا۔“ دونوں میاں بیوی گھن میں بیٹھے ایک دوسرے کا غم بانٹ رہے تھے۔

☆☆☆

رخسانہ آپلی مطیب کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آئیں۔ مطیب بیڈ پر نیم دراز تھا اور اس کی انگلی ہوا میں ایسے لہرا رہی تھی جیسے کوئی موسیقار سازندوں کو تال کا اتار چڑھاؤ سکھاتے ہوئے انگلی کو حرکت دیتا



ارادہ ظاہر کر کے کائنات باجی نے گویا اسے گھر کا فرد تسلیم کر لیا تھا۔

”پینٹ والا دوپہر تک آ جائے گا۔ تم بڑی سڑک والے ڈنگر ڈاکٹر کے گھر سے لمبی میٹر میٹنگوالو۔“ ان کے شوہر نے بھی اس ارادے پر آمادگی ظاہر کی۔

مطیب ممنون تھا۔ مگر جانتا تھا کہ وہ اس گھر کا فرد نہیں ہے۔ اسے رہنا ہے تو مروت سے رہنا ہے۔ ورنہ سب سے پہلے وہ اس نام بگاڑنے والی عادت پر اعتراض کرتا۔ کائنات باجی کی ساس کو نام یاد نہیں رہتے تھے۔ اس لیے سب کی نشانیاں لگائی ہوئی تھیں۔ ایک محلے دارنی بہت گوری چٹی تھی اور بال راکھ سے کالے۔ اس کا نام سنگھاڑے والی رکھ دیا تھا۔ کسی کی پہچان مال گاڑی کے نام سے رکھی تھی تو کسی کو ان کے گھر میں لگی سبزیوں کے ناموں سے یاد کرتی تھیں۔ اب یہ کوئی اور محلے دار تھے جنہیں سب ڈنگر ڈاکٹر کہتے تھے۔ (جانوروں کا ڈاکٹر)

مطیب اور اس کے دوستوں نے میٹرک میں اپنے بائو کے ٹیچر کا نام ڈنگر ڈاکٹر رکھا ہوا تھا۔ وہ جب بولتے تھے تو نوٹل انعام یافتہ معلوم ہوتے تھے۔ مگر جب مار لگانے پر آتے تو لگتا کہ سرکس کے جانور سدھارے ہوں۔ مطیب بڑی بے دلی سے ناشتہ کر کے بہت سستی سے کام پر نکلتا تھا۔

احمد جی کہتا تھا اس کے اندر ایک آرٹسٹ ہے جس کو اپنی غذا مطلوب ہے۔ ورنہ اس کے تمام احساسات کھڑے پانی پر آئی سبزی کائی کی طرح ہو جائیں گے۔ کام اس کی مجبوری تھی اور عرق والی مہندی لگانا اس کا شوق تھا۔

وہ اپنے فارغ وقت میں کاغذ پر ہتھیلی ٹریس کر کے کون مہندی کی پریکٹس کرتا تھا۔ اس کو اصل شوق تو عرق والی مہندی لگانے کا تھا۔ مگر جیسی مولیٰ سرخ اس نے عصمت کی دکان پر دیکھی تھی۔ وہ اسے مل نہیں رہی تھی۔ اس لیے چارو ناچار اس نے کون مہندی سے ہی کام شروع کر دیا تھا۔ وہاں مرد اس کے

ہے۔ اسے ایسے سکون سے لیٹے دیکھ کر رخسانہ آپنی کے ماتھے پر ہل پڑ گئے۔

”تم نے اچھا نہیں کیا۔ امی ابو کس قدر تکلیف میں ہیں۔“ وہ الماری کھول کر تہ شدہ کپڑے غصے سے رکھنے لگیں۔

”آپنی! میں اور کیا کرتا۔ میرا اس کام میں دل ہی نہیں لگ رہا تھا۔“ مطیب اٹھ کر سعادت مندی سے بیٹھ گیا۔

”پھر جس کام میں تمہارا دل ہے، وہ جلد ڈھونڈ لو، ہماری اذیتوں میں اضافہ نہ کرو۔“ رخسانہ آپنی نے زور سے الماری کا دروازہ بند کیا۔ ماتھے پر تیوری ہنوز قائم تھی۔

”آپنی! آپ کو یاد ہے دادی اماں جو ناخن رچنے کے لیے عرق بناتی تھیں۔ وہ کیسے بناتھا؟“

”ہاں، یاد ہے۔“ رخسانہ آپنی جو باہر جانے کو پلٹ گئی تھیں، دوبارہ مڑیں اور مطیب کو حیرت سے دیکھنے لگیں۔

”مجھے وہ عرق بنا دیں۔“ اس نے کسی بچے کی طرح فرمائش کی۔

”تم نے عرق کا کیا کرنا ہے؟“

سوال جیسے ہوا میں متعلق ہو گیا تھا اور مطیب سے جواب بن نہیں بن رہا تھا، بہت ہمت جٹا کر اس نے بولنا شروع کیا۔ مطیب کے ارادے کی بھنگ پانے والی پہلی ہستی رخسانہ آپنی تھیں۔

☆☆☆

”میں اوپر کے کمرے میں تھوڑا پینٹ کروا دیتی ہوں۔ تم دونوں کورہنے میں آسانی ہوگی۔“ ان دونوں وہ اپنی تانیا زاد بہن کائنات کے گھر پر رہ رہا تھا۔ ان کے شوہر اور دیور کا دلکی صابن کی سپلائی کا کام تھا۔ وہ بھی ان کے ساتھ ہی شریک تھا۔

اکثر صبح منہ اندھیرے نکلتے اور آدھی رات کے بعد واپسی ہوتی۔ مطیب کا گھر ڈیڑھ دو گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ اس لیے اکثر تھکاوٹ دور کرنے کے غرض سے وہیں رک جاتا تھا۔ اب کمرہ تیار کروانے کا



تھے۔ "مطیب نے ان کے ہاتھ سے سرنج پکڑ کر دیکھی۔ یہ عرق لگانے کے لیے بالکل مناسب تھی۔  
"نہی تو مجھے چاہیے تھی۔" اس نے خوشی سے کہا۔

"اس سے ہم گائے بھینسوں کو انجکشن لگاتے ہیں۔ تمہیں تو پتا ہی ہوگا، میں جانوروں کا ڈاکٹر ہوں۔" انہوں نے ہنسی نکالتے ہوئے کہا۔

"ادہ اچھا اس لیے سب آپ کو....." مطیب نے جملہ درمیان میں توڑ کر خیال جھٹکا اور سرنج کے بارے میں معلومات لینا شروع کر دیں۔

☆☆☆  
اس کے سامنے اس کی پہلی باقاعدہ گاہک کا ہاتھ تھا۔ اس کی رگیوں میں خون مزید جوش سے دوڑنے لگا۔ یہ منزل تھی یا سفر کی ابتدا ابھی فیصلہ نہیں ہوا تھا۔

مہندی تو اس کے ہاتھوں پر چڑھی ہوئی تھی۔ سرنج سے مہارت حاصل کرنے میں اسے صرف کچھ گھنٹے لگے تھے۔ اب وہ اس ہنر کو آزمانا چاہتا تھا۔ اس نے چند دکان داروں سے بات چیت شروع کی۔ بڑی محنت اور خوشامد کے بعد ایک کاسٹمیکس کے دکان دار سے اس کا معاملہ طے ہو گیا۔ وہ بڑے سلجھے ہوئے انسان تھے۔ انہوں نے مطیب کو گاہک اکٹھے کرنے کے لیے مہینے بھر کی مہلت دی۔ پہلے مہینے وہ اس سے دکان پر بیٹھنے کا کرایہ نہیں لیں گے۔ لیکن دوسرے مہینے سے اسے طے شدہ کرایہ دینا ہوگا۔ مطیب نے ایک چارٹ پیپر پر بڑے بڑے حروف میں لکھا۔

"پانچ منٹ میں ہاتھ پر مہندی لگوائیں صرف دس روپے۔" یہ چارٹ پیپر آدیزاں کر کے وہ قسمت کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ دو، تین، چار گھنٹے گزر گئے تو دکاندار نے اسے آواز دے کر اپنا کوئی کام کرنے کے لیے کہہ دیا۔ چند دن ایسے ہی گزرے۔ وہ دکان کے بیگار کرتا رہتا اور گاہک نہ آتا جو دکان کے خریدار آتے، وہ بڑے دلچسپی سے اس سے تمام تفصیل پوچھتے اور بس معلومات لے کر چلتے بنتے۔ وہ دوسرا ہفتہ تھا

شوق کو زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیتے تھے۔ مگر عورتیں بہت قدر دان تھیں۔ کائنات باجی خود بہت شوقین تھیں۔ ان کی محلے دارنیاں اور سہیلیاں بھی آتیں تو دونوں ہتھیلیاں مہندی سے رنگین کر دیا کرتی جاتیں۔ زندگی چل رہی تھی۔ مگر غلط ڈگر پر چل رہی تھی اس لیے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گزاری جا رہی ہے۔

☆☆☆  
ایک روز مطیب کسی کام سے پیدل جا رہا تھا۔ تو اسے بڑی سڑک والے ڈنگر ڈاکٹر صاحب نظر آئے۔ پہلے تو اس نے نظر بچا کر گزرتا چاہا۔ سلام دعا کس منہ سے لیتا، وہ تو ان کا نام بھی نہیں جانتا تھا۔ گھر والے تو ہمیشہ انہیں ڈنگر ڈاکٹر ہی کہتے تھے۔

"کیسے ہو ینگ مین۔" اس کے راستے بدلنے سے پہلے ہی سامنے سے اسے پکار لیا گیا۔

"السلام علیکم جی۔" اس نے بڑھ کر مصافحہ کیا۔  
"تم وہ مہندی لگانے والے ہو؟" انہوں نے دلچسپی سے پوچھا اور رخ بدل کر ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ وہ شاید واک کر رہے تھے۔

"ہاں جی۔ سیکھ رہا ہوں۔" مطیب کو ٹھنڈی پڑی اس کا چرچا ہونے لگا تھا۔

"بڑا یونیک شوق ہے۔ کہاں سے سیکھا؟"  
مطیب کو وہ شخص بہت بھلا معلوم ہوا، نہ جانے گھر والوں نے ان کا نام ڈنگر ڈاکٹر کیوں رکھا تھا۔ مطیب کو تو وہ کافی معقول انسان لگے تھے۔ وہ کریدتے رہے اور مطیب نے سراٹھایا تو ڈاکٹر صاحب گہری سوچ میں غرق تھے۔ اس نے دیکھا وہ باتیں کرتے کرتے عین ڈاکٹر صاحب کے گھر کے باہر آ چکے تھے۔

"ادھر ہی رکو۔" انہوں نے سخت لہجے میں حکم صادر کیا اور اندر چلے گئے۔ مطیب ادھر ہی کھڑا گیٹ کو گھورتا رہا کہ نہ جانے اب اندر سے کیا برآمد ہونے والا ہے۔ کچھ دیر بعد وہ باہر آئے اور ایک بولی سی سرنج مطیب کو دکھائی۔

"کہیں یہ تو وہ ٹیکہ نہیں جو تم ڈھونڈ رہے



جب ایک بچی نے شوق یا تجسس میں آ کر اس کے سامنے ہاتھ رکھا اور مہندی لگوائی۔ وہ اس کی پہلی گاہک تھی اور آگے ایک لامتناہی سلسلہ تھا۔

☆☆☆

”معاشرے کا تو دتیرہ ہی بدل گیا ہے۔ مرد کھانے پکا رہے ہیں، مہندیاں لگا رہے ہیں اور عورتیں چل پڑی ہیں ٹرک ٹیکسیاں چلانے.....“  
عبیرہ پھوپھو گفتگو میں جو جو باتیں زبان پر لا چکی تھیں۔ ان میں یہ جملہ سب سے بے ضرر تھا۔  
”فاخرہ کا بیٹا تو زخما ہو گیا ہے۔ دکان پر بیٹھ کر عورتوں کو مہندی لگاتا ہے۔“

مطیب خود تو گھر سے دور تھا مگر اس کے چرچے ہر وقت گھر پر منڈلاتے رہتے تھے۔ رشتہ داروں کی محفل میں مقبول ترین موضوع مطیب کا عورتوں میں گھرے رہنے کا شوق اور دو ٹکے کا پیشہ اپنانا تھا۔ وہ اپنی دھن کے اتنے پکے تھے کہ اکثر گھر بھی آ جاتے اور گھر والوں کی ہی بنائی جائے میں خطائیاں ڈبو ڈبو کر کھاتے۔ ساتھ باتیں بھگو بھگو کر لگاتے جاتے۔ ان ناپسندیدہ مہمانوں میں عبیرہ پھوپھو سرفہرست تھیں۔

”وہ اجمل درزی کے پاس لڑکا کام کرتا تھا جو لیڈیز ریشمی کپڑوں کا ماسٹر تھا۔“ عبیرہ نے ایک روز گھر آ کر بہت فکر مندی سے فاخرہ کو کہا۔  
”مجھے تو اس کے سرے سے پہلے ہی گھن آتی تھی اس کی شادی ہوئی، چار ہفتے میں لڑکی کانوں کو ہاتھ لگا کر واپس چلی گئی، کہتی تھی کہ لڑکے کی خصلتیں عورتوں والی ہیں۔“ انہوں نے خصلتیں پر معنی نیز انداز میں زور دیتے ہوئے راز داری سے کہا۔  
جیسے ان سے مخلص کوئی نہ ہو۔

”ابھی بھی وقت ہے سنبھال لو اپنے لڑکے کو۔ یہ زمانہ کام کرتے کرتے زمانہ شوق بھی آ جاتے ہیں۔“

”بولنے سے پہلے سوچ تو لو کہ تمہاری گودوں میں پلا بچہ ہے۔ اس نے تو نظر اٹھا کر بھی پرانی لڑکی

کو دیکھا تک نہیں۔“ فاخرہ غصے سے پھٹ پڑی۔  
”اس کی محبت میں ہی یہ سب کہہ رہی ہوں۔ ایسی بے کار نوکری کرے گا تو کون سی لڑکی ملے گی اس کو ایسا شوہر کسی کو نہیں چاہیے جو سارا سارا دن عورتوں کے ہاتھ پکڑے بیٹھا رہے۔“ عبیرہ پھوپھو مطلب پر آئیں۔

”تم نے اپنے بیٹوں کی خوب تربیت کی ہے اپنے ہی بستر کی چادر ٹھیک کرنا اپنے لیے تو ہین سمجھتے ہیں کہ عورتوں کے کام ہیں۔ میں نے یہ سیکھ نہیں دی اپنے لڑکے کو، جو کماتا ہے اپنی خداداد صلاحیت سے کماتا ہے، نہ ڈاکا ڈالتا ہے نہ چوری کرتا ہے۔ جن کو نہیں دینی اپنی بیٹی شوق سے اے مردوں کے لیے سنبھال کر رکھیں۔ جو عورت کے سنگھار کے حق کو سلب کرنا مردانگی سمجھتے ہیں۔“

فاخرہ نے نند کو تو چپ کروا دیا مگر اس رات مطیب کو فون کر کے خوب تیخ پا ہوئیں۔  
”سب کی نظر میرے بیٹوں پر تھی کہ کسی لائق ہوں تو اپنی بیٹیوں کی راہ ہموار کریں، اب انہیں لگتا ہے ایسے داماد کے ساتھ سراٹھا کر نہیں رہ سکیں گی تو باتیں بنا رہی ہیں۔“ ماں غصے میں تھی مطیب کو اچھا نہیں لگا تھا۔

”اور ابو؟“ اسے ایک ہی شخص کا خیال تھا۔  
”ان سے تو میں خود بچ بچ کر رہی ہوں۔ خدا جانے کیا سوچتے رہتے ہیں۔ میں نے نہیں بوجھا مگر وسیم بتا رہا تھا۔ مغرب کی جماعت کے بعد گشتے ہی لوگ ان کو گھیر کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مہندی کا فنکشن تو ہمارے مذہب میں حرام ہے۔ تمہارا لڑکا مہندی کی رونقیں بڑھا کر گناہ کمارہا ہے۔“ فاخرہ نے لفظوں کی لگا میں ڈھیلی چھوڑ دیں۔  
مطیب کے سینے پر چھریاں چل رہی تھیں۔

مطیب کا کام وسعت پکڑنے لگا تھا۔ اب شادی کی تقریب سے پہلے اسے گھروں پر بھی بلایا جانے لگا تھا۔ پچاس کے قریب عورتوں کو رات مہندی لگانے بیٹھتا تو فجر کی اذانوں تک جا کر فارغ ہوتا۔ مگر



ہوگا۔ اس ہنر کی قدر کرو۔ ان لوگوں کی پرواہ نہ کرو۔  
میں بھی سن کر بھول جاتا ہوں۔ تم بھی ایسا ہی کرو بس تم  
محنت کرو اور پوری ایمان داری سے رزق کماؤ۔“  
انہوں نے بڑھ کر بیٹے کو سینے سے لگا لیا۔  
مطیب کے دل و دماغ پر پرسکون کرنے والی  
پھوار برسے لگی۔ اس کے اپنے پاس اس کے ساتھ  
تھے۔ اسے لگا سب مشکلیں چھٹ گئیں۔ اسے منزل مل  
گئی ہے۔ لیکن اس کا یہ اطمینان وقتی تھا۔

☆☆☆

”آپ دکان بیچ رہے ہیں۔“ مطیب کے  
ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔  
”ہاں، میرے لڑکوں کی اپنی نوکریاں ہیں اور  
مجھے بھی اس کی اب ضرورت نہیں۔ ساڑھے چار لاکھ  
قیمت لگی ہے۔ بولو خریدو گے؟“ وہ مطیب کے سامنے  
آ بیٹھے۔

”کیوں مذاق کر رہے ہیں۔ ساڑھے چار لاکھ  
کیا، میرے پاس تو لاکھ بھی نہیں ہوں گے۔“ مہینوں  
محنت کر کے اس نے کام جمایا تھا۔ سب ہاتھ سے جاتا  
نظر آ رہا تھا۔ ایک بار پھر وہ صفر پر دھکیل دیا جانے والا  
تھا۔

”تم سے اس لیے پوچھا کہ پہلا حق تمہارا بنتا  
تھا۔ تم نہیں لے سکتے تو کوئی اور ڈھونڈ لیتا ہوں۔“  
دکان کا بکنا ایک اہل حقیقت کی طرح سامنے  
آ رہا تھا۔ مطیب اپنی سرنج، عرق سے بھری پیشی اور  
نوم کا ٹکڑا سامنے رکھ کر بیٹھا تھا۔ اس کی کل متاع بس  
یہی تھی۔

☆☆☆

رخسانہ آپلی نے قیلے میں مہندی، چائے کی پتی  
اور گڑ ڈال کر دھیمی آگ پر چڑھا دی تھی۔  
”اب غور سے دیکھ لو، روز روز نہیں سکھا سکوں  
گی۔“ انہوں نے دوسری بار مطیب کو ٹوکا تھا۔ جس کا  
دھیان اپنے پیشے کے نفع نقصان میں پھنسا ہوا تھا۔  
”اب اس میں یہ چھوٹی پیالی رکھ دو، دھیان  
رکھنا۔ پیالی دپچی کے کناروں کو نہ لگے۔“ رخسانہ آپلی

لوگوں کی باتوں کے باعث وہ اس کام کے پھیلاؤ پر  
سچ سے خوش بھی نہیں ہو سکا تھا۔

”میں چکر لگاتا ہوں۔“ اس نے کم صم سے  
انداز میں کہا۔

”ہاں آؤ اور اپنے ابو کو بھی خود ہی دیکھو۔“  
ساری ذمہ داری بیٹے کے کندھے پر ڈال کر وہ خود ہلکی  
پھلکی ہو گئی تھیں۔

☆☆☆

جب اس کی جیب خالی ہوتی تھی تو پیٹ کی فکر  
تھی۔ کبھی پچاس، کبھی سو روپے کی دیہاڑی لگتی دن  
بہت اچھا ہوتا تھا سو کی آمدن ہو جاتی اور ایسے دنوں  
میں مطیب خوشی سے اڑا اڑا پھرتا تھا۔ اب باقاعدگی  
سے اچھی آمدن ہونے لگی تھی تو اس کی قابلیت بدنامی  
لا رہی تھی۔ وہ بڑے جھکے جھکے کندھوں کے ساتھ گھر  
آیا تھا اور اپنے باپ کے سامنے کھڑا تھا۔  
”کام کیسا جارہا؟“ انہوں نے سنجیدگی سے  
پوچھا۔

”ٹھیک جا رہا ہے۔“ مطیب نے ان کی تسلی  
کے لیے اعداد و شمار بھی بتائے۔

”چلو اچھا ہے۔ اللہ مزید کامیا بیاں دے۔“  
انہوں نے بڑھ کر بیٹے کا کندھا تھپکا۔ مطیب بھونچکا  
رہ گیا۔

”ابا! مجھے لگا، آپ خفا ہوں گے۔“ وہ کہے بغیر  
نہ رہ سکا۔

”تم ماشاء اللہ سے اپنے قدم جمارہے ہو، میں  
خفا کیوں ہوں گا۔“ وہ اسے مزید مشکل میں ڈال  
رہے تھے۔

”آپ تو جانتے ہیں، خاندان والے کس کس  
قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔“ مطیب کو باپ میں اب  
اپنا خیر خواہ نظر آ رہا تھا۔ جن کے سامنے وہ اپنا درد کہہ  
سکتا تھا۔

”قدر اور قبر جتنے جی کہاں ملتی ہے۔ لوگوں کی  
پرواہ نہ کرو۔ کبھی تم پر مشکل وقت آئے گا تو یہ رشتہ دار  
نہیں آئیں گے۔ تب تم کو تمہارا ہنر ہی استعمال کرنا



اپنے لیے چوڑے بھائی کی استادنی ہوئی تھیں۔

اب تک مطیب کو وہی عرق بنا کر دیتی تھیں۔

مگر جب سے ان کی شادی کی تاریخ شہری بھی انہوں

نے اس کام سے انکار کر دیا تھا۔ ان کے ہاتھوں

پر عرق لگ جاتا تھا۔ اب وہ چاہتی تھیں کہ ان کی

شادی تک ان کی ہتھیلیاں بے داغ رہیں۔ انہوں

نے تو سادگی سے عرق بنانے سے معذرت کی تھی۔

مگر مطیب دکان بک جانے پر پہلے ہی دل برداشتہ

تھا۔ اس کے دل نے یہ انکار زیادہ ہی لے لیا تھا۔

اسے لگا جیسے قدرت اس کے خلاف جا رہی ہے۔

اسے اشارے مل رہے تھے کہ رستہ بدل لو۔

”اب یہ ٹھنڈے پانی سے بھری دیجی مہندی

والے تیلے کے ادھر رکھ دو، رنگین بھاپ کٹوری میں

اکٹھی ہو جائے گی اور وہی عرق ہوگا۔“ مختصر سا

طریقہ کار تھا۔ مطیب کی سمجھ میں آ گیا۔ اس نے پھر

اپنے ہاتھوں سے عرق بنانا بھی سیکھ لیا۔

اب اسے بس ایک سیکھ کی ضرورت تھی اور وہ یہ

کہ خود کو مشکلوں کے لیے تیار رکھنا چاہیے۔ آسانیاں تو

پانی کا بلبلا ہوتی ہیں۔ ان کی ناپائیدار دوستی کس کام

کی، دشواریوں سے دوستی بھگاری جائے تو کوئی بات

بھی ہو۔

☆☆☆

”ماہ نور! تایا جی آئے ہیں۔“ ایک زرق برق

لباس پہنے لڑکی تیرکی سی تیزی سے دہن کے پاس

آئی۔ مایوں ہٹھی دہن نے ایک مہندی لگا ہاتھ صوفے

پر اکڑوں رکھا ہوا تھا اور دوسرے پر وہ مطیب سے

مہندی لگوا رہی تھی۔

”اچھا میں فارغ ہو کر آتی ہوں پھر سلام کرتی

ہوں۔“ نازک سی دہن نے مسکرا کر اپنی کزن سے

کہا۔ اس کمرے میں لڑکیوں کی جاگیر داری تھی۔

سب دہن کو مہندی لگتے دیکھ رہی تھیں۔

”تایا ابو نہیں..... بڑے تایا جی آئے ہیں۔

ماجد تایا۔“ لڑکی نے ایک ایک لفظ پر زور دیا۔ مکھیوں

سی جھنسناتی ساری لڑکیوں کو چپ لگی۔ دہن کا وہ ہاتھ

جس پر مطیب مہندی لگا رہا تھا کانپ اٹھا تو مطیب کو

ماحول کی سنجیدگی کا اندازہ ہوا۔ اس کا کام ہی ایسا تھا وہ

اکثر کسی کے اہم ترین دن کے پاس موجود ہوتا تھا۔ کئی

فیملی ڈرامے اس کی نظر سے گزرتے تھے اور تھیلے میں

بند کتنی ہی بلیاں اس نے نکلتے دیکھی تھیں۔

”ماجد تایا کیسے آگئے؟“ دہن کا ہاتھ اب بھی

لرز رہا تھا۔ اس لیے مطیب نے اپنا کام روک لیا۔

”پھپھو نے انہیں سمجھایا ہے کہ ماہ نور کی شادی

ہے اب ناراضی ختم کر دیں۔“ اسی کزن نے بقیہ

اطلاع دی۔ کمرے میں موجود لڑکیوں کا سانس کسی

انہونی کے اندیشے سے تھما ہوا تھا۔ یہ سن کر کہ سالوں

بعد تایا جی رنجش مٹانے آئے ہیں، سب کا سانس

برسکون انداز میں خارج ہوا ہر طرف خوشی کی لہری دوڑ

گئی دہن ادھوری مہندی لیے ہی تایا جی کو سلام کرنے

اور پیار لینے گئی۔ باہر چلنے والی صلہ رحمی کی فضا کے چند

ٹھنڈے جھونکے۔ مطیب تک بھی آئے۔ اس نے

اپنے پیسے کے نفع کے خانے میں ایک نمبر مزید جوڑا۔

جذبات کے کئی مدوجزر طے کر کے دہن دوبارہ

آئی۔ گیلے عرق کا ایک حصہ پھیل چکا تھا۔ مطیب نے

احتیاط سے وہ حصہ صاف کیا تا کہ دوبارہ سے ڈیزائن

صحیح کر سکے۔ ٹشو سے سارا عرق جذب کر لیا۔ جلد

پر ایک نا ہونے کے برابر رنگ آیا تھا۔ مطیب ٹھٹھک

گیا، عرق کا رنگ برائے نام تھا۔ سب اپنی باتوں میں

لگے تھے اس کی تر ہوتی پیشانی کسی نے نہیں دیکھی

تھی۔ وہ بغیر کچھ ظاہر کیے اپنا کام کرتا رہا۔ نہ جانے

کہاں کوتاہی ہوئی تھی۔

اس نے ٹھیک ویسا ہی عرق بنایا تھا جیسے رخسانہ

آپی نے سمجھایا تھا۔ چائے کی پتی، گڑ اور مہندی

مطیب جیسے پرچہ دینے بیٹھا تھا اور وہی سوال آگئے

تھے جو اس کو نہیں آتے تھے۔ اب وہ دل ہی دل میں

خود کو کوس رہا تھا۔ اس نے طریقہ تو سیکھ لیا تھا۔ مگر

رخسانہ آپی سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ وہ اجزاء کہاں سے

لیتی ہیں۔ اس نے کسی نئی دکان سے سامان لیا تھا

اور کوئی نہ کوئی چیز ناقص آگئی تھی۔ مسئلہ اسے معلوم



ہو چکا تھا مگر اب دیر ہو چکی تھی۔ دلہن کی مہندی پوری ہو چکی تھی۔ ہتھیلی بے داغ بھی نہیں رہی تھی کہ دوبارہ مہندی لگ سکے نہ ہی عرق کا رنگ اس پائے کا نکلا تھا کہ دلہن کے شایاں شان کھلا لال ہوتا۔

مطیب نے اپنے پیٹے کے نقصان کے خانے میں ایک اور نمبر جوڑا۔ بظاہر سادہ سا نظر آنے والا اس کا کام نکھن بھی تھا۔ اس پر کسی کے اہم ترین دن کی بہت بڑی ذمہ داری تھی۔ رنگ اچھا نہیں آئے تو دلہن ویسے ہی مرجھا جاتی ہے اس کے علاوہ تو ہم پرستوں کی باتیں کہ رنگ خراب نہیں آیا تو مطلب ساس تحت مزاج ہے یا شوہر بے مروت واقع ہوا ہے۔ مطیب کی ایک غلطی سے دلہن کو کئی مسئلے سنبھنے پڑتے تھے۔ ان سارے مسئلوں کو گن کر اس نے نقصان کے خانے میں جمع کر دیا تھا اپنی اجرت خاموشی سے وصول کر کے وہ چلا گیا تھا۔

☆☆☆

اسے ایک ”پہلی پلیس“ کی تلاش تھی۔ بعض اوقات ہماری پہلی پلیس بھی ہماری نہیں ہوتی۔ اس کی بھی نہیں تھی۔ وہ احمد کا گھر تھا۔ بالائی منزل پر احمد کے کمرے کے ساتھ ہی ٹیرس تھا۔ جو احمد کی درک پلیس بن گیا تھا۔ پھر پھلتے پھلتے وہ درک پلیس ٹیرس سے کمرے تک آ گیا تھا اور اب احمد نے بیڈ کو کوونے کی دیوار سے لگا دیا تھا۔ وہاں ہر طرف احمد کا کام سجا ہوا تھا۔

احمد اب ایک این جی او سے منسلک تھا۔ ملک اور بیرون ملک میں روایتی کشیدہ کاری اور دستکاری کی بہت مانگ تھی۔ یہ این جی او دستکار اور گاہک کے بیچ میں وسیلے کا کام کرتی تھی۔ ہاتھ سے ٹانکا ٹانکا بنی رلی ہو یا دیسی ٹرکوں جیسی پینٹنگز، ان سب کے کئی خریدار تھے احمد جیسے آرٹسٹ گاؤں کے کاریگروں کے فن کو ماڈرن رنگ دلو کر ان سے وہ کام نکلاتے تھے جو باہر کو لیکٹرز آئٹمز (collector's item) کے طور پر بکتے تھے۔

مطیب خود کو اور احمد کو دیکھتا تھا اور موازنہ کرتا تھا۔ احمد اندرون ملک چھوٹے چھوٹے کئی گاؤں میں جا چکا تھا۔ بدین، ٹھٹھہ کے مزارعوں کا دورہ کر کے،

بہاولپور کے قلعوں میں گھوم کر اس نے کلہر سے آرٹ اخذ کرنا اور ان سے متاثر ہو کر چیزیں بنانا سیکھ لیا تھا۔ مطیب اس وقت جس پیڑھی پر بیٹھا تھا۔ وہ گاؤں کی نقاشی والی رنگین پیڑھی تھی۔ پاکستان میں سات آٹھ ہزار مالیت کی چیزیں یا ہر ستر اسی ہزار میں بکتی تھیں۔ احمد اور اس جیسے کئی آرٹسٹ این جی او کے ساتھ مل کر چار پائی کو ”مٹی بیڈ“ موڑھے کو ”اسٹول“ اور کھسوں کو ”پیمپس“ بنا کر باہر اور آٹھینک کے لیبل کے ساتھ بیچتے تھے۔

”مجھے اسے شوق ہی رکھنا چاہیے تھا۔ پیشہ نہیں بنانا چاہیے تھا۔“ مطیب کے سامنے ایک شیڈ و پینٹنگ تھی۔

”تم یوں بار بار پیڑی بدلو گے تو منزل پر کبھی نہیں پہنچو گے۔“ احمد سب کام چھوڑ چھاڑ کر اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ہر بار اسے اپنی پوری توجہ دیتا تھا۔ جبکہ مطیب کا دھیان بٹ بٹ کر اس کے آرٹ ورک میں محو ہو جاتا تھا۔ اسی لیے یہ مطیب کا پہلی پلیس تھا۔ اس کا دل بہلانے کو وہاں بہت کچھ ہوتا تھا۔

”آرٹ سکول چھوڑنے کا فیصلہ غلط نہیں تھا اور شاید مستقبل میں مہندی لگانا چھوڑنا بھی صحیح فیصلہ ثابت ہو جائے۔ سچ پوچھو تو یہ کام مجھے کبھی پیشہ لگا ہی نہیں۔ اس میں لطف آتا تھا اس لیے کرتا رہتا تھا۔“

”انسان کا آئیڈیل پیشہ وہی ہے جس میں اتنا مزہ آنے لگے کہ کام کام نہ لگے۔“ احمد نے چائے کی میز رکھنے کے لیے جگہ بنائی۔

”اس دلہن کا سوچو، جس کو بے رنگ عرق لگا کر آیا ہوں۔ وہ کیا یاد کرے گی، شادی پر سب اچھا تھا۔ سالوں سے روٹھے تاپا بھی شرکت کرنے آ گئے تھے۔ بس ایک مہندی کا رنگ پھیکا رہ گیا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کا دن دسوسوں میں گزرا۔“ مطیب کا دل اس لیے دکھی تھا کیونکہ اس دن اس نے اپنے کام سے انصاف نہیں کیا تھا۔

دلہن کی خوشی اور غم عرق سے وابستہ ہونہ ہو مطیب کے سب جذبے اب عرق کے مرہون منت



ہو گئے تھے۔

”ان سینکڑوں دہنوں کا سوچو جنہیں تم نے اسی مہندی کے عرق سے داگی خوشی دی ہے۔“ احمد مستقل مزاج تھا۔

”روزوں کا چھوڑنے کی باتیں کرو گے تو بینک بیلنس بھی سیلف کانفیڈنس کی طرح صفر ہو جائے گا۔“ مطیب کو یہ جملہ کھٹکا۔

احمد اب کاروباری بھی ہو گیا تھا۔ جس این جی او سے وہ منسلک تھا۔ وہ درحقیقت بزنس ہی کرتی تھی بیرون ملک کسٹمرز کو چیزیں سپلائی کرنے کے ساتھ ساتھ اندرون ملک کے کئی برینڈز کے لیے بھی کام نکلاتی تھیں۔ وہ برینڈز جو لوکل آرٹسٹ کے ڈیزائن پر ہزاروں روپے کے جوڑے بنواتے تھے اور بیچتے تھے۔ جن کے باعث ملک میں طبقاتی فرق زمین اور آسمان جتنا وسیع ہوتا جا رہا تھا۔ احمد ان کے لیے بھی کام کرتا تھا۔

یہ بزنس تھا جسے این جی او کی طرز پر پیش کر کے ٹیکس سے بچا جاتا تھا۔ کہنے کو وہ این جی او ہی تھی جو سوشل ورک کر رہی تھی۔ گاؤں کے پسماندہ خاندانوں کو کام دلوا رہی تھی۔ مگر درحقیقت مالکوں کے بینک اکاؤنٹ بھرتے تھے اور غریب ورکرز کی مٹھیاں خالی رہتی تھیں۔ این جی او کی آڑ میں بزنس تھا اور احمد اس سب کا مہرہ بنا ہوا تھا۔ پڑھا لکھا ہونے کے باعث وہ گاؤں کے ورکرز سے بہتر کما لیتا تھا مگر حقیقت وہ بھی جانتا تھا کہ وہ استعمال ہو رہا ہے۔

مطیب نے جبر جبری لی۔ وہ کم کمالے گا مگر احمد جیسی بے سکونی میں نہیں پڑے گا۔ یہاں وہ اپنا باس خود سے اسے یہی چتا ہے۔ مطیب نے موبائل نکال کر اس کو آن کیا۔ موبائل پچھلی رات سے بند تھا۔ اس کو کسٹمر کے آٹھ میسج آچکے تھے کہ عرق کا رنگ نہیں آیا۔ جس خاتون کے توسط سے اسے کام ملا تھا اس کا میسج تھا۔ وہ مطیب کے کام پر ناخوش تھی کہ اس نے مطیب سے مہندی لگوانے کو کہا تھا۔ اپنی سہیلی سے شرمندہ تھی۔ کسی دوسرے کو مشکل میں ڈال کر خود یوں

بھاگ جاتا مطیب کو بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

”ہمارا ہر وہی ماسٹر ہیں کیوں نہیں ہو سکتا۔ اتنے سارے کامیاب کاموں کے بعد یہ دل دکھانے والا ایک بے رنگ ہاتھ منہ چڑانے کیوں آ جاتا ہے۔“ مطیب نے احمد کی ایک ادھوری پینٹنگ کو دیکھا جس میں خزاں رسیدہ جنگل تھا۔

”نظر ٹیڑھی کر کے دیکھو اور کچھ مفکر بنو تو ہر وہی ماسٹر ہیں لگنے لگتا ہے۔“ احمد یقیناً اچھی چیزوں پر نظر میں گاڑتا ہوگا۔ مطیب کو یہ فن نہیں آتا تھا۔

اس خزاں رسیدہ پینٹنگ نے ایک بار پھر مطیب کی توجہ مبذول کی۔ ایک کے پیچھے ایک درخت کی قطاریں یوں لگی تھیں۔ جیسے پیچھے والے درخت سایوں کی مانند ہوں۔ مطیب موبائل جیب میں ڈال کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”کدھر کا ارادہ ہے؟“ احمد اس کو اچانک اٹھتا دیکھ کچھ سمجھ نہ پایا۔

”میں تو نظر ٹیڑھی کر کے مفکر بن کر دیکھ لوں گا۔ امید کرتا ہوں میرے آئیڈیے سے دوسروں کے اندر کا آرٹسٹ بھی جاگ اٹھے۔“ مطیب نے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا اور سیڑھیاں اتر کر جانے لگا۔ احمد مسکرا دیا۔ وہ سمجھ گیا تھا اس نے ان جانے میں مطیب کا مسئلہ حل کر دیا تھا۔

☆☆☆

”میں اپنی غلطی سدھارنے آیا ہوں۔“ مطیب دہن کے گھر دوبارہ آ گیا تھا۔

”چار گھنٹے بعد اس کی مہندی کا فنکشن شروع ہونے والا ہے میں کل ساری شام آپ کو کال کرتی رہی ہوں۔ آپ کہاں تھے۔“ دہن کی بڑی بہن ایسے دھوکے باز عرق والے کالنگ دے کر گھنٹوں بولی تھی اور جب وہ سب پس پشت ڈال چکی تھی تب وہ واپس آ گیا تھا۔

”میں اسی ڈیزائن پر کون مہندی پھیر دوں گا۔ پچھلی مہندی کا پیلا رنگ اور کون مہندی کا گہرا سرخ رنگ مل کر ایسا لگے گا جیسے شیڈڈ مہندی لگی ہے۔ مہندی



کافکشن تو مہندی لگے ہاتھوں سے بھی اٹینڈ ہو سکتا ہے۔“ مطیب کے ذہن میں احمد کی جنگل والی پینٹنگ بسی ہوئی تھی۔

درختوں کے سائے دار جھنڈ اس نے ویسا ہی عارفانہ سا منظر دلہن کے ہاتھوں پر بھی بنا دیا۔ اس کا آئیڈیا کام کر گیا۔ اس دلہن کی خراب ہونے والی چیزوں میں مطیب عرق مہندی کا نام بھی نہیں آیا مگر مطیب کی فہرست میں ابھی ایک مسئلہ باقی تھا۔ دکان بکنے کا مسئلہ۔

☆☆☆

کچھ دنوں سے زندگی میں اتنی بے یقینی تھی کہ وہ بولتا تو داستان غم سنانے لگتا۔

”ارے وہ دنیا کی آخری دکان تھوڑا تھی۔“ مون نے سگریٹ کے مرغولے بناتے ہوئے کہا۔

”ہاں پر میرے لیے پہلی تھی۔ جب دوسری دکان ناممکن لگ رہی ہو تو پہلی سے جدائی زیادہ دل جلاتی ہے۔“ اس نے بسی سانس کھینچ کر جلے تمباکو کا دھواں نتھنوں سے اپنے اندر اتارتے ہوئے کہا۔

”کیوں بادشاہو! کیا شہر میں بازار بند ہو گئے ہیں۔“ مون اس کا دوست نہیں تھا پر اکثر چائے کی دکان پر ملاقات ہو جاتی تھی۔

”خریدنے کی تو حیثیت نہیں ہے۔ کرایہ پر دینے والے بھی چھ ماہ کا کرایہ ایڈوانس مانگتے ہیں۔“

دکان کی آمدن بند ہو چکی ہے۔ اب پیسے کہاں سے جوڑوں گا۔“ مطیب نے خالی ہتھیلیاں پھیلا میں جن پر جگہ جگہ عرق نے نشان چھوڑے ہوئے تھے۔

”تو سوہیو، رات کی شفٹ ڈبل کر لو۔“ مون گنجے سر اور موٹے پیٹ والا آدمی تھا۔

”ہاں کروں گا پر ابھی تو چند ماہ مندا ہے۔ نہ یدیں ہیں نہ شادیاں۔“ مطیب مشکل حالات بھیلنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو چکا تھا۔

”کام چاہیے تو میں اس جگہ سیٹنگ کروا دیتا ہوں جہاں ہر رات شادی ہوتی ہے۔“ مون واحیات سابقہ بار کرہنسا۔

وہ اسے کام آفر کر رہا تھا اور مطیب کو لگ رہا تھا وہ اس پر تھوک رہا ہے۔ وہ شش و پنج میں انگلیاں چٹانے لگا۔ مون کس قبیلے کا انسان تھا اسے آج سے پہلے معلوم نہیں تھا اور اب وہ غرض نہیں رکھنا چاہتا تھا۔

”نہیں رہنے دو مجھے اپنا رزق عزت سے کمانے دو۔“ مطیب نے کچھ بھڑک کر کہا۔

”تو مہندی لگانے میں کون سی بے عزتی ہو جائے گی۔“ مون کے گنجے سر پر تیوری جڑھی خونناک لگ رہی تھی۔

”جتنے ہاتھوں پر پہلے مہندی لگائی ہے۔ ان سے ان کا پیشہ پوچھ کر لگائی ہے؟“ مون نے کڑوا سوال پوچھا۔ ”ہاں حساب لیتے ہو کہ ان کی کمائی حلال ہے کہ نہیں۔ بولو؟“ مون نے پوچھا۔

مطیب گونگا ہو گیا۔

”نہیں..... وہ.....“

”تم اپنے پیشے کی خبر گیری کرو۔ اس سے آگے نہ کوئی تم سے تعلق رکھے گا نہ تم رکھنا۔“ مون نے اوپر نیچے سگریٹ کے کئی مرغولے چھوڑے۔

”اب آخری بار پوچھ رہا ہوں۔ بات کروں کہ نہیں؟“ مون کی نظروں سے جیسے وہ جم گیا تھا وہ نہیں کہتا تو کس وجہ سے کہتا۔

”ٹھیک سے کرو بات۔“ مطیب کے جواب دیتے ہی اس کے حلق میں کڑواہٹ بھر گئی تھی۔

☆☆☆

”سورج ڈھلنے سے پہلے ہی وہ اپنا کام کر کے نکل آیا تھا۔ ابھی تو بالا خانوں میں چراغ بھی نہیں جلے تھے نہ گھنگھروؤں کی آواز تھی نہ ڈھولکیوں کو تھا پ لگی تھی۔ مطیب کے لیے یہ کام اپنے باقی تمام کاموں سے ذرا برابر مختلف نہیں تھا۔ اس نے بس نظر جھکا کر فوم کے شینڈ پر رکھے ہاتھوں کو بنا چھوئے عرق سے ڈیزائن بنائے تھے۔ ہمیشہ کی طرح بس مہندی لگائی تھی۔ اسے اپنے کام سے محبت تھی اور جب وہ محنت سے کام کرتا تھا تو سکون محسوس کرتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں عرق کی سرخ ہو اور سامنے ہاتھ ہو تو وہ دنیا سے



بے گانہ ہو کر کام میں لگن ہو جاتا تھا۔ اس روز بھی ایسا ہی ہوا تھا مومن نے حج کہا تھا اسے اپنے پیٹے سے انصاف کرنا تھا اور اس کا پیشہ عرق تک محدود تھا۔ اگر ڈاکٹر صرف من پسند پیٹے والوں کا علاج کرنے لگیں تو کتنوں کی موت ہو جائے۔ اللہ کی رحمتیں سب کے لیے یکساں ہیں دنیا کا قانون تفریق نہیں کرتا تو وہ کیوں کرے۔“

اس دن کے بعد سے اس نے اپنی خوش قسمتی پر خدا کا شکر ادا کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ خوش قسمت ہی تو تھا جو اسے اپنی پسند کا پیشہ اپنانے کا اختیار ملا تھا۔ اس روز اس نے فیصلہ کیا تھا وہ امیر بنے نہ بنے اسے اچھا انسان ضرور بننا ہے۔ وہ کچھڑ میں سے پیدا ہونے والا چھڑ نہیں تھا نہ ہی اسے وہ کبھی بننا تھا جو صاف جسم چھوڑ کر رستے غلیظ زخموں پر بیٹھتی ہے۔ اسے انسانوں کو انسان سمجھنے والا ایک انسان بننا تھا۔ بس!

☆☆☆

”مطیب عرق مہندی مرکز۔“ دکان کرائے کی تھی مگر کام اس کا اپنا تھا۔ اس نے تین شاگرد لڑکے بھی رکھ لیے تھے۔ وہ کم عمری میں ہی استاد بن چکا تھا۔ ان کی آمدن چھ مہینوں پر تقسیم تھی، چھ مہینے اچھی کمائی ہوتی اور چھ مہینے مندی رہتی پورے سال پر پندرہ دسمبر سے پندرہ جنوری کا ایک مہینہ بھاری تھا۔ جب تقریباً ہر گلی میں شادی ہو رہی ہوتی ہے۔ ان دنوں کے لیے اسے باقاعدہ اپائنٹڈ ڈاکٹری رکھنی پڑتی تھی پھر بھی ایسی مصروفیت ہوتی تھی کہ کھانے پینے کا ہوش نہیں ہوتا تھا۔

ایک رات ایک معروف سیاست دان کے گھر ڈھولکی کی تقریب تھی۔ مطیب اپنے شاگرد امین کو ساتھ لے کر کام کرنے پہنچا وہ سیاستداں جونی دی پر سر ڈھانپ کر آتے ہیں، ان میں سے بیشتر کی گھریلو تقاریب بہت بے باک ہوتی ہیں۔ ان دونوں کے لیے ایسی نوعیت کی یہ پہلی تقریب بھی اندر جاتے ہی دونوں کو شاک لگا سلیو لیس ٹیص، بیک لیس بلاؤز پہنے آرام سے گھومتی لڑکیاں اور گرماش پر فیشن کو ترجیح

دیتے لڑکے۔

”بھائی جان فلموں میں یہ سب دیکھ کر اور طرح محسوس ہوتا ہے۔ مگر لائیو دیکھ کرتے مینوں کا بنا چڑھ گیا اے۔“ (مگر لائیو دیکھ کر تو مجھ پر کچپی طاری ہو گئی ہے) امین کے تو دانت بجنے لگے تھے۔

”اندر بیٹھ لگے ہوں گے، فکر نہ کرو۔“ مطیب نے اپنے تئیں تسلی دی۔

دونوں اندر جا کر کام پر لگ گئے۔ ہیٹروں کی موجودگی کے باوجود دسمبر کے اس آخری ہفتے میں لاہور میں جمادینے والی سردی تھی۔

”سرخ سے مہندی لگاتے ہوئے میرے ہاتھ جم رہے تھے۔ یہ امیر کس مٹی کے بنے ہوتے ہیں وہ باجی کندھے تک مہندی لگوا کر گئی ہیں۔ برزرا جو انہیں ٹھنڈ لگی ہو۔“ چند لمحوں کو انہیں فراغت ملی تو امین نے وہی معرہ پیش کر دیا۔ فنکشن لان میں شامیانے میں ہو رہا تھا اور وہ دونوں موٹی موٹی جیکٹوں میں ٹھہر رہے تھے۔

”وہ سنا نہیں برقانی ریچھ اور شادی کی تقریب میں آئی لڑکیوں کو ٹھنڈ نہیں لگتی۔“ مطیب نے انٹرنیٹ پر پڑھا لطیفہ سنایا۔

امین کے سارے دانت باہر تھے۔ مطیب تعین نہیں کر سکا کہ وہ لطیفہ سن کر باہر نکلے ہیں یا ٹھنڈ کے باعث۔

”ایک سیوزنی مجھے بھی ٹیو بنوانا ہے۔“ ایک عورت آئی اور اپنے کھلے بال کندھے پر سامنے کی طرف پھیلا لیے اور رخ موڑ کر اپنی گردن کا پچھلا حصہ مطیب کے آگے کر دیا۔ مطیب اب کافی تجربہ کار ہو چکا تھا۔ ہر چیز اس کے لیے کورا کیونیس بن جانی تھی۔ اس کی توجہ صرف اس کے کام پر ہوتی تھی۔ اس لیے ایسی بے تکی فرمائشیں بھی اس نے بغیر احتجاج کے پوری کر دیں۔ بہ سہولت اس عورت کی گردن کے پیچھے ایک گول مٹی بنا دی۔

”لگتا ہے ان کے قبضے میں جن ہیں۔“ امین زبان جلاتا گرم گرم سوپ چمچے بھر بھر کر پی رہا تھا۔



بظاہر یہ ایک سادہ محدود سا پیشہ تھا۔ مگر اس کام نے مطیب کو بھانت بھانت کے لوگ دکھائے تھے۔

☆☆☆

”کب تک دوسروں کی مہندیاں لگاؤ گے۔ اب اپنی باری کا انتظام کرو۔“ فاخرہ اپنے بیٹے کی کامیابی پر بڑا خوش تھیں۔ وہ رشتہ دار جو کبھی باتیں بناتے تھے اب ان کے آگے پیچھے پھرتے تھے۔ گھر کی کوئی شادی مطیب کی مہندی کے بغیر پوری ہی نہیں ہوتی تھی۔ اس کا چھوٹا بھائی اور دو کزن بھی اب اس کے ساتھ کام کرنے لگے تھے۔ مطیب کا بڑے بڑے لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا تھا۔ حال ہی میں ایک فلم کی ہیروئن کو سیٹ پر جا کر مہندی لگائی تھی۔ بڑے پردے پر چھوٹا ہی سہی مگر اس کا نام بھی آیا تھا۔ کچھ سال پہلے کی بات الگ تھی۔ اب تو ہر طرف لڑکے ہی تھے جو عرق سے مہندی لگاتے تھے۔ یہ عرق جیسے مردوں کا ہی خاصا ہو گیا تھا۔

”ابھی تو میرا نام ہونے لگا ہے۔ مجھے اس پر توجہ دینے دیں۔ یہ شادی کے بکھیروں میں میں نے نہیں پڑنا۔“ مطیب نے معذرت کے ساتھ ہاتھ جوڑے۔

”یہی تو عمر ہے شادی کرنے کی، ایک سے ایک اچھی خاندانی لڑکی ملے گی۔“ فاخرہ نے خوشی سے کہا۔

”میں نے تو اپنی بارات کا جوڑا تمہاری شادی کے لیے ہی سنبھال کر رکھا ہے۔ جلدی دن دکھا دو۔ کہیں پڑے پڑے کام ہی کالائیں ہو جائے۔“ رخسانہ آپلی نے بھی بھائی کو قائل کرنے کے لیے گھیرا تنگ کیا۔

”میں سب جانتا ہوں، محلے کے کس کس گھر سے کیا کیا ہفتہ وار پکوان آرہے ہیں۔ یہ سلسلہ بند کر دیں اور سب کو بتادیں کہ اگلے تین چار سال تک میرا شادی کا کوئی ارادہ نہیں۔“ اس نے بہت دو ٹوک انداز میں کہا۔

بہن کا چہرہ لٹک گیا اور ماں بھی افسردگی سے سر ہلانے لگی۔ مگر مطیب کے اٹل فیصلے کے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکیں اور چپ ہو کر بیٹھ گئیں۔ مطیب نے اس وقت تو سکون کا سانس لیا اس نادان کو اپنے ارادے کی

پختگی پر یقین تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ چھ مہینے بعد وہ خود آئے گا اور ماں سے کہے گا مجھے ایک لڑکی پسند ہے اس کے گھر رشتہ لے کر جانا ہے۔

☆☆☆

چیونیاں گرمیوں میں ذخیرہ اندوزی کر لیتی ہیں اور سردیوں میں بلوں میں کھس کر اسی خوراک سے گزر بسر کرتی ہیں۔ مہندی والوں کا معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ سردیوں میں شادی بیاہ کی تقریبات عروج پر ہوتی تھیں اور اس موسم میں اتنی کمائی ہو جاتی تھی کہ سخت گرمیوں کے دو مہینے گھر بیٹھ کر بھی گزراوقات ہو جاتی تھی۔

فراغت کے دنوں میں بھی دکان ضرور کھلتی تھی۔ کبھی نہ کبھی جھلتے دنوں میں بھی دکان پر کوئی گاہک ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کی طرح آئی جاتا تھا۔ ایسی ہی ایک دوپہر میں برداسر کا تھا اور دو لڑکیاں اندر آئی تھیں۔

”السلام علیکم۔“ ایک لڑکی مطیب سے مخاطب تھی۔ مطیب سنبھل کر بیٹھ گیا کمان جیسی بھنویں اور سانولی رنگت پر سفید میک اپ کے استعمال کے بعد وہ عورت کچھ زیادہ ہی ٹیکھی لگ رہی تھی۔ وہ پہلے بھی دکان پر آ چکی تھی۔ مگر پہلے کی طرح اسٹینڈ پر ہاتھ رکھنے کی بجائے آج وہ دروازے میں ہی کھڑی تھی۔

”جی وعلیکم السلام، فرمائیں۔“ مطیب نے اس کا ارادہ جاننے کی نیت سے کہا۔

”میں مہندی لگانا سیکھنا چاہتی ہوں۔“ وہ عورت سامنے بیٹھ کر بزنس ڈیل کے انداز میں بات کرنے لگی۔

مطیب کے کئی شاگرد رہ چکے تھے۔ ایک اور سہمی۔ اس نے ہائی بھرنی۔ اس کے ساتھ آنے والی دوسری لڑکی برقعے میں بھی جس کی صرف دو آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ اس نے جھک والے انداز سے وہ کم عمر معلوم ہوتی تھی اور وہ پہلی لڑکی کی اوٹ میں تقریباً چھپ کر بیٹھ گئی۔

”پاس ہی میں نے سلائی سینٹر کھولا ہوا ہے۔ لیکن مجھے مہندی سیکھنے کا بہت شوق تھا۔“ اس کا نام کرن تھا اور اسے بولنے کا بھی بہت شوق تھا۔

”آپ چکر لگائیے گا۔“ وہ بولنے کے بعد



سوچتی تھی اور اس بار بول کر سوچا تو ہنس پڑی۔

”آپ کے کام کا ویسے وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ لڑکیوں کو مردانہ سوٹ کی سلائی میں قطعاً دلچسپی نہیں ہے۔“ اس روز کرن نے اپنے سیدھے ہاتھ سے اپنے اٹے ہاتھ پر مہندی لگانے کی مشق کی۔ مطیب نے اس کی ساری بے سرد باتیں سنیں اور نقاب پوش لڑکی بنا کچھ بولے کرن کا ہینڈ بیک سنھالے اس کے پیچھے پیچھے جیسے آئی تھی ویسے ہی واپس چلی گئی۔

☆☆☆

”آپ جب دائرے بناتی ہیں تو مناسب فاصلہ رکھا کریں۔“ مطیب سبق کی ابتدا میں کرن کو سمجھا رہا تھا۔

”بس یہ گولے بنانے میں چوک ہو جاتی ہے۔ ورنہ اب تو میری اتنی اسپنڈ ہو گئی ہے کہ کھنڈ بھر میں چاروں سائیڈ لگاتی ہوں۔“ کرن نے ایک بار پھر بے گونج تہقہہ لگا کر کہا۔

”آپ کے ہاتھوں پر پہلے ہی مہندی لگی ہے۔ آپ آج کاغذ پر پریکٹس کر لیں۔“ مطیب جلد از جلد کام کی بات پر آنا چاہتا تھا۔

”اس کی ضرورت نہیں، میں اسی لیے تو اپنی ماڈل ساتھ لائی ہوں، لبتی۔“ اس نے گردن موڑ کر پیچھے بیٹھی نقاب والی لڑکی کو کہا۔

”جی آئی۔“ لڑکی کی سعادت مندی سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کرن کے سلائی سینٹر کی شاگرد ہے۔

”لبتی! آؤ ذرا میرے سامنے بیٹھو۔“ کرن نے بزرگانہ انداز سے کہا۔

مطیب کی نظریں جھکی ہی رہتی تھیں، ہتھیلی سے اوپر نکا ہیں اٹھانا اس کی تہذیب کے باہر تھا۔ اس نے جھکے سر کے ساتھ ہی اس لڑکی کا نام سنا تھا ”لبتی“۔ نام بھی کتنی گہری چیز ہے ایک انسان کی زندگی شخصیت، کردار سب کو ایک لفظ میں سمیٹ دیتا ہے۔ دو لوگ اگر نام سے ناواقف ہوں تو چاہے روز ملیں اجنبی رہتے ہیں۔ اور کبھی صرف ناموں کے تبادلے کے بعد اپنائیت قائم ہو جاتی ہے۔ اپنا سیاہ برقعہ سنبھالتی

ہوئی لبتی کرن کے سامنے آ چکی تھی۔ مگر مطیب کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھی نہیں۔

”تھوڑا فاصلہ کر لیں۔“ وہ پہلی بار بولی تھی اور نہایت کھردری آواز میں بولی تھی۔ مطیب نے نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی وہی رعب اور روکھا پن تھا جو کسی اجنبی سے مخاطب ہوتے ہوئے ہونا چاہیے۔ مطیب نے مرعوب ہو کر فوراً اپنی کرسی دور کر لی۔ لبتی بیٹھ گئی اور کرن اس کی ہتھیلی پر مہندی لگانے لگی۔ کرن کے ہاتھ کی رفتار بہتر ہو گئی تھی مگر اس کی زبان کی رفتار کے مقابلے میں وہ اب بھی کچھ نہیں تھی۔

”ہتھیلی پر سرخ پھولوں جیسا رنگ آتا ہے تو کلائی پر ایسا لگتا ہے جیسے رنگ لگا ہو۔ اس لیے مجھے کلائی پر مہندی پسند نہیں۔ مگر لبتی کی کلائی اتنی گوری ہے اس پر سرخ رنگ ہی آئے گا۔“ کرن نے لبتی کی کلائی سے آستین اوپر کرتے ہوئے کہا۔

آستین ذرا سی سرکی تو نظر آیا کہ لبتی نے کلائی میں دھاتی چوڑیاں پہن رکھی ہیں۔

”اتنا ہی کافی ہے۔“ لبتی نے غیر آرام دہ ہوتے ہوئے آستین دوبارہ نیچے کی۔

کرن ایک ہاتھ پر مہندی لگا کر دوسرے ہاتھ کو مہندی سے بھرنے لگی۔

”اوہ میری چوڑیاں۔“ مہندی ختم ہونے کے بعد لبتی نے بے خیالی میں ہاتھ نیچے کیا تو اس کی

چوڑیاں کلائی کی مہندی کی لپیٹ میں آ گئیں ڈیزائن بھی خراب ہوا اور چوڑیاں بھی گندی ہو گئیں۔

”جوتھان پڑے گا، وہ نیل پالش ریموور سے اتر جائے گا۔“ مطیب نے اب ان دو آنکھوں میں فکر اترتے دیکھی تھی۔

”اور اگر نہ اترتا تو۔“ وہ دوسری بار مطیب سے مخاطب ہوئی تھی۔

مطیب کے الفاظ کھو گئے تھے کیونکہ اب ان آنکھوں میں نمی اتر رہی تھی۔ وہ چوڑیاں شاید اسے

بہت عزیز تھیں۔

”نہ اترتا تو میں تمہیں نئی لے دوں گی۔ ویسے



بھی یہ کون سا سونے کی چوڑیاں ہیں، لوہے کی تو ہیں۔“ کرن نے بڑی بہنوں کی طرح تسلی دی تھی۔  
”یہ میری مانی کی چوڑیاں ہیں اور مجھے سونا نہیں چاہیے۔ مجھے لوہا زیادہ پسند ہے۔“ اس کی آنکھوں کے کنارے باریک ہوئے تھے۔ شاید وہ نقاب کے نیچے خود کو تسلی دینے کے لیے مسکرائی تھی۔ کرن اس کی بات کو لطیفہ جان کر ہنس پڑی۔  
”لو جی۔ کس بے وقوف کو سونے سے زیادہ لوہا پسند ہوتا ہے۔“ کرن کی ہنسی بکھر کر فضا میں پھیلی ہو جاتی تھی اور لٹنی کی خاموشی بھی دل میں گھر کر رہی تھی۔  
”گھر میں جتنا بھی سونا بھر لیں، اس کی حفاظت کے لیے لوہے کے گیٹ اور لوہے کا تالا چاہیے ہوتا ہے۔ سونے کی چمک ہی ہے، وہ بھی وبال جان بن جاتی ہے۔“ وہ جانے سے پہلے سادہ سے انداز میں بڑا فلسفہ بیان کر گئی تھی اور ایسا لگا تھا، وہ گئی ہی نہیں مطیب کے ارد گرد ہی کہیں بس گئی ہے۔

☆☆☆

عورت جذباتی ہوتی ہے اس کے پاس ہر جذبہ ہوتا ہے۔ مطیب نے لٹنی کو چند منٹوں میں اکھر، نرم، روہانسی، مصلحت جو اور دانا ہوتے دیکھا تھا۔  
مطیب رات کو بستر پر لیٹے سوچ رہا تھا۔ مرد اپنے جذبات چھپا لیتا ہے جبکہ عورت انہیں بہنے دیتی ہے۔ عورت نگاہ کی ہلکی سی جنبش سے ہی کئی گنا زیادہ کہہ جاتی ہے۔ مطیب نے کروٹ بدلی۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ رات کے اس پہر وہ لٹنی کو کیوں سوچ رہا تھا، سوچنے کی بات تھی۔

☆☆☆

اس روز کرن اکیلی آئی تھی۔ اب مطیب کو اس کے کام میں خامیاں نہیں ملتی تھیں۔ وہ سب کچھ بہت اچھا سیکھ گئی تھی۔

”مجھے آپ سے ایک بات کرنی تھی۔“ مطیب کی نگاہ اس دن ضرورت سے زیادہ جھکی ہوئی تھی۔ اس کے راز دارانہ انداز نے کرن کو بھی خاموش کر دیا تھا۔  
”آپ کے ساتھ جوڑ کی آئی ہے لٹنی، میں اس بے

شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ اس کا جملہ نرم عرق کی طرح تیزی سے نکلتا تھا۔ کرن کو اس بات کی قطعاً توقع نہیں تھی۔  
”وہ..... وہ..... لٹنی؟“ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ وہ جھکی نظر ڈھکے چہرے والی لڑکی مطیب کو کیسے بھاگئی۔  
”جی، میں اپنے والدین سے بات کروں گا۔“ آپ ان کی رضامندی بھی پوچھ لیں۔“ مطیب ایسا بے باک نہیں تھا کہ اس قسم کی بات براہ راست کر سکے۔ اسے کرن کی مدد چاہیے تھی۔ مگر کرن الجھ گئی تھی۔  
”تم نے تو اسے دیکھا بھی نہیں۔ جانتے ہو، اس کے چہرے پر جملے کا کتنا بڑا داغ ہے۔ ایسا لگتا ہے کسی نے گوشت نوچ کر چبا کر دوبارہ چپکا دیا ہو۔“ وہ دوبارہ اپنی ازلی رفتار سے بولی اور مطیب کا دل چیر گئی۔ کرن کو احساس ہی نہیں تھا کہ کس جملے کو ست رفتاری سے بولنا چاہیے تھا۔

”کیا۔“ مطیب کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ مگر زبان میں سکت نہیں تھی کہ انہیں تر کر سکے۔  
”اسی لیے تو پردہ کرتی ہے ورنہ اس کی فیملی تو بہت ماڈرن ہے۔“ وہ مطیب کے شپٹائے تاثرات دیکھ کر جیسے محظوظ ہو رہی تھی۔

مطیب نے نظریں بہت بہت بہت نیچے جھکا لیں۔ اب اسے کچھ دیکھنے کی چاہ نہیں تھی۔ اس کی نظروں میں مایوسی کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔

☆☆☆

اس نے کوئی محبت کے دعوے نہیں کیے تھے جو پیچھے ہٹنے پر اسے بے وقفا قرار دے دیا جائے اس نے تو بس ایک خواہش کی تھی۔ اسے لگا تھا جس لڑکی کو چمک سے زیادہ مضبوطی عزیز ہے وہ اس کے چھوٹے سے ٹھکانے کی بھی قدر کرے گی اس کا دل چاہا تھا کہ اس معصوم مگر حوصلہ مند لڑکی کو جیون سا بھی بنائے۔ مگر اب شاید دل کو سمجھانے کی ضرورت تھی۔

مطیب افسوس سے ان دو کالی آنکھوں کو تصور میں لایا۔ بکے علم تھا اتنی حسین آنکھوں کے نیچے ایک بد صورت جلا ہوا چہرہ ہے۔ جس کے ڈر سے وہ نقاب کر کے پھرتی ہے۔ وہ جسے چوڑیاں داغ دار ہونا برا لگتا تھا



وہ نہ جانے اپنا چہرہ آئینے میں دیکھ کر کیسے جیتی ہوگی۔

مطیب کا دل جاہا کہ وہ اس کے باقی چہرے کو بھی اس کی آنکھوں کی مانند حسین کروادے۔ کوئی پلاسٹک سرجری کروادے کوئی معالج ڈھونڈے۔ وہ دیکھتے دل کے ساتھ ایک حسین چہرے پر جلا ہوا بد صورت ابھرا ہوا داغ تصور کرنے لگا۔ ایک بار ایک کون مہندی اس سے پٹنگ کے چپے گر گئی تھی۔ ہفتوں بعد جب پٹنگ سر کا یا تو مہندی کون پھٹ کر فرش پر ڈھیری کی مانند پڑی تھی مطیب کے ذہن میں مہندی کی وہی ڈھیری آنے لگی۔ اسے لگاتلی کے گال پر بھی ویسی ہی مہندی رنگ کی ابھری پھوڑے دار جلد ہوگی۔ لپٹی کو سونے کی اسے عادت ہو گئی تھی۔ وہ رات بھی مختلف نہیں تھی۔ مطیب بدل گیا تھا۔ وہ آسانوں کا دوست نہیں رہا تھا۔ اب مشکلوں سے بھی اس کی گاڑھی چھنتی تھی۔ اسے شکست کی عادت تھی اسے سنبھلنے کا ذوق تھا۔ وہ اس رات جیسے جیسے لپٹی کو سوچتا گیا اس کا داغ دار چہرہ قابل قبول ہوتا گیا۔ مہندی عرق اور ان کا رنگ۔ ان چیزوں سے تو اسے محبت تھی۔ اس کے چہرے کے نشان کو بھی وہ کسی اناڑی کی طبع آزمائی سمجھ کر قبول کر لے گا۔

بد صورت بیوی کسی کو نہیں چاہے تھی مگر لپٹی بد صورت کہاں تھی۔ ایک جلا ہوا گال بھی بھلا کسی کو بد صورت بنا تا تھا۔ ہرگز نہیں ان آنکھوں میں اتنی چمک تھی کہ سارا چہرہ بھی داغ دار ہوتا تو اسے چاند کی مانند چمکنے پر مجبور کر دیتیں۔ اس رات فیصلہ ہوا تھا۔ دن کے اجالے میں مطیب نے نظر ثانی کی۔ مگر اگلی رات اور اس کے آگے چند مزید راتوں میں بھی فیصلہ نہیں بدلا۔ مطیب اپنے ارادے پر قائم رہا۔

”میں نے تسلی سے سوچا ہے۔ میں لپٹی جی کے لیے ذشتہ بھجوانا چاہتا ہوں۔“ اس روز مطیب کی نگاہیں اس کے عزم کی طرح بلند تھیں۔

”ارے! آپ تو ج میں سنجیدہ نکلے۔“ کرن کو اس کے جذباتوں پر اگر شک تھا تو وہ دور ہو چکا تھا۔ ”وہ تو بات بھی نہیں کرتی، آپ کو اس میں کیا

پسند آیا؟“ کرن نے تعجب سے کہا۔

”اس روز ان کی چوڑیاں خراب ہوئی تھیں اگلے روز وہ پھر خوشی خوشی واپس آئی تھیں۔ مجھے ایسے لوگوں کی بہت قدر ہے۔ جو اپنے فیصلوں پر قائم رہتے ہیں اور ذمہ داری پوری کرتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں مجھ میں بہت کم ہیں اور مجھے ایک مستقل مزاج سا بھی چاہیے۔“ اس نے چھوٹی چھوٹی حرکتوں میں بہت گہرے وصف بھانپے تھے۔

”ٹھیک ہے، میں بات کروں گی۔ مگر ابھی نہیں۔“ کرن کچھ بزرگی سے بولی۔ ”پہلے آپ دونوں ایک بار باہر کہیں مل لیں۔“ اس کی تجویز پر مطیب کا سر نفی میں ہلنے لگا۔ جیسے کہہ رہا ہو اس کی ضرورت نہیں۔

”ایک بار اس کو دیکھ لیں پھرے شک والدین کو لے کر آجائے گا۔ یہی بہتر ہے۔ لپٹی کی بھی یہی تجویز ہے۔“ کرن نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ لپٹی کی بھی یہی خواہش تھی تو مطیب نے احتراماً ہی بھر لی۔

☆☆☆

وہ ایک شرمیلا سالڑکا تھا۔ یہ ملنے ملانے والے کام اس نے بھی نہیں کیے تھے۔ وہ ریسٹورنٹ میں میز پر کہیاں نکائے بیٹھا تھا۔ اس کے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے تو پیٹ میں بلیاں اچھل رہی تھیں۔

کرن اور لپٹی ایک ساتھ اندر آئی تھیں۔ کرن ہمیشہ کی طرح زبان اور ہاتھوں سے کوئی بات کر رہی تھی۔ لپٹی کی نظر آج کی خاص وجہ سے جھکی ہوئی تھی۔

آج اس نے کالا برقعہ نہیں اوڑھا تھا۔ بس دوپٹے سے چہرے کا ننھا حصہ چھپا رکھا تھا۔

”آپ کچھ لیں گی؟“ سلام کے تبادلے کے بعد وہ دونوں بیٹھ گئی تھیں۔

”ضرور۔“ کرن چبکی۔

”یہاں کی رس ملائی بہت اچھی ہوتی ہے۔“

لپٹی نے دوپٹے کی اوٹ سے ہی کہا۔

وہ جیسے اپنی پسندنا پسند بتا رہی تھی۔ مطیب کے

ارادے پر اس کی رضا مندی جھلک رہی تھی۔

”چلیں پھر سب رس ملائی کھا لیتے ہیں۔“



کرنے آؤر دیا اور آؤر آنے تک بولتی رہی۔  
ویٹر پلیٹیں اور رس ملائی رکھ کر پلٹا تو لبتی نے  
آہستگی سے بچ اٹھایا۔ مطیب نے بڑی مشکل سے  
نظریں ٹیبل پر جمائی ہوئی تھیں۔ وہ خود کو بہت سبق  
بڑھا کر آیا تھا کہ اس کو صرف سرسری سادیکھے گا تا کہ  
لبتی کی تسلی ہو جائے۔ کوئی ایسا رد عمل ظاہر نہیں کرے گا  
جس سے اس کا دل دکھے۔ مگر جب لبتی نے دوپٹہ  
سر کا یا تو مطیب کی نظر اس کی صورت پر جم ہی گئی۔ وہ  
پلک جھپکانا تک بھول گیا۔

اس کے چہرے پر کچھ بھی نہیں تھا۔ کم عمری کے  
باعث بھرے بھرے سے گال اور معصوم سے مین نقش  
بس..... کوئی بدنما داغ، جلے کا نشان یا بدرنگ جلد وہ  
جو کچھ سوچ کر آیا تھا وہاں ویسا کچھ بھی نہیں تھا۔

لبتی نظریں جھپکائے اپنی پلیٹ کی رس ملائی میں  
بے مقصد چیخ چلا رہی تھی۔ شاید مطیب کی نظروں کا اثر تھا  
کہ اسے نوالہ لینے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ جبکہ مطیب  
اسے ہونق پن سے گھور رہا تھا۔ وہ تو کتنے ہی بدنما تصور کر  
کے آیا تھا جبکہ لبتی دنیا کے ہر معیار پر پورا اترنے والی  
ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ بڑی دیر بعد لبتی نے رس  
ملائی کا چیخ منہ میں رکھا اور مطیب کو دیکھ کر ہلکا سا  
مسکرائی۔ اس کی سیادہ مسکراہٹ سے واضح تھا، وہ اس  
بات سے ناواقف تھی کہ کرن نے مطیب کو اس کے  
چہرے کی کتنی خوفناک تصویر پیش کی تھی۔ اسی بوکھلاہٹ میں  
مطیب نے کرن کی طرف دیکھا۔ وہ بے لکری سے کھانے  
میں مگن تھی۔ مگر وہ مطیب کی نظر کا مطلب اچھے سے سمجھتی  
تھی، وہ ہلکا سا ہنسی اور شرارت سے مطیب کو دیکھنے لگی۔

”لگتا ہے آپ میری باتیں کچھ زیادہ ہی سنجیدہ  
لیتے ہیں۔“ کرن نے ایسے بے پرواہی سے کہا جیسے  
اس نے بھی مطیب سے جان سو لی پر لٹکا دینے والا  
مذاق کیا ہی نہ ہو۔

مطیب نے مسکراتے ہوئے چہرہ جھکا لیا۔

☆☆☆

لبتی نے آستین کہنیوں سے اوپر موڑے ہوئے  
تھے۔ اس کا دایاں ہاتھ کسی نوم کے شینڈ پر نہیں مطیب

کے ہاتھ میں تھا۔ مہندی کی تقریب سے ایک رات  
پہلے مطیب نے اپنا شاگرد لڑکا لبتی کے گھر بھیجا تھا۔  
لیکن اس کے لگائے عرق کا رنگ نہیں آیا تھا۔  
اب رخصتی کے اگلے دن ویسے کی صبح اپنے کمرے میں  
مطیب لبتی کو دوبارہ عرق لگا رہا تھا۔ اب وہ اس پٹھے کا  
ہر سینترا جانتا تھا۔ بے رنگ عرق سے دوسووں کا شکار  
نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی چند دنوں کی خشکی پر برسات  
سے مایوس ہو کر کام چھوڑنے کی سوچتا تھا۔ اس نے  
اپنے کام کو لگن اور محنت دی تھی اور اس کے پٹھے نے  
اسے روزی اور عزت..... سودا منافع کا رہا تھا۔

”کہیں پڑھا تھا کہ ایک عبادت گزار آدمی نماز  
ادا کر کے اپنی بیوی کی انگلیوں پر تسبیح پڑھتا تھا اور دعا  
کرتا تھا، وہ جنت میں بھی ساتھ ہوں۔ وہ ایک  
عبادت گزار آدمی کا اظہار محبت تھا۔ یہ مجھ جیسے  
سادے سے عرق والے کا طریقہ اظہار ہے کہ میں  
آپ کے ہاتھوں پر عرق لگا رہا ہوں۔“ مطیب نے  
محبت سے اپنی نئی نوٹلی بیوی کو کہا۔

پہلے اس کی زندگی میں ایک عرق کے رنگ کی  
پہار تھی اور اب اس کی زندگی میں قوس قزح کے رنگ  
بکھرے ہوئے تھے۔

”آپ تو آرٹسٹ ہیں، آپ کے اظہار کے  
طریقے بھی آپ کی طرح اچھوتے ہیں۔ میں تو عام  
سی لڑکی ہوں۔ مجھے تو مردانہ کرتا بھی سینا نہیں آتا۔  
میں آپ سے کیسے اظہار کروں گی۔“ لبتی نے سادگی  
سے کہا۔

”بس تم اپنے اور میرے رشتے کو لو ہے سا  
مضبوط رکھنا، مجھ پر اعتبار کرنا اور ہمارے گھر میں وہ  
خوشیاں بھرنا جن کو چوری کا خطرہ لاحق نہ ہوتا ہو۔  
مجھے جھی چمک نہیں مضبوطی چاہیے۔“

مطیب کو کبھی آسمان چھونے کی چاہ نہیں رہی تھی  
پھر بھی اب وہ بلندیوں پر ہی رہتا تھا۔ یہ بلندیاں  
اسے محبت اور لگن نے عطا کی تھیں۔ یہ اس عرق ریزی  
کا ثمر تھا۔ جس کا رنگ کبھی ماند نہیں پڑتا۔

☆



## عفت سحر طاہر

# رنگِ رستخیز

ہائی وے پر ٹرالر اور کار کا شدید ایکسیڈنٹ ہوتا ہے ٹرالر کا ڈرائیور بھاگ جاتا ہے، کار بری طرح پچک جاتی ہے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا سر درد اور اگلی نشست پر بیٹھی عورت خون میں لت پت ہیں۔ ریسکیو عملے کا انتظار ہے کہ وہ آئے تو گاڑی کی باڈی کاٹ کر لائیں نکالی جائیں اسی وقت گاڑی سے ایک بچے کے رونے کی آواز آتی ہے۔ ہاسپٹل میں چار لوگ آئی سی یو کے باہر بیٹھے ہیں نرس باہر آ کر کہتی ہے آپ کے پیشہ کو ہوش آ گیا ہے۔ وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔

سرخ پھولوں سے بچی گاڑی پوش ایریا کے ایک سنگلے کے آگے رکتی ہے تو۔ دولہا کی ماں ملازمہ سے کہتی ہے کہ دلہن کو لے کر اندر آؤ۔ ملازمہ دلہن کو بیڈروم میں بٹھا کر جانے لگتی ہے تو دلہن اس سے سر درد کی گولی مانگتی ہے۔ ملازمہ کہتی ہے کہ چائے بھی لے آؤں۔

دولہا کمرے میں آتا ہے۔ تو وہ اس کی شکل دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔ وہ ایک بچی کو لے کر آتا ہے کہ اس کے لیے میں نے تم سے شادی کی ہے۔

نرمن کو ہواؤں میں اڑنے اور اونچے خواب دیکھنے کا شوق ہے حریم اس کی چھوٹی بہن اسے سمجھاتی ہے۔ نرمن کی سبیلی بجل کہتی ہے کہ تمہیں عبادوسیم پوچھ رہا تھا۔

نرمن اپنی دوست صوما کی سالگرہ میں جانے کی ضد کرتی ہے لیکن اس کی اماں کو اعتراض ہوتا ہے کہ جوان جہان لڑکی آدمی رات کو سالگرہ میں سے واپس آئے گی تو محلے والے کیا کہیں گے۔ اس کے اصرار پر اباسے جانے کی اجازت





دے دیتے ہیں لیکن اس کی اماں ناراض ہی رہتی ہیں۔

زمین صوما کی سالگرہ کی تقریب میں (جو کہ عظیم برہمن) گھر سے تیار ہو کے نہیں جاتی بلکہ محل کے گھر سے تیار ہو کر جاتی ہے۔ راستے میں محل رانا سعید سے عبادوسیم کے متعلق بات کرتی ہے کہ رانا سعید عباد کا دوست ہے وہ عباد سے زمین کی دوستی کرادے۔ وہ کہتا ہے کہ اپنی دوست کو بربادی کے راستے پر مت ڈالو۔ پارٹی میں زمین کی عباد سے ملاقات ہوتی ہے لیکن وہ یکنی الطاف کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگلی ملاقات میں محل بتاتی ہے کہ عبادوسیم، رانا سعید سے تمہارا پوچھ رہا تھا۔ زمین بے یقین ہوتی ہے۔

وہ اپنے حواس میں نہیں تھی۔ سلی ڈاکٹر فریجہ کی ویسے کی صبح اس کا چیک کرنے آیا تو اس نے کہا کہ شکڈ اور ڈپریسڈ ہیں۔ میڈیسن دیں آرام کرائیں شام تک بہتر ہو جائیں گی۔

محل زمین کو آفس کے بعد لے کر کلب آ جاتی ہے زمین کا موڈ آف ہے۔ وہاں ان کی ملاقات عبادوسیم سے ہوتی ہے۔ دونوں کے درمیان رکھائی سے بات چیت ہوتی ہے۔ عبادوسیم ان کے جوس کا بل ادا کر دیتا ہے۔ زمین کو برا لگتا ہے۔

نصرت زلفی کو کہتی ہیں کہ اٹھ کر دکان پر چلا جا لیکن وہ نہیں سنتا۔ وہ زمین کی ہم راہی کا خواب دیکھتا ہے نصرت کہتی ہیں کہ وہ پڑھی لکھی لڑکی تجھ سے شادی سے انکار کر دے گی۔ زلفی کہتا ہے کہ وہ میرے بچپن کی سنگ ہے۔

زمین کے پاس چھٹی والے دن عباد کا فون آتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ دن گزارنا چاہتا ہے۔ زمین، محل کے گھر کا بہانہ کر کے اس کے بتائے ہوئے ریسٹورنٹ میں اس کا انتظار کرتی ہے۔

عبادوسیم کے ساتھ ایک بھر پور دن گزار کر زمین خوشی خوشی گھر لوٹ آتی ہے۔ زمین کو اس کی کھوجتی چمکتی آنکھوں کی گہرائی کا اندازہ نہیں ہوتا۔

زمین کی غیر موجودگی میں اماں کے پیٹ میں درد ہوتا ہے۔ حریم ابا کے گھر میں نہ ہونے کی وجہ سے زمین کو فون کرتی ہے، فون بند ہونے کی صورت میں وہ تھک ہار کر محل کے نمبر پر کال کرتی ہے، اسے مبارک یاد دیتی ہے تو وہ حیران رہ جاتی ہے کہ کس چیز کی مبارک باد اور اپنے گھر میں صبح سے کپڑے دھونے کی مظلومیت کا رونا روئی ہے۔ حریم پریشان ہو جاتی ہے۔ ابا آ جاتے ہیں وہ اماں کو ڈاکٹر کے پاس لے جاتے ہیں۔

زمین کے آنے پر حریم اس سے پوچھتی ہے کہ وہ کہاں تھی، زمین سچ اسے بتا دیتی ہے۔ عبادوسیم، رانا سے ملتا ہے تو زمین کی بات ہوتی ہے، رانا کہتا ہے کہ وہ شریف گھرانے کی ہے اس کو بخش دے۔ عباد

ہنسنے لگتا ہے۔

مارہ صبح صبح پھپھو کے گھر پہنچتی ہے جہاں عبادوسیم اور نزہت ناشتہ کر رہے ہیں۔ مارہ اور نزہت کی معنی خیر باتوں سے انجان بننا عباد وہاں سے اٹھ کر چلا جاتا ہے۔

حریم بے ساختہ میرب کو پیار کرتی ہے، وہ گھبرا جاتی ہے۔

نزہت گھبر واپسی پر حریم کو کہتی ہیں کہ وہ میرب کے سلسلے میں کوئی کوتاہی برداشت نہیں کریں گی۔

حریم عباد گھسی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے اس کے شوروم تک آ جاتی ہے عباد اسے دھمکاتا ہے وہ اس سے کہتی ہے کہ تم خراب کیریئر کے ہو۔ میری بہن کا بیچھا چھوڑ دو۔ زمین پتا چلنے پر ناراض ہوتی ہے اور عباد سے معذرت کرتی ہے وہ معذرت قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔

مارک ڈینٹیل کو بتاتا ہے کہ اس کی مسلمان لڑکی سے دوستی ہے۔ نصرت پھپھو تاریخ طے کرنے کے لیے مٹھائی اور شادی شدہ مٹی کو لے کر آتی ہیں۔ زمین گھر میں نہیں ہوتی۔

حریم کو وہ اس کے گھر لے کر آتا ہے اماں اور طوبی بہت خوش ہوتی ہیں لیکن ابا کے آنے سے پہلے اسے جانے کا کہتی ہیں۔ عباد کی برتھ ڈے کے موقع پر عباد زمین کو اپنے فلیٹ پر تنہا بلاتا ہے، وہاں جانے کے بعد زمین کو باپ کی بات یاد آتی ہے کہ دو نامحرموں کے بیچ تیسرا ہمیشہ شیطان ہوتا ہے۔

عباد زمین کو اپنے فلیٹ پر بلاتا ہے۔ اس کے فریب آنے پر وہ وہاں سے واپس آ جاتی ہے۔ عباد کی پرکھ کہ وہ پورا اترتی ہے۔ ادھر نصرت پھپھو تاریخ لینے آ جاتی ہیں۔ اماں اور حریم کے پوچھنے پر زمین شادی کی ہامی بھر لیتی







"جب میں ماں ہو کر اس کے بدلے تیوروں سے اس کے دل کی بات سمجھ نہ پائی۔"  
"اماں..... اماں..... پلیز..... مت کریں۔" حریم نے ان کے ہاتھ تھام لیے، اس کی آنکھیں بھی برس رہی تھیں۔

"میں بات کرتی ہوں اس سے اماں! شادی کے کارڈ چھپنے والے ہیں..... رشتہ داروں کو منہ زبانی اطلاع ہو چکی ہے شادی کی۔ وہ ابا کی عزت رلنے نہیں دے گی۔"

زمین کی بے پناہ ضدی طبیعت سے واقف ہونے کے باوجود حریم نے کسی موہوم سی امید کے سہارے اماں کو تسلی دی۔ مگر ادھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ تھی۔

"مجھے کچھ مت سمجھانا حری! اب میں کچھ بھی نہیں سمجھوں گی۔" وہ سرکش تو تھی ہی، اب باغی بھی ہو رہی تھی۔  
حریم نے اس کا بازو سختی سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

"تم نے مجھے اس بے غیرت شخص کے بارے میں بتایا تھا..... کیسے تنہائی میں فائدہ اٹھانا چاہا تھا اس نے تمہاری اندھی محبت کا۔" آہستہ لیکن سخت آواز میں اس نے زمین کو یاد دلایا۔ جب زمین زلفی کے لیے ہاں کرنے کے بعد اندر سے ٹوٹ گئی تھی تو اس نے حریم کو ساری بات بتا کر دل کا بوجھ ہلکا کر لیا تھا۔ حریم دنگ رہ گئی..... مگر پھر اللہ کا شکر بھی ادا کیا کہ عزت بچنے کے ساتھ ساتھ زمین کو اس ٹھوکر نے عقل بھی سکھادی تھی۔

"وہ سب ڈرامہ تھا... وہ مجھے چیک کر رہا تھا کہ کہیں میں بھی تو عام لڑکیوں جیسی نہیں۔" زمین نے آسودہ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو حریم کو جھٹکا لگا۔

"اس قدر خبیث سوچ رکھنے والا شخص تمہارا آئیڈل کیسے ہو سکتا ہے زمین! تم نے تو یہ "ٹیسٹ" پاس کر لیا..... جو فیل ہو جاتی ہوں گی، وہ کہاں تک اس کے ساتھ چلی ہوں گی یہ نہیں سوچا تم نے۔" مارے دکھ کے اس کی آواز پھٹ سی گئی۔ لیکن یہ سب گہرائیاں تو وہ دیکھتا ہے جو اندھی کھائی میں چھلانگ لگانے سے ڈرتا ہو۔

"جو لڑکیاں فیل ہوئیں، وہ اب اس کی زندگی میں نہیں ہیں، میں صرف اتنا جانتی ہوں۔" وہ مطمئن تھی۔  
"بکو اس مت کرو زمین! اور یہ سوچو کہ اگر تم اس روز اس خبیث شخص کی باتوں میں آ جاتیں تو وہ تمہیں برباد کرنے سے نہ چوکتا..... اور آج تم بھی ان ہی لڑکیوں میں سے ایک ہوتیں۔"

"میں یہ سب فضولیات کیوں سوچوں؟ اس نے مجھے جن لیا ہے اپنے لیے..... اینڈ دیش اٹ۔" وہ ناگواری سے بولی تو حریم نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

"اب بغاوت کا وقت نہیں ہے مینو! تم نے اپنی مرضی سے زلفی کے رشتے کے لیے ہاں کی تھی۔ اب مرجائیں گے۔"

"شٹ اپ۔" زمین نے غصے سے کہا۔ "زندگی کے فیصلوں سے بھی کوئی مرا کرتا ہے کیا؟ میں نے بھی تو فیصلہ کیا تھا عباد کے بجائے زلفی کے ساتھ شادی کا..... میں تو نہیں مری۔"

"ایسے موقعوں پر فرماں برداری بچوں کا فرض بن جاتی ہے زمین! ابا کا سر نیچا مت کرو۔"  
"میں نے زلفی کے لیے ہاں کر کے ابا کی عزت ہی رکھی تھی... اب میری خوشی کی باری ہے۔" وہ اٹل تھی۔

"واہ.... کیا عزت رکھی تھی والدین کی۔" حریم تڑخی۔ "کل شادی کے لیے خود ہاں کی... اور اب جب شادی سر پہ ہے تو ان کی موت کا سامان کر رہی ہو۔" حریم کا دل چاہ رہا تھا، اماں کی طرح اسے پیٹ کر رکھ دے۔

"بس کرو حریم! تم جانتی ہو، میں اپنے فیصلے سے ایک انچ بھی ہٹوں گی۔" زمین نے اطمینان سے کہا۔ "مرنے کے بعد زندگی پائی ہے میں نے... میری خوشی کا اندازہ لگا سکتی ہو تم؟"

"اپنی خوشی کے لیے خود غرض مت بنو زمین۔"





"اگر ابا اپنی خوشی اور عزت کے لیے خود غرضی کا مظاہرہ کر سکتے ہیں تو جس کی زندگی کا فیصلہ ہو رہا ہے وہ کیوں نہ خود غرض بن کر اپنی خوشی کے بارے میں سوچے۔" وہ بہت ڈھیٹ لگی۔ زمین کو آج اندازہ ہوا۔  
"یہ دولت اگر تمہارے نصیب میں ہے تو پھپھو کے گھر بھی مل جائے گی۔" اس نے سمجھانا چاہا۔  
"بے وقوفوں جیسی باتیں مت کرو حری۔" زمین نے خفگی سے کہا۔ "تمہیں پتا ہے ناجب عباد سے مایوس ہو کر میں خودکشی کرنا چاہ رہی تھی تب میں نے زلفی کے لیے ہاں کہہ دی۔ اب جبکہ میرے سامنے زندگی ہے تو میں موت کو کیوں چنوں۔ زندگی کا ہاتھ کیوں نہ تھاموں؟"  
"دوسروں کو مار کر زندہ رہنے میں کیا خوشی ہے بھلا؟" حریم دکھی تھی۔ آنے والے وقت کا خوف دل کو بھیجنے ہوئے تھا، اسے تو لگ رہا تھا جیسے اسے سانس بھی ٹھیک سے نہیں آرہی۔

☆☆☆

"دماغ تو خراب نہیں ہو گیا تمہارا عالی!" نزہت مارے صدمے وحیرت کے پوری کی پوری اس کی طرف مگھوم گئیں۔  
"لیں..... خود ہی تو پیچھے پڑی رہتی تھیں کہ لڑکی پسند کرو، شادی کرو۔ اب پسند کر لی لڑکی تو آپ کو میری جہنی کیفیت پہ شک ہو رہا ہے۔" احتیاط سے گاڑی کا موڑ کاٹتے ہوئے وہ مسکرایا۔ لیکن نزہت مارے ٹینشن کے مسکرا بھی نہ پائیں۔

"تم نے کہا تھا، تمہیں کوئی بھی لڑکی پسند نہیں ہے۔"  
"ہاں..... تو جب آپ نے پوچھا تھا تب تک تو واقعی کوئی لڑکی پسند نہیں تھی۔" وہ لاپرواہی سے بولا۔  
"شٹ اپ۔" نزہت بگڑیں۔ "شادی بیاہ مذاق نہیں ہوتا..... بھائی صاحب اور بھابی سے بات کر چکی ہوں، میں تمہارے اور مائرہ کے رشتے کی۔"  
"واٹ؟" عباد کو جھٹکا لگا۔ "مجھ سے پوچھے بنا؟"  
"پوچھنا اور کیسے ہوتا ہے اور خبردار جو کوئی ٹینشن پھیلائی ہو تو..... بھائی صاحب کی رضامندی لینے کے بعد میں تم سے پوچھنے والی تھی۔" وہ اطمینان سے کہہ رہی تھیں۔  
"ایکسیکویزمی ماما جانی۔" وہ ہنسا۔ "شادی میری ہونی ہے۔ پہلی رضامندی تو میری ہوگی تاکہ آپ کے بھائی صاحب کی؟"  
"تم سیریس ہو؟" وہ سنجیدہ ہو گئیں۔

"آف کورس لیس ماما۔" اس نے گیٹ کے سامنے گاڑی روکتے ہوئے ہارن بجایا تو چوکیدار نے بھاگ کر گیٹ داکر دیا۔ وہ سبک رفتاری سے گاڑی پورچ میں لے آیا۔  
"کون ہے وہ؟" اندر لاؤنج میں پہنچنے تک ہا مشکل صبر کرتی نزہت نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔  
انہیں یہ سب مذاق ہی لگ رہا تھا کیونکہ اس سے پہلے بھی کئی بار وہ لڑکی پسند کرنے اور پھر اسے ریجیکٹ کر دینے کی بیماری میں مبتلا رہ چکا تھا۔ ان کے خیال میں وہ ابھی کبھی مذاق ہی کر رہا تھا۔  
"لڑکی ہی ہے ماما! ڈونٹ وری۔" وہ مسکرایا۔ تو چند لمحے اسے دیکھتے رہنے کے بعد وہ دو ٹوک انداز میں بولیں۔

"تم اپنی پسند بتانے میں لیٹ ہو گئے ہو عالی! اب میں بھائی صاحب سے بات کر چکی ہوں۔"  
"فار گاڈ سیک ماما۔" وہ خفا ہوا۔ "میں کوئی مڈل کلاس گھرانے کی دیو سی لڑکی نہیں ہوں جس کی آپ زبردستی منگنی کر دالیں گی اور میں چپ چاپ شادی پہ آمادہ ہو جاؤں گا۔"



”تم نے کہا تھا کہ تمہیں کوئی لڑکی پسند نہیں، آپ جو چاہے کریں۔“ وہ پریشان سی اسے یاد دلانے لگیں۔

"تب واقعی پسند نہیں تھی۔" وہ شانے اچکا کر لا پرواہی سے بولا۔

”کون ہے؟ کس خاندان سے ہے؟ ہمارے خاندان کے ہم پلہ لوگ بھی ہیں یا کوئی راہ چلتی پسند کر لی؟“

انہوں نے تجھے لمحے میں کتنے ہی سوال کر ڈالے۔

”بہت اچھی لڑکی ہے۔ فیملی بھی ٹھیک ہی ہوگی آئی تمہنک، غریب ہی ہیں..... لیکن مجھے تو لڑکی سے شادی

کرتی ہے ماما! بھیلی سے نہیں۔“ وہ ہمیشہ کی طرح بس اپنی پسند کی چیز پر اٹک گیا تھا۔

”مجھے کچھ نہیں پتا عباد! اب تم اسے غلط سمجھو یا صحیح..... لیکن میں تمہاری وجہ سے اپنے بھائی کو نہیں چھوڑ

سکتی۔“ انہوں نے قطعی لہجے میں کہا تو عباد کو معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا۔ وہ واقعی مارہ گئے ہارے میں سنجیدہ

میں

”میں نے مارہ سے شادی کرنا ہوتی تو بہت پہلے آپ سے کہہ دیتا ماما گھر کی لڑکی تھی، میری دوست ہے۔“

بہت اچھی۔ لیکن میں نے اس کے بارے میں ایسا کبھی نہیں سوچا کہ شادی ہی کر لوں..... سوری ٹوے۔“ اس

نے یہی صاف لولی کا مظاہرہ کیا تو زہت حق دہ رہ گئیں۔ وہ حراب موڈ لیے اٹھ کر چلا گیا تو زہت نے سر ہٹام لیا۔ انہیں انے چھوٹے مٹے کی بات یاد آئی..... ”بھائی نے کہا ہے ”فی الحال“ انہیں کوئی لڑکا نہیں

پسند.... آپ جلد بازی مت کیجیے گا۔“ اس نے انہیں متنبہ کیا تھا لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ واقعی اپنے

بھائی کی حرکتوں سے زیادہ اچھی طرح واقف تھا۔

”اس کے باپ سے بات کرتی ہوں۔ الٹی خیر..... کوئی نیا تماشا ہی نہ لگ جائے اب۔“

☆☆☆

"تم نے خود اس شادی کے لیے ہاں کی تھی زمین! یہ کوئی بچوں کا کھیل نہیں، جب جی چاہا کھیل لیا جب جی

چاہا انکار کر دیا۔ والدین کی عزت پہ بین آئے گی..... ذرا سوچو۔“

”اور جو میری جان پہ بن آئے گی اس کا کیا؟“

وہ بہت خود غرض بھی، حرم کو شدت سے احساس ہوا۔

”تم بتاؤ..... ایک بار بھی ابا نے سوچا کہ زلفی میرے قابل ہے بھی یا نہیں۔“ اس نے یکبارگی سوال پوچھ کر

اسے لا جواب کر دیا تھا۔

”لیکن تم نے خود ہاں کی تھی، اپنی مرضی سے۔“ حریم نے اس پر حاوی ہونا چاہا۔

”تو جب لڑکی کی ہاں مانی جاسکتی ہے تو پھر اس کی ناپس کی بھی ویلو ہونی چاہیے۔“ وہ ہٹ دھرمی سے گویا

تھی۔ حریم کے پیٹ میں گرہیں پڑنے لگیں۔ اچھی بھلی زندگی الجھے ہوئے میڑھے راستوں پہ چل نکلی

تھی..... یوں کہ آپس میں ہی ایک دوسرے کا ساتھ چھوٹا جا رہا تھا۔

”ابا کی جان ہے اپنی بہن میں نرمی! وہ بہت دھی ہوں گے۔ طوفان مچا دیں گے اپنی چار دن کی محبت کے رخصت ہو کر رہا کر رہا تیس سال کا محبت تمہیں دیکھائی نہیں رہی۔“ ”ہر؟“ ”حریم کو روٹا آگیا۔“

"تم نے دوسروں کی حمایت اور میری مخالفت ہی کرنی ہے تو براہ کرم یہاں سے چلی جاؤ۔ جو ہوگا میں خود

دیکھ لوں گی۔“ “زمین نے رکھائی سے کہتے ہوئے کروٹ بدل لی۔ محبت ایسے ہی ٹڈر کر دیا کرتی ہے شاید اور بے

باک بھی۔ حریم مزید سمجھانا عبث جان کر وہاں سے اٹھ گئی۔

”کیا کہتی ہے؟“ ماں نے اسے دیکھتے ہی بے تابي سے پوچھا تو وہ ڈھیلے ڈھالے انداز میں ان کے پاس

بیٹھ گئی۔



"کہتی ہے کہ ابا سے خود بات کر لے گی۔"

"میری غلطی..... ہائے..... میری غلطی....." اماں نے کلمے چٹے تو حریم نے تڑپ کر ان کو تھام لیا۔

"اللہ کا واسطہ ہے اماں! بس کریں۔ کر لینے دیں اسے ابا سے بات..... ہو جانے دیں اس کی حسرت پوری..... خود ہی ٹھیک کر لیں گے اپنی لاڈلی کو۔ آپ کیوں ٹینشن لیتی ہیں۔"

"ان کا دل ٹوٹ جائے گا۔ باپ بیٹی کا رشتہ خراب ہو گا حری! انہیں بہت تکلیف ہو گی بیٹی کی سرکشی سے۔" وہ حق رکھتی ہے بات کرنے کا اماں! ایک بار کر لینے دیں اسے..... عین دقت پر تماشے سے بہتر ہے کہ پہلے ہی تماشا ہو کر ختم ہو جائے۔" حریم نے انہیں ٹھنڈا کیا تھا۔ مگر وہ آنے والی گھڑیوں کے بارے میں سوچ سوچ کر دہل رہی تھیں۔

"پریشان مت ہوں۔ طوبی بے چاری بھی سہم گئی ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ لائیں، میں آپ کا سر دبا دوں۔ سکون ہو جائے گا ذرا۔" حریم نرم ہاتھوں سے زبردستی ان کا سر دبانے لگی تو بیٹیوں والے مخصوص سکون کو محسوس کر کے ان کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

☆☆☆

"عباد..... کیوں تنگ کر رہے ہو ماں کو؟" وسیم سٹھکی تک بات پہنچی تو وہ رات گئے اس کے کمرے میں چلے آئے۔

"مانسڈ پوڈیڈ۔ آپ کی سز مجھے تنگ کر رہی ہیں آج کل۔" اس نے جواباً ناراضی دکھائی۔  
"مذاق نہیں ہے یہ عباد! دو خاندانوں کا مسئلہ ہے۔ اپنے ماموں کی فطرت اچھی طرح جانتے ہو تم۔ تمہاری ماں کا میکہ ختم ہو جائے گا۔"

"تو تمہارے کس نے کہا تھا کہ جا کر رشتہ پکا کر آئیں..... کم از کم میں نے تو نہیں کہا ان سے۔" وہ براہم ہوا۔  
"یہ اب کی بات نہیں ہے عباد! شروع ہی سے تمہاری ماں کی خواہش تھی.. بیٹی کے طور پہ ماں کو دیکھا ہے اس نے ہمیشہ..... سب کو پتا تھا وہی بہو بنے گی اس گھر کی۔ اور یہ بات اکثر تمہارے سامنے بھی ہوتی رہی ہے۔" وہ اپنے اس بیٹے کی فطرت اچھی طرح جانتے تھے، اسی لیے بہت نرمی سے بات کر رہے تھے۔

"میں نے بھی ان فضول باتوں کو سنجیدگی سے نہیں لیا ڈیڈ! بچپن کی باتیں بچپن کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہیں۔ مجھے اپنے لیے کسی لائف پارٹنر چاہیے۔ میں زیادہ اچھی طرح جانتا ہوں۔" وہ اسی رکھائی سے کہہ رہا تھا۔  
"اے دوستی کے خانے میں رکھ لو عباد! ماں سے شادی کر لو۔ عزت بہت ڈسٹرب ہے تمہاری ضد سے۔"  
"دوستی ہی سے آزما کر تو لائف پارٹنر والے خانے میں فٹ کیا ہے اسے۔ آپ کیا جاتیں اور ڈونٹ وری۔ ماما کو میں سمجھا لوں گا۔ انہیں تو لڑنے اور نکتہ چینی کرنے کے لیے ایک عدد بہو چاہیے، وہ میں لا دوں گا۔" عباد نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے آخر میں بات کو مزاحیہ رنگ دے دیا تو وہ مسکرا بھی نہ سکے۔

"یہ تم ٹھیک نہیں کر رہے عباد! خاندان کا معاملہ ہے۔"

"اور میری پوری زندگی کا معاملہ ہے ڈیڈ۔" وہ فوراً سنجیدہ ہو گیا۔

"کس فیملی سے ہے؟" انہوں نے اکٹھے لہجے میں اب اسے دوسری طرح سے گھیرنا چاہا۔

"کوئی اونچے خاندان سے نہیں ہے ڈیڈ! لیکن مجھے بس لڑکی سے غرض ہے۔" وہ محتاط انداز میں بولا۔

"زمین سے تو نہیں اگی ہو گی نا۔ ماں باپ، بزنس میں نام..... کچھ تو ہو گا اس فیملی کا؟" وہ تے۔

"اس کے والد کسی گورنمنٹ کے ادارے میں جاب کرتے ہیں شاید..... مجھے ٹھیک سے علم نہیں لیکن زمین

بہت پڑھی لکھی اور خوب صورت لڑکی ہے ڈیڈ! اچھی جاب کر رہی ہے۔ انڈی پینڈنٹ ہے۔"



"ہم نے لڑکی سے جاب نہیں کروانی لیکن جن سے ماتھا جوڑنا ہے، ان کا جوڑ کا ہونا ضروری ہوتا ہے بیٹا جی اور نہ بقاتیں پیدا ہوتی ہیں۔" انہوں نے درپردہ انکار ہی اس تک پہنچایا تھا۔  
"جب مجھے ان سب باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا تو آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں ڈیڈ۔" وہ اب اس ساری بحث سے اکتانے لگا۔

اس نے تو سوچا تھا کہ شادی کے لیے لڑکی پسند کر کے بتائے گا تو گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ جائے گی۔ یہاں تو کرنٹ ہی دوڑ گیا تھا گویا گھر بھر میں اور سب ہی کو لگا بھی زوروں کا تھا۔  
"لیکن ہمیں فرق پڑتا ہے برخوردار۔" ویم صاحب نے قطعی انداز میں کہا۔

"ہمارے گھر میں ایک انسان کا اضافہ ہونے والا ہے عباد! تو شرط یہ اسے اونچے خاندان سے ہونا چاہیے۔ بے نسل تو ہم کتے بلیاں بھی نہیں پالتے۔" نتھنے پھلاتے ہوئے انہوں نے منہ سے کہا تھا۔

"بہر حال..... شادی تو میں زمین ہی سے کروں گا ڈیڈ! اب خاندان متاثر ہو یا گھر..... آئی ڈیم کیئر۔" عباد نے اکھڑے لہجے میں کہا۔ سامنے بھی ویم کھسی تھے۔ کئی پٹرول پمپس اور کھسی لیدرز اینڈ گارمنٹس کے کرتا دھرتا..... ان بچوں کے عیش ان ہی کے دم سے قائم و دائم تھے۔

"کان کھول کر سن لو عباد! شادی تمہاری مائے ہی سے ہوگی۔ اس لڑکی کو کس حیثیت سے رکھنا چاہتے ہو، وہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔" وہ قطعیت سے کہتے اٹھ کھڑے ہوئے تو اس کی کنپٹیاں سلکیں۔

"وہ کسی اور کیٹگری کی لڑکی ہوتی تو شادی کے لیے اسے کبھی نہ چٹا ڈیڈ! مسئلہ ہی یہ ہے کہ وہ اس کیٹگری کی نہیں ہے۔ تب ہی میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اور میری خواہش ہے کہ آپ دونوں میرا پروپوزل لے کر جائیں اس کے گھر۔" عباد نے ان پر مکمل کر زمین کی حیثیت واضح کر دی تھی۔

"اس گھر میں بہو بن کر صرف مائے آئے گی عباد! اور یہ بات تم لکھ کر رکھ لو۔ ہم صرف اسی شادی میں شریک ہوں گے۔" انہوں نے واضح طور پر اس سے قطع تعلقی کا اعلان کیا تھا۔ عباد کو بھی غصہ آ گیا۔

"اوکے۔ آپ لوگوں کی مرضی..... لیکن میں شادی زمین سے کروں گا اور بس۔ مائے کی میری زندگی میں کوئی جگہ نہیں۔" اس نے بھی صفا چٹ انداز میں جواب دے دیا۔

"تو پھر اسے اس گھر میں مت لانا۔" ان کا بھی میٹر گھوم گیا۔ ساری عمر کی عیاشیوں کا یہ بدلہ دے رہی تھی اولاد۔

"نہیں لاؤں گا۔" وہ کمرے سے باہر جاتے ہوئے دروازہ دھڑام سے بند کر کے گیا تھا۔ ویم صاحب ماتھے پر آیا پسینہ پونچھنے لگے۔ بیٹا ہاتھ سے نکل چکا تھا یہ احساس انہیں بھی شدت سے ہوا تھا۔

☆☆☆

"کم آن ڈینیئل....! تم اچھی طرح سے جانتے ہو کہ مارک اور میرے بیچ کتنا فرق ہے۔ ہماری سوچ بالکل الگ ہے ایک دوسرے سے۔ ڈیڈ کو سمجھاؤ..... نتیجے سے پیار کے اظہار کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں۔ اسے داماد بنانا ضروری نہیں۔" کیتھی سخت اکتائی ہوئی تھی۔

"وہ تمہیں پسند کرتا ہے۔" ڈینیئل نے آئس کریم کی کون اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے اسے گویا تصویر کا اچھا رخ دکھایا۔

"ہااا..... اور اسے اپنی پسندیدہ چیزیں جمع کرنے کا بہت شوق ہے، یہ میں جانتی ہوں ڈینی! لیکن سوری..... میں کوئی چیز نہیں ہوں۔" وہ سخت اکتائی ہوئی تھی۔

"کم آن کیتھ! تم نے اپنی مرضی سے یہ منگنی کی تھی۔" ڈینیئل نے ہنستے ہوئے اسے یاد کرایا۔



"تب میں چھوٹی تھی اور ڈیڈ کو خوش کرنے کے لیے بس ہاں کر دی۔ مجھے کیا پتا تھا چند سالوں میں یہ اتنا عجیب نکل آئے گا۔" کیتھی ناگواری سے بولی۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ محبت کرتا ہے تم سے، کیئرنگ ہے اس لیے تھوڑا جیس بھی ہو جاتا ہے تمہارے دوستوں سے۔" ڈینیل اسے سمجھا رہا تھا۔

"یہی کیئر اگر وہ اپنی کرے تو کئی میگزینز اور ایڈیٹس آجائیں اسے۔ جن کے بارے میں پتا ہی نہیں اسے۔" وہ بد مزہ ہو کر بولی تو ڈینیل نے بے اختیار اونچا قہقہہ لگایا۔

"بتاؤں گا میں مارک کو۔"

"سو واٹ..... پروا کسے ہے۔ اچھا ہے، پیچھا چھوڑ دے گا میرا۔" وہ اکتا کر بولی۔ ڈینیل نے اسے بغور دیکھا۔

"کیا بات ہے..... تمہاری فیلنگز کچھ زیادہ ہی بری نہیں ہیں مارک کو لے کر؟"

"اس کا رویہ نظر نہیں آتا تم سب کو؟" کیتھی نے الٹا اس سے پوچھا۔

"لڑکے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جاتے ہیں۔" ڈینیل نے کون ختم کرتے ہوئے ٹشو پیپر سے ہونٹ صاف کیے۔

"لیکن مجھے اس کا رویہ بالکل بھی پسند نہیں ہے۔ اگر وہ ایسا ہی رہا تو آئم سوری..... میں اسے اتنا موقع نہیں دوں گی کہ وہ مجھ سے شادی کر کے خود کو صحیح ثابت کر سکے۔" وہ ناراضی سے کہہ کر اپنی آنکس کریم ختم کرنے لگی تو اس کی بات پر ڈینیل مسکرا دیا۔

ڈینیل کو آج واپس چلے جانا تھا۔ اس کی چھٹی ختم ہو گئی تھی۔ جانے سے پہلے وہ کیتھی کو کافی ہاؤس ڈراپ کر گیا جہاں وہ پارٹ ٹائم جاب کرتی تھی۔ چھوٹے مگر خوب صورت سے کافی ہاؤس میں داخل ہوتے ہی دائیں کونے کی مخصوص ٹیبل پر مخصوص کسٹمر کو دیکھ کر کیتھی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اسپرن کی ڈوریاں باندھتی وہ کاؤنٹر کے پیچھے چلی آئی۔

"تمہارا کسٹمر آدھے گھنٹے سے بنا کسی آرڈر کے بیٹھا ہے، اب تم آگئی ہو تو جاؤ اور آرڈر لو اس سے..... اور کسی کو تو دیکھتا بھی نہیں وہ۔"

اس کی ساکھی ویٹرس جیس ہو کر بولی تو کیتھی بے اختیار مسکرا دی اور نوٹ پیڈ اور پین لے کر کونے والے ٹیبل کی طرف بڑھی۔

"واٹ وڈ یو لائنک سر؟" پاس جا کر مودبانہ پوچھا تو وہ مسکرانے لگا۔

"یہ لٹو ہے کیتھی پر..... اسی کے لیے آتا ہے یہاں..... ہائے..... ہینڈ سم..... اسی لیے تو دیکھتا نہیں ہے کسی اور ویٹرس کو اور نہ ہی آرڈر دیتا ہے اس کے آنے سے پہلے۔" سیاہ فام ویٹرس ڈور تھی وہاں نئی آئی تھی، ان دونوں کے مسکراتے ہوئے چہروں کو نظر میں رکھے ہوئے آہ بھر کر بولی تو کافی ہاؤس کی پرانی ویٹرس سیلینا نے جوس کے لیے تیزی سے گاجر چھیلنے ہوئے مسکرا کر اسے ٹوکا۔

"سمہیں تو دو دن میں ہی سمجھ جانا چاہیے تھا کہ وہ کافی کے لیے نہیں بلکہ کیتھی کے لیے آتا ہے یہاں۔"

"ڈیوڈ کو پتا چلے تو کیا وہ ناراض نہیں ہوگا؟" ڈور تھی نے اعتراض کیا۔

"اس کا کافی ہاؤس چل رہا ہے، کسٹمر آکر کسی بھی بہانے کافی پیے، اس کا تو فائدہ ہی ہے۔" سیلینا نے گاجروں کی ٹوکری سنک میں رکھ کر پانی کھول دیا تھا۔

"تم اپنے باپ کا سارا پیسہ بلا وجہ کافی پینے پر لگا دو گے۔" آرڈر لیتے ہوئے کیتھی اسے چھیڑ رہی تھی۔



"خیر..... وجہ تو بہت سولڈ ہے میرے پاس یہاں آکر کافی پینے کی۔" وہ کیتھی کے چہرے کو نظروں میں رکھتے ہوئے مسکرایا۔

"جس دن ڈیوڈ کو پتا چل گیا تھا..... بہت سولڈ ریزن کے ساتھ ہی نکالے گا تمہیں یہاں سے۔" کافی کا آرڈر لے کر وہ اسے چڑاتے ہوئے گئی تھی۔ زیڈ بے ساختہ مسکرا دیا۔

"تم سے شادی کرنا چاہتا ہے وہ؟" ڈور تھی کو جس لگا ہوا تھا، کافی پھینٹتے ہوئے کیتھی کے ہاتھ ست ہوئے۔ بائیں ہاتھ کی انگلی کا چھلا جیسے گردن میں کسا ہوا محسوس ہونے لگا۔

"کون..... کس کی بات کر رہی ہو؟" وہ انجان بن کر زور زور سے کافی پھینٹنے لگی۔

"یہی ہینڈ سم ایشیائی کسٹمر..... جو کسی اور ویٹرس کو آرڈر نہیں دیتا جب تک کہ تم نہ آ جاؤ۔" ڈور تھی مزہ لے رہی تھی۔

"ایسا کچھ نہیں۔ میرا یونی فیلو ہے..... ریسپیکٹ کرنا ہے میری۔" کیتھی نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا وہ خواجواہ اپنی نوکری کے متعلق کوئی ایشو نہیں بنانا چاہتی تھی سو ٹالنا ہی بہتر تھا۔

"اس سے پہلے کہ ڈیوڈ مجھے نوکری سے فارغ کر دے، تم کوئی اور کافی ہاؤس دیکھ لو مسٹر۔" اپنے ڈیوٹی آؤرز ختم ہونے کے بعد وہ باہر نکلی تو زیڈ کو کچھ انتظار پا کر مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا اس کا قہقہہ فضا میں بکھر گیا۔

"اے تو شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس کے پاس ایسی ویٹرس ہے جس کی وجہ سے اس کا مستقل کسٹمر سسٹم قائم ہے۔" وہ اسے چھیڑتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ کیتھی مصنوعی حشکی سے اسے دیکھتے اپنی مسکراہٹ دبا گئی۔ وہ اس کے ہم قدم تھا، کیتھی جانتی تھی وہ اس کے گھر تک اس کے ساتھ ہی جانے والا تھا اور اسے یہ بات بہت اچھی لگتی تھی، وہ دونوں انڈر گراؤنڈ ٹرین اسٹیشن کے لیے سیڑھیاں اتر رہے تھے شدید سردی کی وجہ سے مسافر نہ ہونے کے برابر تھے، ٹرین آنے میں چند منٹ باقی تھے، وہ دونوں سیڑھیاں اتر کر ایک بیچ کی طرف بڑھے ایک دم ہی مارک اور اس کے ساتھ دو بد معاش ٹائپ لڑکے ان کے سامنے آ گئے۔ زیڈ نے غیر ارادی طور پر کیتھی کو اپنے پیچھے کر دیا۔

"ہمم..... تو تم اتنی آسانی سے کیتھی کا پیچھا نہیں چھوڑو گے؟" مستحمانہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے مارک نے کہا تو کیتھی گویا ہوش میں آ کر چلائی۔

"واٹ دائل از دس..... تمہیں پتا بھی ہے، تم خود کو کتنا گھٹیا ثابت کر رہے ہو؟"

"تم سے تو میں بعد میں بات کروں گا۔ پہلے اسے سبق سکھا دوں۔" وہ کینہ تو نظروں سے زیڈ کو دیکھ رہا تھا۔ بات کرتے ساتھ ہی اس نے اپنے ساتھ موجود لڑکوں کو اشارہ کیا تو وہ دونوں زیڈ پر پل پڑے۔ کیتھی کو مارک نے قابو کر لیا مگر وہ اسے بری طرح نوچ کھوٹ رہی تھی۔ زیڈ نے کچھ بیچ کھائے اور کئی ان دونوں کو مارے، اسی وقت ٹرین آ کر اپنے اسٹاپ پر رکی تو وہ تینوں ہی بھاگ گئے۔

"اسے پہلی قسط سمجھنا۔" جاتے ہوئے مارک نے فاتحانہ نظروں سے زیڈ کو دیکھا تھا۔

"تم ٹھیک ہوتا؟" کیتھی نے پوچھا۔

"ہاں..... شاید۔" بالوں میں انگلیاں چلا کر ٹھیک کرتے وہ کیتھی کا ہاتھ تھام کر ٹرین کے دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ واقعی ٹھیک تھا۔ لڑائی بھڑائی میں تو پچھلے تین سال سے وہ بھی ماہر ہو چکا تھا۔ ایک مکا اگر کھاتا تھا تو جواباً تین کے مقابل کو مارنے کی بھی طاقت رکھتا تھا۔

"اس سورتو میں دیکھ لوں گی۔ بہت ہو گیا زیڈ کے بھتیجے کا خیال۔" وہ شدید غصے میں تھی۔

"اس کی قسط تو سود سہست میں ادا کر دوں گا۔ تم فکر مت کرو۔" اس کے مقابل کھڑے ہوتے ہوئے وہ مسکرا رہا تھا کیتھی کو اس ایشیائی لڑکے پر بے حد پیار آیا۔ وہ جانتی تھی اگر آج وہ اس کے ساتھ نہ ہوتی تو وہ ان



تینوں کو ایسے بھاگنے نہ دیتا بلکہ آج ہی بدلہ چکا دیتا۔

"آتم سوری..... میری وجہ سے....." یہی تھی شرمندہ ہونے لگی۔

"تمہیں تو مغرور ہونا چاہیے کہ وجہ "تم" ہو۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مسکرا کر بولا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو یہی واقعی قہقہہ لگاتی مگر فی الحال اسے مارک کی اس گری ہوئی حرکت پر شدید غصہ تھا اور وہ آج گھر جا کر اس سارے قصے کا خلاصہ کرنے والی تھی۔

☆☆☆

"مجھے پتا تھا، یہی سب ڈرامہ ہوگا۔ تم جیسا غیر مستقل مزاج بندہ ایسی ہی حرکت کر سکتا تھا برو! ماما کو دارن کیا تھا میں نے۔" وہ سخت بیزار تھا۔ عباد کو چھوٹے بھائی کا انداز بہت برا لگا۔

"اگر ماما کی حمایت اور ڈیڈ کے بودے نظریات کا جھنڈا بلند کرنے کے لیے کال کی ہے تو اللہ حافظ۔" اس نے سرد مہری سے کہہ کر واقعی کال ڈراپ کر دی تھی۔

"حد ہے یعنی کہ....." وہ تپ اٹھا اور سگریٹ کیس سے سگریٹ نکال کر لیوں میں دبا کر سلگایا اور اٹھ کر آفس میں ٹہلنے لگا۔ توقع کے عین مطابق کال دوبارہ آئی تھی۔ چند لمحوں تک لب بچنے وہ موبائل کو ہی کینہ توڑ نظروں سے گھورتا رہا پھر دوسری طرف موجود شخص کی ڈھٹائی سے ہار کر کال انڈینڈ کر ہی لی۔

"بکواس....." اس نے بہت برے طریقے سے کہا۔

"بکواس صرف یہ ہے کہ مارہ ماما کی فرسٹ چوائس ہے اور برو! تمہاری بے وقوفی کی وجہ سے ماما جا کر ماموں جان سے اس رشتے کی بات بھی کر چکی ہیں..... اب تم کیا اس خاندان کو توڑنا چاہتے ہو؟"

"تو ان سے اتنی جلد بازی کرنے کا کس نے کہا تھا؟" وہ بھڑکا۔

"اور اگر ماما کو اتنا ہی احساس ہے اپنی فرسٹ چوائس کا اور اتنا ہی شوق ہے مارہ کو بہو بنانے کا تو تم کر لو اس سے شادی..... لیکن میں زمین کے علاوہ اور کسی کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتا۔" عباد نے دانت پیستے ہوئے کہا تو وہ رساں سے بولا۔

"مارہ بھی انوالو ہے برو! تم جانتے ہو کہ اس کی اسپیشل فیلنگز ہیں تمہارے لیے۔"

"اس کی فیلنگز کا اتنا خیال ہے سب کو..... اور میں نے تو محبت کر کے گویا جھک ہی ماری ہے۔ سنا تھا اگر کسی کو آپ پوری شدت سے چاہتے ہیں تو ساری دنیا مل کر پوری طاقت کے ساتھ اسے آپ سے ملانے میں لگ جاتی ہے..... پر یہاں تو الٹ ہی ہو رہا ہے۔ سب ہی (سالے) پیچھے ہی پڑ گئے ہیں پوری طاقت کے ساتھ کہ یہ رشتہ ہونے نہ پائے۔"

گالی لیوں کے بیچ روک کر وہ بری طرح بگڑ کر بولا کہ دوسری طرف بے اختیار قہقہوں کی آواز سنائی دینے لگی..... نہ چاہتے ہوئے بھی عباد کا موڈ کچھ بہتر ہو گیا۔

"اب تم خود ماما کو سمجھا لو۔ میں خاندان کو جوڑنے والی ایلفی بننے کے موڈ میں بالکل بھی نہیں ہوں۔" عباد نے حتمی لہجے میں کہا تو جو ابا وہ محض ہنکارہ بھر کر رہ گیا لیکن یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ زمین کے لیے ان سب کے دل میں بغض پیدا ہو گیا تھا جس نے ان کے خاندان میں دراڑ ڈال دی تھی۔

☆☆☆

"سنیے جی! آپ سے ایک بات کرنی تھی۔"

ابا کھانا کھا کر کچھ دیر صحن میں ٹہلنے کے بعد لیٹنے کے ارادے سے کمرے میں چلے گئے تو اماں کو موقع غنیمت لگا بیٹی کی سرکشی بتانے کا۔



"بات تو میں نے بھی کرنی تھی تم سے۔ کوئی پریشانی، کوئی ٹینشن ہے تو بتاؤ۔ شادی کی خریداری کے پیسے تو کم نہیں پڑ گئے؟ بھلی لوک! آج پھر کھانے میں نمک تیز تھا اور پودے کی چٹنی گھوٹی ہی نہیں تم نے۔"

ابا مسکرا رہے تھے۔ پریشانی میں اماں یونہی بھلکڑا ہوا جایا کرتی تھیں۔ ہر کام الٹا سیدھا کیے جاتیں۔ اماں کو ان کے اندازوں پر رونا آنے لگا۔

"اور وہ کارڈ پسند کر لیا مینو نے؟" بھی تھوڑا ہی وقت رہ گیا ہے۔ چھپنے میں بھی دن لگنے ہیں پھر کہیں جا کر بانٹنے کی باری آئے گی۔" ابا بہت مطمئن تھے۔ پرسکون..... گھر کا سربراہ جب اپنی تمام ذمہ داریاں اچھے طریقے سے نبھا رہا ہو تو وہ اپنی طرف سے یونہی پرسکون ہوا کرتا ہے۔ یہ تو آس پاس والے ہوتے ہیں جن کی "کمی بیشی" زندگی کو پرسکون نہیں رہنے دیتی تھی۔

"کہو..... کیا بات ہے۔" اماں کو ابھی بھی تذبذب اور پریشانی کا شکار دیکھ کر وہ ٹھٹکے۔

"وہ..... زمین کی بات ہے۔" اماں کی آواز گلے میں پھنسی۔ ابا پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہوئے۔

"کیا ہوا۔ کیا چاہیے اسے؟ میں نے کہا بھی تھا، میری بیٹی کو ساری شاچنگ اس کی پسند سے کروانا۔" ابا مسکرا دیے۔ اور ساتھ ہی زمین کو آواز بھی لگادی۔ ان کے خیال میں زمین کا سب سے بڑا مسئلہ اپنی پسند کی شاچنگ ہی ہو سکتا تھا۔

"آرام اور تیز سے بات کرنا مینو! سوچ سمجھ کر..... آنے والے حالات کی ذمہ داری سراسر تمہاری ہوگی۔"

زمین ابا کی آواز سن کر زرد چہرہ لے چلوں میں پاؤں ڈال کر، دوپٹہ صاف کر رہی تھی، حریم نے اسے دیکھا اور دبے لہجے میں بولی خود اس کا دل جیسے اچھل کر حلق میں آ رہا تھا۔ وہ بوجھل قدموں سے چلتی ان کے کمرے کی طرف بڑھی۔ حریم کمرے کے باہر ہی کھڑی ہو گئی۔

"آؤ بھئی..... کیسی شاچنگ چل رہی ہے میری بیٹی کی؟" ابا اسے دیکھتے ہی مسکرائے تو زمین کی آواز حلق ہی میں پھنس گئی۔

"میں چائے لاتی ہوں بنا کر..... آپ اس کا مسئلہ پوچھ لیں۔" آنسو پیتے ہوئے اماں کیٹیلی نظر زمین پر ڈالتی کمرے سے نکل گئیں، ان میں اتنی ہمت نہ تھی کہ ابا کا غیض و غضب دیکھتیں۔

"ہاں بھئی..... کیا مسئلہ ہو گیا ہے۔ پیسے کم پڑ گئے ہیں کیا؟" ابا نے مسکرا کر لاڈلی بیٹی کو دیکھا اور پھر شرارت سے اضافہ کیا۔ "پھر تمہاری اماں تمہاری پسند کی چیز نہیں لے کر دے رہیں۔"

"خوشیاں کم پڑ گئی ہیں ابا! اور واقعی اماں مجھے میری پسند پہ ٹوک رہی ہیں۔"

اپنی پوری ہمت جمع کرتے ہوئے زمین اپنی زندگی کا مقدمہ لڑنے کے لیے میدان میں اتری تھی۔ باہر کھڑی حریم نے بے اختیار دروازے کا سہارا لیا۔

"میں بات کروں گا تمہاری اماں سے۔ بھئی شادی تمہاری ہے تو شاچنگ بھی تمہاری پسند سے ہونی چاہیے۔" ابا کی آواز ابھری۔

"اور لڑکا؟" زمین ذرا توقف کے بعد مدھم لہجے میں بولی۔

"کون..... زلفی.....؟ کیا ہوا اسے؟" ابا چونکے۔ ان کا ذہن یقیناً وہاں پہنچ بھی نہیں سکتا تھا جہاں سے زمین بول رہی تھی۔

"مجھے پسند نہیں ہے وہ ابا۔" زمین پل صراط سے گزر رہی گئی تھی۔

ابا نے بغور اسے دیکھا۔ "لڑائی ہوئی ہے زلفی سے تمہاری؟"

"نہیں ابا۔" زمین نے پیچھے ہاتھوں کو آپس میں رگڑا۔ "کوئی لڑائی نہیں ہے۔"



”کارڈ پسند کر لیا ہے تم نے؟“ ابانجانے انجان بن رہے تھے اس کی کہی بات سے یاد آتی نہیں سمجھے تھے۔  
”نہیں ابا! میں نے کارڈ پسند نہیں کیا۔“  
”تو کرونا۔ دن ہی کتنے رہ گئے ہیں باقی۔ میں تو خاص طور پر تمہیں پسند کروانے کے لیے کیٹلاگ گھر لایا تھا۔“

”ابا! کیا میری شادی میں ہر چیز میری مرضی کی ہوگی؟“  
وہ بڑی آس سے ان کا چہرہ دیکھتی انہیں چار پانچ سالہ زمین لگی جو ہر عید بہ ابا کی شہ پا کر اماں کے سامنے اعلان کیا کرتی تھی کہ مینو کے ابا مینو کو ہر چیز اس کی پسند سے دلوائیں گے۔ ان کا دل بڑے زور سے دھڑکا۔  
”بالکل۔ جو چاہے خریدو۔ پیسے چاہیں تو اور لے لو۔“ وہ اس بار کوشش کر کے مسکرائے تھے۔  
”خوشی چاہیے مجھے ابا! اور وہ پیسوں سے نہیں ملتی۔ نہ دنیا کے بازار میں۔“ زمین نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا تو اب کی بار وہ کچھ بولنا ہی بھول گئے۔  
”مجھے زلفی نہیں پسند ابا۔“ زمین نے ہمت کر کے ایک ہی جملے میں پوری کہانی سمودی تھی۔ ابا کے تاثرات ایک دم بدلے۔

”کیا بکواس کر رہی ہو؟“  
”اس میں اور مجھ میں زمین آسمان کا فرق ہے ابا۔“ زمین کی آواز آنسوؤں سے بوجھل تھی۔  
”زاہدہ..... زاہدہ.....“ ابا کی گرج بہت دنوں بعد پورے گھر کے در و دیوار نے سنی۔ اماں جو باد رچی خانے میں چائے کے بہانے خود کو چھپائے ہوئے تھیں، گرتی پڑتی افتاں و خیزاں کمرے کی طرف لپکیں۔  
”یہ..... یہ تماشا..... کب سے چل رہا ہے..... یہ تماشا؟“ وہ اماں کو دیکھ کر چیخے۔  
”اماں کو کچھ نہیں پتا ابا! یہ سب میرا مسئلہ ہے۔“

زمین نے آنکھیں مسلتے ہوئے بہادری کا عظیم الشان مظاہرہ کیا۔ اور شکایتی انداز میں بولی۔  
”شادی کے لیے سوئی سے لے کر ہاتھی تک بی بی سے پسند کروانے والے جب لڑکے کی باری آتی ہے تو بیٹی کو چپ کر کے بٹھا دیتے ہیں ابا۔“  
”یہ کیا بکواس کر رہی ہے؟“ اماں کو لال آنکھوں سے گھورتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔ ان کی غیرت گوارا ہی نہیں کر رہی تھی کہ سامنے کھڑی جوان بیٹی سے کوئی ایسا سوال کریں جس کا جواب انہیں منہ کے بل گرا دے۔  
”مم..... مجھے تو آج ہی کہا اس نے..... کہ زلفی سے شادی نہیں کرے گی۔“ اماں جھپٹا کر بولیں۔ ابا ساکت سے زمین کو دیکھنے لگے۔

”ابا پلیز۔ ابھی بھی وقت ہے ابا! کون سا شادی کے دعوت نامے بٹ گئے ہیں۔ کھانے پینے اوڑھنے اور پڑھ لکھ کر نوکری تک کرنے کی اجازت دے کر، اب جب پوری زندگی کا فیصلہ کرنے کی بات آئی ہے تو بیٹی کو منہ بند کر کے کونے میں مت بٹھا میں۔“

وہ گڑ گڑائی۔ ابا کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ چاہے بیٹیوں کو اتنی آزادی اور خود مختاری دی تھی لیکن اندر سے تو وہ وہی روایتی مرد اور باپ والی سوچ رکھتے تھے کہ جب جی چاہے وہ اولاد کی ڈور کھینچ سکتے ہیں، پرکاٹ سکتے ہیں۔

”خبردار..... خبردار.....“ ابا نے انگشت شہادت اٹھائی اور دھاڑے۔ ”خبردار جو یہ بکواس دوبارہ منہ سے نکالی ہو تو..... دفع ہو جاؤ یہاں سے اور یہ خناس نکال دو دماغ سے کہ زلفی کے علاوہ کسی اور سے شادی ہوگی تمہاری۔“



"ابا..... پھر اتنی تعلیم اور شعور دلوانے کا کیا مقصد تھا ابا! کھائی میں دھکا ہی دینا تھا تو جاہل گنوار اور اندھا ہی رہنے دیتے ہیں۔" وہ رو دی۔

"اس کی زبان بند کرو! لوزا ہمدہ! اور نہ میں مار ڈالوں گا اسے یا اپنے آپ کو۔" وہ چیخے تھے۔ اماں نے گھبرا کر زمین کی پشت پر دو ہتھکڑیاں مارے۔

"بس کر دے..... بے غیرت..... باپ کے سامنے کھڑی ہے۔"

"اسی باپ نے ہر چیز کا شعور دیا ہے اماں! اور اتنی اہمیت بھی کہ میں ہر بات ان سے کر سکوں..... تو زندگی کے اس قدر اہم معاملے پر کیوں نہیں اماں! وہ زندگی جس میں آگے آپ لوگ کہیں نہیں ہوں گے..... جو صرف میں نے گزارنی ہے۔" زمین نے خود کو مضبوط بناتے ہوئے کہا۔

"یہ تعلیم اور شعور اس لیے نہیں دلویا تھا کہ ایک روز تم میرے ہی سامنے آ کر کھڑی ہو جاؤ۔" ابا نے منہ سے کف اڑاتے ہوئے کہا۔

"ماں باپ سے بڑھ کر اچھا بھی کوئی سوچ سکتا ہے اولاد کے لیے۔"

"بی اے قیل..... ویلے نکلتے کو چتا ہے آپ نے میرے لیے ابا! کیا میں اسی قابل ہوں؟ کیا میرا حق نہیں کہ میں اپنی مرضی سے اپنی خوشی سے یہ فیصلہ کروں؟" وہ دکھ سے بولی۔

"تجھ کو اس بند کرو اور دفع ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے۔ خبردار جو ایک لفظ بھی مزید کہا اس رشتے کے خلاف۔"

ابا مزید بھڑکے۔ وہ بار بار مٹھیاں کھول اور بھیج رہے تھے جیسے بمشکل اپنا ہاتھ اٹھنے سے روک رہے یوں۔  
نجانے کیوں..... ہر کلاس میں بچے کی پسند کے مضامین رکھنے سے لے کر کھانے پینے پہننے اور نہ ہننے تک میں اولاد کی مرضی کو اہمیت دینے والے والدین، شادی کے لیے ہم سفر پسند کرنے کے معاملے پر اتنے تنگ نظر کیوں بن جاتے ہیں۔ کیوں یہ معاملہ خوش اسلوبی سے طے کرنے کے بجائے اولاد کو ان کے سامنے سرکش بن کے کھڑا ہونا پڑتا ہے؟ مانا کہ زمین غلط تھی مگر کیا ایک بار بھی ابا نے سوچا تھا کہ زلفی اور زمین کے مابین زمین آسمان کا فرق ہے؟

"چل اب بس کر دے تالاق نکلتی اولاد..... کیوں بوڑھے ویلے ہمارے سروں میں خاک ڈلوانا چاہتی ہے۔ دفع ہو یہاں سے۔" اماں نے اسے باہر کی طرف دھکیلا۔ مگر وہ جلی نہیں۔

"ابا! پلیز..... ذرا سوچیں تو کسی۔ کیا آپ کا دل نہیں چاہتا کہ آپ کی بیٹیاں بہت اچھے گھروں میں بیاہی جائیں اور اگر اللہ نے موقع دیا ہے تو....."

"میرا ہاتھ اٹھ جائے گا زاپدہ! لے جاؤ اسے یہاں سے۔" وہ زور سے چلائے۔ تو اماں اسے دھکیلتی ہوئی باہر لے گئیں۔

"یا اللہ!" وہ اپنے بستر پر گر سے گئے۔ چھوٹی چھوٹی فرمائشوں کے لیے اماں کی شکایت لے کر ان کے سامنے کھڑی ہونے والی بیٹی اپنی بڑی فرمائش لے کر سامنے آ کھڑی ہوگی یہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ ابھی صرف انہیں یہ پتا چلا تھا کہ وہ زلفی سے شادی نہیں کرنا چاہتی تو وہ ڈھکے گئے تھے۔ کہیں عبادوسیم کے بارے میں بھٹک پڑ جالی تو نجانے کیا کر بیٹھتے۔

☆☆☆

"زہے نصیب! آج پرفیس عبادوسیم نے خود مجھے یاد کر لیا۔" عباد کا نمبر دیکھ کر کال اٹینڈ کرتے ہی مارہرہ چپک اٹھی۔



"ہم..... یہ کیا تماشا چل رہا ہے گھر میں؟" وہ رکھائی سے پوچھتا سید حامد عابد آیا۔  
"کیا مطلب..... کون سا تماشا؟" وہ گڑبڑائی۔ اس نے تو سمجھا تھا کہ رشتے کی بات کو لے کر کسی چھیڑ  
چھاڑ کے لیے کال کی گئی ہے مگر ادھر تو کوئی الگ ہی سین چل رہا تھا۔

"یہی..... تمہارے اور میرے رشتے کو لے کر جو فضولیات چل رہی ہیں۔" وہ اس قدر ناگواری سے بولا کہ  
مارہ بے اختیار برامان کر اسے ٹوک گئی۔

"ایسکیوز می۔ اس میں فضول بات کیا ہے؟"

"فضول بات یہ ہے کہ ہم سے پوچھتے بغیر ہماری زندگی کا فیصلہ کیسے کیا جاسکتا ہے۔"  
"مجھے اس معاملے میں مت گھسیٹو..... کیونکہ مجھ سے میری مرضی سونی صد پوچھی گئی ہے۔" وہ تھکی سے  
بولی۔ تو لمحہ بھر کو عباد خاموش رہ گیا۔

"میں زمین کو پسند کرتا ہوں مارہ! آئم سوری..... لیکن نیک بنتی سے میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ میری زندگی  
میں تمہاری کوئی جگہ نہیں ہے۔ میں تم سے شادی کر کے سائیڈ افیئر نہیں چلانا چاہتا بہتر ہے کہ اسی افیئر کو شادی  
میں بدل لوں۔" وہ صاف گوئی سے کہہ رہا تھا، مارہ چکرا گئی۔ اس قدر بے رحمی..... اسے تو اندازہ بھی نہیں تھا کہ  
عباد و سیم اس کی قسمت کا ستارہ نہیں ہے۔ "اگر یہ بے ہودہ مذاق ہے تو اسے ختم کرو عباد! مجھے غصہ آرہا ہے۔" مارہ  
نے بمشکل مسکراتے ہوئے کیا۔

"بد قسمتی سے..... یہ مذاق نہیں ہے مارہ! ممانے تمہاری محبت میں جذباتی ہو کر مجھ سے پوچھتے بنا ہی  
ماموں جان سے جا کر بات کر لی۔ حالانکہ انہیں چاہیے تھا کہ پہلے مجھ سے کفرم کر لیں۔"  
وہ لفظی لا تعلقی سے کہہ رہا تھا۔ اسے واقعی مارہ کے جذبات اور خود سے لگاؤ کی کوئی پروا نہ تھی۔ وہ صرف اپنی  
خوشی اور طمانیت کے بارے سوچنے والی فطرت رکھتا تھا۔ بات شاید ختم ہو گئی تھی اور الفاظ بھی  
فون کے دونوں طرف خاموشی تھی۔ جیسے کہنے سننے کو کچھ بچانہ ہو۔ سب کہہ دیا گیا ہو۔ سب کچھ من لیا گیا  
ہو۔ مارہ نے آنکھوں میں آنسو لیے کال ڈراپ کر دی تھی۔ وہ گہری سکون بھری سانس لے کر رہ گیا۔ اسے خبر تھی،  
اب خود مارہ اس رشتے سے انکار کر دینے والی تھی۔

☆☆☆

"ابا..... ایک بار پلزز..... ایک بار عباد سے مل لیجئے۔ اتنی آزادی اور اعتماد دے کر یوں بے اعتبار مت  
کریں، سانس مت گھونٹیں اپنی بیٹی کا۔" وہ اپنی پسند کے کارڈ چھپنے کو دے آئے تو زمین ہدیائی انداز میں پھٹ ہی  
پڑی۔ وہ ساکت سے کھڑے اسے دیکھتے رہے۔

"وہ بہت اچھے گھر سے ہے ابا! بہت اونچا نام ہے ان کا..... اپنا بزنس ہے..... پڑھا لکھا ہے۔" وہ گڑگڑا  
رہی تھی۔ ابا کا ہاتھ بے اختیار اٹھ گیا۔ زندگی میں پہلی بار..... ورنہ انہوں نے کبھی اپنی بیٹیوں پر گرم نگاہ تک نہ  
ڈالی تھی۔

"یہ..... یہ صلہ دے رہی ہو میرے اعتماد اور اعتبار کا؟" ان کی آواز پھٹ گئی، مارے غصے کے وہ لرز رہے  
تھے۔

"آپ بھی تو اس اعتبار اور اعتماد کا بدلہ مانگ رہے ہیں ابا۔"  
"جان سے ملو ڈالو گاتھیں اگر تم نے دوبارہ اس بے شرمی سے کسی غیر مرد کا نام لیا ہو تو۔" ابا غرائے تھے۔  
زمین منہ پہ ہاتھ رکھے آنسو بہاتی بے بسی سے انہیں دیکھتی رہی۔  
"تم اس گھر سے زلفی کے ساتھ ہی رخصت ہوگی یا پھر کفن میں لپٹ کر۔ یہ بات پلو سے باندھ کر رکھ لو۔"



وہ سرد مہری سے بولے۔

”ابا امت خریدیں یہ ظلم۔“

”والہ..... ساری عمر ناز و نحرے اٹھائے اور آج اگر والدین کی خوشی کے لیے ایک کام کرنا ہے تو وہ ظلم ہو گیا۔“ وہ بڑنے۔

”اور اولاد کی خوشی..... وہ کہاں ہے ابا؟“ زمین سکی۔

”اے کہہ دو زائدہ! اس گھر سے اس کی لاش بھی نکلی تا تو وہ بھی زلفی کے ساتھ ہی رخصت کروں گا..... اب اس کی شکل دور کر لو مجھ سے... نفرت ہو رہی ہے مجھے اس محبت سے جو اس بیٹی سے کی تھی میں نے۔“

ابا بھرائے لہجے میں کہتے اپنے کمرے میں چلے گئے تھے اور اماں چنگاریاں اگلتی نظروں سے زمین کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا اسے دھنک کر رکھ دیتیں۔

☆☆☆

”تم ہوتے کون ہو مارہ سے جا کر بکواس کرنے والے..... رو رو کر بے حال ہو رہی ہے بے چاری بچی۔ طبیعت خراب کر لی ہے اس نے۔ فارگا ڈسک عباد! اپنا خاندان اپنا اسٹیشن دیکھو۔ ایسی لڑکیاں دوستی تک ٹھیک ہوتی ہیں مگر انہیں نیملی تک مت لاؤ۔ گھر کا ماحول ڈسٹرب مت کرو۔“ ڈیڈی اس پر بھڑکے تو وہ اطمینان سے بولا۔

”ایسی ویسی لڑکی نہیں ہے وہ۔“ چیک شدہ“ ہے۔ دولت دیکھ کر اپنا آپ لٹانے والی نہیں ہے۔“

”سو واٹ۔ وہ جانتی تھی تم اس پہ لٹو ہو۔ کچھ تو فنکاری اس میں بھی ہوگی نا جس نے عباد و سیم کی جیسے الو کے پٹھے کو پھنسا لیا ہے۔“ انہوں نے دانت پیسے۔

”ایک بات یاد رکھنا عباد! میں نے دنیا دیکھ رکھی ہے۔ کوئی دولت کی بھوکی چمٹ گئی ہے تم سے۔ ایسی لڑکیاں گھر پرانے کے لیے نہیں صرف اپنی قسمت چکانے کے لیے شادی کیا کرتی ہیں۔ اور بھول جاؤ کہ اس گھر میں سے کوئی تمہارا رشتہ لے کر جائے گا ان ٹٹ پونجیوں کے گھر..... اور نہ ہی وہ رخصت ہو کر اس گھر میں قدم رکھے گی۔“

”یعنی آپ مجھے گھر سے نکال رہے ہیں؟“ وہ بے یقینی سے انہیں دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”یعنی تم اب بھی اپنے فیصلے پر قائم ہو؟“ انہیں افسوس اور غصہ ایک ساتھ آیا۔

”جی بالکل۔ اپنی زندگی کے اس بڑے فیصلے کو میں اپنی دلی رضامندی کے ساتھ کرنا چاہتا ہوں بیٹی۔“

”قیمت چاہے کچھ بھی ہو؟“ انہوں نے غمی سے کہا تو عباد نے لا پرواہی سے شانے اچکا دیے۔ وہ لب بھینچ کر رہ گئے..... آندھی ان کے گھر کا رخ بھی کر چکی تھی۔ اب کتنی جا ہی آتی۔ یہ تو آنے والا وقت ہی بتانے والا تھا۔

☆☆☆

”عباد۔“ سرگوشی جیسی آواز تھی۔ وہ ٹھٹھا۔

”کیا بات ہے..... گلا خراب ہے تمہارا؟“

”نہیں۔ قسمت خراب ہے۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔ ”ابا مجھے زلفی کے ساتھ رخصت کر رہے ہیں عباد! کچھ کرو پلیز۔“

وہ سر تھام کر رہ گیا۔

”مما کسی طرح بھی تمہارے لیے پروپوزل لانے پر راضی نہیں ہیں زمین!“



"تو....." وہ کپکپائی۔

"تو..... پھر کوئی تیسرا ہی راستہ نکالنا پڑے گا۔ سنو....." وہ پرسوج انداز میں کہتا ایک لخت ہی کسی بڑے فیصلے پر پہنچ گیا۔ زمین تیزی سے دھک دھک کرتے دل کے ساتھ اس کی بات سننے لگی۔ جو سرا سر غلط ہونے کے باوجود اسے حرف بہ حرف درست لگ رہی تھی۔

"کارڈ بٹ گئے ہیں شادی کے مینو! اب بس کر دو۔" حریم نے اس کے آگے ہاتھ تک جوڑ دیے تھے۔ اماں نے دوپٹہ پیروں میں رکھ دیا۔ آنکھوں میں سرکشی لیے وہ چپ رہی..... اور آج صبح جب سب معمول کے مطابق اٹھے تو زمین گھر میں کہیں بھی نہیں تھی۔ حریم نے گھر کا کونہ کونہ دیکھ لیا۔ "بھاگ گئی؟" اماں کے منہ سے ٹوٹ کر لفظ نکلے تھے حریم بے جان ہوتے قدموں کے ساتھ چھت پہ جانے والی سیڑھیوں پر ہی بیٹھ گئی۔

☆☆☆

"ایک بار پھر اچھی طرح سوچ لو مینو!"

عباد اور رانا نکاح پڑھوانے کے لیے مولوی کا بندوبست کرنے گئے تھے۔ بجل نے برا فروختہ ہو کر ایک بار پھر زمین سے کہا۔

"اچھی طرح سوچ لیا ہے بجل! جب کوئی آسانی سے آپ کی خوشیاں نہ دے تو چھین لینی چاہئیں۔ اب جو بھی ہو رہا ہے وہ بہت سوچ سمجھ کر ہو رہا ہے۔" وہ بالکل مطمئن تھی۔ بجل خاموش ہو کر رہ گئی۔ اگلے دو گھنٹوں کے دوران زمین اور عباد روشہ ازدواج میں منسلک ہو چکے تھے۔ بجل اور رانا کے علاوہ عباد کے چند ایک دوست موجود تھے اور بس۔

ابا کی لاڈلی نے آج ان کے ہر لاڈ، ہر اعتبار اور ہر مان کو اسی دلیز پہ چھوڑ دیا تھا۔ یہاں صرف دولت کی بھوکی اور اچھی زندگی کا خواب دیکھنے والی زمین آئی تھی جس نے جو چاہا، وہ پالیا تھا چاہے غلط طریقے سے ہی سہی۔ عباد کا چہرہ بھی سرشاری کی چمک سے جگمگا رہا تھا۔

☆☆☆

میرب کو ساتھ لیے وہ ٹیرس پہ آگئی۔ موسم بہت اچھا ہو رہا تھا۔ کچھ اماں اور طوبیٰ سے ملنے آنے کی خوشی اور کچھ ابا سے متوقع ملاقات اور معاف کر دیے جانے کی بندھنے والی امید نے حریم کو ان دنوں سرشار سا کر رکھا تھا۔ موسم اس کے دل پر اثر کرنے لگے تھے۔ میرب کے ساتھ چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے اس کے ساتھ پکڑن پکڑائی کھیلتے اس نے گاڑی کے ہارن کی آواز سنی۔ چوکیدار گیٹ کھول رہا تھا۔

"پاپا..... پاپا....."

میرب ریلنگ کی طرف لپکی، گاڑی کے ہارن سے وہ اچھی طرح واقف تھی۔ حریم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ بھی میرب کے پیچھے آکھڑی ہوئی لیکن اس طرح کہ میچے سے اس پر کسی کی نظر نہ پڑ سکے۔

وہ گاڑی سے اتر رہا تھا سیاہ گلاسز بالوں پہ چڑھا تا وہ اپنا لپ ٹاپ بیگ نکال رہا تھا اور..... حریم نے تھوڑا اچک کر تعجب سے دیکھا۔ دوسری طرف سے مارہ گاڑی سے اتر کر آئی تھی اور مسکراتے ہوئے کچھ کہہ رہی تھی جو ابا وہ بھی مسکرا دیا۔ مارہ نے ہاتھ اس کی طرف بڑھایا جسے اس نے گرم جوشی سے تھام لیا وہ دونوں یونہی ہاتھوں میں ہاتھ دیے اندر کی طرف چل دیے۔

"پاپا..... پاپا....." میرب کی آواز لان کی فضا میں لہرائی تو ان دونوں نے بے اختیار ادھر دیکھا۔ میرب کی کلکاریاں گونج رہی تھیں لیکن وہ میرب کے پیچھے سے جھانکتی دو شکوہ کناں آنکھوں کو دیکھ رہا تھا جو انہیں اوپر دیکھتے



”او۔ بابا کی جان۔“ اس نے جھک کر میرب کو اٹھایا اور اس کا رخسار چوم لیا۔

”پاپا کی جان تو ساتھ ہی آئی تھی... کہاں ہے وہ دکھائی نہیں دے رہی؟“

"جاؤ میرو! پاپا چاکلیٹ لائے ہیں۔ شریا ماسی سے بولو وہ دیتی ہیں آپ کو۔" میرب کو جھک کر نیچے اتار تو وہ ننھے قدموں سے باہر کی طرف بھاگی۔

"ہمم..... تو کیا طنز کے تیر چلائے جا رہے ہیں؟" اب وہ حرم کی طرف متوجہ تھا۔

"طنز کیا ہے اس میں۔" حریم نے شانے اچکائے اور کڑوے لہجے میں بولی۔

”تمہاری غیاشی سامنے ہے میرے..... میرا رشتہ تڑوا کر مجھ سے زبردستی شادی کر لی اور پہلو میں سابقہ معیتر بھی رکھی ہوئی ہے۔ بہت خوب۔ اچھی گیم کھیل رہے ہو۔“

اس نے اب کی بار بہت دھیان سے حریم کے تاثرات اور لہجہ ملاحظہ کیا تھا۔

”تم بتاؤ۔ بسنا چاہتی ہو میرے ساتھ تو یہ جگہ خالی بھی ہو سکتی ہے تمہارے لیے۔ تمہاری خواہش کی خاطر۔“ اس کی طرف دو قدم بڑھا کر درمیانی فاصلہ مٹاتے ہوئے وہ سنجیدگی سے بولا تو اس کےلبوس سے اٹھتی خوشبو نے لمحہ بھر میں ہی حریم کی سانس تک ساکن کر دی۔

”بولو۔۔۔ خطر ہوں میں تمہاری ہاں کا۔“

کمرے کی فضا میں معنی خیزی خاموشی کا راج تھا۔

”بسا؟ اجڑنے والوں سے بنے کا پوچھتے ہیں۔ گناہ ملے گا کہ اجاڑنے والے بھی تو تم ہی ہو۔“ حریم شفر سے کہتی پلٹی مگر اس کا ہاتھ تمام کردہ زبردستی اسے روک گیا۔

”بیوی بنی ہو، ماں بنی ہو..... حقیقت کو سمجھو گی تو بس جاؤ گی حُریم۔“ سنجیدگی سے کہا۔

”اڑنا یا بسا دل سے ہوا کرتا ہے۔ محض نام سے نہیں..... لیکن تم جیسے دولت مند کیا جانیں، دولت سے سب کچھ خریدا جاسکتا ہے فیملی کو نہیں خریدی جاسکتیں۔“

”خریدی نہیں جاسکتیں۔۔۔ پیدا تو کی جاسکتی ہیں نا۔“ اس کا ہاتھ حریم کی ہتھیلی کے عین وسط میں آن ٹھہرا تھا۔  
حریم نے کرنٹ کھا کر اس کی طرف دیکھا، وہ غنظرنگا ہوں سے اسی کو دیکھ رہا تھا۔ حریم کا دل دھک دھک کرنے لگا۔  
اسی وقت دھڑام سے دروازہ کھلا تھا۔

”وااا..... بہت خوب..... مجھے ساتھ لا کر خود تم کمرے میں گھسے ہوئے ہو..... چلو جلدی سے اب..... پھپھو کو ختم کر کے تیار کیا ہے میں نے..... اس سے پہلے کہ یہ خوب صورت موسم بھاگ جائے لانگ ڈرائیو ہو جائے..... میرب بھی پھپھو کے پاس ہی ہے۔“ مارہ نے بڑی سہولت کے ساتھ اس کا ہاتھ حرم کے ہاتھ سے چھڑا لیا تھا اور افراتفری مچاتے ہوئے اسے بڑے تاز سے کھینچ کر کمرے سے باہر لے گئی۔ حرم ایک ٹرانس کی کیفیت میں کھڑی اپنی خالی ہتھیلی کو بس دیکھتی رہ گئی جہاں ایک انجانا سا کس سر سر رہا تھا۔

☆☆

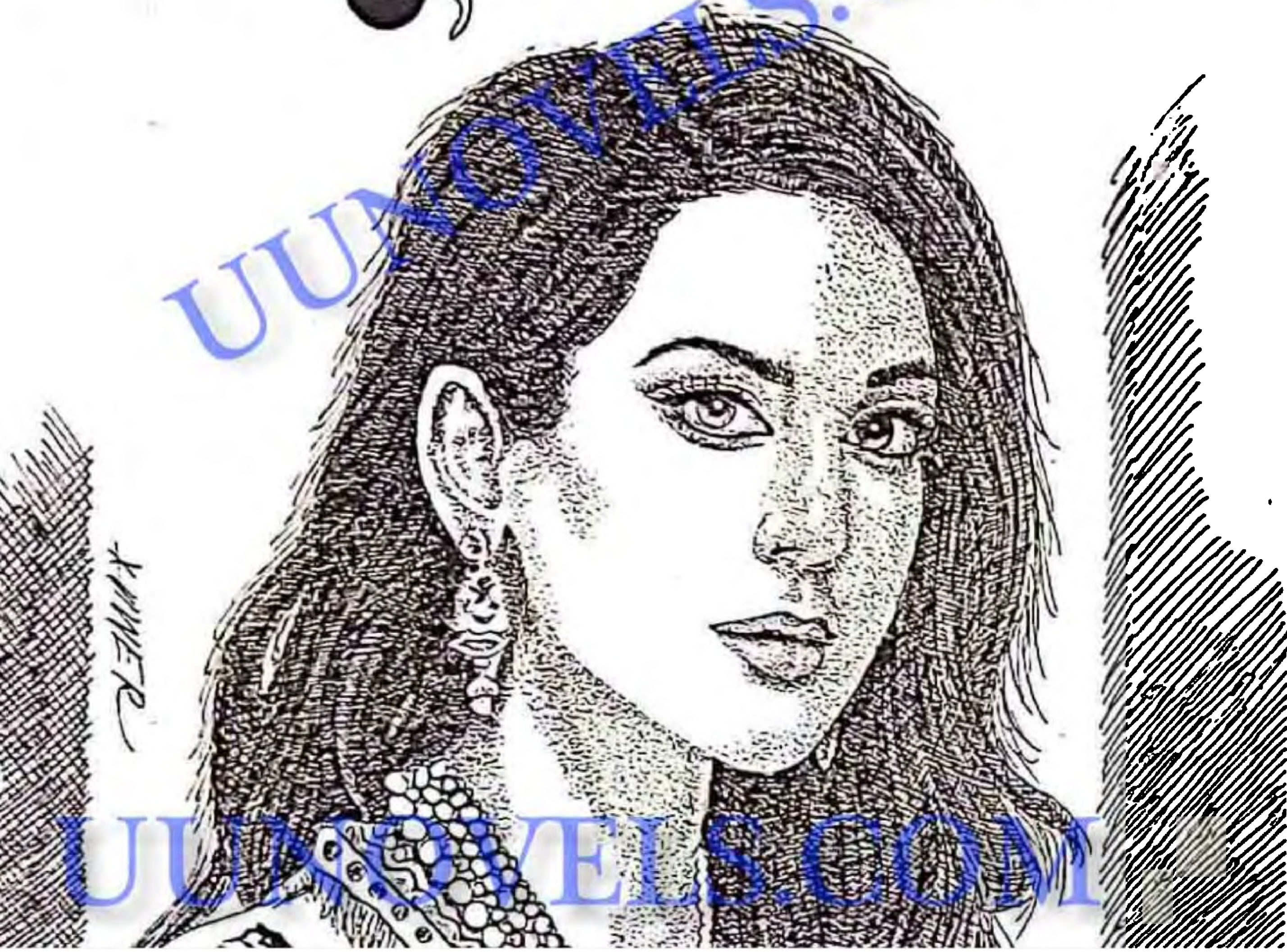
باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ



قرۃ العین خرم ہاشمی

اندر کاشیہ

”کب سے کال کر رہی ہوں۔ تم کہاں تھیں؟“  
عروج نے شہلا کے فون اٹھاتے ہی سلام دعا  
کیے بغیر پوچھا تو شہلا گہری سانس لے کر رہ گئی۔  
”جہنم میں۔“ شہلا نے چڑ کر کہا۔  
”سسرال کو جہنم کہہ رہی ہوتاں؟“ عروج نے





ہوتی ہے۔ گھر والوں کی صحت اور تندرستی کا انحصار ایک عورت کے سلیقے اور گھر گرہستی پر ہوتا ہے اور.....“ شہلانے کہتے ہوئے توقف کیا۔  
”اف تم ایسے فضول لیکچرس کیسے لیتی ہو؟“  
عروج نے ٹوکتے ہوئے کہا۔

”تو اور کیا کروں۔ ہر وقت روک ٹوک، پابندی، اپنی مرضی سے تو کچھ کر ہی نہیں سکتے ہیں۔ کبھی کوئی تند آ رہی ہے کبھی کوئی رشتے دار۔ حد ہے۔“ شہلانے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

”تو اور کیا سسرال ہوتے ہی ایسے ہیں۔ میں تو اسی وجہ سے شادی کے فوراً بعد الگ ہو گئی تھی۔ اب تو سکون ہی سکون ہے۔“  
عروج نے فخریہ انداز میں کہا۔

”تمہاری قسمت ہمیشہ سے مجھ سے اچھی رہی ہے۔“ شہلانے حسرت بھرے انداز میں کہا۔  
”خیر قسمت تو تمہاری بھی بہت تیز ہے۔ بس تمہاری عقل ذرا کم ہے۔“ عروج نے کہا۔

”اچھا وہ کیسے؟“ شہلانے حیرت سے پوچھا۔  
”میری ارنج میرج تھی اور پھر بھی میں سسرال سے الگ ہو گئی جبکہ تمہاری تو محبت کی شادی ہے۔ تم کیوں نہیں فیصل کو ہینڈل کر سکتیں۔“

عروج نے کہا تو شہلا سوچ میں پڑ گئی۔  
”ہاں۔ بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔ آج کل ویسے بھی دونوں بھائیوں میں کاروبار کو لے کر کافی لڑائی چل رہی ہے۔“

شہلانے پرسوج انداز میں کہا۔  
”بس پھر تم آج سے ہی کمر کس کے میدان میں اترو۔ فیصل کو پیار اور محبت سے سمجھاؤ کہ الگ ہونے میں ہی بہتری ہے۔“

عروج نے اپنے سے تین سال چھوٹی بہن کوئی راہ دکھاتے ہوئے کہا۔ شہلانے جلدی سے سر ہلایا اور پھر عروج کے کہنے کے مطابق عمل کرنے لگی۔

شہلا کے سسرال میں سانس سر، دو بیابا

مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔  
”تو اور کیا۔“ شہلانے ناگواری سے کہا۔  
”او..... ویسے آج کیا نیا ہو گیا؟“ عروج نے ہمدردی سے سوال کیا۔

”ہونا کیا ہے؟ ساس صاحبہ عجیب وہ غریب سبزیاں منگوا لیتی ہیں پھر سارا دن لگا کر ان کے ساتھ کاٹو، بناؤ، دھو کر ابال کر رکھو۔ اف تنگ آ جاتی ہوں میں یہ سب دیکھ کر۔“ شہلانے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی میٹھی اور پالک کاٹ کر آئی تھی۔

”پھر یہ اعتراض بھی کہ سبزی ایسے نہیں کاٹنی، ویسی کاٹو۔ حد ہے اب کیا سارا وقت ان ہی چیزوں پر لگا میں۔“ شہلانے چڑ کر کہا۔

”یار تم کیوں ان فضول کے جھنجھٹ میں پڑی ہوئی ہو۔ کھانا آرڈر کر لیا کرو۔“ عروج نے مسئلے کا حل بتایا۔

”اف کیا یاد دلا دیا۔ تمہارے ہی کہنے پر، شروع شروع میں اکثر فیصل سے فرمائش کر کے کچھ منگوا لیتی تھی۔ صرف اپنے لیے نہیں، ساس، سر کے لیے بھی۔ جیٹھانی کا پوریشن تو پہلے ہی الگ ہے۔ سوچا اس طرح کھانا بکاتا بھی نہیں پڑے گا اور سانس خوش بھی ہو جائیں گی مگر.....“ شہلا گہری سانس لے کر رہ گئی۔

”مگر کیا؟“ عروج نے دلچسپی سے سوال کیا۔

”ایک دن ساس صاحبہ نے مجھے اپنے پاس بٹھایا اور پیار سے سمجھانے لگیں کہ مرد اتنی محنت اور مشقت اس لیے کرتا ہے کہ اسے گھر کا سکون ملے اور گھر تب ہی آباد اور پرسکون ہوتے ہیں جب ہر کوئی اپنی اپنی ذمہ داری کو ایمان داری سے نبھائے۔ چلو

کبھی کبھار تو آؤ تنگ کرنے میں کوئی برائی نہیں مگر یہ کیا کہ ایک عورت کا کچن ہی خالی پڑا رہے۔ اس میں کوئی پہچل نہ ہو۔ عورت جب گرمی اور سردی میں اپنے گھر والوں کے لیے کھانا بناتی ہے تو یہ بھی نیکی میں شمار ہوتا ہے۔ اس سے گھروں میں برکت پیدا



”بازار جانا تب ہی اچھا لگتا ہے جب جیب میں پیسے ہوں۔ شفتنگ کی وجہ سے ہاتھ تنگ ہے۔“ شہلانے کہا۔

”تنگ نہیں ہے۔ فیصل بس جان بوجھ کر تمہیں تنگ رکھ رہا ہے۔ کاروبار میں سے اچھا بھلا پیسہ ملا ہو گا۔ یہ تو مت کہو۔“

عروج نے مذاق اڑایا تو شہلا چوٹ مگنی۔ ”فیصل جھوٹ کیوں بولیں گے؟“ شہلانے حیرانی سے کہا۔

”ہر شوہر بولتا ہے۔ مگر سمجھ دار بیوی اس کا جھوٹ پکڑ لیتی ہے۔“ عروج کے کہنے پر شہلا سر ہلا کر رہ گئی۔

”تم آج کیا بناؤ گی؟“ شہلانے موضوع بدلا تھا۔

”میں.....؟ کچھ نہیں۔ مجھ سے نہیں ہوتے کچن کے کام۔ یہ کیا کہ ہر دقت چولہے کے سامنے کھڑے رہو۔ گرمی ہو یا سردی۔“ عروج نے منہ بنا کر کہا۔

”پھر؟“ شہلانے حیرت سے سوال کیا۔ ”پھر کیا۔ فون کروں گی تو سب گھر حاضر۔ ہم صرف چار لوگ ہی تو ہیں۔ دو میاں بیوی اور دو بچے۔ ہمارا کون سا اتنا خرچا ہوگا۔“ عروج نے شہلا کوئی راہ دکھائی تھی۔

”ہاں۔ یہ تو بہت اچھا آئیڈیا ہے۔ ہم بھی صرف دو لوگ ہیں۔ بازار سے منگوانا بہترین آپشن ہے۔“

شہلانے ہمیشہ کی طرح بغیر سوچے سمجھے عروج کی تقلید کرنے کی ٹھانی تھی۔ ”اگر ایسا ہے تو پھر جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ میں آرہی ہوں۔“

عروج نے کہا تو شہلا نے سر ہلا دیا۔ پھر وہ ساری سبزیاں اسی طرح چھوڑ کر عروج کے ساتھ بازار چلی گئی۔ شام کو تھکی ہاری گھر آئی تو آتے ہی

نندو لڑکھڑکھ جیٹھانی اور ان کے تین بچے تھے۔ نندیں بھی بھی میکے آتیں۔ جس پر بھی شہلا کو اعتراض رہتا۔ جیٹھانی ویسے تو اچھی تھیں مگر شہلا کے ساتھ جیٹھانی، دیورانی والا رشتہ رکھ کر ہی چلتی تھیں۔ دونوں میں ایک مقابلے کی فضا قائم تھی۔ دونوں بھائیوں میں کاروبار کو لے کر آئے روز جھگڑا ہونے لگا جس کا فائدہ شہلانے اٹھایا تو فیصل کو بھڑکا کر الگ ہونے کا مشورہ دیا۔ فیصل نے بھی بیوی کی بات کو درست سمجھتے ہوئے کاروبار اور گھر میں سے اپنے حصے کا مطالبہ کر دیا۔

بہت بحث مباحثے، لڑائی جھگڑے کے بعد بالآخر فیصل الگ ہو گیا۔ تب شہلانے سکون کا سانس لیا۔ یہ ہی اس کی خواہش تھی۔ شہلا کو اپنی خوشی میں کسی کے آنسو اور دکھی دل نظر نہیں آتے تھے۔ خود غرضی کی گرد میں احساس کے بہت سے رنگ چھپ جاتے ہیں مگر جب یہ گرد بٹھکتی ہے تو پچھتاوے کی دھوپ، خوشی کے سب رنگوں کو پھیکا کر دیتی ہے مگر دھوپ میں جلنے سے پہلے یہ کوئی نہیں سوچتا۔

☆☆☆

”کیا کر رہی ہو؟“ فیصل کے آفس جانے کے بعد، ناشتہ کر کے شہلا فارغ ہی ہوئی تھی کہ عروج کا فون آ گیا۔

”سبزی بنانے کا سوچ رہی ہوں۔ کل اتوار تھا تو فیصل کالی سبزیاں لے آئے۔ اب ان کو ہی سنبھال رہی ہوں۔ سمجھ لو کہ آج کا سارا دن اسی میں نکل جائے گا۔“

شہلانے کاؤنٹر پر رکھے سبزی کے ڈھیر کی طرف دیکھ کر کہا۔ اسے میٹھی بنانے سے سخت الجھن ہوتی تھی اور فیصل کو میٹھی آلو بہت پسند تھے۔ ”یعنی آج کا سارا دن اس میں نکال دو گی۔“

میرا تو پروگرام تھا کہ بازار چلتے ہیں۔ گھوم پھر بھی لیں گے اور کچھ مزے کا کھا بھی لیں گے۔“ عروج نے چٹخارہ لیتے ہوئے کہا۔



فیصل کو سبج کر دیا۔

”پلیز۔ آج کچھ لے آنا۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

فیصل رات کو تھکا ہارا گھر آیا تو کھانا بھی پیک کروا کے لے آیا تھا۔ شہلا نے عروج کی عقل مندی کی داو دی اور اب اسی طریقے پر چلنے کا ارادہ کر لیا۔

☆☆☆

”یہ کیا ہے؟“ فیصل نے حیرانی سے ڈش میں موجود چیز کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”آپ کی پسندیدہ سبزی ہے۔“ شہلا نے مسکرا کر کہا۔

”یہ اس کی شکل کیسی ہے؟“ فیصل نے حیرت سے سوال کیا۔

”کیا ہوا شکل کو؟ آپ کھانا کھائیں، خرامت کریں۔“

شہلا نے کہا تو فیصل نے خاموشی سے کھانا پلیٹ میں نکالا۔ پہلا نوالہ لیتے ہی اس کے منہ کے زاویے بگڑ گئے۔

”یہ تم نے بنایا ہے؟“ فیصل نے شہلا کو گھورتے ہوئے سوال کیا تو شہلا نے نفی میں سر ہلایا۔

”آن لائن آرڈر کیا ہے۔“ شہلا نے سر جھکا کر اعتراف کیا۔

”کیوں؟“ فیصل نے کڑے تیوروں سے سوال کیا۔

”اس میں کیا برائی ہے؟ آج کل سب کھانا گھر آرڈر کروا لیتے ہیں۔“

شہلا نے لا پرواہی سے کہا۔  
”مگر ہمارے گھر میں ایسا نہیں ہوتا۔ ہمارے گھر میں خواتین ہی کچن سنبھالتی ہیں۔“ فیصل نے سنجیدگی سے کہا۔

”وہ سب پرانے زمانے کی باتیں ہیں۔ مجھ سے نہیں پکتے کھانے۔ دیے بھی ہم دو میاں بیوی ہی

تو ہیں۔ روز روز کیا پکاتا۔“

شہلا نے لا پرواہی سے کہا تو فیصل روٹی اڈھوری چھوڑ کر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

”سوری۔ مگر یہ سب نہیں کھا سکتا۔“

فیصل نے کہا اور غصے سے قدم اٹھاتا کچن میں چلا گیا۔ چائے کا پانی چوبے پر رکھ کر، دودھ لینے کے لیے جیسے ہی اس نے فریج کھولا اس کی نظر دروازے کے پاس رکھی کچرے کی ٹوکری پر پڑی اور اس نے ہونٹ چیخ لیے۔ اس کی محنت سے لائی ساری سبزی گل سڑ کر کچرے میں پڑی ہوئی تھی۔ اس وقت شہلا بھی کچن میں چلی آئی۔ فیصل نے سخت نظروں سے اسے گھورا۔ شہلا کندھے اچکا کر رہ گئی۔

”تم جانتی ہو کہ کتنی مہنگائی ہے اور تم اس طرح سبزیاں ضائع کر رہی ہو۔“

فیصل نے ناگواری سے کہا تو شہلا نے پلٹ کر کچرے کی ٹوکری کی طرف دیکھا۔

”آئندہ مت لانا۔“ شہلا نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔

”تم بہت بے حس اور جاہل عورت ہو۔ جسے کسی چیز کا احساس نہیں ہے۔ صرف اپنی خوشی، اپنے سکون کی پرواہ ہے۔“

فیصل جو پہلے ہی تھکا ہارا اور خالی پیٹ تھا، شہلا کی ہٹ دھرمی دیکھ کر ایک دم ہی بھٹ پڑا۔

”چینجومت۔ بیوی ہوں، زر خرید غلام نہیں۔“ شہلا نے بھی اسی کے لہجے میں چیخ کر جواب دیا۔

دونوں کی بحث بڑھتے بڑھتے نوبت یہاں تک آ گئی کہ دونوں ایک دوسرے پر چیختے ہوئے یہ بھی بھول گئے کہ آس پاس کے فلیٹس میں آواز جا رہی تھی۔ فیصل غصے میں جا کر کمرے میں بند ہو گیا۔ شہلا نے روتے ہوئے اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا اور فیصل کو بتائے بغیر چند جوڑے بنک میں رکھے اور گھر سے چلی گئی۔ جب فیصل کو اس کے گھر سے جانے کا پتا چلا تو غصے سے اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔



”میں دوبارہ تمہاری شکل بھی نہیں دیکھوں گا۔“ فیصل نے جلدی سے شہلا کے موبائل پر سرج ٹائپ کر کے بھیجا۔

”میں بھی۔ اپنی شکل دکھانا بھی نہیں چاہتی، تم ایک جاہل مرد ہو۔“ شہلا نے بھی حساب برابر کیا۔  
”لغت ہے میرے انتخاب اور محبت پر۔“  
فیصل نے نفرت سے کہا۔ تو سچ بڑھ کر شہلا ساکت رہ گئی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ فیصل اس سے اتنا چڑچکا ہے۔ شہلا میکے پہنچی تو بہت گرم سمجھی۔ والدین اسے رات کو اکیلا آتے دیکھ کر ٹھنک گئے۔ بھائی اور بھابھی بھی حیران ہوئے۔ شہلا سب سے نظریں چراتے ہوئے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔

☆☆☆

”تمہارے کمرے میں کتنا سکون ہے۔“  
شہلا نے حیران نظروں سے ادھر ادھر گھوم پھر کے عروج کا گھر دیکھتے ہوئے کہا۔ عروج نے فخریہ انداز میں سر ہلایا۔

”سب یہ ہی کہتے ہیں۔“ عروج نے کہا تو شہلا سر ہلانے لگی۔ دونوں لاؤنج میں رکھے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ کچھ دیر تک دونوں بہنیں اپنی اپنی جگہ سوچ میں ڈوبی رہیں۔

”فیصل کا کوئی فون نہیں آیا۔“ عروج نے شہلا کے جھکے سر کو دیکھ کر سوال کیا۔ شہلا نے نفی میں سر ہلایا۔

”خود ہی عقل آجائے گی اسے۔“ عروج نے منہ بنا کر کہا۔

”بیس دن تو ہو گئے ہیں۔“  
شہلا نے افسردگی سے کہا۔ اسے بار بار فیصل کا خیال آ رہا تھا۔ مگر فیصل نے ایک بار بھی پلٹ کر اسے نہیں پکارا تھا۔

”ایک بات کہوں عروج۔“  
شہلا نے اصل ندعا کی طرف آتے ہوئے کہا تو عروج چونکی ہو گئی۔ اسے کچھ اندازہ تھا کہ شہلا اس کے پاس کیوں آئی ہے۔

”آں ہاں۔ کہو!“ عروج نے کہا۔  
”میں تمہارے پاس رہنے آ جاؤں؟“ شہلا نے امید بھری نگاہوں سے اسے دیکھا۔ عروج کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔  
”میرے پاس کیوں؟“ عروج نے گڑبڑا کر پوچھا۔

”میکے میں امی ابو کے ساتھ ساتھ بھائی اور بھابھی بھی بار بار سوال کرتے ہیں کہ واپس کب جاؤ گی۔ کبھی امی سمجھاتی ہیں، کبھی ابو۔ اب تو بھابھی عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگی ہیں۔ بس میرا وہاں دل گھبراتا ہے۔“ شہلا نے پریشانی سے کہا۔

”دیکھو شہلا۔ بات دراصل یہ ہے کہ تم چاہو تو ایک یا دو دن رہ لو مگر اس سے زیادہ نہیں۔ تم جانتی ہو کہ میری حالت کیا ہے۔ کچھ عرصے میں میرے بچے کی آمد متوقع ہے۔ میں زیادہ مہمان داری نہیں کر سکتی۔“

عروج نے صاف لفظوں میں کہا تو شہلا کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔  
”اچھا۔ میں چلتی ہوں۔“ شہلا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ارے آج مت جاؤ۔ پلیز رک جاؤ۔“  
عروج نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر منت کی تو نہ چاہتے ہوئے بھی شہلا رک گئی۔

عروج کو اپنی بات کی سنگینی کا احساس تھا اس لیے وہ شہلا کو روک رہی تھی۔ عروج دوپہر کو سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی تو شہلا عروج کے بچوں کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگی۔

بچوں کو بھوک لگی تو شہلا ان کے لیے چھس بنانے کچن میں چلی آئی۔ سمٹا ہوا صاف و شفاف کچن، جس میں کسی بھی طرح کا کوئی پھیلاوا نہیں نظر آ رہا تھا، شہلا کو عجیب ویران سا لگا۔ کینٹ میں مسالے کے سب ڈبے خالی، آٹا، چاول کوئی بھی چیز کچن میں نہیں تھی۔ خوب صورت گرا کری سے سجا امریکن اسٹائل کچن مگر پکانے والی کوئی چیز نہیں تھی۔



شہلا نے چند لمحوں میں کچن کا جائزہ لیا اور گہری سانس لے کر رہ گئی۔ اسے اپنا بھرا ہوا کچن شدت سے یاد آیا تھا۔

”خالہ۔ کیا آپ کو بھی ماما کی طرح کچھ بنانا نہیں آتا ہے؟“

دونوں بچوں نے کچن میں داخل ہو کر جب شہلا کو بھی قارغ کھڑے دیکھا تو حیرت سے سوال کیا۔

”مجھے سب کچھ بنانا آتا ہے مگر یہاں کچھ ہے ہی نہیں۔“ شہلا نے افسوس سے ادھر ادھر دیکھا۔

”بابا تو ماما سے کہتے ہیں بلکہ اکثر دونوں بہت لڑتے ہیں مگر ماما کہتی ہیں کہ انھیں کوئنگ اچھی نہیں لگتی ہے۔“

چھ اور سات سالہ بچوں نے افسردگی سے گھر کے اندر کی کہانی اسے سنائی تو شہلا افسوس سے سر ہلا کر رہ گئی۔ شہلا نے عروج کے کمرے میں جھانکا تو اسے گہری نیند میں دیکھ کر واپس پلٹ گئی۔ شہلا نے کچھ سوچ کر دونوں بچوں کو ساتھ لیا اور اسی کالونی میں موجود چھوٹی سی مارکیٹ میں سے پکانے کے لیے چند چیزیں لینے چلی گئی۔ گھر آ کر اس نے بچوں کو چھین بنا کر دیے تو وہ دونوں حیرت اور خوشی سے اچھلنے لگے۔ دونوں تمام وقت کچن میں شہلا کے ساتھ رہے اور اسے کام کرتا ہوا دیکھتے رہے۔

”خالہ! یہ تو بازار سے بھی زیادہ مزے کی چھین ہے۔“

بچوں نے خوشی سے کہا تو شہلا بھی خوشی سے کھل اٹھی۔ عروج جب سو کر اپنے کمرے سے باہر نکلی تو سارے گھر میں بریانی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

”تم میرے کچن میں کیا کر رہی ہو؟“ عروج نے حیرت اور ناگواری سے سوال کیا۔

”بچوں نے فرمائش کی تھی تو.....“ شہلا نے سلا دیتے ہوئے کہا۔

”تو مجھے بتائیں۔ میں کچھ آرڈر کر دیتی۔ اف تم نے میرا کچن کتنا گندا کر دیا ہے۔ یہ دیکھو یہ تیل گرا

ہوا ہے اور یہ داغ.....“

عروج ہر چیز اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگی۔ شہلا کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

”عروج بیگم۔ زندگی کے دستر خوان پر محبت اور خلوص کے ذائقے سے سجے پکوان قسمت والوں کو ہی ملتے ہیں۔ اپنی بہن کی قدر کر لو۔ ہمیں تو یہ نعمت شادی کے اتنے سالوں میں تو نصیب نہیں ہوئی۔“

عروج کے شوہر فرخ نے کچن کے دروازے پر کھڑے ہو کر طنزیہ انداز میں کہا۔ فرخ نچانے کس وقت آفس سے واپس آیا تھا۔ اس کی بات سن کر عروج کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک چار پا تھا۔ شہلا کے سامنے اس کی عزت دو کوڑی کی ہو کر رہ گئی تھی۔

”شہلا بہن! جلدی سے کھانا لگائیں۔ میں فریش ہو کر آتا ہوں۔“

فرخ نے بے تابی سے کہا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ شہلا نے ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگایا۔ فرخ اور بچوں نے بہت خوشی سے کھانا کھایا۔ عروج سر جھکائے شرمندہ بیٹھی رہی۔ شہلا کی نگاہوں کے سامنے سے بہت سے پردے ہٹ گئے تھے۔ کھانے کے بعد شہلا نے واپس جانے کی بات کی تو فرخ نے اسے گھر چھوڑنے کی آفر کر دی۔

”اچھا ہے، اس بہانے بچوں کی سیر بھی ہو جائے گی اور میں سب کو آئس کریم بھی کھلا دوں گا۔“

فرخ کا موڈ گھر کا کھانا کھا کر بہت خوش گوار ہو گیا تھا جسے عروج نے بھی محسوس کیا۔ فرخ نے گاڑی جب سڑک پر نکالی تو شہلا نے اسے فیصل کے گھر کا پتہ بتا کر وہاں ڈراپ کرنے کا کہا۔ عروج چونک گئی۔

ایک جگہ گاڑی روک کر فرخ بچوں کے ساتھ آئس کریم لینے گیا تو شہلا عروج سے مخاطب ہوئی۔

”امی نے مجھے بہت بار بتایا تھا کہ فرخ بھائی اور بچے تمہارے رویے کی وجہ سے خوش نہیں ہیں مگر میں نہیں مانی۔ کیسے مانتی جب تک خود اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیتی۔ تمہاری ہر بات کو سچ سمجھ کر میں نے ہمیشہ غلط قدم اٹھایا، غلط فیصلہ کیا۔ تمہاری تقلید کرنا، اندھے شیشے



کی طرح تھا جس سے زندگی کا کوئی منظر صاف نظر نہیں آتا۔ تمہارے کہنے پر میں نے اپنے سرال میں نا اتفاقی کا بیج بویا تو اس کا ثمر میرے آنکھن میں لگا کہ محبت کے نام پر شادی کرنے والے ہم میاں بیوی چند ماہ بھی اکٹھے نہیں رہ سکے اور ناراض ہو کر بیٹھ گئے۔ میں اپنے سرال دالوں کا دل دکھا کر، انھیں ذلیل کر کے آئی تھی، میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ سب کی نگاہوں میں گری بھی اور چھوٹی بھی بڑ گئی۔

مگر شکر ہے کہ مجھے بہت جلد عقل آگئی ہے۔ عروج ہم نہیں ہیں۔ ایک دوسرے کا عکس۔ ابھی بھی وقت ہے خود کو سنبھال لو۔ اپنے بچوں اور شوہر کی قدر کرو۔“

وہ تینوں واپس لوٹ آئے۔ ہنستے مسکراتے آئیں کریم کھا کر فرخ نے شہلا کو اس کے گھر کے باہر اتارا۔ شہلا نے دوسری منزل پر موجود اپنے فلیٹ کی بیل بجائی تو کچھ دیر کے بعد دروازہ کھلا۔ سامنے فیصل کھڑا تھا۔ دونوں چند لمحے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے پھر فیصل نے راستہ چھوڑ کر اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ شہلا اندر آئی تو فیصل نے دروازہ بند کر کے اس کی طرف دیکھا۔

”سوری۔“ دونوں نے بے ساختہ ہی ایک ساتھ کہا اور پھر بھیگی آنکھوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنس پڑے۔

”میں سب کچھ پہلے کی طرح درست کرنے کی کوشش کروں گی۔ مجھ سے بہت سی غلطیاں ہوئی ہیں مگر میں انھیں ٹھیک کرنے کا حوصلہ رکھتی ہوں اگر آپ میرا ساتھ دیں۔“ شہلا نے مضبوط لہجے میں کہا۔

”میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں شہلا۔ اپنے گھر دالوں سے الگ ہونے اور کاروبار میں مسلسل نقصان نے مجھے بہت چڑا دیا تھا اس لیے شاید میں تمہارے ساتھ بھی زیادتی کر گیا۔ میں کچھ دنوں میں سب گھر دالوں کے ساتھ سمجھیں لینے آ رہا تھا۔ مگر تم اس سے پہلے ہی واپس آگئی ہو۔“ فیصل نے خوشی سے کہا۔

”ہاں۔ اس لیے کہ میں مانتی ہوں کہ جب

اپنی زیادتی کا احساس ہو جائے تو اس کا ازالہ کرنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ چلیں آپ کے والدین سے ملنے چلتے ہیں۔ میں نے ان کا بھی بہت دل دکھایا ہے۔“ شہلا نے کہا تو فیصل مسکرا دیا۔

”مجھے یقین تھا کہ میری محبت، میرا انتخاب کبھی مجھے شرمندہ نہیں ہونے دے گا۔“

فیصل نے کہا تو شہلا بے اختیار اس کے بازو پر سر ٹکا کر رو پڑی۔

”اس یقین کو حاصل کرنے کے لیے مجھے سچائی کے بہت سے آئینے دیکھنے پڑے۔ جن میں اپنا آپ بہت بد صورت لگا۔“

شہلا نے روتے ہوئے کہا۔

”مگر محبت ہر رشتے کو خود صورت بنا دیتی ہے۔“ فیصل نے یقین سے کہا تھا۔ شہلا نے دل سے تسلیم کیا۔

☆☆☆

”آج کافی دنوں کے بعد فون کیا ہے؟“ شہلا نے ہنستے ہوئے عروج سے کہا۔

”اف کیا کروں۔ تین تین بچوں کے ساتھ وقت کہاں ملتا ہے۔ تمہارے تو مزے ہیں سرال میں اتنے لوگ ہیں تمہارے بچے کو سنبھالنے کے لیے۔“ عروج نے مسکرا کر کہا تو شہلا نے سامنے بیٹھی اپنی ساس کو دیکھا جنہوں نے دو ماہ کے زیشان کو گود میں اٹھایا ہوا تھا۔

”ہاں۔ ایک صحیح فیصلے نے زندگی میں سب کچھ ٹھیک کر دیا۔“ شہلا نے اطمینان سے کہا۔

”اچھا یہ بتاؤ کہ نہاری کیسے بنائی ہو؟ تمہاری نہاری میرے بچوں اور فرخ کو بہت پسند ہے۔ کل تمہارے طریقے سے پرانی بنائی تھی بہترین بنی اور.....“ عروج کہہ رہی تھی۔ شہلا ہنستے ہوئے اسے نہاری بنانے کی ترکیب بتانے لگی۔

اب زندگی دونوں طرف مسکراتی تھی۔ غلطی کا احساس ہو جائے تو کسی بھی موڑ پر واپس پلٹا جاسکتا ہے۔



## نمرہ احمد



### اٹھائیسویں قسط

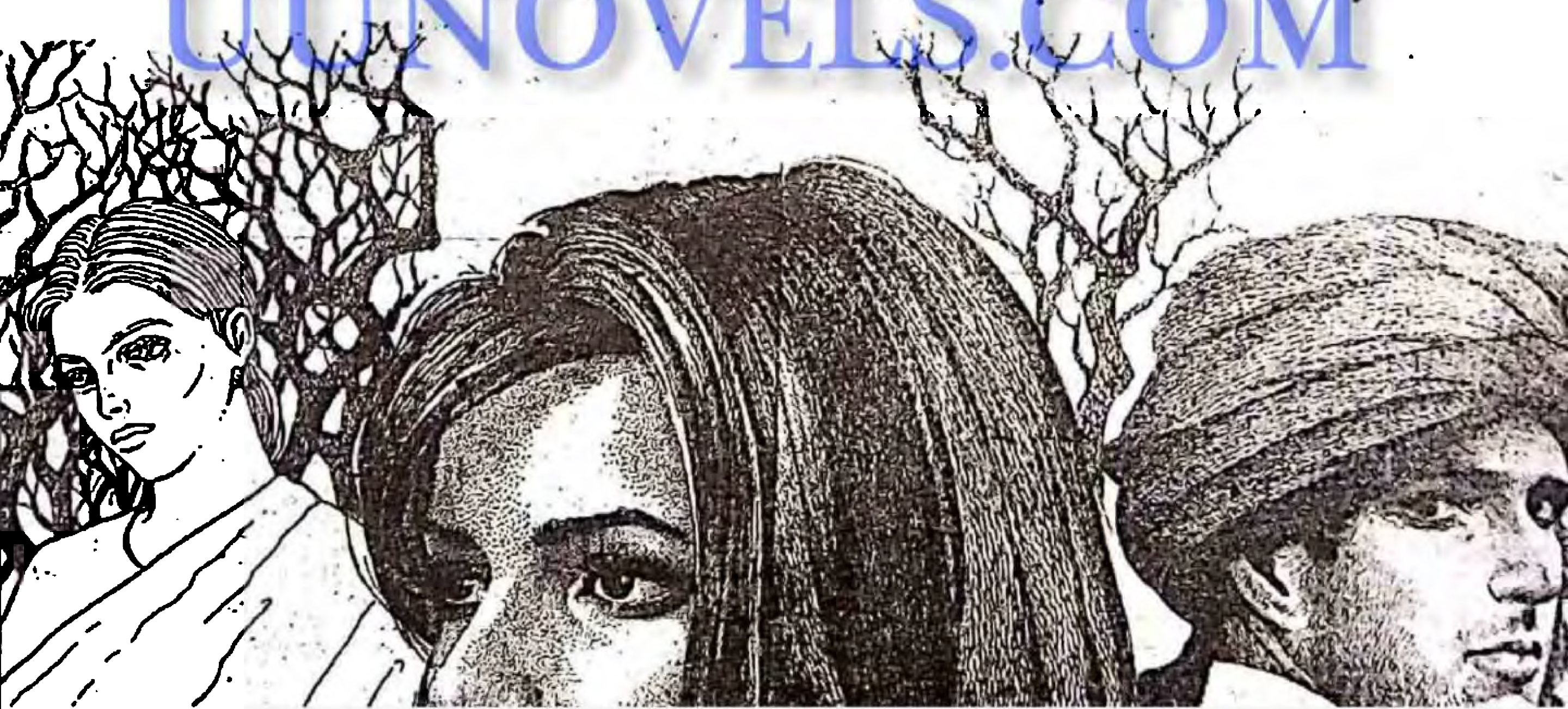
نہ اٹھی۔

”آپ کی ہدایت کے مطابق ایڈم بن محمد کو میں نے بلوالیا تھا۔ وہ اندر آپ کا انتظار کر رہا ہے۔“  
فاح نے سر کو خفیف سی جنبش دی اور آگے بڑھ گیا۔

ایڈم اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ مرجھایا ہوا لگتا تھا۔  
فاح گھوم کے میز کے پیچھے آیا اور اپنی اونچی کرسی پر بیٹھتے ہوئے تشویش سے اسے دیکھا۔  
”تمہیں معلوم ہے وہ کہاں ہے؟“ سارے سوال جواب بس ایک ہی انسان کے پارے میں ہو سکتے تھے۔ نام لینے کی بھی ضرورت نہیں تھی

بی این کے آفس میں اس روز معمول کے کام جاری تھے۔ ایسے میں لفٹ کے دروازے کھلے اور وان فاح نکلتا دکھائی دیا تو اس کے ماتھے کے بل واضح تھے اور وہ شدید ناخوش لگتا تھا۔ گرے سوٹ میں ملبوس وہ بظاہر معمول کے کاموں کے لیے تیار لگ رہا تھا مگر اس کا موڈ خراب معلوم ہوتا تھا۔ آج پھر راستے میں اس کو رپورٹرز نے روک کے سوالوں کی بوچھاڑ کی بھی اور یہ سوال اب اذیت دینے لگے تھے۔

وہ اپنے آفس کے قریب پہنچا تو سیکرٹری فوراً





آواز دھبی کی۔ انگلیوں سے نیٹھی دبائی۔ ”وہ اپنا دفاع نہیں کر رہی اور لوگ اس کا میڈیا ٹرائل کیے جا رہے ہیں۔ اسے اپنے لیے لڑنا ہوگا۔ اس سب کو قیس کرنا ہوگا۔“

”بے تالیہ..... خوف زدہ ہیں۔“ ایڈم نے توڑ توڑ کے دہرایا۔

وان فاتح چند لمحے کے لیے اسے دیکھتا رہا۔ پھر لب ہلائے۔

”اپنی بے تالیہ سے کہو.... وہ واپس آجائے۔“ وقت چند صدیاں پیچھے چلا گیا تھا۔ وہ دونوں جائے خانے میں موجود تھے اور سفید کرتے والا غلام فاتح ماتھے پہ بل ڈال لے کھڑا تھا۔

”اپنی شہزادی کو کہو سلطان سے دور رہے۔“ ”تمہاری اس سے ملاقات ہو.... (فاتح کی آواز اسے ماضی سے کھینچ لائی۔ وہ سنبل کے سننے لگا).... بارابطہ ہو تو.... اس کو کہو کہ وہ گرفتاری دے دے۔ اگر وہ یوں چھپ کے بیٹھ جائے گی تو میں اس کی کوئی مدد نہیں کر پاؤں گا۔“

”وہ رابطہ نہیں کریں گی۔ وہ کوئی رسک نہیں لیں گی۔“

”تو تم اس سے رابطہ کرو۔ کوئی طریقہ تو ہوگا اسے ڈھونڈنے کا۔“

”سزا داتن سے رابطہ کریں گی۔ ان دونوں کے پاس ایک دوسرے تک پہنچنے کے طریقے ہوں گے۔ مگر مجھے انہوں نے کبھی نہیں بتایا کہ اگر وہ کھو جائیں تو انہیں کیسے ڈھونڈنا ہے۔ اگر مجھے پتا ہوتا تو میں ان کو تب بھی ڈھونڈ لیتا جب وہ پولیس کی قید میں تھیں۔“

”ایڈم۔“ وہ آگے کو جھکا اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”میں تالیہ کو ایسے نہیں جانتا جیسے تم جانتے ہو۔ ہمارے تعلق میں کچھ چیزیں سنگ ہیں۔ جیسے کھو گئی ہوں۔“ وہ کہتے کہتے چپ ہوا۔ کچھ تھا جو بات بے بات کھو جانے کا احساس دلاتا تھا۔ ”میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں ایسی زندگی کا تصور نہیں

”نہیں۔“ ایڈم نے فکر مندی سے نفی میں سر ہلایا۔ وہ جینز اور سفید شرٹ کے اوپر سیاہ کوٹ پہنے ہال جیل سے پیچھے کیے شاید کام کے لیے تیار ہوا تھا مگر فاتح کی کال نے اسے کام چھوڑ کے ادھر آنے پہ مجبور کیا تھا۔

”اور لیانہ صابری؟“ فاتح مٹھیاں باہم ملائے میز پر آگے ہو کے سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

”وہ ملک سے فرار ہو چکی ہیں۔ مجھے ان کی میل آئی تھی۔ سکیورٹی خدشات کے باعث اب ہم رابطہ نہیں کر سکتے۔ بے تالیہ کے بارے میں انہوں نے کچھ نہیں بتایا۔“ ایڈم رکا۔

”کیا آپ سے بھی بے تالیہ نے رابطہ نہیں کیا؟“ اس کے انداز میں جھجک تھی مگر یقین بھی تھا۔ ”وہ گھر آئی تھی۔“ فاتح پیچھے کو ہوا اور گہری سانس لی۔ پھر ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی۔

”کب؟“ ایڈم چونکا۔ وہ مختصر الفاظ میں بتاتا گیا۔

”اس وقت عصرہ کی میت سامنے تھی اور سب اس پہ شک کر رہے تھے۔ اگر وہ میری چھت پھلانگ کے داخل ہوتی دکھائی دیتی تو مجرم لگتی۔ اس کا وہاں سے بھاگ جانا ہی بہتر تھا۔ مگر.....“ وہ ناخوشی سے کہہ رہا تھا۔ ”مگر وہ صبح واپس آ سکتی تھی۔ اس کو چاہیے کہ وہ منظر عام پہ آجائے اور اپنی صفائی دے۔“

”وہ ایک دفعہ پولیس کی قید میں رہ چکی ہیں۔ وہ خوف زدہ ہیں۔“

”اس کا یوں بھاگنا اس کو مزید مجرم بنا رہا ہے ایڈم۔“ وہ غصے سے بلند آواز میں بولا۔

”وہ..... خوف زدہ ہیں سر!“ ایڈم نے بھی آواز اتنی ہی اونچی کی۔

چند لمحے کے لیے آفس میں تناؤ بھری خاموشی جائل ہو گئی۔ پھر فاتح نے بے بسی سے کندھے اچکائے۔

”میں اس کے لیے پریشان ہوں ایڈم۔“



کر سکا جس میں وہ نہ ہو۔ وہ میرے لیے بہت اہم ہے۔ مگر تم.....“

اس نے ابرو اٹھا کر زور دے کر کہا۔ ”تم اس کو زیادہ جانتے ہو اور جو تم جانتے ہو وہ ہمیشہ تمہاری مدد کرتا ہے۔“

اس بات پر ایڈم بن محمد مسکرا دیا۔ بہت کچھ یاد آیا تھا جو ان فائغ کو یاد نہیں آتا تھا۔

”اس کو ڈھونڈو اور اس سے کہو کہ وہ مجھ سے ملے۔“ کیا آپ ان کے خوف دور کر پائیں گے؟“

”میں کوشش کرنا چاہتا ہوں۔“

چند لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی۔ پھر ایڈم نے سر ہلایا اور ایک فائل میز پر رکھی۔ مگر اسے کھولا نہیں۔ اس پر ہاتھ رکھے رکھے وہ پوچھنے لگا۔

”آپ کے بچے.... وہ ٹھیک ہیں سر؟“

”کیسے ہو سکتے ہیں؟ اس ماحول میں جہاں بی

وی پہ بار بار ان کی ماں کے قتل کی باتیں دہرائی جاتی ہیں۔“

”آپ کو انہیں اس ماحول سے دور کرنا ہوگا۔“

”اشعر بھی یہی کہہ رہا ہے کہ ہم بچوں کو کچھ

عرصے کے لیے عصرہ کی کزن کے پاس امریکہ بھیج

دیں۔ میرے لیے یہ ایک بہت مشکل فیصلہ ہوگا“ مگر

پھر.....“ گہری سانس لی۔ ”کسی نے وعدہ نہیں کیا تھا

کہ زندگی آسان ہوگی۔“

پھر اس نے قلم اٹھایا اور ایک کاغذ پر پتا لکھا۔

”یہ آدمی ذوالکفلی..... ملا کہ میں رہتا ہے۔“

شاید یہ تالیہ کے بارے میں کچھ جانتا ہو۔“

ایڈم نے چٹ جیب میں رکھ لی مگر اٹھا نہیں۔

چند لمحے سوچتا رہا۔ فائغ نے بے اختیار گھڑی کو

دیکھا۔ ”کچھ اور؟“

”میں نے بچے تالیہ کو چار دن دیے تھے کہ وہ

اس آف شور کمپنی کیس میں آپ کی بے گناہی ثابت

کر دیں۔“

فائغ نے بے زاری سے سر جھٹکا۔ ”میں بتا چکا

ہوں میری کوئی آف شور کمپنی نہیں ہے۔“

”وہ چار دن کل تمام ہو گئے تھے۔“ وہ سننے بغیر

کہہ رہا تھا۔ ”آج مجھے جن سپر زکوریلیز کرنا ہے ان

میں آپ کے دستخط شدہ کاغذات بھی شامل ہیں۔ یہ

اور بیکل ڈاکو سنس ہیں سر۔ یہ کوئی فوٹو کاپی نہیں

ہے۔“ اس نے فائل کھول کے فائغ کی طرف

دھکیلی۔ (اس سے پہلے اس نے فائغ کو فوٹو کاپی

دکھائی تھی جس کو اس نے پہچاننے سے انکار کر دیا تھا)

”میں نے ان کی تصدیق دوبارہ اپنے سروس

سے مانگی تو اس نے مجھے ہانگ کانگ سے اپنے

آفس کی آرکائیوز سے یہ اور بیکل فائل لا کر دی

ہے۔ پہلے صرف فوٹو کاپی تھی..... آپ اس کو نہیں

پہچانتے تھے.... مگر اس کو دیکھیں اور بتائیں۔ یہ تین

کاغذ آپ نے خود سائن کیے تھے؟“

وہ اس کے چہرے کو غور سے دیکھ کے پوچھ رہا

تھا۔ فائغ نے فائل کھولی۔ اندر تین کاغذ اسٹیکل

سے جن اپ کیے گئے تھے۔ ان تینوں کے نیچے فائغ

کے دستخط تھے۔

”میں تمہیں بتا چکا ہوں یہ میں نے نہیں کیے نہ

میں ان کاغذات کو پہچانتا ہوں اور.....“ وہ قدرے

ناگواری سے صفحہ پلٹتے ہوئے کہہ رہا تھا جب وہ ٹھہرا۔

پہلے اور دوسرے صفحے کے درمیان جہاں

اسٹیکل کی پن لگی تھی وہاں کچھ پھنسا تھا۔ فائغ نے

آہستہ سے پن جدا کی۔

ایک تھپی سی مقید شے آزاد ہوئی۔

اس نے دو انگلیوں میں اسے اٹھایا۔

وہ گلابی رنگ کے چیری بلاسم کی ایک پتی تھی۔

خشک، مرجھائی ہوئی، ان کاغذوں میں برسوں

سے امر ہوئی۔

اس نے پتی کو اوپر لے جا کے دیکھا۔ آنکھیں

چھوٹی ہوئیں۔ ایڈم غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”آپ کو کچھ یاد آیا سر؟“ اس کے اندر جوش

سا بھرا۔

فائغ نے پتی رکھی۔ اور ان کاغذات کو الگ

الگ کر کے دیکھا۔ پھر دستخط کی جگہ پہ انگلی پھیری اور



اوپر پرنٹ شدہ عبارتیں پڑھیں۔ ایڈم اس کے ایک ایک تاثر کو دیکھ رہا تھا۔

”ایسا لگتا ہے آپ دستخط کو پہچانتے ہیں مگر..... عبارتوں کو نہیں۔ کیا کسی نے کورے کاغذ پہ آپ سے دستخط کروائے تھے؟“

والن فاتح اس کی بات نہیں سن رہا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک اور منظر چلنے لگا تھا.....

وہ ساگور اہانامی کے دن تھے.....

جاپان کی سڑک تھی.... گلابی اور سفید روٹی کے گالوں جیسے چیری بلاسم ہر طرف گرے تھے۔

وہ لمبا کوٹ اور مفلر پہنے ٹھنڈی ہوا میں بچہ پہ بیٹھا تھا۔ وہ نظریں جھکا کے اخبار پڑھتا دوسرے ہاتھ سے کافی اٹھا کے پیتا پھر واپس بچہ رکھ دیتا۔

ایک دم سکے کھٹکنے کی سی آواز آئی۔ فاتح نے نظریں اٹھائیں۔

سامنے ایک کپل چلا آ رہا تھا جن کے ساتھ ایک پانچ چھ سال کا بچہ تھا۔ اس کے ہاتھ میں گلابی کاشن کینڈی تھی اور وہ اس کی اسٹک کو خوشی سے ہاتھ میں گھما رہا تھا۔

فاتح کی نظریں اس کے قدموں پہ جھکیں۔ اس کے جو گرز میں سکے لگے تھے۔ وہ چلنے سے کھٹکتے تھے۔ اس نے واپس نظریں اخبار پہ جھکائیں۔

بچہ کے پیچھے بڑا سا چیری بلاسم کا درخت تھا۔

اس کے عقب سے عصرہ نکل کے قریب آئی اور اس کے ساتھ بیٹھی۔ اس کے بیٹھنے پہ وہ چونکا۔ کافی کا کپ اٹھا لیا۔ بے دھیانی میں ذرا سی کافی چھلکی۔ گھاس پہ گرتے ایک سفید پھول کو وہ داغدار کر گئی۔ ہاتھ پہ بھی گرم گرم قطرے گرے تھے۔ عصرہ نے ادھوکتے ہوئے نشو سے اس کا ہاتھ صاف کیا۔

”بھینکس۔“ اس نے کافی کا گھونٹ بھرا۔ پھر عصرہ کو دیکھا۔ وہ مسکرا کے ہچکچاہٹ سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ہوا سے اس کے بال اڑ رہے تھے۔ اس کے ہاتھوں میں ایک فولڈر تھا۔

”مجھے تم سے کچھ مانگنا ہے۔ اور تم انکار نہیں کرو

گے۔“ وہ نرمی بھری قطعیت سے کہہ رہی تھی۔

”کہو۔“ ہوا کا جھونکا آیا اور درخت سے ڈھیر

سارے پھول نیچے آن گرے۔ کچھ عصرہ کے بالوں اور کندھوں پہ ٹھہر گئے۔ کچھ فاتح کے مفلر پہ۔

”میں ایک کاغذ پہ تمہارے سائن لینا چاہتی ہوں۔ بغیر کوئی سوال کیے تم ان پہ سائن کر دو گے کیا؟“

فاتح نے اچنبھے سے فولڈر کو دیکھا۔ ”اس میں کیا ہے۔“

”کچھ بھی نہیں۔“ وہ مسکرائی۔ ”اگر بتایا تو تم لمبی بحث کرو گے۔ بس بنا سوال کے سائن کر دو۔ میری بات مان لو۔“

”بلینک ڈاکومنٹ یہ سائن؟“

”نہیں مجھ پہ اعتبار نہیں ہے؟“ اس نے مان سے فاتح کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔ ”کیا میں کوئی ایسا کام کر سکتی ہوں جو ہماری فیملی کے لیے خطرہ بنے؟“

اس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑے۔ وہ مسکرا دیا۔

”ہین دو۔“ ہاتھ بڑھایا تو عصرہ نے مسکرا کے ہین اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے ہین پکڑا اور فولڈر کھولنے لگا۔ اس میں تین کاغذ تھے اور وہ اسٹیل نہیں تھے۔

ہوا کا ایک سرد جھونکا آیا اور کاغذ پھڑپھڑائے۔

یہاں ہی بہت سے پھول چھم سے نیچے آن گرے۔ کاغذ پتوں سے گلابی ہو گیا۔

”آپ کو یاد ہے.... ہے نا؟“ ایڈم کی آواز پہ

وہ چونکا۔ وہ ایسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ سانس روکے۔ پل بھر میں فاتح واپس اپنے آفس میں آ گیا۔

”کسی نے آپ کو یہ کاغذ سائن کرنے کو دیے تھے کیا؟“ ایڈم اندازہ لگا رہا تھا۔

فاتح نے ابرو اچکائے اور قائل بند کر کے اس کی طرف بڑھائی۔

”میں نے کہا نا“ میں اس عبارت کو نہیں



پچانا۔“ انداز خشک ہو گیا۔

”کیونکہ جب آپ نے دستخط کیے تو عبارت لکھی ہی نہیں گئی تھی۔ آپ کو بلیٹک کاغذات دے گئے تھے۔“ وہ رکا۔ ”عصرہ بیگم..... انہوں نے بنائی تھی یہ کہنی راسٹ؟“

”میری بیوی مرجی ہے۔ اس کو اس معاملے میں مت گھسیٹو۔“ اس کا لہجہ ایک دم سخت ہو گیا، مگر ایڈم کو جیسے سارا معاملہ سمجھ میں آ رہا تھا۔

”سر..... آپ مجرم نہیں ہیں کیونکہ آپ کو نہیں معلوم تھا ان میں کیا ہے۔ مگر مسز عصرہ آپ کو ایسے اسکیٹڈل میں پھنسا کے چلی گئی ہیں جو آپ کا کیریئر برباد کر سکتا ہے۔“

”میں نے کہا نا، مجھے یہ کاغذ یاد نہیں ہیں۔ تم نے ان کو لیک کرنا ہے، کر دو۔ میرا واحد کنسرن فی الوقت تالیہ ہے۔ اس کو ڈھونڈنا مت بھولنا۔“ ایڈم گہری سانس لے کر اٹھا۔

”یعنی یہ کاغذ سچے تھے۔ میں درست تھا۔ آئی ایم سوری، سر۔ مگر مجھے ان کو عوام کے حوالے کرنا ہوگا۔ پورا سچ بولنا بھی آپ نے ہی مجھے سکھایا تھا۔“

فاح ماتھے پہ بل ڈالے اسے دیکھے گیا۔ وہ اب مڑ کے دروازے کی طرف جا رہا تھا۔

آف شور کہنی بنانا جرم نہیں تھا۔ اسے بنانے کے بعد چھپا لیتا جرم تھا۔ اس پہ ٹیکس نہ دینا، اور اس کو ظاہر نہ کرنا جرم تھا۔

اور فاح کو معلوم تھا کہ وہ شدید مشکل میں گرفتار ہونے والا ہے۔

☆☆☆

کتابوں کے مقبرے میں دن رات یکساں تھے۔ کون سا پہر تھا، کیا وقت ہوا تھا، کچھ پتا نہ چلتا تھا۔

تالیہ انگلیاں مروڑتی، بے چینی سے بک ریکس کے درمیان ٹہل رہی تھی۔ ہنڈ پیچھے گرائے بالوں کو گول مول باندھے، وہ بے رونق، زرد چہرے کے ساتھ بار بار کنپٹیوں کو چھوئی جیسے سوچ سوچ کے

دماغ تھکنے لگا ہو۔

اس کے پان کیا تھے؟ فرار کے کون سے راستے دستیاب تھے؟

کن انکیوں سے اسے وہ ریک نظر آ رہا تھا جس میں نیلی جلد والی کتاب ہنوز اسے تسخیر سے دیکھ رہی تھی۔ اس روز تالیہ نے اسے اٹھانے کے چند لمحے بعد واپس رکھ دیا تھا مگر آج... آج لگتا تھا کہ کوئی راستہ نہیں بچا۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس تک آئی اور دھڑکتے دل سے وہ کتاب نکالی۔

اس کے صفحے وقت گزرنے کے باعث بھر بھرے ہوئے تھے۔ ہاتھ لگانے سے کنارے ٹوٹنے لگے تھے۔ اس نے کھڑے کھڑے احتیاط سے صفحے پلٹے۔

”اگر تم زندگی سے مایوس ہو چکے ہو.... اور ہر چیز تمہارے خلاف جا رہی ہے.... اور تم مرنا چاہتے ہو تو مزید تکلیف کیوں اٹھاتے ہو؟“

اس کی پلکیں بھیگنے لگیں۔ کتنی ظالم سطور تھیں وہ۔

”تم پہلے ہی بہت اذیت سہہ چکے ہو۔“

اب خود کو ایسے طریقے سے فنا کرو جس میں خوشی ہو آرام ہو۔ اور تکلیف نہ ہو۔

جیسے تم بادلوں میں اڑ رہے ہو۔ بنا درد کے مرنا چاہتے ہو تو میں تمہیں اس کی تیاری کرنا سکھاتا ہوں۔

یہ میرے تین زہر ہیں جو تمہاری جان ایسے لیں گے کہ تمہیں درد محسوس نہیں ہوگا۔

یوں جیسے مکھن سے بال نکلتا ہے۔ یوں تمہاری روح.....“

اس نے جھرجھری لے کر کتاب زور سے بند کی۔ گرد اڑی۔ اس نے جلدی سے اسے واپس رکھا اور اس کی طرف سے پشت کر لی۔ کسی قیدیم زمانے کے شکار باز کی لکھی یہ کتاب بہت ڈراؤنی تھی۔

اور جو خیال اس کے ذہن میں پنپ رہا تھا وہ



زیادہ خونناک تھا۔ ابھی اس کو ایسا کچھ نہیں سوچنا تھا۔  
ابھی وہ اپنی اس زندگی پر گرواپ نہیں کرے گی۔ اس کو مقابلہ  
کرنا تھا۔ سارے آپشن آزمانے ہوں گے۔

یہ کتاب اس کا آخری آپشن ہوگی۔ ابھی اس کا  
وقت نہیں آیا تھا۔

وہ ایک کونے میں دیوار سے کمرٹکائے بیٹھ گئی  
اور موبائل کھولا۔ پھر چونکی۔

ایڈم کے نام سے ٹویٹر بھرا پڑا تھا۔ اس نے  
بنگارا یا پلائیو کا دوسرا حصہ ریلیز کر دیا تھا اور اس میں  
وان فاتح کا نام بھی تھا۔

چار دن گزر چکے تھے۔ تالیہ نے کراہ کے  
آنکھیں بند کیں۔ ہر چیز اس کے اور اس کے عزیز  
لوگوں کے خلاف جا رہی تھی۔ ایک دوست موت  
کے قریب ہو اور دوسرے کا سیاسی کیریئر برباد ہونے  
جا رہا ہو۔۔۔ تو ایسے میں کوئی راستہ کیسے نکل سکتا تھا؟  
اب وہ کیا کرے؟

☆☆☆

اگلی صبح کے اہل کے باسیوں کے لیے ایک نیا  
دن لے کر طلوع ہوئی تو بہت سے لوگوں کی زندگیاں  
بدلنے لگیں۔

وان فاتح کی رہائش گاہ پہ وہ صبح اداسی لائی  
تھی۔

وہ لاؤنج کی کھڑکی کے ساتھ کھڑا تھا۔ سوٹ  
ٹائی میں لمبوس آفس کے لیے تیار تھا مگر باہر نہیں نکلا  
تھا۔ ماتھے پہ ہل ڈالے وہ چھٹی نظروں سے باہر دیکھ  
رہا تھا۔

پورچ کے آگے چھوٹے گیٹ سے باہر کھڑے  
رپورٹرز کا ہجوم نظر آ رہا تھا۔ وہ رات سے یہیں  
تھے۔ وہ اس کے ٹکٹنے کا انتظار کر رہے تھے۔ کل ایڈم  
کی کتاب ریلیز ہوئی تھی اور تب سے اب تک وان  
فاتح رپورٹرز کے ہاتھ نہیں آیا تھا۔

”ڈیڈ!“

وہ چونکا۔ سکندر لاؤنج کے وسط میں کھڑا تھا۔  
اس کے چہرے پہ خوف و ہراس تھا۔

”اب ہم اسکول کیسے جائیں گے؟“

”اوہ سکندرا“ وہ اس کے قریب آیا اور ہنچوں  
کے بل نیچے بیٹھا۔ پھر اس کے دونوں ہاتھ تھامے اور  
اس کی خوف زدہ آنکھوں میں جھانکا۔ ”تم میرے  
بیٹے ہو۔ تم بہت بہادر ہو۔“

”جولیانہ صبح سے رو رہی ہے۔“ سکندر کی  
آنکھیں بھگنے لگیں۔ ”ڈیڈ ایہ سب کیا ہو رہا ہے؟“

”میری بات غور سے سنو سکندرا!“ وہ نرمی سے  
کہنے لگا۔ ”ہم فیملی ہیں اور فیملیز دوسروں کی باتوں پہ  
یقین کر کے کبھی آپس میں لڑائیاں نہیں کرتیں۔ یہ

سب جھوٹ بول رہے ہیں تمہارے باپ کے  
خلاف۔ میں نے یا تمہاری ماں نے کبھی کوئی ایسا غلط  
کام نہیں کیا۔ تم جو سنو اس کو ذہن سے نکالتے جاؤ۔“

”ماما نے بھی نہیں کیا تھا نا یہ؟“ نہ جانے کیوں  
سکندر نے پوچھا تھا۔

”ہر گز نہیں۔“ وہ تیزی سے بولا۔ ”تمہاری

ماں ایک بہت اچھی عورت تھی اور کوئی اس کے  
بارے میں جو بھی کہے تم ہمیشہ یاد رکھو گے کہ وہ  
بہترین عورت تھی۔“ وہ جیسے بے چین ہو گیا تھا۔

اس کے بچے ایک دفعہ اپنی یاں کھو چکے تھے۔  
وہ دوسری دفعہ اسے کھونے کے تحمل نہیں ہو سکتے  
تھے۔

”آج تم اسکول نہ جاؤ۔ آرام کرو۔ میں  
جولیانہ کو دیکھتا ہوں۔“ وہ سیدھا کھڑا ہوا اور موبائل  
نکالتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ جب وہ سکندر کی پہنچ  
سے دور ہو گیا تو اس نے کال ملا کے فون کان سے  
لگایا۔

”ایش۔۔۔۔۔“ اور گہری سانس لی۔

”آبنگ۔۔۔۔۔ یہ آپ نے کیا کر دیا ہے؟“ وہ

گویا سنز ہاتھوں میں دیے بیٹھا تھا۔ میڈیا سوشل  
میڈیا ہر جگہ غم و غصے کا طوفان برپا تھا۔

”میں اس سب کا مقابلہ کر لوں گا۔ مگر بچے ا

میں ان کو اس ماحول میں نہیں رکھ سکتا۔ وہ ذہنی مریض  
بن جائیں گے۔“ وہ شدید پریشان لگتا تھا۔



اسے یہ جواب دینا تھا۔ یہ جواب سب کو چپ کر دے گا۔ مگر زیادہ سے زیادہ دو دن تک۔ اور اس کے بعد؟

☆☆☆

وہ صبح ایڈم بن محمد کے لیے بھی کچھ نیالائی تھی۔ وہ تیار ہو کے باہر برآمدے میں آیا تو اس کا باپ باغیچے میں کرسی ڈالے بیٹھا دھوپ سینکا اخبار پڑھنے میں مصروف تھا۔ اس کے لبوں پر نخریہ مسکراہٹ تھی۔ ماں بھی کندھے کے ساتھ کھڑی جھک کے اخبار پہ جھانک رہی تھی۔ میز پہ چند دوسرے اخبار بھی تھے ہوئے رکھے تھے۔

آج اخبارات 'ٹوئینٹرڈی وی' میں صرف ایڈم بن محمد کا ذکر کر رہے تھے یا وان قانع کا۔ اس نے دھوپ میں بیٹھے ان دونوں بوزھوں کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا اور دبے قدموں دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ آہستہ سے لکھا اور باہر کھڑی اپنی کار کی طرف آیا۔ دروازے کے شیشے میں اپنا عکس نظر آیا تو وہ مسکرا ہوا۔

کوٹ کے اندر ہائی نیک پہنے وہ ہلکی بڑھی شیو اور سلیقے سے کٹے بالوں کے ساتھ کافی اچھا لگ رہا تھا۔ اس کے کندھوں کا سارا بوجھ اتر چکا تھا۔ اس نے سچائی کے ساتھ قوم کی امانت ان تک پہنچا دی تھی۔ اپنا فرض نبھا دیا تھا۔ دوست دشمن دونوں کو ایک پیانے پہ رکھ کے فیصلہ کیا تھا اور وہ ایک دم بہت ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔

کار میں بیٹھنے سے پہلے دو تین محلے داروں نے اسے دیکھ کے مسکرا کے ہاتھ ہلائے تھے۔ وہ بھی مسکرا دیا تھا۔

وقت کتاب بدل گیا تھا۔ کہاں وہ ایک بزدل شخص تھا۔ کم اعتماد مستقبل سے پریشان مایوس سائیم جس کو اپنا مستقبل تاریک نظر آتا تھا.... اور کہاں..... اس نے بیک مرر درست کیا اور مسکرا کے کار اشارٹ کی.... اور کہاں یہ ایڈم تھا۔

پر اعتماد 'نڈر' بہادر۔ اس کا مستقبل روشن

"ظاہر ہے۔ میں چار دن سے یہی کہہ رہا ہوں۔ خیر آپ فکر نہ کریں۔ میں آرہا ہوں آپ کی طرف اور میں آج ہی بچوں کو حرمت کا کا کے پاس باہر بھجوانے کا انتظام کرتا ہوں۔" وہ رکا اور توقف سے بولا۔ "میں بھی کچھ دن کے لیے ان کے ساتھ چلا جاؤں گا۔ وہ سیٹ ہو جائیں گے تو میں آ جاؤں گا۔"

قانع کے لبوں پہ زخمی مسکراہٹ بکھر گئی۔ (اشعر بھی میڈیا کے سوالوں کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ قانع کے دفاع میں جھوٹ بول کے اپنی ساکھ خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یعنی اس سارے بکھیرے میں وہ اکیلا ہی تھا۔ مگر خیر... فی الوقت اسے اشعر کے اس اقدام کی ضرورت تھی۔)

"تھینک یو ایش۔"

"اپنی ٹائم آجنگ۔" پھر وہ رکا۔ "مجھے معلوم ہے کہ یہ کہنی آپ کی نہیں ہے۔ نہ آپ نے یہ بتائی ہوگی مگر....." وہ اچھکیا۔ "کیا کا کا نے آپ کے نام سے...." وہ بھی اپنی بہن سے واقف تھا۔

"عصرہ نے کچھ نہیں کیا۔" قانع تیزی سے بولا۔ "اور میں کسی کو اجازت نہیں دوں گا کہ وہ ایک مری ہوئی عورت کو اس معاملے میں گھسیٹے۔ تمہیں بھی نہیں۔" اور موبائل نیچے کرتے ہوئے زور سے سرخ ہٹن دبا یا۔ پھر ٹائی درست کی اور جولیاناہ کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

اپنی بیٹی کو تسلی دے کر اسے باہر جانا تھا اور صرف ایک کمنٹ دینا تھا۔

اسے جھوٹ اور بچ دونوں سے احتراز کرنا تھا۔ "لو کمنٹس۔ میں کسی کی ٹویٹس یا آن لائن کتابوں پہ تبصرہ نہیں کر سکتا۔ نہ میرے پاس ایسے کاغذات کو نظر بھر کے دیکھنے کا وقت ہے۔ جب مجھے عدالت نوٹس سرورکزے اور کسی کورٹ میں بلایا جائے تب میں ان کو دیکھوں گا اور بتاؤں گا کہ ان کی حقیقت کیا ہے۔"



تھا۔ لوگ اس سے پیار کرتے تھے اور وہ اسی طرح اپنے ملک کی خدمت کرنا چاہتا تھا۔ اب کوئی اسے اس کے رنگ کی بنا پہ کسی جگہ سے نہیں نکال سکتا تھا۔ کوئی اسے کسی ٹخنے سے محروم نہیں رکھ سکتا تھا۔ اب کوئی ایڈم بن محمد کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔

وہ بالآخر ایک آزاد انسان بن چکا تھا۔ جب اس نے یہ سوچا تو آٹھ بج کے اکیس منٹ تھے۔

کار کو چند بلاک دور لے جانے میں اسے سات منٹ لگے۔

ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے وہ مرکزی شاہراہ پہ کار ڈال رہا تھا اور عین اسی وقت..... فضا تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی تھی۔

تڑتڑ چلتی اندھا دھند گولیاں کار کے شیشوں سے ٹکرائیں۔ جھٹکے سے کانچ ٹوٹا۔ اس نے بریک لگانی چاہی مگر کار بے قابو ہو گئی۔ وہ تیزی سے نیچے ہوا۔ گولیوں کی بوچھاڑ رک گئی مگر کار سنبھالتے سنبھالتے دائیں طرف ایک درخت سے جا لگی۔

رفار کم تھی اس لیے اسے محض زور سے جھٹکا لگا۔ سیٹ بیلٹ اور ایر بیگز نے بروقت اسے بچا لیا۔ اس نے ماتھا ایر بیگ سے اٹھایا اور بے یقینی سے اطراف میں دیکھا۔

ونڈ اسکرین پہ کانچ ٹوٹنے کے باعث مڑی کا جالا سا بنا تھا۔ سائیڈ شیشہ آدھا ٹوٹ چکا تھا اور کانچ اس کے ہاتھوں پہ آگیا تھا۔ سوائے چند خراشوں کے بظاہر اسے کوئی چوٹ نہ آئی تھی۔..... مگر.....

اس کا سانس رک چکا تھا۔ لب ادھ کھلے تھے جیسے وہ اس قاتلانہ حملے پہ دنگ رہ گیا ہو۔ موت کا خوف واپس آ گیا تھا جسے وہ دبا کے سلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

یہ سائنس کے بندے نہیں تھے جو چند ٹھوکریں مار کے حملے گئے تھے۔ یہ اندھی گولیاں تھیں جو ایک دفعہ چوک گئی تھیں مگر ہر دفعہ نہیں چوکیں گی۔ یہ ڈرانے کے لیے بھی نہیں ماری گئی تھیں۔ اس نے کل

صرف فاتح کا نام نہیں باہر نکالا تھا۔ اس نے بیسیوں طاقتور آدمیوں کے راز افشا کیے تھے۔

یہ انتہائی دار تھا اور یہ بہت دلخراش تھا۔ وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ بونٹ سے دھواں نکل رہا تھا اور لوگ ارد گرد جمع ہو رہے تھے۔ کوئی اندر جھانک کے پوچھ رہا تھا کہ وہ ٹھیک ہے اور کوئی پولیس کو کال کر رہا تھا..... مگر وہ بس تیز تیز سانس لے رہا تھا۔

وہ ٹھیک نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ ٹھیک نہیں تھا۔ وہ ڈر گیا تھا۔ ہم چکا تھا۔ اس کا سارا اعتماد چکنا چور ہو چکا تھا۔ اور آزادی کے پرنٹ گئے تھے۔

موت کو اتنا قریب دیکھ کے اسے احساس ہوا تھا کہ ہر دوسرے انسان کی طرح وہ بھی موت سے ڈرتا تھا۔ وہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔ کم از کم اب وہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔

☆☆☆

ایڈم ان ہی قدموں پہ گھر واپس آیا مگر اس کا چہرہ وہ نہیں تھا جس کے ساتھ وہ گیا تھا۔ وہ لٹھے کی مانند سفید ہو رہا تھا۔

”تمہاری کار کو کیا ہوا؟ اور تم کسے کال کر رہے ہو؟“

وہ جس طرح دیوانہ وار فون ملاتا ہوا اندر داخل ہوا تھا، باغیچے میں کھڑے اس کے باپ نے حیرت سے پوچھا تھا۔

ایجو برآمدے میں پودوں کو پانی دے رہی تھیں وہ بھی رک کے اسے دیکھنے لگیں۔

”پولیس کو۔ مجھے رپورٹ کروانی ہے۔“ فون کان سے لگائے وہ گہرے سانس لیتا کہہ رہا تھا۔ اس کے ماں باپ نے پریشان نظروں کا تبادلہ کیا مگر خاموش رہے کیونکہ رابطہ مل چکا تھا اور ایڈم تیز تیز بولتا سارا وقوعہ بتا رہا تھا۔

اس نے فون رکھا اور باپ کا چہرہ دیکھا تو وہاں بھی وہی خوف تھا۔ اور پریشانی بھی۔ وہ دونوں سب سن چکے تھے۔



”یہ کس نے کروایا ہے؟“

”میں نے بہت سے لوگوں کے نام لیک کیے ہیں۔ کوئی بھی کروا سکتا ہے۔ اور مزے کی بات... اگر ایک شخص مد مقابل ہوتا تو اس پہ شک جاتا۔ اب اتنے سارے لوگوں کی وجہ سے بندہ کس پہ شک کرے؟“

وہ مضطرب سا کہہ رہا تھا۔

”تم.... تم پریس کانفرنس کرو اور لوگوں کو بتاؤ کہ....“ باپ پریشانی کے عالم میں کہنا چاہ رہا تھا مگر ایڈم نے سختی سے نفی میں سر ہلایا۔

”اس سے کیا ہوگا؟ کوئی ایک آدمی ہوتا تو میں کہتا کہ اگر مجھے کچھ ہوا تو میرا خون اس کے ذمے ہے مگر کتنے لوگوں پہ شک کروں؟ پبلک مجھے نہیں بچا سکتی۔ یہ سلسلہ اب نہیں رکے گا۔“

پھر اس نے موبائل کی اسکرین باپ کو دکھائی۔ ”یہ میرے میگزین کے دفتر کی فوٹیج ہے۔ اور یہ (سوائپ کیا) پبلشر کے آفس کی۔ یہاں بھی فائرنگ ہوئی ہے۔ دو افراد زخمی ہو گئے ہیں۔“

”تم خوف زدہ ہو ایڈم؟“ ایو تشریش سے دیکھتی قریب آئیں۔ وہ تینوں اب نکلون صورت گھاس پہ کھڑے تھے۔ چمکتی دھوپ میں چار دیواری پہ لگے کالج کے ٹکڑے چمک رہے تھے۔

”میں بہت خوف زدہ ہوں ماں۔“ اس کے ماتھے پہ پسینہ تھا۔ ”میں مرنا نہیں چاہتا۔ اور یہ سب یہاں نہیں رکے گا۔ وہ آپ لوگوں کو بھی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ دونوں کچھ عرصے کے لیے گاؤں چلے جائیں۔ خالہ کے پاس۔“

”کیا موت گاؤں میں نہیں آ سکتی؟“ ایو نے باری باری دونوں کو دیکھا تو ایڈم زچ ہو گیا۔ وہ اس وقت نصیحت نہیں برداشت کر سکتا تھا۔

”میں آپ کو محفوظ رکھنا چاہتا ہوں ایو۔“ ”موت ہی زندگی کی حفاظت کرتی ہے“ ایڈم۔ کوئی نہیں جانتا وہ کس زمین پہ مرے گا۔ اور

تمہارے تایا نے کہا تھا کہ اگر تم سچ بولو گے اور....“

”کاش تایا نے اپنے خواب کے آخر میں یہ بھی

بتایا ہوتا کہ سچ بولنے کے بعد کیا ہوگا۔“

نچی سے کہہ کے وہ اندر کی طرف بڑھ گیا۔

ایڈم بن محمد کو آج کے واقعے کے بعد اس بات

میں کوئی شک نہیں رہا تھا کہ وہ موت سے نہیں بھاگ

سکتا۔ وہ عرصے سے اس کے تعاقب میں تھی۔ اسے

اب اس مسئلے کا حل ڈھونڈنا تھا۔

اسے تالیہ کو ڈھونڈنا تھا۔ صرف وہی اس کو اس

مشکل سے نکال سکتی تھی۔ کیونکہ اس کے پاس ہمیشہ

پلان ہوتا تھا۔

ایڈم کمرے میں آیا اور گزشتہ روز کے اتارے

ہوئے کوٹ کی جیب سے وہ چٹ نکالی جس پہ

ذوالکفلی کا پتہ درج تھا۔ اسے اس شخص کو ڈھونڈنا تھا۔

وہی جانتا ہوگا کہ تالیہ کہاں جا سکتی ہے۔

☆☆☆

کتابوں سے بھرے تہہ خانے میں اس نے

موم بتیاں جلا رکھی تھیں۔ مصنوعی بتیاں بجھا رکھی

تھیں۔ وہاں خوف تھا اور اداسی تھی۔ وہ میٹ پہ آلتی

پالتی کے یوگا کے پوز میں بیٹھی آنکھیں بند کے ہوئے

تھی۔ سینکڑوں کتابیں خاموشی سے اسے دیکھ رہی

تھیں۔ وہ بار بار جیسے کچھ سوچتی اور پھر سر جھٹکتی....

تالیہ مراد پریشان اور خوف زدہ تھی.... اداس

تھی.... اکیلی تھی....

☆☆☆

بی این کے آفس میں فاتح کرسی پہ بیٹھا ہے

تو جہی سے فائلز دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے ٹائی ڈھیلی

کرتے ہوئے لی وی اسکرین کو دیکھا۔ اور ریموٹ

اٹھا کے آواز بلند کی۔

اسکرین گلا پھاڑ کے دان فاتح کی مبینہ آف شور

کمپنی کے یارے میں لوگوں کو بتا رہی تھی۔ اسکرین

پہ بار بار فاتح اور صوفیہ کی میوزیم کی ڈی بیٹ کا وہ

منظر چلا جا رہا تھا جس میں فاتح نے ببا نگ دہل کہا

تھا کہ اس کی کوئی بے نامی جائیداد نہیں ہے۔ اس نے



جیل بدلا۔ ہر جگہ بھی تھا۔ اس نے بے زاری سے  
بٹن دبا کے ٹی وی کو خاموش کرایا اور پیچھے فیک لگالی۔  
وان فاتح پریشان تھا..... خوف زدہ تھا.....  
اداس تھا..... اکیلا تھا.....

بس سرسبز بیلٹ کے درمیان سڑک یہ رفتاری  
سے۔ رواں دواں تھی۔ مسافر نشستوں پہ بیٹھے کھڑکی  
سے باہر کا نظارہ کر رہے تھے۔ کچھ فونز اور آئی پیڈز پہ  
لگے تھے۔ ایڈم البتہ بالکل گم صدم سا کھڑکی سے باہر  
بھاگتے درخت دیکھ رہا تھا۔ وہ ملا کہ جارہا تھا اور اسے  
نہیں معلوم تھا کہ تالیہ کو کیسے ڈھونڈنا ہے۔ سوائے  
ذوالکفلی کے کوئی نشانی، کوئی طریقہ کچھ بھی اس کے  
پاس نہ تھا۔ وہ کہاں تھی اور اس کو کیسے ڈھونڈا جاسکتا  
تھا؟ اگر وہ اسے ڈھونڈ نہ پایا تو ایڈم کو موت کے اس  
تغائب سے کوئی نہیں بچا پائے گا۔

ایڈم بن محمد پریشان تھا..... خوف زدہ تھا.....  
اداس تھا..... اور اکیلا تھا۔

☆☆☆

مغرب کا نیلگوں اندھیرا وان فاتح کی رہائش  
گاہ پہ پھیل رہا تھا۔ گیٹ کھلے تھے اور اس کی کار اندر  
داخل ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ کھڑکی کے شیشے سے  
فاتح نے دیکھا اس کے لان میں دولت کھڑا  
تھا۔ سینے پہ بازو لپیٹے وہ خطر مسکراہٹ کے ساتھ کار  
کو آتے دیکھ رہا تھا۔  
فاتح کے ماتھے پہ شکنیں نمودرا ہوئیں۔ لب بھنج  
گئے۔ وہ کوٹ کا بٹن بند کرتا باہر نکلا اور نیلے  
اندھیرے میں ڈوبتے لان کی طرف آیا۔

”السلام علیکم فاتح! امید ہے سب خیریت ہو  
گی۔“ دولت دوستانہ انداز میں مسکرایا۔

فاتح نے زیر لب اس کے سلام کا جواب دیا اور  
اکھڑے اکھڑے انداز میں کہتے ہوئے قریب آیا۔  
”تم نے تالیہ کو ڈھونڈ لیا ہے؟ اگر نہیں تو میں  
تمہاری اپنے گھر میں موجودگی غیر ضروری سمجھتا  
ہوں۔“  
”نہیں۔ ابھی تک ہم اس کو نہیں ڈھونڈ سکے۔“

مگر.....“ دولت نے اعتراف کرتے ہوئے ٹھنڈی  
سانس بھری۔ اب وہ دونوں لان میں آنے سانسے  
کھڑے تھے۔  
”چونکہ تم چائے نہیں پوگے اس لیے تم جاسکتے  
ہو۔“

وہ اسی درشتی سے کہتا گھر کی طرف مڑ گیا۔  
اسے اس آدی سے مزید کوئی بات نہیں کہنی تھی۔  
”فاتح..... میری بات سنو۔“ دولت اس کے  
پیچھے لگا۔ ”میں جانتا ہوں تم اب مجھے اپنا دوست  
نہیں سمجھتے کیونکہ تمہیں میری جاب سے اختلاف ہے  
مگر تم نے کبھی سوچا کہ تمہارے دوستوں کو بھی برسوں  
سے تمہاری سیاسی پالیسیز سے اختلاف ہوتا ہوگا، مگر  
انہوں نے پروٹیشنل معاملات کی وجہ سے پرسنل  
تعلقات کو کبھی خراب نہیں کیا۔“

وہ پورچ تک پہنچا تھا جب پیچھے آتے دولت کی  
بات پہ رکا اور گردن موڑ کے اسے دیکھا۔

”تم تالیہ کو میرا نام لے کر.... دھوکا دے  
کر.... اس قید میں لے کر گئے تھے جس نے اس لڑکی  
کو اتنا ہرٹ اور خوف زدہ کر دیا کہ وہ بے گناہ ہوتے  
ہوئے بھی قانون پہ بھروسہ نہیں کر پارہی۔“

لان میں اندھیرا گہرا ہونے لگا تو ایک ملازم  
نے پورچ کی بتیاں جلا دیں۔ (باقی ملازم اور گارڈ  
ادھر ادھر کھسک گئے۔) پورچ ایک دم روشنی میں نہا  
گیا تو دولت کو اس کا چہرہ واضح نظر آیا جس پہ شدید  
غصہ تھا۔ اس نے بے بسی سے ماتھے کو چھوا۔

”فاتح.... فاتح.... وہ کوئی بے گناہ لڑکی نہیں  
ہے۔ وہ اسکا میر ہے۔ چور اور فراڈ۔“

وان فاتح ایک قدم آگے آیا اور افسوس سے  
دولت کی آنکھوں میں جھانکا۔

”تم خود کو اس لڑکی کی جگہ پہ رکھ کے سوچ سکتے  
ہو؟ ایک دفعہ دولت تم اپنے تعصب کو بھلا کے....  
صرف اس لڑکی کا سوچو جو ایک سیاہ زندگی سے  
چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی۔ وہ میرے لیے اپنے  
سیاسی آئیڈیلزم کے لیے کام کر رہی تھی۔ اس نے



معاشرے میں عزت بنائی تھی۔ وہ خوش تھی۔ وہ غلط راستے کو چھوڑ چکی تھی کیونکہ میں نے اسے کہا تھا 'اچھائی پہ چلنے کے اچھے نتائج پر یقین رکھو۔ اور تم لوگوں نے کیا کیا؟'

وہ تکلیف بھرے انداز میں پوچھ رہا تھا۔ دولت خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

"جب کوئی اچھا بننا چاہتا ہے تو اس کے ساتھ ایسے کرتے ہیں کیا؟ پروموشن کے لیے..... اپنا نام خبروں میں دیکھنے کے لیے کسی اچھے انسان کو یوں بدنام کرتے ہیں کیا جیسے تم کر رہے ہو؟"

دولت کی آنکھوں میں بھی تاسف ابھرا۔

"You're a man in love"

فاح نے سر جھٹکا۔ "میرے جذبات تمہارا کنسرن نہیں ہیں۔ تم اپنی پروموشن کی فکر کرو۔"

مگر اس سے پہلے کہ وہ واپس مڑتا 'دولت تیزی سے بولا۔

"میں برا ہوں ٹھیک ہے۔ مگر تم اس کے لیے کچھ اچھا کیوں نہیں کرتے۔"

وان فاح ٹھہر گیا۔ بالآخر دولت اس کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اسے خاموش دیکھ کے وہ تیز تیز کہنے لگا۔

"وہ تم سے ضرور رابطہ کرے گی۔ تم جانتے ہو

کہ اس کا بھانجا اس کو مزید مشکوک بنا رہا ہے۔ تم اس کو سمجھاؤ۔ اس کی بھلائی کے لیے کہ اگر وہ بے گناہ

ہے تو واپس آ جائے۔ بجائے اس کے کہ ہم اس کو پکڑیں..... وہ خود آ جائے.... اور باعزت طریقے

سے گرفتاری دے دے۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔" سینے پہ ہاتھ رکھ کے بولا "کہ میں اسے کسی مجرم کی طرح گرفتار نہیں کروں گا۔ میں اس کو میڈیا کے سامنے

جھکڑی بھی نہیں لگاؤں گا۔ میں رپورٹرز کو بتاؤں گا کہ وہ ملک سے باہر تھی وہ بیمار تھی اسی لیے وہ آ نہیں

سکی اتنے دن۔ وغیرہ وغیرہ۔ مگر اس نے خود ہم سے رابطہ کر لیا تھا اور وہ خود اپنے آپ کو قانون کے حوالے

کر رہی ہے۔ کورٹ میں میں تالیہ کے خلاف ہی

رہوں گا' مگر اس کی گرفتاری تک... میں اس کو.... بے عزت نہیں کروں گا۔"

وہ رکا اور فاح کے خاموش چہرے کو دیکھ کے ٹھہر ٹھہر کے کہنے لگا۔

"لیکن.... دوسرا امکان سوچو... اگر ہم نے اسے خود گرفتار کیا.... اور ہم اسے گرفتار کر لیں گے..... تو تم وہ منظر جانتے ہو کیسا ہوگا؟ ایک عورت

کو جھکڑیاں لگا کے سر جھکائے پولیس کے زرخے میں تھانے تک لایا جانا.... کیا لگے گا کی وی ویٹلو کی

اسکرین پر؟ کیا تم چاہتے ہو کہ تالیہ کے ساتھ یہ ہو؟"

فاح خاموش نظروں سے اسے دیکھے گیا تو دولت نے دہرایا۔ "فاح... کیا تم اس کو گرفتاری

دینے کے لیے راضی کرو گے؟ اگر ہاں تو... میں یہ گارنٹی دیتا ہوں کہ....."

"تم یہ گارنٹی لکھ کے دے سکتے ہو؟"

وہ بات کاٹ کے سپاٹ سا بولا تو دولت نے گہری سانس لی اور جیب سے ایک لفافہ نکال کے اس کی طرف بڑھایا۔

"مجھے معلوم تھا تم بھی کہو گے۔ اسی لیے گارنٹی ساتھ لایا ہوں بلیک اینڈ وائٹ میں۔ اس کو راضی کرو

فاح... اس کے اپنے لیے اسے راضی کرو۔"

فاح نے کانڈکھول کے دیکھا۔ پورچ کی تیز روشنی میں دھندلی نظر دوڑانے کے باوجود اسے تحریر

سمجھ میں آ گئی۔ اس نے ہلکے سے اثبات میں سر کو جنبش دی۔

"اگر اس نے مجھ سے رابطہ کیا... تو میں کوشش کروں گا۔ اور چونکہ تم چائے نہیں پیو گے اس لیے تم

جا سکتے ہو۔" اسی بے رحمی سے کہہ کے کانڈ لیے وہ اندر کی طرف بڑھ گیا۔ دولت روشنیوں میں نہانے

پورچ میں کھڑا مسکرا کے اسے جاتے دیکھنے لگا۔

☆☆☆

ذوالکفلی کے گھر کی راہداری میں لکڑی کا تختہ باہر ہٹا تھا کیونکہ تالیہ کچھ دیر پہلے اوپر آئی تھی۔ سارے گھر میں اسی طرح مدھم بتیاں جلی تھیں۔



دیوان خانے میں ساحر دوزانو بیٹھا چھوٹی میز پر کاغذ رکھے کچھ لکھ رہا تھا۔

”اتنی دیر سے خاموش کیوں بیٹھی ہو پتری تالیہ؟“ وہ سر اٹھائے بنا لکھتے لکھتے بولا۔

وہ سامنے اکڑوں بیٹھی گھٹنوں کے گرد بازو لیے بیٹھی تھی۔ ٹھوڑی گھٹنے سے نکالے اداسی سے بولی۔

”کیا کہوں؟ کچھ کہنے میں دلچسپی ہی نہیں رہی۔“

”مایوس ہو؟“ تالیہ نے اثبات میں سر ہلادیا۔ اس کی کچیل (غزال) جیسی آنکھوں میں زمانے بھر کی اداسی تھی۔ ذوالکفلی نے کتاب بند کی، قلم واپس رکھا اور نرمی سے اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”میں تمہارے لیے اور کیا کر سکتا ہوں پتری تالیہ؟“

”تم جانتے تھے کہ میں پتری تاشہ ہوں۔ پھر بھی تم مجھے ہمیشہ شہزادی تالیہ کیوں کہتے تھے؟“

”کیونکہ یہی تمہاری اصل شناخت ہے۔ پندرہویں صدی کے ملا کے کی ”شہزادی“ اور آج کی ”تالیہ“ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔“

تالیہ نے گردن موڑی اور دیوار پر نصب صلیف پر رکھی ایک جامنی رنگ کی بوتل کو دیکھا جس کے پینڈے میں کچھ سونے کا دمک رہا تھا۔

”کیا تم مجھے وقت میں واپس پیچھے بھیج سکتے ہو؟“ وہ حسرت سے اسے دیکھ کے بولی۔

”نہیں تالیہ۔ وقت کی چابی زائل ہو چکی ہے اور وہ دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا ہے۔ یہ کچھ اور ہے جو میں نے تمہاری ہیرین سے بنایا تھا۔ مگر تم دوبارہ وقت کی قید میں جانے کا کیسے سوچ سکتی ہو؟“

”کیونکہ.....“ اس نے ذوالکفلی کی طرف چہرہ موڑا اور تذبذب سے لب کائے۔ ”کیونکہ میں اپنے باپا سے ایک آخری دفعہ ملنا چاہتی ہوں..... بس چند لمحوں کے لیے اگر میں پیچھے جاسکوں۔“

”آخری دفعہ؟“ ذوالکفلی نے غور سے اس کی اداس آنکھوں کو دیکھا۔ ”آخری دفعہ تم مراد سے ملنے کے لیے؟“

”جی ہاں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں نے تم سے ملنے کے لیے تمام ممکنہ راستے کاغذ پر لکھ دیے ہیں۔“

”مگر کچھ کڑ بھی گزروں تو یہ پچھتاوا نہیں رہے گا کہ باپا کو خدا حافظ نہیں بولا تھا۔“ وہ دور خلا میں گھورتے ہوئے بے خودی کے عالم میں بولی۔

”مجھے تم سے اب خوف آنے لگا ہے۔ کیا اس موجودہ دنیا سے تمہاری ساری امیدیں ختم ہو گئی ہیں؟“

تالیہ نے نظریں جھکا دیں۔ ”نہیں۔ ابھی فاتح ہے۔“

”ہاں۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم باپا سے ملاقات کا نہ سوچو۔ وہ دروازہ اب بند ہو چکا۔“

”مگر بنگارا یا ملاو کے آخری تین ابواب میں لکھا تھا کہ میں واپس گئی تھی ملا کہ میں۔“ اسے یاد آیا۔

”وہ ابواب بعد میں مراد راجہ نے لکھوائے تھے۔ تمہارے غائب ہونے کی وجہ سے اور اپنی عزت بچانے کے لیے۔ وہ سچ نہیں تھے۔ تاریخ کی ساری کتابیں سچ نہیں ہوتیں۔ تم اب واپس نہیں جا سکتیں۔“

اس نے گہری سانس لی۔ ”یعنی کہ واپسی کی امید بھی ختم؟ میں نے سوچا تھا کہ اگر اس زندگی سے امید ختم ہو گئی تو میں واپس چلی جاؤں گی۔ مگر تم نے میری وہ امید بھی توڑ دی۔ اب اگر فاتح نے مجھے مایوس کیا تو میں کیا کروں گی؟“

وہ میز پر کہنیاں رکھ کے آگے کو جھکا اور مسکرا کے کہنے لگا۔ ”انسان بہت بڑا سروائیور ہوتا ہے۔ تم اس کو بھی جھیل لو گی۔ یوں کرنا اس ملک سے دور چلی جانا اور نئی زندگی شروع کرنا۔“

تالیہ زخمی سا مسکرائی۔ ”نہیں ذوالکفلی۔ اگر فاتح نے بھی مجھے مایوس کر دیا تو میرے پاس اس زندگی کو جاری رکھنے کے لیے کچھ نہیں بچے گا۔“

”انے مت سوچو۔ کم از کم تم ایسے سوچتے ہوئے اچھی نہیں لگتی ہو۔ تم تو بہت بہادر ہو۔ ہم سب سے زیادہ بہادر۔“

https://pklibrary.com/

Digitized by Google



تالیہ کان لگا کے سنے لگی۔ ہر آہٹ ہر لفظ۔ اس کی ہتھیلیوں پہ پسینہ آرہا تھا۔

وہ دیوان خانے میں چٹائی پہ اسی جگہ بیٹھ گیا جہاں تالیہ بیٹھی تھی اور چھوٹی میز پہ کہیاں رکھے آگے کو جھکے بات کا آغاز کیا۔

”میں چے تالیہ کے لیے بہت پریشان ہوں۔“

”میں بھی ہوں۔ کیا تم اس کو میرا ایک پیغام دے سکتے ہو؟“ ذوالکفلی نے جواباً اتنی ہی فکر مندی سے کہا تو ایڈم دھیرے سے ہنسنے لگا۔

”یعنی آپ نہیں جانتے وہ کہاں ہیں؟“ اس کی آس ٹوٹ گئی۔

”میں؟ میں نے چند ماہ سے اسے نہیں دیکھا۔

وہ مجھ سے شدید ضرورت کے علاوہ رابطہ نہیں کرتی۔

میں سمجھا تم اس کا پیغام لائے ہو۔ اسی لیے میں نے تمہیں اندر آنے دیا۔“ ذوالکفلی ایک دم مشکوک نظروں سے اسے دیکھنے لگا تو ایڈم جلدی سے بولا۔

”انہوں نے آپ سے کوئی رابطہ نہیں کیا؟“

”نہیں۔ میں نے کوشش کی۔ ہمارے کچھ

(آواز دھیمی کی) خفیہ طریقے ہیں مگر اس کا کوئی

جواب موصول نہیں ہوا۔ شاید وہ ملک چھوڑ چکی

ہے۔“

”اُف“ ایڈم نے آنکھیں بند کیں اور پیشانی

کو دو انگلیوں سے چھوا۔

”اب میں کیا کروں؟ مجھے ان کو ڈھونڈنا

ہے۔“ پھر سر اٹھا کے ذوالکفلی کو دیکھا۔

”آپ جادوگر ہیں میں جانتا ہوں۔ کیا آپ

ان کا سراغ نہیں لگا سکتے۔“

”اگر یہ ممکن ہوتا تو پھر ساری دنیا کے سراغ

رساں ایک جادوگر ساتھ لے پھرتے تو جو ان۔ جادو

ایسے کام نہیں کرتا۔“ وہ رکھائی سے بولا۔ ”اگر تم کہہ

چکے تو جاسکتے ہو۔“

ایڈم چند لمحے اس کا چہرہ دیکھا رہا۔

وہ اداسی سے مسکراتی رہی۔ ”ٹوٹا ہوا دل انسان سے سہرا کام بھی کروا دیتا ہے جن کے بارے میں اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوتا۔ مگر خیر۔۔۔ فکر نہ کرو۔۔۔ مجھے موت کی تکلیف سے کبھی ڈر لگتا ہے۔“

دروازے پہ دستک ہوئی تو وہ چونکی۔

”اس وقت کون آیا ہے؟“ وہ تیزی سے

اٹھی۔ ایک دم چہرے پہ خوف نظر آنے لگا۔

”میں دیکھتا ہوں۔ تم نیچے جاؤ۔“ وہ اطمینان

سے کہتا ہوا اٹھا۔ تالیہ تیزی سے راہداری تک آئی

ٹریپ ڈور ہٹایا نیچے کودی اور تختہ بند کر دیا۔ ذوالکفلی

نے اوپر میٹ برابر کیا اور خود دروازے کی طرف بڑھ

گیا۔ تالیہ نے ٹریپ ڈور پورا بند نہیں کیا تھا۔ وہ

وہیں اوپری زینے پہ کھڑی کان لگا کے سننے لگی۔ دل

زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

ذوالکفلی نے دروازہ کھولا تو سامنے ایڈم کھڑا

تھا۔ اس کی شیو بڑھی تھی ماتھے پہ بال بکھرے تھے اور

شکل سے مضمحل نظر آتا تھا۔

”کیا میں اندر آ سکتا ہوں ذوالکفلی

صاحب؟“

”نہیں کیونکہ میں آپ کو نہیں جانتا۔ آپ کو جو

کام ہے یہیں سے بتادیں۔“ ذوالکفلی رکھائی سے

بولا۔

نیچے تہ خانے کے زینے پہ کھڑی تالیہ نے بے

چینی سے لب کاٹے تھے۔ پھر بلا ضرورت ہی سر پہ

ہنڈ ڈال دی۔ کہیں وہ فرش کے اندر سے ہی اس کو نہ

دیکھ لے۔

”میں.... ایڈم ہوں....“ ایڈم جھجک کے

بتانے لگا۔ ”چے تالیہ مجھے جانتی ہیں اور مجھ پہ اعتبار

کرتی ہیں۔ میں انہی کے لیے آپ سے ملنے آیا

ہوں۔“

ذوالکفلی نے گہری سانس لی اور راستہ چھوڑ

دیا۔

اب قدموں کی آواز سے معلوم ہوتا تھا کہ

دونوں اندر دیوان خانے کی طرف جا رہے ہیں۔



ہیں۔“ گلی میں چلتا ہوا ایڈم الجھا الجھا سا کہہ رہا تھا۔  
”مجھے.... مجھے کچھ ایسا کرنا ہوگا کہ وہ خود مجھ سے ملنے  
پر راضی ہو جائیں کیونکہ اگر میں نے یہاں کوئی سین  
گری ایٹ کیا تو ارد گرد لوگوں اور پولیس کو معلوم ہو  
جائے گا۔“

”ہوں..... کیا چیز ہو سکتی ہے جو اسے باہر آنے  
پر مجبور کر دے۔“

”اگر آپ آجائیں!“ ایڈم نے کہا تو دل میں  
عجیب سا خالی پن محسوس ہونے لگا۔

”دولت مجھ پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ میں  
اُس کا لیکن تمہیں پہلے اس کو باہر نکلنے پر راضی کرنا  
ہوگا۔ یہ نہ ہو کہ وہ اب وہاں سے بھی بھاگ  
جائے۔ کوئی حل نکالو!“

اس کو حکم سے کہہ کے فارج نے فون رکھ دیا اور  
ایڈم پریشانی سے مڑ کے اس گھر کو دیکھنے لگا۔

جو اسے معلوم تھا، وہ اس کی مدد کر سکتا تھا مگر  
اسے کیا معلوم تھا، تالیہ کے بارے میں؟

اس کا ذہن کورے کاغذ کی طرح خالی تھا۔  
☆☆☆

اگلی صبح بی این کے چیرمین آفس کو سرما کی  
چمکی دھوپ نے منور کر رکھا تھا۔ سیکرٹری کارمن  
بھاپ اڑاتا گ فارج کی میز پر رکھ رہی تھی۔ وہ  
کاغذوں میں اتنا الجھا تھا کہ لب بٹا آواز کے  
ہلائے۔ (تھینک یو تالیہ)

قلم سے کچھ لکھتے لکھتے وہ رک گیا اور ہولے  
سے سر جھٹکا۔ (اتنے ماہ گزر چکے تھے مگر تالیہ کی کافی  
اور تالیہ کی موجودگی کی عادت نہیں گئی تھی۔) پھر ادب  
سابلایا۔ ”تھینک یو کارمن!“

”سر! آپ میڈیا بریفنگ کب دیں گے؟“  
سیکرٹری وہیں رک کے پوچھنے لگی۔ وہ بھی سمجھتی تھی  
تھی۔ ”رپورٹرز نے الگ ٹاک میں دم کر رکھا ہے اور  
مخالفین خاموش ہی نہیں ہو رہے۔“

وان فارج آگے کو جھٹکا۔ کاغذات پر کچھ لکھ رہا  
تھا۔ سپاٹ سے انداز میں جواب دیا۔ ”ابھی انتظار

”آپ سچ کہہ رہے ہیں نا؟“

”تمہیں یقین نہیں کرنا تو نہ کرو۔“

”دیکھیں.... میں وان فارج کا پیغام لایا ہوں

ان کے لیے۔ اگر وہ آپ سے رابطے میں ہیں تو پلیز

ان کو میرا پیغام پہنچادیں۔“

”کیا مجھے تمہیں اپنے گھر سے نکالنے کے لیے

پولیس کو بلانا پڑے گا؟“

ایڈم پیچھے کو ہوا اور گہری سانس لے کر اسے

دیکھا۔ ”سوری۔ مجھے آپ کا یقین کرنا چاہیے۔ میں

اب آپ کو تکلیف نہیں دوں گا مگر یہ میرا نمبر ہے۔ اگر

وہ رابطہ کریں تو مجھے بتائے گا۔“

”اوکے۔ یہ میں کر سکتا ہوں۔“ ذوالکفلی نے

اس کا کارڈ رکھ لیا تو وہ اٹھ گیا۔ وہ باہر چلا گیا تو

ذوالکفلی دروازہ بند کر کے راہداری میں آیا اور جوتے

کی نوک سے میٹ پرے کیا۔ ٹریپ ڈور کی درز نظر آ

رہی تھی۔

”کوئی پیغام جو تم اس کو پہنچانا چاہو؟ وہ تم سے

تخلص لگتا ہے۔“

تالیہ نے جواب دینے کے بجائے زور سے

ٹریپ ڈور بند کیا اور زینے اترنے لگی۔ یہ صاف

انکار تھا۔

باہر گلی میں چلتے ایڈم نے دوسرا موبائل نکالا جو

محفوظ تھا اور فارج کے اس نمبر پر کال ملائی جو اس نے

خفیہ گفتگو کے لیے ایڈم کو دیا تھا۔ کیونکہ اس نمبر کو

پولیس ٹریس نہیں کر سکتی تھی۔

فارج نے چھوٹے ہی فون اٹھایا۔

”کچھ معلوم ہوا؟“

”جی۔ وہ اسی کے گھر میں ہیں۔ میں نے

انہیں ڈھونڈ لیا ہے۔“

”آریوشیور۔“

”جی۔ جس طرح اس آدمی نے مجھے بار بار گھر

سے نکل جانے کو کہا، اس کا بھی مطلب تھا کہ وہ گھر

میں ان کو چھپائے ہوئے ہے۔ لیکن میں زبردستی

چھ تالیہ کو اس گھر سے نہیں نکال سکتا۔ وہ خوف زدہ



کرو۔“

سیکرٹری نے بے بسی سے اسے دیکھا وہ دودن سے یہی سوال پوچھ رہی تھی اور وہ یہی جواب دیتا تھا۔

وہ کس شے کے انتظار میں تھا؟

”سر آپ کے وکلاء آگئے ہیں۔ میں ان کو بھیج دیتی ہوں۔“ وہ کہہ کے جانے لگی تو فاح نے پکارا۔

”ہاں..... اور تم بھی یہیں آ جانا۔“

سیکرٹری کا رمن اس بات پہ ٹھٹھک کے رکی اور مڑ کے اسے دیکھا۔ اس کا لباس ٹائی ڈھیلے کے آستین موڑے کاغذوں کو الٹ پلٹ کر کے دیکھ رہا تھا۔ بالکل بے نیاز، مطمئن۔

”سر..... میں وکیل اور کلائنٹ کی میٹنگ کے درمیان کیسے بیٹھ سکتی ہوں؟“

کارمن سمجھ دار لڑکی تھی۔ وہ تالیہ کے بعد آئی تھی اور اب تک اسے ان قوانین کی بخوبی سمجھ آ چکی تھی۔

”کیوں کارمن؟“ اس نے فاح سے نظریں اٹھا کے اسے دیکھا تو وہ جریز ہوئی۔

”جب کلائنٹ اپنے وکیل سے بات کرتا ہے تو کانفیڈنسیلٹی کا قانون اپلائی ہوتا ہے۔ وکیل آپ کے راز نہیں کھول سکتا۔ آپ کی کہی بات آپ کے خلاف نہیں استعمال کر سکتا۔ لیکن ایک تیسرا فرد بیٹھ جائے تو....“

”تو اس پہ یہ قانون لاگو نہیں ہوگا اور وہ جب جا ہے میرے اور میرے وکلاء کی باتیں باہر جا کے بتا سکتا ہے۔ یہی نا؟“ وہ ہلکا سا مسکرایا۔ ”تمہیں لگتا ہے وان فاح ان چیزوں سے ڈرتا ہے؟“

کارمن اداسی سے مسکرائی۔ ”آپ مجھ سے آج تک ملنے والے انسانوں میں مضبوط ترین سر۔ مگر یہاں ہر کوئی آپ کو گرانا چاہتا ہے۔ میں آپ کے لیے فکر مند ہوں۔“

”تمہیں کیا لگتا ہے میں لے یہ کیا ہوگا؟“ وہ قلم بند کرتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ کارمن نے تھوک نگلا۔ چیرمین سے براہ راست یہ بات ڈسکس

کرنے کی ہمت رپورٹرز کے سوا کسی میں نہیں تھی۔

”سر جب میں یہاں آئی تھی تو آپ سے چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے نصیحت لینے آتی تھی اور آپ.....“ وہ یاد کر کے کہتی میز کے عین سامنے آکھڑی ہوئی۔ ”اور آپ مجھے سچ بولنے کا درس دیتے تھے۔ مجھے رسول اللہ ﷺ کی زندگی سے کوئی چھوٹا سا واقعہ سنا کے کہتے تھے کہ پوچھ کر دلاؤ اور یوں نہ کرو۔ میں اتنا جانتی ہوں کہ جس شخص کو چھوٹی چھوٹی باتوں میں رسول اللہ ﷺ کے واقعات یاد رہیں وہ کبھی اتنا بڑا دھوکا نہیں کر سکتا۔ آپ میرے آئیڈیل رہے ہیں اور میرے ملک کے بہت سے لوگوں کے آئیڈیل ہیں۔ ہم ان باتوں پہ کبھی یقین نہیں کریں گے۔ کسی نے آپ کو وہ کاغذات سائن کرنے کے لیے ٹریک کیا ہوگا۔“ پھر وہ رکی۔ ”آپ یہ بات میڈیا پہ بتا کیوں نہیں دیتے؟ ان لوگوں کے الزامات کا شور مجھے اور آپ کے ووٹرز کو پریشان کر رہا ہے۔“ فاح نے فیک لگائی اور قلم بند کرتے ہوئے مسکرا کے اسے دیکھا۔

”ایک دفعہ ایک بوڑھے کسان کی گھڑی کھو گئی کارمن۔“ وہ نرمی سے کہنے لگا تو کارمن توجہ سے سننے لگی۔ ”اس نے باڑے میں اسے بہت ڈھونڈا مگر وہ نہ ملی۔ وہ تھک گیا تو باہر کھلتے بچوں کے گردہ کو بلایا اور انعام کا وعدہ کر کے انہیں گھڑی تلاش کرنے کو کہا۔ بچے خوش خوش گھڑی ڈھونڈنے ادھر ادھر بھاگے۔“ اس نے ساتھ ہی مگ اٹھایا، گھونٹ بھرا اور اسے واپس رکھا۔

”کئی گھنٹے بچے گھڑی ڈھونڈتے رہے مگر وہ انہیں نہ ملی۔ آخر تھک کے بچے جانے لگے۔ ان کی تعداد گھٹتی گئی۔ یہاں تک کہ سب بچے چلے گئے سوائے ایک کے۔ اس ایک نے ابھی تک گھڑی ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ چپ کر کے بیٹھا رہا تھا۔ جب سب چلے گئے تو وہ تھکے ماندے کسان کے پاس آیا اور پوچھا کہ کیا میں گھڑی تلاش کروں۔ کسان نے فوراً اجازت دے دی۔ وہ باڑے میں گیا



اور چند منٹ بعد گھڑی ڈھونڈ لایا۔“

کارمن کے ابرو استعجاب سے اٹھے مگر وہ خاموش رہی۔ جانتی تھی وہ وجہ بتانے والا ہے۔

”کسان خوش ہونے کے ساتھ حیران بھی ہوا۔ اس نے پوچھا کہ جو کام اتنے گھنٹے تک اتنے سارے بچے نہیں کر سکے وہ تم نے کیسے کر لیا۔ تو اس بچے نے کہا کہ....“ وہ ذرا توقف کے بعد بولا۔ ”کہ زیادہ بچوں کے باعث شور بہت تھا۔ جیسے ہی وہ گئے اور شور تھا باڑے میں خاموشی ہوئی اور اس خاموشی میں گھڑی کی سوئیوں کی ٹک ٹک سننا زیادہ آسان تھا۔ میں نے صرف اس آواز کو تلاشا اس کا تعاقب کیا اور مجھے یہ گھڑی مل گئی۔“

وہ خاموش ہوا تو کارمن نے نا سمجھی سے اسے دیکھا۔

”آپ شور تھمنے کا انتظار کر رہے ہیں تاکہ.... تاکہ وہ اصل آواز سن سکیں جو آپ کو سننی چاہیے۔“  
”دکلا کو اندر بھیج دو اور تم بھی آ جاؤ۔“ وہ مسکرا کے آستین واپس موڑنے لگا۔ یہ طے تھا کہ وہ براہ راست جواب نہیں دے گا۔

کچھ دیر بعد کارمن دیوار کے ساتھ کرسی پہ بیٹھی تھی اور دکلا قانع کے مقابلہ بر اجماع کاغذات کھولے بحث میں لگے تھے۔

”مگر یہ دستخط اصلی ہیں تو آپ مشکل میں ہیں“ قانع۔ ”سینئر وکیل فکر مندی سے کہہ رہا تھا۔“ آپ کی کریڈیٹ بلیٹی ختم ہو رہی ہے۔“

”میری کوئی بے نامی جائیداد نہیں ہے۔“ وہ فیک لگائے اسی سکون سے بولا۔ جوئیر وکیل آگے ہوا اور آواز دھیمی کی۔

”سر..... ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ فراڈ ہے۔ آپ کے نام سے کسی نے دستخط کیے ہیں۔ ہم ایڈم کو عدالت میں لے جاسکتے ہیں اور کلائیڈ اینڈ لی کمپنی کے گواہوں کو خرید سکتے ہیں۔ وہ کورٹ میں بیان دیں گے کہ ایسی کوئی فائل کمپنی کے ڈیٹا میں موجود نہیں ہے۔“

دور بیٹھی کارمن نے نا پسندیدگی سے اسے دیکھا۔ قانع کے تاثرات ویسے ہی تھے۔ پرسکون۔  
”مگر کمپنی اس فائل کی کاپی نکال کے دکھا سکتی ہے۔“

”نہیں سر۔“ جوئیر وکیل پر جوش ہوا۔ ”ایڈم بن محمد کی کتاب کے حصہ دوم کے بعد کلائیڈ اینڈ لی بند ہو گئی ہے اور انہوں نے تمام ڈیٹا تلف کر دیا ہے۔ ایک پراسرار آگ میں۔ آپ اگر اس کمپنی کی ملکیت سے انکار کر دیں تو کوئی بھی آپ کو اس کا مالک ثابت نہیں کر سکتا۔“

”بالکل قانع۔“ سینئر وکیل گویا ہوا۔ ”تمہیں صرف یہ کہنا ہے کہ میں نے یہ کاغذات زندگی میں پہلی دفعہ اب دیکھے ہیں۔ تم ان کو نہیں پہچانتے۔“  
”میں دو دن گزر جانے کے بعد یہ کہوں کہ میں ان کو نہیں پہچانتا؟“

”جی سر۔ دو دن آپ دکلا سے مشورہ کر رہے تھے اور ان کاغذات کے فارنزک کردار ہے تھے۔ اس لیے جواب نہیں دیا۔ پھر ایڈم بن محمد یہ قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔ وہ اس وقت کیس لڑنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ یہ معاملہ چند دن میں دب جائے گا۔ آپ صاف انکار کر دیں۔ بس۔“  
قانع نے وہ فائل اٹھا کے دیکھی جس میں ان کاغذات کی کاپی موجود تھی۔ اسٹیکل کے قریب ایک دھبہ سا تھا۔ سوکھے چیری بلاسم کی پتی کا نشان جو ساتھ ہی فوٹو کاپی ہو گیا تھا۔

وہ اس کو دیکھنے لگا اور منظر بد لئے لگا۔  
وہ سڑک کنارے بیچ پہ بیٹھا تھا..... سڑک پہ سفید اور گلابی چیری بلاسم کے پھولوں کی تہ چھٹی تھی۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اس نے کانوں اور گردن کو مفلر میں لپیٹ رکھا تھا..... سامنے سے ایک بچہ گزر رہا تھا..... اس کے جوتوں سے چھٹکنے کی آواز آتی تھی..... قانع کی نظرین اس کے ہاتھ میں پکڑی کاٹن گینڈی پہ جمی تھیں جس کی اسٹک کو وہ گھما رہا تھا۔ گول.... گول.... کسی سمندر میں بنے بھنور کے وسط



نقطے کی طرح....

عصرہ درخت کے عقب سے نکلی اور اس کے ساتھ بیچ یہ بیٹھی۔ وہ چونکا۔ بے دھیانی میں کانی چھلکی بیروں میں گرا ایک پھول داغدار ہو گیا۔

”مجھے تم سے کچھ مانگنا ہے۔“ وہ کہہ رہی تھی۔  
”صرف ایک دستخط.... میرے لیے..... بنا کوئی سوال پوچھے۔“

”بلینک ڈاکومنٹ؟“

”تمہیں مجھ پہ اعتبار نہیں ہے کیا؟“

”ہین دو۔“ اس نے کہتے ہوئے فائل کھولی۔  
ہوا کا جھونکا آیا اور جھم سے ڈھیروں چیری بلاسم کھلی فائل پہ آگرے۔

”سر!“ وہ چونکا اور سر جھٹکا۔ وکیل کچھ کہہ رہا تھا۔

”آپ ان کاغذات کو واقعی نہیں پہچانتے کیوں کہ....“ وہ کھنکھارا۔ ”میری تفتیش کے مطابق یہ مسز عصرہ نے کلائڈ اینڈ لی میں جمع کروائے تھے۔ انہوں نے شاید آپ سے بلینک ڈاکومنٹ پہ سائن لیے تھے۔“

کونے میں بیٹھی کارمن نے گہری سانس باہر خارج کی۔ اتنے دنوں کی بے کلی تمام ہوئی۔ (تو وہ درست تھی۔ اس کے لیڈر کو اس کی بیوی نے پھنسا یا تھا اور اب وہ مرجھ چکی تھی تو وہ اس کا پردہ رکھ رہا تھا۔)

”تو آپ کا یہ کہنا جھوٹ نہیں ہوگا کہ آپ نے یہ کہنی نہیں بنائی تھی۔“ وکیل کہہ رہا تھا۔ دوسرا بھی کھنکھارا۔

”آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ مسز عصرہ نے کیا ہے۔ یہی سچ ہے آپ ہمیں نہ بتائیں تب بھی ہمیں سب سمجھ میں آ رہا ہے کہ....“

”عصرہ کا نام اس میں نہیں آئے گا۔“ وہ ایک دم سختی سے بولا۔ ”یہ دستخط میں نے ہی کیے ہیں۔ خود کو بچانے کے لیے میں اپنی مرحوم بیوی کو ولن بنا کے نہیں پیش کر سکتا۔“

”بے شک آپ نے دستخط کیے ہیں مگر آپ کو

علم نہیں تھا سر کہ یہ کاغذ کس لیے استعمال ہوگا۔ آپ سے غلطی ہوئی ہے جرم نہیں۔“ جو نیئر وکیل نے زور دیا۔ ”اور ان کاغذات کی قانونی حیثیت بھی ثابت نہیں ہوگی۔ ہمیں صرف اخلاقی گراؤ ٹڈی پہ اس بحث کو جیتنا ہے۔ آپ لوگوں کو صرف اتنا بتادیں کہ یہ آپ کی بیوی نے آپ سے کروایا تھا تو یہ معاملہ ختم ہو جائے گا۔ آپ ملک کے اگلے وزیر اعظم ہیں سر۔“

”عوام کو اپنے لیڈر سے بہت محبت ہوتی ہے۔ وہ اس کی غلطیوں کو جسطافائی کرنے کے بہانے کے خطرہ ہوتے ہیں۔ اس کی بیوی مشیر دوست کسی اور کو اس کے لیے قربان کرنے کو تیار رہتے ہیں۔“  
”عصرہ کا نام بیچ میں نہیں آئے گا۔“ وہ سختی سے بولا۔ آفس میں ایک افسوس ناک خاموشی پھیل گئی۔

”پھر آپ کہہ دیں کہ آپ نے یہ کاغذات کبھی نہیں دیکھے۔ مہینے لگ جائیں گے انہیں یہ ثابت کرنے کے لیے کہ....“

”یہ جھوٹ ہے۔ میں نے یہ کاغذات دیکھے تھے اور خود سائن بھی کیے تھے۔“

”مگر ہم سب جانتے ہیں کہ مسز عصرہ نے دھوکے سے وہ سائن کروائے تھے۔“

فاح کوٹ کا بٹن بند کرتے ہوئے اٹھا اور ان کو جانے کی اجازت دی۔ دکلاء مزید نصحتوں کے ساتھ رخصت ہوئے مگر کارمن کھڑی رہی۔ فاح نے اسے دیکھا تو وہ قریب آئی اور اس کے سامنے رک گئی۔

”آپ صرف مسز عصرہ کو نہیں بچا رہے۔ آپ یہ اعتراف نہیں کرنا چاہتے کہ آپ اتنے سمجھ دار ہو کے بھی بلینک ڈاکومنٹ پہ کیسے سائن کر سکتے ہیں۔ یوں آپ۔ اور بے وقوف لگیں گے ہے نا۔“ وہ اس کی نفسیات کو سمجھنا چاہ رہی تھی۔

”انسان فیملی کے لیے بہت کچھ کرتا ہے کارمن۔“

”مگر اس وقت آپ کو اپنے لیے کچھ کرنا ہے۔“



مسز عمرہ کی فکر نہ کریں۔ آپ نے کوئی جرم نہیں کیا۔ اپنے سر پہ وہ الزام نہ لیں جس میں آپ کا تصور نہیں ہے۔“ وہ تاسف سے اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”پلیز سر لوگوں کو سچ بتادیں۔ سچ آپ کو بچالے گا۔“

وہ دونوں میز کے دونوں سروں پہ کھڑے تھے اور وہ ٹا صحنہ انداز میں کہہ رہی تھی۔

”کیا تم مجھے نصیحت کر رہی ہو؟ کارمن؟“ وہ پتا نہیں کیوں مسکرایا۔

”جی۔ کیونکہ آپ ہی سارا وقت ہم سب کو نصیحتیں کرتے آئے ہیں۔ جب میں کوئی مسئلہ لے کر آتی تھی تو آپ کہتے تھے کہ اللہ کے رسول ﷺ خوشی اور غم میں ہمیشہ سچ بولنے کی تلقین فرماتے تھے۔ یہی تو آپ کا امتحان ہے کہ اس موقع پہ آپ سچ بولتے ہیں یا نہیں۔“

”سچ بولنے کے نتائج ہوتے ہیں کارمن۔“ اسے پہلی دفعہ فاتح کی آنکھوں میں زخمی پن نظر آیا۔ اس کا دل دکھ گیا۔

”تو پھر آپ کیا کریں گے سر؟“

”خاموشی سے گھڑی کی سوئیوں کو سننے کا انتظار۔“ وہ وہیں کرسی پہ بیٹھا اور صینک اٹھاتے ہوئے فائل کھول لی۔ یہ اشارہ تھا کہ کارمن اب جا سکتی ہے۔ وہ مجھے دل کے ساتھ باہر آگئی۔

☆☆☆

ملا کہ اس دوپہر ٹھنڈی دھوپ میں چپک رہا تھا۔ شاہراہ پہ ٹریفک زور و شور سے رواں دواں تھی۔ ایسے میں ایک فون بوتھ کے اندر کھڑا ایڈم ریسورکان سے لگائے بات کرتا نظر آ رہا تھا۔ اس نے سر پہ پی کیپ پہن رکھی تھی اور چہرے پہ فکر مندی کے واضح آثار تھے۔

”تمہاری ماں شہر چھوڑنے کے لیے راضی نہیں تھی مگر....“ دوسری جانب اس کا باپ کہہ رہا تھا۔ ”آج صبح....“

”میں جانتا ہوں آج صبح کیا ہوا ہے۔ مجھے

اطلاع مل گئی ہے۔“ وہ تلخی سے کہہ رہا تھا۔ ”وہ لوگ ہمارے گھر تک آن پہنچے ہیں۔“

”وہ ہمیں مارنا نہیں چاہتے تھے۔ گولیوں سے صرف کھڑکیوں کے شیشے توڑے اور جلے گئے۔“

”گولیاں اندھی ہوتی ہیں۔ کسی کو لگ جائیں تو نیت بے معنی ہو کے رہ جاتی ہے۔“ وہ غصے بھری بے بسی سے کہہ رہا تھا۔ ”باپا..... پلیز.... آپ.....“

”میں جانتا ہوں۔ میں نے تمہاری ایبو کو سمجھایا ہے۔ ہم آج ہی کے ایل چھوڑ کے جا رہے ہیں۔ مگر تم.....“

”میں آپ کے ساتھ نہیں آ سکتا۔ یہ میرا دوست جس کے گھر پہ اس وقت میں کال کر رہا ہوں یہ آپ کو بحفاظت گاؤں پہنچا دے گا۔ میرا آپ سے دور رہنا بہتر ہے کیونکہ ٹارگٹ میں ہوں۔ میں دور رہوں گا تو وہ آپ کی طرف نہیں آئیں گے۔“ پھر خیال آیا۔ ”آپ کو اس گھر میں آتے کسی نے دیکھا تو نہیں؟“

”نہیں۔ تمہارا دوست مجھے بازار میں ملا تھا اور احتیاط سے یہاں لایا تھا کیونکہ تم نے کال کرنی تھی۔“ محمد صاحب نے وقفہ دیا۔ ”ایڈم.... ہم تمہارا انتظار کریں گے۔ جب یہ لوگ تمہارا پیچھا چھوڑ دیں تو ہمارے پاس چلے آنا۔ تم ہماری ساری زندگی کی کمائی ہو۔“

ایڈم کی ہلکی بھگنے لگیں۔ ”میں آ جاؤں گا“ باپا۔ بس پہلے مجھے کچھ کام کرنے ہیں۔“ اس نے فون رکھا اور آنکھیں بند کیں۔ ٹوٹے دل کا ایک آنسو دل پہ ہی گر کے جذب ہو گیا۔ کیا وہ زندہ سلامت اپنے ماں باپ کے پاس واپس جاسکے گا؟ اسے اب یقین نہیں رہا تھا۔

وہ ابھی تک تالیہ کو ڈھونڈ نہیں پایا تھا۔ تالیہ دوسری دفعہ کھوئی تھی اور دونوں دفعہ وہ اسے تلاش کرنے میں ناکام ٹھہرا تھا۔

کیسا دوست تھا ایڈم بن محمد؟ وہ سچ کہتی تھی کہ اگر اس کی جگہ ایڈم کو کچھ ہوتا تو



وہ کیا کچھ نہ کر ڈالتی۔ وہ کبھی آرام سے نہ بیٹھتی اور....

ایڈم نے چونک کے آنکھیں کھولیں۔ وہ چمکی دھوپ میں ہنوز فون بوتھ میں کھڑا تھا۔ شیشے کے بند ڈبے میں اور اس کے دونوں اطراف میں گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ مگر اسے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

اس نے موبائل نکالا اور فلاح کو پیغام لکھا۔  
”مجھے معلوم ہے بچے تالیہ کو کیسے ڈھونڈنا ہے۔“  
داتن کی طرح وہ تالیہ سے رابطے کے طریقے نہیں جانتا تھا۔ مگر وہ ”تالیہ“ کو جانتا تھا۔ اور جو وہ جانتا تھا وہی اسے تلاش کرنے کی تھی۔

☆☆☆

کتابوں کا مقبرہ موم بتیوں سے نیم روشن تھا۔ ایک بلب بھی کونے میں جل رہا تھا، جس کے نیچے زمین پر اکڑوں بیٹھی تالیہ ایک کتاب کی ورق گردانی کرتی دکھائی دے رہی تھی۔ آج اس کے کپڑے مختلف تھے۔ اس نے سیاہ ٹراؤزر پہ کھلے بازوؤں والی بھوری قمیص پہن رکھی تھی اور بال پونی میں بندھے تھے۔ چہرہ ویسا ہی بے رونق تھا اور کتاب پکڑے ہاتھوں میں سرخ یا قوئی انگوٹھی دکھائی دیتی تھی۔

آہٹ یہ اس نے نظریں اٹھائیں تو ذوالکفلی اوپری زینے پر کھڑا تھا۔ اتنی دور سے وہ اس کی کتاب کا سرورق نہیں دیکھ سکتا تھا مگر تالیہ نے پھر بھی نامحسوس انداز میں کتاب نیچے کی۔

”کیا ہوا؟“ (اور کتاب پیچھے گول مول رکھے لحاف میں چھپائی۔)

”تمہارا دوست..... ایڈم..... وہ ایک خط چھوڑ گیا ہے۔“ ذوالکفلی نے خط اوپری زینے پر رکھا اور خود مڑ گیا۔ تالیہ کتب خانے کے دوسرے سرے پر تھی۔ اس کے اور زینوں کے درمیان طویل فاصلہ حائل تھا۔

”تم مجھے یہ دینے نیچے بھی آ سکتے تھے۔“ اس

نے ہنسی چڑھا کے اس فاصلے کو دیکھا۔

”پھر تمہیں کیسے علم ہوگا کہ تم اس خط کو پڑھنے کے لیے کتنی بے تاب ہو۔“

وہ بے نیازی سے کہہ کے واپس اوپر چلا گیا اور ٹریپ ڈور بند کر دیا۔

تالیہ تیزی سے اٹھی اور دوڑ کے زینوں تک آئی۔ پھر دھڑکتے دل سے زینے پھلاکتی گئی۔ لکڑی کے چٹخنے کی ہلکی ہلکی سی آواز آتی تھی۔

اوپری زینے پہ بیٹھ کے اس نے خط اٹھایا اور کھولا۔

”ذوالکفلی۔“

میں نہیں جانتا کہ آپ میرا یہ خط بچے تالیہ تک پہنچا سکتے ہیں یا نہیں کیونکہ آپ شاید سمجھتے ہوں کہ میں بچے تالیہ کو اس لیے تلاش چاہتا ہوں تاکہ ان کو سرینڈر کرنے کا مشورہ دے سکوں۔ جبکہ ایسا نہیں ہے۔

اسے میری خود غرضی کہہ لیں یا کیا، مگر میں ان کو اپنے لیے ڈھونڈنا چاہتا ہوں۔ میں مشکل میں ہوں۔

میری جان کو خطرہ ہے۔ مجھ پر قاتلانہ حملے بھی ہو چکے ہیں اور میرے ماں باپ کو گے ایل چھوڑنا پڑ گیا ہے۔

مجھے نہیں معلوم میں اپنی زندگی کے لیے کیا کروں۔ میں بالکل بھی وہ سیریلی ریپورٹر نہیں رہا جو عوام کو چند ماہ سے دیکھنے کو مل رہا ہے۔ میں ایک کم ہمت اور جلدی ہار مان جانے والا وہی باڈی مین بن گیا ہوں جو بچے تالیہ کو پہلی دفعہ ملا تھا۔ مجھے ان کی ضرورت ہے۔

میں آج رات گیارہ بجے ان کا اسی جگہ انتظار کروں گا جہاں وقت میں سفر سے پہلے ہم ملے تھے اور تب تک انہوں نے مجھ سے سچ نہیں بولا تھا۔

نقطہ شاہی مورخ۔“

اس نے خط واپس لے لیا اور گہری سانس لی۔



رواق لے گئے تھے۔ وہ اپنی اسٹڈی میں تنہا بیٹھا تھا۔ وہ کہیاں میز پر جمائے لیپ ٹاپ پر کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔ اس کے تاثرات سنجیدہ اور سچاٹ تھے۔ ان سے اندرونی جذبات کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔

وہ تحریر مختصر تھی۔ ختم کر کے اس نے پرنٹ کا بٹن دبایا۔ پرنٹر زوں زوں کی آواز کے ساتھ اس کے الفاظ سے ایک کورا صغہ رنگین کرتا گیا۔ کاغذ کو باہر آنے میں چند لمحے لگے۔ یہ چند لمحے بہت بھاری تھے۔

پھر اس نے قلم کی نوک صفحے کے نچلے حصے پر رگڑی۔ نوک نے سیاہی کو اس کے دستخط میں تبدیل کیا اور سارے فیصلے خود بخود ہوتے گئے۔

اس نے سیاہی کو سوکھنے دیا۔ پھر ست روی سے اس کاغذ کو تہ کیا۔ لفافے میں ڈالا۔ اور اس پہ لکھا ”کارمن..... پرائیوٹ اینڈ کانفیڈنشل۔“ پھر اسے سیل کیا اور گھنٹی بجائی۔

چند لمحوں بعد بلر نے اندر جھانکا۔ ”جی سر؟“ ”یہ لفافہ میں اسٹڈی کے پہلے دراز میں رکھ رہا ہوں۔ کل ویک اینڈ ہے۔ تم سوموار کی صبح اسے کارمن کے حوالے کرو گے۔ یہ ایک امانت ہے۔“ ”آپ کہیں جارہے ہیں سر؟“

”میں سوموار تک واپس آ جاؤں گا۔ امید ہے۔“ توقف کے بعد اضافہ کیا۔

بھاری لفافہ دراز میں رکھ کے اس نے دراز بند کی تو گویا سارے فیصلے خود بخود ہوتے گئے۔

☆☆☆

ملکہ یان سوفو کا کنواں رات کے اس پہر ویران پڑا تھا۔ سیاح دن کے وقت آتے تھے اور اب گیٹ بند ہونے لگے تھے۔ پھر بھی اندر داخل ہونے والے رانستے نکال لیتے تھے۔

یہ ایک قدیم طرز کا کھلا ہوا سامان تھا جس کے وسط میں کنواں بنا تھا۔ احاطہ ویران پڑا تھا اور اوپر آسمان خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

احاطے کے ایک طرف دیوار میں راستہ تھا جو

پھر گھڑی پہ وقت دیکھا۔ گیارہ بجتے میں ابھی کافی وقت تھا اور اب... ایڈم کی اس ”مدد کی پکار“ کے بعد اگر وہ تالیہ مرادھی تو وہ اس کو تنہا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔

اس نے چہرہ گھٹنوں پہ نکا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

وہی یاد نظروں کے سامنے چلنے لگی۔

وہ ریسٹوران کے مینوئی جھونپڑے میں داتن کے سامنے بیٹھی تھی... دونوں کی قہوے کی پیالیاں گرم تھیں۔

”تم..... تم ٹھیک ہو داتن؟“

”یہ کینسر کی دوا ہے اور یہ بوتل تمہاری ہے۔ تم کینسر کی دوا کیوں لے رہی ہو؟“

”تم سن کے ہرٹ ہوگی۔ اسی لیے میں نے تم سے چھپایا۔“

پیانو تیز ہو گیا۔ کاؤنٹر پہ کھڑا تاؤ ٹھک ٹھک سوٹی رول کو چھرے سے کاٹنے لگا۔ دیوار پہ ابھی تک پھول گرتے نظر آ رہے تھے۔ اور سوٹی رول کٹنے کی آوازیں..... ٹھک ٹھک ٹھک.....

تالیہ نے آنکھیں کھولیں تو خود کو تہ خانے کے زینے پہ بیٹھے پایا۔ اس نے پھر سے گھڑی دیکھی۔ گیارہ بجتے میں کافی وقت تھا۔

اسے یاد تھا وہ دونوں کہاں ملے تھے۔ ملکہ یان سوفو کے کنویں پہ جہاں ایڈم نے اسے سکھ اچھالنے کو کہا تھا کیونکہ جو سکھ اچھالتا ہے وہ ملاکہ دوبارہ واپس ضرور آتا ہے۔ اور تالیہ نے سکھ نہیں اچھالا تھا۔ پھر بھی وہ ملاکہ واپس آگئی تھی۔ کئی دفعہ۔

ایک دفعہ پھر اسے اس کنویں پہ جانا تھا۔ ایڈم کے لیے۔ وہ اسے تنہا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔

☆☆☆

مغرب کی نیلا ہٹ دان فاتح کی رہائش گاہ پہ پھیلی تھی۔ اس کا گھر سونا اور ویران سا لگتا تھا۔ وہاں ایسی خاموشی تھی جیسی ان عجائب گھروں میں ہوتی ہے جہاں بچوں کا داخلہ منع ہوتا ہے۔

اس کے بچے چلے گئے تھے اور وہ گھر کی ساری



مندرجہ کی طرف جاتا تھا۔ اس کی چوکھٹ پہ ایک ہیولہ سا کھڑا تھا۔ سیاہ لبادے پہ سیاہ ہڈ پہنے ایک لڑکی جو احتیاط سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

وہ اندر نہیں جا رہی تھی۔ اسے کچھ دیر یہیں چھپ کے ایڈم کا انتظار کرنا تھا۔ ایڈم کو سامنے سے آتا تھا اور وہیں سے گزر کے کنویں تک جاتا تھا۔ وہ پہلے اسے اندر آنے دینا چاہتی تھی۔

دفعتاً ہلکی سی آہٹ ہوئی۔ پھر قدموں کی آواز آئی۔ آواز کافی واضح تھی جیسے نووارد کو چھپنے یا ملاقات کو خفیہ رکھنے میں دلچسپی نہ ہو اور وہ اعتماد سے چلتا آ رہا ہو۔

تالیہ کی اندھیرے میں دیکھتی آنکھیں اچنبھے سے چھوٹی ہوئیں۔

یہ ایڈم کے چلنے کا انداز نہ تھا۔ اور اگلے ہی لمحے اس کی آنکھیں بے یقینی سے پھیلیں۔

وان فائغ احاطے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس نے سیاہ پینٹ پہ سیاہ جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اور جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ ادھر ادھر دیکھتا کنویں کی طرف بڑھ رہا تھا۔

وہ دم سادھے اسے دیکھے گئی۔ وہ کنویں تک آیا اور اس کی منڈیر کے کنارے پہ بیٹھا۔ کنویں کی سطح جالی سے ڈھکی تھی۔ وہ مڑ کے جالی کے نیچے گہرے کنویں کو دیکھ کے بولا۔

”باہر آ جاؤ تالیہ۔۔۔ مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“

اس کا انداز پرسکون تھا۔ اس میں تحکم بھی تھا اور اپنائیت بھی۔

تالیہ کے حلق میں کچھ اٹکنے لگا مگر اس نے تھوک نگلا اور سارے آنسو اندر اتارے۔ پھر ہڈ چبھے کو گرائی اور باہر آئی۔ اندھیرے سے چاندنی کا سفر اس نے لمحوں میں کیا۔ یہاں تک کہ وہ اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

وہ منڈیر پہ بیٹھا ابھی تک گردن موڑے کنویں کے اندر جھانک رہا تھا۔

”یہ ملاکہ کی ایک ملکہ یاں سو فو کا کتواں تھا جو اس کے لیے سن باؤ وائیگ لی نے تعمیر کروایا تھا۔ یاں سو فو شاہ چین کی بیٹی تھی اور ملاکہ میں وہ خود کو اجنبی محسوس کرتی تھی۔ غیر فارز۔“

کہتے ہوئے اس نے گردن موڑی اور مدھم مسکراہٹ کے ساتھ سامنے کھڑی تالیہ کو دیکھا جو جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے چپ چاپ اسے دیکھ رہی تھی۔ سیاہ بال بونی میں بندھے تھے اور چہرے سے وہ مرجھائی ہوئی لگتی تھی۔

”تم نے جو سونے میں لکھی کتاب مجھے پڑھنے کے لیے دی تھی اس میں لکھا تھا کہ ملکہ یاں سو فو ملاکہ میں کسی پہ اعتبار نہیں کرتی تھی۔ وہ ہر ایک کو اپنا دشمن سمجھتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ہمیشہ خود کو خود بچائے کیونکہ اس کا ماننا تھا کہ کوئی کسی کو بچانے نہیں آتا۔“

”کوئی کسی کو بچانے آیا بھی نہیں کرتا۔“ وہ طعنی سے زرب لب بولی مگر منڈیر پہ بیٹھے شخص نے سن لیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں واضح فکر مندی ابھری تھی۔

”مگر۔۔۔ کبھی تو۔۔۔ کبھی تو تالیہ! انسان کو دوسروں کو موقع دینا چاہیے کہ وہ اسے بچائیں۔ کیا ایک دفعہ تم وان فائغ پہ اعتبار نہیں کر سکتیں؟“

وقت گھم گیا۔ کتواں خاموش تھا اور آسمان پہ چاندنی پھیلی تھی۔ اس چاندنی کے ہالے میں فائغ کا چہرہ روشن دکھائی دیتا تھا۔

”کیا ایک دفعہ تم مجھے اپنی مدد نہیں کرنے دے سکتیں؟“

وہ آہستہ سے اس کے ساتھ بیٹھی۔

بہت کچھ یاد آیا۔ کبھی وہ ابوالخیر کی حویلی کی منڈیر پہ یونہی بیٹھتے تھے اور قدیم ملاکہ کو اپنے سامنے پھیلے دیکھتے تھے۔ مگر سارا مسئلہ یہی تھا کہ اسے سب یاد تھا اور فائغ کو (اس نے چہرہ موڑ کے زخمی نظروں سے اسے دیکھا۔) فائغ کو کچھ یاد نہیں تھا۔

”ایڈم۔۔۔ کیوں نہیں آیا؟“ وہ بولی بھی تو یہ۔ یوں لگتا تھا ایک زمانے بعد وہ اس سے ملی ہے۔



آگئے۔ یقیناً کسی نے نعلی دستخط کیے ہوں گے۔ مگر..... مگر پھر مجھے احساس ہوا کہ شاید وہ آپ نے ہی کیے ہوں۔ کورے کاغذ پہ۔“

اسی نے چہرہ موڑ کے فاتح کی آنکھوں میں دیکھا اور نچی سے مسکرائی۔

”مسز عصرہ نے آپ سے کورے کاغذ پہ دستخط لیے تھے؟“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ دستخط تو میرے ہی ہیں۔“ وہ سادگی سے شانے اچکا کے بولا۔

”فرق پڑتا ہے۔“ وہ افسوس سے بولی۔

”آپ مسز عصرہ کو کور کرنے کے لیے سارا الزام اپنے سر نہیں لے سکتے۔ یہ جھوٹ ہوگا۔ آپ کو لوگوں کو حقیقت بتانی پڑے گی۔“

”میرے دو بچے ہیں تالیہ۔“

”وہ سروائیو کر لیں گے۔ آپ ان کے ساتھ ہوں گے تو وہ ہر چیز برداشت کر لیں گے۔ پلیز اپنا کیریئر اس جرم کے لیے تباہ نہ کریں جو آپ نے نہیں کیا۔“

”اور اتنے لوگوں کے نام سامنے آئے، ان کا کیریئر تباہ نہیں ہوا۔ کیونکہ وہ لیڈر نہیں ہیں۔ مگر آپ کے لیے لوگوں کے چمانے مختلف ہیں۔ وہ آپ کو عظمت اور سچائی کے جس معیار پہ بٹھا چکے ہیں وہ آپ کو اس سے نیچے برداشت نہیں کر پائیں گے۔ اس جرم کو تسلیم کرنے سے آپ اپنے لوگوں کا اعتبار کھو دیں گے۔ ہم دونوں جانتے ہیں کہ آپ سے دھوکے سے سامن کروائے گئے تھے۔ پلیز فاتح.... خود کو بچائیں۔“

وہ تالیہ کو دیکھ کے نرمی سے مسکرایا۔

”آج تم میری چیف آف اسٹاف کی طرح بول رہی ہو۔ کیا تم اپنی جاب کو مس کر رہی ہو؟“

شہزادی کے تاثرات بدلے۔ ماتھے پہ ہل پڑا اور ناک نخوت سے سکڑی۔

”مشورہ دے رہی ہوں۔ مفت تھا۔“ اور

”اسے نہیں آتا تھا۔ اس کو یہ ملاقات کروانے کے لیے میں نے کہا تھا۔“ وہ سادگی سے کہہ رہا تھا۔ وہ دم سادھے اسے دیکھے گئی۔

”آپ کو میری ای میل مل گئی تھی؟ اسی لیے آپ نے اس دن کہا تھا کہ میں بھاگ جاؤں؟“

”مجھے تمہاری بے گناہی پہ یقین کرنے کے لیے اس ای میل کو پڑھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ جس تالیہ کو میں جانتا ہوں جو اتنے مہینوں تک میرے لیے کام کرتی رہی ہے وہ کسی کو قتل نہیں کر سکتی۔“

تالیہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور اس کا دل ڈوب سا گیا۔ وہ صرف اپنی چیف آف اسٹاف کو جانتا تھا۔ وہ شہزادی تالیہ کو نہیں جانتا تھا۔

”آپ کو واقعی میرا یقین ہے۔“

”ہاں۔ میں نہیں جانتا عصرہ کو کس نے مارا ہے مگر....“

”انہوں نے خودکشی کی ہے۔“ وہ ایک دم بول پڑی۔ فاتح کے ابرو اکٹھے ہوئے۔

”ایسا نہیں ہو سکتا۔“

”نہ یقین کریں۔ آپ کو تو اس بات کا یقین بھی نہیں آئے گا کہ مسز عصرہ نے ہی آریاناہ کو....“

اس نے نچی سے کہہ کے سر جھٹکا اور سامنے اندھیرے میں ڈوبی خستہ حال دیوار کو دیکھنے لگی۔

”مجھے ذوالکفلی نامی آدمی نے وہ تحریر دی تھی جو میں تمہارے لیے اس کے حوالے کر کے گیا تھا۔ اس رات میں جو میری یادداشت سے کھو چکی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کتنا سچ اور کتنا جھوٹ ہے مگر میں عصرہ کے بارے میں بات کرنے نہیں آیا۔“ اس کا لہجہ قطعی تھا۔ تالیہ چپ چاپ سامنے دیکھ رہی تھی اور وہ اس کو۔

”میں تمہارے بارے میں بات کرنے آیا ہوں۔“

”آپ اس اسکیٹل سے خود کو کیوں نہیں نکالتے؟“ تالیہ نے جیسے سنا ہی نہیں تھا۔ ”میں کافی دن سوچتی رہی کہ ان کاغذات پہ آپ کے دستخط کیسے

ہوں۔“

”آپ اس اسکیٹل سے خود کو کیوں نہیں نکالتے؟“ تالیہ نے جیسے سنا ہی نہیں تھا۔ ”میں کافی دن سوچتی رہی کہ ان کاغذات پہ آپ کے دستخط کیسے

ہوں۔“

”آپ اس اسکیٹل سے خود کو کیوں نہیں نکالتے؟“ تالیہ نے جیسے سنا ہی نہیں تھا۔ ”میں کافی دن سوچتی رہی کہ ان کاغذات پہ آپ کے دستخط کیسے

ہوں۔“



کندھے اچکا کے ناراضی سے سامنے دیکھنے لگی۔

”افسوس ہو رہا ہے مجھے آپ کے لیے۔ آپ اتنے عقل مند ہو کر بغیر سوال و جواب کے کسی کے دیے بلینک ڈاکومنٹ پہ کیسے دستخط کر سکتے ہیں؟ یا اللہ!“

فاح نے جواب نہیں دیا۔ وہ بھی سامنے موجود اس کھنڈر زدہ دیوار کو دیکھے گیا۔

”تم کبھی ہانامی کے دنوں میں جاپان گئی ہو؟“

”چیری بلاسم سیزن میں؟ نہیں..... مگر میں نے ملائیشیاء میں ساکورا کے پھولوں کو گرتے دیکھا ہے۔“

”میں نے بھی۔“ وہ خاموش ہو گیا۔ ارد گرد پھیلا اندھیرا بل بھر کے لیے چھٹ سا گیا۔

”کیا سوچ رہے ہیں؟“ تالیہ کی آواز پہ وہ چونکا۔

”یہی کہ اس نے کاغذات سائن کروانے سے پہلے کیا کہا تھا۔“

وہ دونوں اندھیرے کنویں کے دہانے پہ بیٹھے تھے اور سامنے کالی زدہ خستہ حال دیوار انہیں دیکھ رہی تھی۔

”کیا کیا تھا؟“ تالیہ نے گردن موڑ کے اس کا چہرہ دیکھا۔ فاح کافی دیر خاموش رہا۔ اتنی دیر کہ تالیہ اپنا سوال بھول گئی۔

”تم جانتی ہو چیری بلاسم کس شے کی علامت ہیں؟“

”جوانی میں جلد مر جانے کی؟“

”ہاں اور نزاکت کی بھی۔ یہ اتنا نازک ہوتا ہے کہ زیادہ دیر موسم کی سختی برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ مار مان جاتا ہے اور گر جاتا ہے۔ شاید اس لیے کہ یہ کسی اور کو منوع نہیں دیتا کہ وہ اسے بچا لے۔ یہ صرف خود پہ ہی انحصار کرتا ہے مگر کوئی بھی انسان ہر دفعہ اپنے آپ کو خود ہی نہیں بچا سکتا۔“

”میں چیری بلاسم نہیں ہوں تو انکو۔“ عرصے بعد وہ لفظ منہ سے نکلا۔

”مگر تم چیری بلاسم کی طرح زمانے کی ساری سختی کو اکیلے جھیلنے کا فیصلہ کر چکی ہو۔ ایسے تم گر جاؤ گی تالیہ۔ ختم ہو جاؤ گی۔“

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کے کہہ رہا تھا۔ سارے موسم رک گئے تھے۔ وقت ان کے آس پاس ٹھہر گیا تھا۔

”ہر انسان کو اپنے آپ ہی بچانا پڑتا ہے۔“

”ہر دفعہ ایسا نہیں ہوتا۔“ وہ زور دے کر بولا۔ ”تم زندگی کے سارے مسئلوں سے اکیلے نہیں لڑ سکتیں۔ فیملی، دوست، یہ سب کس لیے ہوتے ہیں اگر یہ ہمارے ساتھ ہماری جنگیں نہ لڑ سکیں؟“

”مگر ہر انسان اکیلا ہی ہوتا ہے۔ اسے....“

”ایک دفعہ“ تالیہ.... ایک دفعہ تم مجھے خود کو بچانے دو۔“ وہ اس کی طرف ترچھا رخ موڑے زور دے کر کہہ رہا تھا۔ ”ایک دفعہ تم ہر کسی کو اپنی زندگی سے شٹ آؤٹ کرنے کے بجائے مجھے اپنی مدد کرنے دو۔“

”آپ مجھے اس میں سے نہیں نکال سکتے۔“

اس کی آنکھیں بھگنے لگیں۔ ”مسز عصرہ مجھے بہت برا پھنسا گئی ہیں۔“

”میں تمہیں اس میں سے نکال سکتا ہوں اگر تم مجھ پہ اعتبار کرو۔“

”آپ کیا کر سکتے ہیں؟“

”تم مجھ پہ اعتبار تو کر کے دیکھو۔ میں سب ٹھیک کر لوں گا۔“ وہ دھیمی آواز میں قطعیت سے کہہ رہا تھا۔

”اچھا..... آپ بتائیں کیا کروں میں؟“

تالیہ نے کندھے اچکائے۔

”میں نے اس وقت تمہیں کہا تھا کہ بھاگ جاؤ کیونکہ تم غلط وقت پہ غلط جگہ موجود تھیں، مگر میرا خیال تھا کہ تم وہاں سے گھر جاؤ گی اور.... جب پولیس آئے گی تو تم....“

”تو میں گرفتاری دے دوں گی؟“ اس کی آنکھیں بے یقینی سے کھلیں۔



”تمہیں اپنا بیان دینا چاہیے تھا۔ وکیل اگلے روز تمہاری ضمانت کروالیتا۔ تم اس سب کا سامنا کر سکتی تھیں بجائے بھاگنے کے۔ تم اب بھی یہ کر سکتی ہو۔“

وہ بے بسی بھرے اصرار سے کہہ رہا تھا۔ ”اب بھی“ کے الفاظ پہ تالیہ بدک کے کھڑی ہوئی اور دو قدم پیچھے ہٹی۔

”آپ چاہتے ہیں میں اس جہنم میں دوبارہ چلی جاؤں جہاں سے میں اتنی مشکل سے نکلی تھی؟ میں مصر تک گئی..... اتنی دور..... اپنی آزادی خریدنے.... اور وہاں بھی میں اتنے دن اس خوف سے لڑتی رہی جو اس قید خانے نے میرے دل میں بٹھا دیا تھا۔ اور آپ چاہتے ہیں کہ میں دوبارہ اس میں چلی جاؤں؟“

”کیا تم ایک دفعہ میرا اعتبار نہیں کر سکتیں؟“ وہ بھی کھڑا ہو گیا اور افسوس سے اسے دیکھا۔ ”مجھے موقع دو خود کو بچانے کا۔ میں تمہیں اس سب سے نکال لوں گا۔“

مگر تالیہ مراد نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں دوبارہ اس جہنم میں نہیں جاؤں گی۔“ وہ ایک دم ہراساں نظر آنے لگی تھی۔

”تو تم کیا کرو گی؟ تم ملک سے باہر نہیں جا سکتیں۔ تم مجھ سے دن کی روشنی میں نہیں مل سکتیں۔ تم سر اٹھا کے یہاں چل نہیں سکتیں۔ تم ہر ایک سے کٹ کے خوف سے بھاگتے ہوئے کیسے زندگی گزارو گی؟“

”دولت کی قید میں جانے سے پہلے میں اپنی اس زندگی کو ختم کرنا بہتر سمجھوں گی۔“ وہ غرا کے بولی اور پھر سناٹا چھایا گیا۔

وان فارح کے چہرے پہ بے یقینی ابھری۔ پھر اس نے سر جھٹکا۔

”کم از کم تم اپنی زندگی خود ختم نہیں کر سکتیں۔“ اس نے جیسے ماننے سے انکار کیا۔

”کیوں سمجھتے ہیں آپ سب مجھے اتنا بہادر اور مضبوط؟ کیوں لگتا ہے آپ کو کہ تالیہ مراد آپ اپنی

زندگی سے مایوس نہیں ہو سکتی؟“ اسے اس بات نے غصہ دلایا تھا۔

اور اسی وقت باہر شور سا مچا۔ جلتی بجھتی نیلی سرخ بتیاں پولیس کے سائین۔ تالیہ چونکی اور پھر..... اس نے بے یقینی سے فارح کو دیکھا۔

”آپ مجھے پکڑوانے آئے تھے؟ آپ نے..... آپ نے پولیس بلالی۔“

”فارح گاڈ سیک! میں نے نہیں بلایا ان کو۔ شاید وہ کسی طرح میری لوکیشن ٹریک کر رہے ہوں گے۔“ مگر تالیہ نے بے یقینی سے اسے دیکھتے ہوئے ہڈ سر پہ گرائی۔ ”آپ مجھے گرفتار کروانا چاہتے ہیں؟ کیا آپ نے دولت سے ساز باز کر رکھی تھی؟ اور میں ایڈم پہ اعتبار کر کے یہاں چلی آئی۔“

”نہیں تالیہ۔“ وہ زور دے کر بولا۔ ”پلیز..... مت جاؤ۔ ان کا سامنا کرو۔ تم بے گناہ ہو! میں تمہیں بچالوں گا۔“

مگر وہ مڑ چکی تھی۔ اس کے قدم دیوار کی طرف اٹھ رہے تھے۔ کنویں کے پاس کھڑا شخص بے بسی سے آخری دفعہ بولا۔

”تالیہ.... مت جاؤ..... میرے ساتھ رہو۔“ وہ الفاظ..... وہ لہجہ..... وہ اس کے دل کو دھکا دے گیا مگر اس کے قدم اب نہیں ہٹ سکتے تھے۔ چند لمحوں میں وہ دیوار پھاند کے اندھیرے میں غائب ہو چکی تھی اور وان فارح تنہا کھڑا رہ گیا تھا۔

کچھ ٹاپے یوں ہی گزر گئے پھر وہ احاطے سے باہر نکلا اور مرکزی ہال تک آیا جہاں بارہ دری بنی تھی۔ اس کی چوکھٹ پہ رکن کے اس نے باہر سڑک کی طرف دیکھا۔

سڑک کنارے کسی کا ایکسڈینٹ ہوا تھا اور وہاں ایک ایسبولینس کھڑی دکھائی دے رہی تھی جو زخمی کو لینے آئی تھی۔ ساتھ میں پولیس کی ایک بائیک بھی موجود تھی۔

”اوہ تالیہ!“ اس نے کراہ کے آنکھیں بند کیں اور افسوس سے سر جھٹکا۔



☆☆☆

وہ دبے قدموں ذوالکفلی کے گھر کا دروازہ کھول کے اندر داخل ہوئی تو دلبری طرح دھڑک رہا تھا۔ دروازہ بند کر کے اس نے پشت ٹکائے چند گہرے سانس لیے پھر ہڈ اتاری اور راہداری میں آگے بڑھی۔

دیوان خانے کی جی جلی تھی۔ وہ پہلے اس طرف آئی تاکہ ذوالکفلی سے بات کر کے مگر چوکھٹ پہ پھہر گئی۔

وہاں ذوالکفلی کے ساتھ فرش پہ ایڈم بیٹھا تھا۔ وہ چند ٹائیے کے لیے بالکل ساکت ہو گئی۔ پھر سوالیہ نظروں سے ذوالکفلی کو دیکھا جس نے کندھے اچکا دیے۔ ”یہ تو جوان بہت ضدی واقع ہوا ہے۔ میں اسے گھر سے نہیں نکال سکا۔“

ایڈم اسے دیکھ کے اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں چند لمحے اداسی سے ایک دوسرے کو دیکھے گئے پھر وہ سر کو ہلکا سا خم دے کر بولا۔

”شہزادی!“ اور مسکرایا۔

تالیہ جواب میں حکمت سے سر نہیں جھٹک سکی جیسے قدیم ملاکہ میں جھٹکا کرتی تھی۔ بس چپ چاپ آگے آئی اور فرش پہ بیٹھ گئی۔ وہ بھی سامنے بیٹھ گیا تو ذوالکفلی اٹھ کھڑا ہوا۔

”تم پریشان لگ رہی ہو۔ میں تمہارے لیے سوپ لاتا ہوں۔“ بوڑھے جادوگر نے اپنی ٹوپی سر پہ جمائی اور باہر نکل گیا۔

دیوان خانے میں خاموشی چھا گئی۔ وہ دونوں آمنے سامنے فرش نشست پہ بیٹھے تھے۔ کچھ میں نہیں آتا تھا بات کہاں سے شروع کریں۔

”تم نے کہا تم مشکل میں ہو۔۔۔۔“

”وہ تو ہوں۔“

”اور تم نے وہاں کتوں پہ وان فاتح کو بھیج دیا۔۔۔۔“

”آپ دونوں کا ملنا ضروری تھا۔“

”اور انہوں نے پولیس بلا لی۔“ تالیہ نے

شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔

ایڈم کے ابرو تھیرے اٹھے۔ ”کیا؟“

”وہ چاہتے ہیں کہ میں گرفتاری دے دوں۔“

پھر وہ چونکی۔ ”تم بھی یہی چاہتے ہو کیا؟ کیا ادھر بھی تم پولیس کو لے آؤ گے جو۔۔۔۔“ وہ بدک کے اٹھنے لگی۔

”نہیں بے تالیہ۔“ وہ تیزی سے بولا۔ ”مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ پولیس کو بلا لیں گے ورنہ میں ان کو کبھی آپ سے ملنے نہیں دیتا۔ اور میں نہیں چاہتا کہ آپ گرفتاری دیں۔ اگر آپ جیل چلی گئیں تو مجھے کون بچائے گا؟“

تالیہ کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ اور وہ تذبذب سے اسے دیکھنے لگی۔

”ایڈم۔۔۔۔ تم سچ بول رہے ہو نا؟“ وہ بار بار چوکھٹ کو بھی دیکھتی۔ جیسے وہاں سے پولیس دروازہ توڑ کے اندر داخل ہو جائے گی۔

”ایڈم جھوٹ نہیں بولتا اور ایڈم آپ کے ایسے کاموں میں ہمیشہ آپ کا ساتھ دیتا ہے جنہیں آپ وان فاتح سے بھی چھپانا چاہیں۔“

اسے یاد آیا۔۔۔۔ ان دونوں کا خزانے والا ایڈو نچر۔۔۔ یوں لگتا تھا اس واقعے کو واقعی چھ سو سال گزر چکے ہوں۔

یا شاید پانچ سو ستاون برس۔

”ہاں۔ تم میری ہر بات مانتے تھے۔“ وہ قدرے ڈھیلی ہو بیٹھی اور آزر دگی سے مسکرائی۔ ”کیسے ہو تم؟“

”اب آپ کو دیکھ کے لگ رہا ہے کہ میرا مسئلہ آپ سے بڑا نہیں ہے۔“

”تم اپنے حملہ آوروں سے چھپ رہے ہو؟ تم چاہو تو یہاں رہ سکتے ہو۔ یہاں نیچے۔۔۔ کتابوں کا ایک ذخیرہ ہے جو۔۔۔۔“

”نہیں بے تالیہ۔ موت میرے تعاقب میں ہے اور کتابیں مجھے نہیں بچا پائیں گی۔ آپ بتائیں ایڈم آپ کے لیے کیا کر سکتا ہے۔“



تالیہ چھ لے کے لیے بھگی آنکھوں سے اسے دیکھے گئی۔ سو مہینوں سے نیم روشن دیوان خانے کو آزردگی نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔  
”تم بتاؤ مجھے کیا کرنا چاہیے۔“

”میں دان فاح نہیں ہوں جو لیڈ کرتے ہیں اور مسکوں کا حل بتاتے ہیں۔ میں ایڈم ہوں۔ میں لیڈ ہونے والوں میں سے ہوں۔ آپ جو کہیں گی میں کروں گا۔ آپ بتائیں۔“ وہ بے لوث انداز میں کہہ رہا تھا۔

تالیہ کا آخری حل اس کے ذہن میں تیار تھا مگر وہ ایڈم سے کیسے کہے؟ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ذوالکفلی کو معلوم ہو۔ اور وہ کچن میں تھا۔

پھر اس نے جیب سے ایک چٹ نکالی اور اس کی طرف بڑھائی۔

”مجھے ایک پاؤڈر تیار کرنا ہے۔ اس کے لیے کچھ جڑی بوٹیاں چاہیے ہیں۔ تم یہ صبح مجھے لا دو گے؟“

ایڈم نے چٹ نکالی اور اجنبی سے اسے دیکھا۔ ”مگر یہ پاؤڈر آپ کو اس مسئلے سے کیسے نکال سکتا ہے؟“

”..... میرے لیے نہیں ہے۔“ کون دوسم نے کہانی گھڑنی شروع کی۔ ”یہ داتن کے لیے ہے۔ اس کو کینسر ہے۔ وہ مردہ ہی ہے۔“

”دات؟“ ایڈم ایک دم سیدھا ہو کے بیٹھا اور بے یقینی سے اسے دیکھا۔

”ہاں۔ اس کے بال جڑ رہے تھے کیونکہ وہ کیمو کروا رہی تھی مگر اس نے مجھے کہا کہ وہ کیٹو ڈائٹ ہے اور اس لیے ایسا ہو رہا ہے۔ مگر..... ذوالکفلی کے کتب خانے میں میں نے ایک دوا کی ترکیب پڑھی ہے جو اس کا کینسر مکمل طور پر ٹھیک کر سکتی ہے۔ یہ حلوہ نہیں ہے۔ ایک قدیم جاپانی دوا ہے۔ میں یہ اس کو سبکا پور بھجوا دوں گی۔ تم بس اس کو بتانے میں میری مدد کرو۔“

ایڈم افسوس سے لنگ ہو گیا تھا۔ کچھ لمبے وہ

کچھ بول ہی نہیں سکا۔ پھر دیکھا کہ ذوالکفلی ٹرے میں بھاپ اڑاتے پیالے لیے آرہا ہے تو اس نے چپ چاپ پرچی جیب میں رکھ لی۔ ذوالکفلی سوپ رکھ کے وہاں سے اپنے کمرے میں چلا گیا تو ایڈم نے پرچی نکال کے پڑھی اور اجنبی سے پوچھا۔

”یہ عجیب طرح کی جڑی بوٹیاں ہیں۔ ان میں سے اکثر زہریلی ہیں۔ آر یوشیور یہ دوا بتانے کے لیے ہی ہیں؟“

”ایڈم..... تمہیں مجھ پہ اعتبار نہیں ہے کیا؟“ وہ برامان کے بولی۔ اور عورت کا مان سے کہا یہ فقرہ بڑے بڑے کام کر دیتا ہے۔  
مشکل دستخط بھی۔

زہریلی جڑی بوٹیوں کی تلاش بھی۔

”اوکے۔ مجھے آپ پہ اعتبار ہے۔ میں لا دوں گا۔ مگر ان سے دوا کیسے بنے گی؟“

”بڑے بڑے تریاق زہریلی بوٹیوں سے ہی بنتے ہیں ایڈم بن محمد!“ وہ مبہم سے انداز میں بولی تھی۔

”میں تو داتن پہ حیران ہوں۔ وہ کب سے اس بیماری کا شکار تھیں اور انہوں نے مجھے بتایا تک نہیں؟ مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا کہ.....“

”پلیز اب تم جاؤ۔ مجھے آرام کرنا ہے۔“

وہ سوپ کا پیالہ اٹھا کر ایک دم کمرے سے نکل گئی۔ ایڈم نے دیکھا کہ اب وہ نیچے جا رہی تھی۔

وہ گھر سے باہر نکلا ہی تھا کہ ذوالکفلی نے اسے پکارا۔ ایڈم چونک کے مڑا۔ بوڑھا جادوگر اس کے پیچھے باہر آرہا تھا۔

”سنو نو جوان۔“ وہ سنجیدگی سے اس سے مخاطب ہوا۔ ”میں تالیہ کے پلانز میں مداخلت نہیں کرتا۔ وہ جو کرنا چاہتی ہے وہ اس میں آزاد ہے۔

اور میں تمہیں یہاں آنے سے بھی نہیں روکوں گا۔ تم جب آنا چاہو آ جاؤ۔ مگر کل مجھے شہر سے باہر جانا ہے۔ میں رات تک آ جاؤں گا۔ اور.....“ وہ فکر مندی سے کہہ رہا تھا۔ ”تم اس کو کوئی جڑی بوٹی لا کر نہیں دو



کے۔“

”وہ اپنی دوست کے لیے دوا بنانا چاہ رہی ہیں۔ آپ کی کتابوں سے انہوں نے....“

”ہاں ٹھیک ہے، نیچے ایسی کتابیں موجود ہیں جن میں طب کے نسخے ہیں مگر وہ دوا نہیں بناتا چاہتی۔“ وہ بے چینی سے بولا۔ ”وہ زندگی سے مایوس ہو چکی ہے اور مجھے ڈر ہے کہ وہ اپنی زندگی ختم کرنے کا نہ سوچے۔“

ایڈم بن محمد ہنس دیا۔ ”بے تالیہ کبھی بھی خودکشی نہیں کر سکتیں۔“

ذوالکفلہ سنجیدگی سے اسے دیکھے گیا۔ ”وہ اس روز سمندر میں خود کو ڈبوئے چلی گئی تھی۔ اگر میں اسے واپس نہ لاتا تو تم اس سے یوں مل نہ سکتے۔“

مگر ایڈم پھر سے ہنس دیا۔ ”آپ کو غلط محسوس ہوا ہوگا۔ میں بے تالیہ کو جانتا ہوں۔ کوئی بھی خودکشی کر سکتا ہے۔ وہ نہیں۔ اور اگر انہیں اپنی جان لینی ہوتی تو سمندر تک جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ خیر تو ہے ان کے پاس۔“

”موت کی تکلیف شدید ہوتی ہے۔ نیچے کتب خانے میں ایسے زہریلے مادے بنانے کی کتابیں موجود ہیں جو انسان کو بنا تکلیف کے مار دیتے ہیں۔ مجھے ڈر ہے وہ ایسا ہی زہرا پنے لیے نہ تیار کرنا چاہتی ہو۔“

”بنا تکلیف والا زہر؟ کیا معلوم اس سے بھی تکلیف ہوتی ہو مگر کوئی اس تکلیف کو بتانے تک زندہ نہ رہ سکا ہو۔“

”مجھ سے بحث مت کرو لڑکے۔ جو میں کہہ رہا ہوں وہ کرو۔ تم اسے کوئی ایسا سوا نہیں لا کر دو گے جس سے وہ اپنی جان لے لے۔“

”اوکے! میں کہوں گا مجھے وہ بوٹیاں نہیں ملیں۔“ اس نے جان چھڑانے کے لیے کہہ دیا اور اس کا انداز ایسا تھا کہ ذوالکفلہ نے یقین بھی کر لیا۔

”بہت بہتر۔“ وہ اسے گھورتے ہوئے واپس مڑ گیا۔

گلی کے اس پار جاتے ہوئے ایڈم نے مڑی مڑی چٹ نکالی اور اسٹریٹ لائٹس میں اسے پڑھنا چاہا۔

اب اسے یہ سوچنا تھا کہ یہ بوٹیاں اسے کہاں سے ملیں گی؟

وہ تالیہ کا دوست تھا، ذوالکفلہ کا نہیں۔ اسے تالیہ سے وفا نبھانی تھی۔ اگر تالیہ نے کہا تھا کہ اسے یہ بوٹیاں چاہیے ہیں تو ایڈم انہیں زمین کے آخری سرے سے بھی ڈھونڈ کے لا دے گا۔

☆☆☆

سن باد و انگ لی کی سرخ حویلی چاندنی میں ڈوبی اپنے ڈھیروں راز چھپائے وہیں کھڑی تھی۔ اس کا محن اب مزید ویران لگتا تھا کیونکہ مجسمہ وہاں موجود نہ تھا اور اس کا لمبہ تک صاف کر دیا گیا تھا۔ برآمدے میں بنے آتش دان میں ہیشہ جلا تھا جس نے محن سے آتی سردی کو روک رکھا تھا۔

کتواں درخت اور محن کا سرخ اینٹوں والا فرش.... سب خاموشی سے برآمدے کو دیکھ رہے تھے جہاں آتش دان کے قریب الیکٹرک چولہے پہ رکھی کیٹلی میں پانی گرم ہو رہا تھا۔ قلعہ وہیں کھڑا تھا۔ سیاہ پینٹ، سفید سویٹر پہنے وہ ماتھے پہ بال بکھرائے، موبائل پہ میسج دیکھتا لی این کے صدر سے مختلف ایک بے نیاز سا آدمی دکھائی دیتا تھا۔

دفتر کیٹ پہ گھنٹی بجی تو فاتح نے گہری سانس لی۔ موبائل رکھا اور پہلے اوپری کیبنٹ کھولی۔ ایک اونگ نکالا اور میز پہ موجود اپنے نگ کے ساتھ رکھا۔ پھر کیٹلی میں ایک دوسرے فرد کی چائے کے پانی کا اضافہ کیا۔

”مجھے معلوم تھا تم آؤ گے۔“ دروازہ کھول کے اس نے جتا کے کہا اور خود واپس مڑ گیا۔ ایڈم اس کے تعاقب میں برآمدے تک آیا۔ جہاں اب کیٹلی میں پانی کھولنا دکھائی دے رہا تھا۔

”میں نے آپ پہ اعتبار کیا اور آپ نے پولیس بلالی؟“ ایڈم برہمی سے گہوا وسط برآمدے میں آرکا۔



”اگر مجھے پولیس بلانی ہوتی تو پہلے ان کو ذوالکفلی کے گھر بھیجتا جہاں وہ پناہ لیے ہوئے ہے۔“

وہ اب جی کے ڈبے کا ڈھکن کھول رہا تھا۔ ایڈم کی طرف پشت تھی اور چہرہ سنجیدہ لگتا تھا۔ ”تو پھر وہ کیوں سمجھ رہی ہیں کہ آپ نے.....“ ایڈم الجھن اور حشکی سے بولا۔

”کیونکہ وہ خوف زدہ ہے۔“ اس نے مٹھی میں سوکھے پتے مسلے اور کیتلی میں جھونکے۔ پتے گرتے ساتھ ہی گرم پانی کے کھنور میں پھنستے چلے گئے۔ ”تو آپ کو ان کا خوف دور کرنا چاہیے تھا۔“ ایڈم کی آواز بلند ہوئی۔

”میں نے پولیس نہیں بلائی تھی۔ وہ کسی اور کے لیے آئی تھی۔ سڑک پہ کوئی ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔“ فاتح نے اپنی صفائی دی۔ ساتھ ہی کیتلی کو ہینڈل سے پکڑ کے ہلایا۔ پتے پانی میں گھلتے ساتھ ہی اسے رینگیں کر رہے تھے۔ سارے برآمدے میں چائے کی خوشبو پھیلی جارہی تھی۔

”آپ کیوں چاہتے ہیں کہ وہ گرفتاری دیں۔“

اس نے بٹن دبا کے تیش دھبی کی اور کیتلی کو ڈھک دیا۔ پھر ایڈم کی طرف مڑا اور سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ ”کیونکہ فرار حل نہیں ہوتا۔ انسان کو حالات کو فیس کرنا چاہیے۔“

”مگر آپ خود تو ایسا نہیں کر رہے۔“

فاتح ساٹ نظروں سے چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ ”تم کیوں چاہتے ہو کہ وہ بھاگتی رہے۔“ ”میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ ان کے ہر فیصلے میں ان کا ساتھ دوں۔“

”غلط فیصلوں میں بھی؟“

”انسان کو ہر وقت نامح دوست نہیں چاہیے ہوتے سر۔ کبھی کبھی صرف غم بانٹنے والے اور ہر حال میں ساتھ دینے والے بھی چاہیے ہوتے ہیں۔“ وہ

جنا کے بولا۔ اسے معلوم نہیں کس بات کا قصہ تھا۔ ”اور تم اسی لیے اس کی مدد کر رہے ہو تاکہ وہ ساری عمر بھاگتی رہے؟“

”اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ مجھے ان پہ اعتبار ہے۔ بچے تالیہ کے پاس ہمیشہ پلان ہوتا ہے۔“

فاتح مڑا اور پھر چولہا بند کر کے کیتلی کا ڈھکن اتار دیا۔ خوشبودار بھاب تیزی سے اوپر کواٹھی۔ اس نے چہرہ پیچھے کر لیا اور پھلنی پیالی پہ رکھی۔ پھر کیتلی سے سنہری دھار اس میں اٹھنے لگا۔

”تم اس کی کس کام میں مدد کر رہے ہو؟ وہ کیا کرنے کا سوچ رہی ہے؟“

”اگر بچے تالیہ مجھے کوئی کام کہیں گی تو میں آنکھیں بند کر کے اسے کروں گا سر۔ کسی کو بھی بتائے بغیر۔“

”چاہے وہ کام اس کے اپنے لیے برا ہی ثابت ہو؟“

اب وہ سر جھکائے دوسری پیالی میں چائے انڈیل رہا تھا۔ تپوں کی کڑک دار خوشبو سارے برآمدے کو معطر کر گئی تھی۔

”میں ان کو کسی بھی چیز کے لیے انکار نہیں کر سکتا۔“

وان فاتح دونوں کپ اٹھائے اس کی طرف مڑا اور سادگی سے پوچھا۔

”کیوں؟ کیا تمہیں ڈر ہے کہ شہزادی تمہارا دایاں ہاتھ کٹوا دے گی شاہی مورخ؟“

اور ایک پیالی اس کی طرف بڑھائی۔ ایڈم بن محمد سکتے میں آگیا۔ لب ذرا سا کھل گئے۔ وہ پلک تک نہیں جھپک سکا۔

”چائے!“ فاتح نے اسے پکارا۔ اس کا ہاتھ ابھی تک بڑھا ہوا تھا۔

ایڈم کے کندھے ڈھیلے پڑ گئے۔ ساری ناراضی ہوا ہو گئی۔ اس نے مرے مرے ہاتھوں سے کپ تھاما۔ آنکھیں ابھی تک بے یقینی سے فاتح کو تنک رہی



تھیں۔

”آپ کو..... سب یاد ہے؟“

”کیا تمہیں ابھی بھی شک ہے؟“

اپنے کپ سے گھونٹ بھر کے اس نے پیالی نیچے کی اور چھوٹے قدم اٹھاتا برآمدے کے ستون کے ساتھ آکھڑا ہوا۔ باہر چاندنی میں ڈوبا صحن خاموش پڑا ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

”کب سے؟“ ایڈم نے کمزور لہجے میں پکارا۔ گرم کپ اس کے ٹھنڈے ہاتھوں میں سرد پڑتا جا رہا تھا۔

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ نیند کتنی گہری تھی؟ جاگنا زیادہ اہم ہے۔“ وہ اندھیرے میں درخت کو دیکھتے ہوئے گھونٹ بھر کے بولا۔

”مگر کیسے؟“ ایڈم بے جان قدموں سے چلا اس کے عقب میں آرکا۔

”کل رات یہاں آنے سے پہلے میں نے ایک کاغذ لکھا تھا۔ اس کو دراز میں رکھنے کے بعد مجھے ملا کہ آنے تک سب یاد آگیا تھا۔ ایسے جیسے کبھی بھولا ہی نہ ہو۔“

”اور آپ نے بچے تالیہ کو نہیں بتایا؟“ وہ صدمے سے اس کی پشت کو دیکھ رہا تھا۔

وان فاح نے جواب نہیں دیا۔ وہ سامنے درخت کو دیکھتے ہوئے گھونٹ گھونٹ چائے پیتا رہا۔

”اگر آج آپ ان کو بتا دیتے تو وہ کسی غلطی کا شکار نہ ہوتیں۔“

”اس نے کہا کل وہ مجھ سے ملے۔“ اس نے ایڈم کی بات کاٹی تھی۔

چند منٹ پہلے اس نے یہ کہا ہوتا تو ایڈم سختی سے انکار کر دیتا مگر اب سب بدل چکا تھا۔ اس نے سر تسلیم خم کر دیا۔

”کل رات..... وہی وقت.... وہی جگہ۔“ مسکرا کے کہتے ہوئے فاح اس کی طرف مڑا۔ وہ بالکل پرسکون لگتا تھا۔

”اوکے۔“ ایڈم نے پھر سے سر کو جنبش دی۔

اب وہ ان دونوں کے درمیان نہیں آسکتا تھا۔

”تمہارے خیال میں وہ دوبارہ ملنے پہ راضی ہو جائے گی؟“

”انہوں نے مجھے ایک کام کہا ہے۔ میں اس کے بدلے میں ان سے آپ سے ملنے کے لیے کہوں گا۔“

اس نے چائے سے بھرا کپ واپس رکھا اور مڑ گیا۔ تب فاح نے اسے پکارا۔

”ایڈم..... تھینک یو!“ ایڈم اس کی طرف پشت کیے چند تالیے کھڑا رہا۔ فاح نہیں دیکھ سکتا تھا کہ اس نے لب کاٹے تھے اور آنکھوں میں زخمی سا تاثر ابھرا تھا۔ وہ لمحہ جس سے وہ خوف میں تھا..... وہ آگیا تھا۔ فاح کو تالیہ یاد تھی۔ اور تالیہ کو وہ کبھی بھولا ہی نہیں تھا۔ دونوں اپنی جگہوں پہ واپس آگئے تھے۔ وقت کے اس چکر نے اگر کسی کو برباد کیا تھا تو وہ ایڈم بن محمد تھا۔

”آپ کو شکریہ کہنا بھی چاہیے سر۔ کیونکہ شکر ہے کہ ایڈم بن محمد کوئی خود غرض آدمی نہیں تھا۔ ورنہ....“ اور پھر سر جھٹک کے وہ آگے بڑھ گیا۔

وان فاح افسوس بھری نظروں سے اسے جاتے دیکھنے لگا۔

وہ دونوں جانتے تھے کہ ایڈم بن محمد کے ان کہے الفاظ میں کیسا درد پنہاں تھا۔

☆☆☆ ذوالکفلی کا گھراگلی صبح اپنے مالک کی غیر موجودگی میں مزید ویران نظر آنے لگا تھا۔ وہ شہر سے باہر تھا اس لیے آج اس نے تالیہ کا کھانا ٹریپ ڈور سے نیچے نہیں رکھا تھا۔ وہ اب خود کچن میں کھڑی ناشتہ بنا رہی تھی۔ ذرا سے کھٹکے پہ چونک جاتی۔ باز بار کھڑکی کی بلاسٹڈز کو دوا لکیوں سے کھولتی اور درز سے باہر جھانکتی۔

ارڈر دسب سکون تھا۔ صرف وہی خوف زدہ تھی۔

ناشتے کی ٹرے لیے وہ دیوان خانے میں آئی۔



اور اسے فرش پہ اپنے سامنے سجایا۔ پھر کافی کامک اٹھا یا علی تھا کہ نظر فیلف یہ پڑی۔ وہاں قطار میں بوتلیں رکھی تھیں۔ وہ اپنی بوتل کو پہچانتی تھی۔ جو عمر سے خالی ہو چکی تھی مگر.... مرکزی مقام پہ رکھی وان فارغ کی بوتل.... آج وہ بھی خالی تھی۔

تالیہ کے لب بے یقینی سے کھل گئے۔ اس نے پرسوں رات یہ بوتل غور سے دیکھی تھی اور یہ تمن چوتھائی بھری تھی۔ کل وہ اسے دیکھ نہیں پائی تھی۔ اور آج یہ خالی تھی۔

وان فارغ کی یادداشتیں اس کے ذہن کو واپس مل گئی تھیں۔ کب؟

یقیناً کچھلے چوبیس گھنٹوں میں۔ وہ گزشتہ روز ملا کہ آیا تھا۔ اور کچھلی رات تالیہ سے ملا تھا۔ کیا تب اس کو سب یاد تھا؟ پھر بھی اس نے پولیس بلالی؟ اس نے تالیہ کو بتایا کیوں نہیں؟

چند لمحے وہ شاک میں بیٹھی رہی..... اور پھر..... پھر اسے ڈھیروں غصہ آیا۔ اور آنکھیں..... آنکھیں بے بسی بھرے زخمی پن سے بھر گئیں۔ وہ مارے باندھے ناشتہ کرنے لگی۔ بار بار آنکھوں میں پانی آتا مگر وہ اسے ہتھیلی سے رگڑ دیتی۔

تب ہی گھنٹی بجی۔ تالیہ کرنٹ کھا کے اٹھی اور تیزی سے تختے سے بندھا تنجر نکالا۔ اس کی رنگت سفید پڑ گئی تھی۔

چند لمحے وہ خاموشی سے دم سادھے کھڑی رہی۔ پھر باہر سے آواز سنائی دی۔ ”میں ہوں۔ ایڈم۔“

”مجھے امید نہیں تھی کہ تم اتنی جلدی آ جاؤ گے۔“ وہ اسے اندر لائی اور پھر دروازے کو لاک کیا۔ چٹنی بھی چڑھائی اور بولٹ بھی اٹکایا۔ آج موسم قدرے زیادہ ٹھنڈا تھا۔ اس لیے ایڈم نے جیکٹ پہن رکھی تھی۔ مگر گرم تھا۔ اس نے راہداری میں آتے ہی جیکٹ اتار دی اور اسے افسوس سے دیکھا۔ جواب کھڑکی سے باہر کا جائزہ لے رہی تھی۔

”فکر نہ کریں۔ کوئی میرا پیچھا نہیں کر رہا۔ میں

بہت احتیاط سے ادھر آیا ہوں۔“

تالیہ نے سر جھٹکا اور دیوان خانے میں چلی آئی۔ وہ اس کے پیچھے آیا اور بنا تمہید کے کہنے لگا۔ ”وان فارغ کو سب یاد ہے۔“

”جانتی ہوں۔ ابھی دیکھا ہے۔“ وہ تلخی سے فیلف کی طرف اشارہ کر کے بولی اور واپس فرش پہ دوڑا نو بیٹھی۔ ماتھے پہ ہل تھے اور اس نے دوبارہ ناشتے کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

”واہ۔ خاصا ترقی یافتہ جادوگر واقع ہوا ہے ذوالکفلی۔ کافی اپ گریڈ سسٹم ہے اس کا۔“

پھر اس نے تالیہ کے تاثرات دیکھے تو چہرے کو سنجیدہ کیا اور اس کے سامنے بیٹھا۔

”انہوں نے پولیس نہیں بلالی تھی۔ وہ....“ ”مجھے بعد میں اندازہ ہو گیا تھا۔“ وہ ہنوز تلخ تھی۔ ایڈم نے گہری سانس لی۔ وہ سارے مسئلے خود ہی حل کر چکی تھی۔

”وہ آپ سے دوبارہ ملنا چاہتے ہیں۔“ ”اب کیا بچا ہے جس کے لیے وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ کیا ان کے پاس میرے سوالوں کے جواب ہیں؟ کیونکہ ان کی طرف میرے بہت سے حساب نکلتے ہیں ایڈم۔“

اتنے مہینوں کے ادھورے جواب اور فارغ کے ادھورے فیصلے یاد آئے تو اس کے دل پہ آنسو گرنے لگے۔

”جواب ہو گا تب ہی ملنا چاہتے ہیں۔ آپ ایک دفعہ ان کی بات سن لیں۔ آج رات وہی جگہ وہی وقت۔ فیصلہ آپ کا ہے۔“ پھر اس نے جیب سے ایک پوٹلی نکالی اور اس کے سامنے رکھی۔

”یہ وہ تمام چیزیں ہیں جو آپ کو درکار تھیں۔“ تالیہ دنگ رہ گئی۔ ”تمہیں یہ اتنی جلدی کیسے ملیں۔“

(باقی آئندہ)





ثبوتِ عشق، جمالِ یقیں، محبت ہے  
مری سرشت میں دھوکا نہیں، محبت ہے

گلِ خلوص مہکتا ہے میری صورت میں  
مرا مزاج، میری سرزمین، محبت ہے

سب اپنی رائے کا اظہار کر رہے ہیں بہاں  
مرے خیال میں سب سے حسین محبت ہے

میں اس کے دل میں اُتر کر تلاش کر بھی چکا  
میں جانتا تھا یہیں پر کہیں محبت ہے

میں ظالموں کا طرف دار ہو نہیں سکتا  
میں دین دار ہوں، میرا دین محبت ہے

اے عزیز یونہی تو نہیں علی یا سر  
وہ میرا خواب میری اولیں محبت ہے

علی یا سر

## میاس

محبت کے مفرد میں

ازل سے

تشنگی کیوں ہے

بہت ہی مضطرب

آزردہ اور بے تاب کھتی ہے

وہ کیسے لوگ سہہ رہے ہیں

جنہیں میراب رکھتی ہے

ہمارے واسطے، اس کے الگ

جذبات ہیں جاناں

ہماری راہ میں باقی

ابھی فرات ہیں جاناں!

فاطمہ نجیب



شکستہ جگہ



رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔  
"اللہ تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے عملوں اور دلوں کو دیکھتا ہے۔"  
فوائد و مسائل :-

خوب صورت یا بد صورت ہونا بندے کے اختیار میں نہیں بلکہ یہ اللہ کی مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔

کوشش کرنی چاہیے کہ عمل اچھے ہوں تاکہ اللہ کو راضی کیا جاسکے۔

اللہ کے ہاں مال دار اور غریب برابر ہیں۔ مال دار کو محض دولت مند ہونے کی وجہ سے معافی نہیں مل سکتی اور نادار کو محض اس کی مفلسی کی بنا پر محرم نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔

مال دار ہونا بھی اللہ کی آزمائش ہے اور مفلس ہونا بھی آزمائش۔ اگر مال دار شکر کرے تو اللہ کے ہاں پسندیدہ ہے اور ناشکری کرے تو نا پسندیدہ ہے۔ اسی طرح نادار آدمی صبر کرے تو اللہ کا پیارا ہے اور بے صبری کرے اور حرام کمائی کی کوشش کرے تو اللہ کے قرب سے محروم ہو جاتا ہے۔

انسان اگر نیکی کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اس کی نیت اور خواہش مزید رکنی چاہیے۔ ایسی نیت پر بھی ثواب ملتا ہے۔

بکری پر شفقت

حضرت فقیر علیہ السلام کے ہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام بکریاں چراتے تھے۔ ایک دن ایک بکری

جھاگ گئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کی تلاش میں خوب دوڑے۔ تھک ہار گئے۔ بکری بھی جھلکتے جھلکتے تھک ہار کر رک گئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے پکڑ لیا۔ آپ نے غصہ ہونے کے بجائے اس کی نیت پر اور سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس کی تھکاوٹ پر آپ کی آنکھوں سے آنسو آ گئے۔ اللہ بکری سے فرمایا۔

”تجھے مجھ پر رُس تو نہ آیا، تو نے مجھے تھکا دیا۔ لیکن تجھے خود پر بھی رحم نہ آیا۔“

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی اس شفقت پر آپ کو نبوت سے سرفراز فرمایا۔  
ذریعہ خانم لغاری۔ مظفر گڑھ

لقمان حکیم

کہا جاتا ہے کہ حکیم لقمان، ایوب علیہ السلام کے چاہنے والے تھے اور انہوں نے اپنی لمبی عمر پائی کہ داؤد کے زمانے تک زندہ رہے۔ وہ شہر نوبہ کے رہنے والے تھے اور خاندانی اعتبار سے ایک جٹی غلام تھے۔ ان کا رنگ بالکل سیاہ، ناک چٹی اور کسی کی بکریاں چرا یا کرتے تھے لیکن ان کی عادات بہت اچھی تھیں۔ اور وہ بہت اعلیٰ اخلاق کے مالک تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کے چند اصول ایسے بنا رکھے تھے جو اللہ تعالیٰ کو پسند آ گئے تھے اور اس نے انعام کے طور پر ان کو حکمت یعنی غیر معمولی فہم و فراست سے نوازا۔

لقمان حکیم کا ایک بیٹا بھی تھا۔ اس کا نام باران تھا۔ وہ بچے تو حکیم لقمان تمام لوگوں کو نیکی اور شرافت سے زندگی بسر کرنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ مرتے وقت انہوں نے اپنے بیٹے باران کو جو نصیحتیں کیں، وہ مذہبی اعتبار سے بہت قیمتی اور قابل عمل ہیں۔



۱۰ بادان کو سب سے پہلی نصیحت یہ کی کہ اللہ کو ہمیشہ وعدہ لا کر ایک ماننا، لوگوں کو بھلائی کی طرف بلانا اور بُرائی سے روکنے کی کوشش کرنا۔  
۱۱ دوسری نصیحت یہی کہ زمین پر اکر کر کبھی مت چلنا۔  
۱۲ تیسری نصیحت یہ کی کہ لوگوں سے بات کرتے وقت تکبر سے گردن مت اکرانا۔  
۱۳ چوتھی نصیحت یہ کی کہ کبھی اونچی آواز سے بات مت کرنا۔  
اللہ تعالیٰ کو عاجزی اور انکساری پسند ہے۔ ہمیشہ عاجزی اور انکساری سے رہنا۔  
نمرہ، اقرار۔ کراچی

### گناہ گارِ احسان

بندہ گناہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس وقت بھی اُس پر چار احسان فرماتا ہے۔  
۱۔ اُس کا رزق بند نہیں کرتا۔  
۲۔ اُس کی طاقت سلب نہیں کرتا۔  
۳۔ اُس کے گناہ کو ظاہر نہیں کرتا۔  
۴۔ اُس کو فوراً سزا نہیں دیتا۔  
ایسے مہربان رب کی بندہ پھر بھی نافرمانی کرتا ہے افسوس۔

### ارم کمال۔ فیصل آباد

### ساگ

ایک آدمی کو ساگ بہت پسند تھا۔ وہ بقتار گھر میں ساگ پکواتا۔ کھانا کھانے سے پہلے وہ ہمیشہ اپنے بیٹے سے کہتا۔  
”کھانا بسم اللہ پڑھ کر شروع کیا کرو“ ورنہ شیطان کھانے میں شامل ہو جاتا ہے۔  
لیکن بیٹا ہر بار بسم اللہ پڑھنا بھول جاتا۔ ایک دن وہ بسم اللہ پڑھے بغیر ساگ کھانے ہی والا تھا کہ شیطان خود آگیا اور دوتے ہوئے بولا۔  
”بھولے! کبھی تو بسم اللہ پڑھ لیا کرو، ساگ کھا کھا کر میں تو مرنے کے قریب ہو گیا ہوں۔“  
سیدہ نسبت زہرا۔ کہر ڈپٹا

### تار۔ نئی عمارت

ایک گائڈ لوگوں کو تار۔ نئی عمارت کا ایک کمرہ دکھاتے ہوئے کہنے لگا۔  
”یہ کمرہ ایک خاص اہمیت رکھتا ہے، اس میں مہارانی کھانا پکاتے ہوئے بے ہوش ہو گئی تھی۔ اور اسی کمرے میں اُس کا انتقال ہوا تھا۔“  
لوگوں میں سے ایک نے کہا۔ ”جب میں جھہپنے پہلے یہاں آیا تھا، تب آپ نے یہی بات سامنے والے کمرے کے بارے میں کہی تھی۔“  
گائڈ نے کہا۔ ”ہاں آج سامنے والے کمرے کی مرمت ہو رہی ہے۔“  
نادیہ یاسر۔ گوہر خان

### پھر کیا ہوگا؟

ایک شخص اپنے دوست کے سامنے اپنی بیوی کے خلاف دل کی بھڑاس نکال رہا تھا۔  
”کبھی کبھی اس کی اوٹ پٹانگ حرکتیں دیکھ کر اور باتیں سن کر میرا دل جانتا ہے کہ اسے اٹھا کر اوپر والی منزل سے نیچے پھینک دوں مگر مصیبت یہ ہے کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔“  
”کیوں؟“ دوست نے پوچھا۔ ”یقیناً اس کا وزن زیادہ ہوگا۔“

”نہیں بھئی!“ ان صاحب نے چر کر کہا۔ ”سوچا ہوں اگر وہ نیچے گئی تو میرا کیا ہوگا؟“  
زمینب۔ کراچی

### شکوہ

ماں نے دوسرے کمرے سے آواز دے کر بیٹے سے پوچھا۔  
”بیٹا! تمہارا چھوٹا بھائی کیوں روتا ہے؟“  
”ممتی! میں اپنے بسکٹ کھا رہا ہوں اور اسے جس دے رہا، اسی لیے روتا ہے۔“ بیٹے نے جواب دیا۔  
”اس کے پاس اپنے بسکٹ نہیں ہیں کیا؟ میں نے تو اسے بھی دیتے تھے؟“ ماں نے کہا۔  
”ممتی! جب میں وہ کھا رہا تھا، یہ تب بھی روتا



تھا بیٹے مشکوہ بھرے انداز میں کہا۔  
نفل بطل۔ فیصل آباد

وجہ تسمیہ،

نئے نئے والے ایک بہت بڑے فیشی ایل ڈیٹاٹنٹل  
اسٹور میں ہر سیلز مین کو ہدایت کی گئی تھی کہ اگر گاہک  
کوئی چیز خریدے بغیر چلا جائے تو رجسٹر میں اس کی  
کوئی وجہ ضرور تحریر کرے۔

ایک خاتون نے ملبوسات کے شعبے میں بہت  
سے سیاہ رنگ کے لباس دیکھے لیکن کوئی بھی لباس

خریدنے بغیر چلی گئی۔

سیلز مین بہت دیر تک سوچا رہا کہ کیا وجہ لکھے۔  
آخر کار اس نے رجسٹر میں نوٹ لکھا۔

خاتون نے بہت سے لباس دیکھے لیکن کوئی چیز  
خریدنا وجہ غالباً یہی ہے کہ ابھی تک اس کے شوہر کا  
انتقال نہیں ہوا۔

ایمان نہید۔ پشاور

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں،

تمہاری اصل ہستی تمہاری سوچ ہے، باقی تو

صرف ہڈیاں اور خالی گوشت ہے۔  
(مولانا جلال الدین رومی)

برتن اور ظرف چھوٹا ہو تو زیادہ چیز سما جائے گی

سکتا، چمک جاتا ہے، چاہے علم ہو، دولت ہو،

تقویٰ ہو، شہرت ہو یا عزت ہو۔

(ابن رشد)

صرف میں ہی اپنی زندگی بدل سکتا ہوں، کوئی اور  
میرے لیے کچھ نہیں کرے گا۔

(مینڈیخو)

بعض اوقات کوئی شکست ایسی بھی ہوتی ہے

جس کے دامن میں فتح سے زیادہ کامیابی ہوتی

ہے۔ (آئن اسٹائن)

وائٹ منڈ آدی کبھی اپنی تکلیف کا اندازہ نہیں

رہتا بلکہ اپنی تکلیف کے رفع کرنے میں خوشی سے

معروف عمل ہوتا ہے۔

(شیکسپیر)

جو عورت کی قدر نہیں کرتا، میرے خیال میں وہ

سب سے بڑا بے وقوف ہے۔

(پولیٹیکس بونا پارٹ)

عزیزہ چیزوں سے ہی غم پیدا ہوتا ہے اور عزیز

چیزوں سے ہی خوف۔ جو عزیزہ چیزوں کے خوف

سے آزاد ہے، اسے خوف ہے نہ غم۔

(گوتم بدھ)

نادیہ یاسر۔ کراچی

انمول ہیرے،

جو لوگ مال و دولت پر فخر کرتے ہیں، انہیں

نہیں بھولنا چاہیے کہ ان کی دولت کی مثال ایسی

ہے کہ جیسے جلتی شمع کو تیز ہوا کے درمیان میں

رکھ دیا گیا ہو۔

اگر کچھ لوگ آپ سے زیادہ ذہین ہیں تو معلوم ہونے

کی ضرورت نہیں۔ آپ ان سے زیادہ مکتبی بن

سکتے ہیں۔

وقت اور سمجھ ایک ساتھ خوش قسمت لوگوں

کو ملتے ہیں۔ اگر وقت آنے پر سمجھ نہیں آتی اور

سمجھ آنے تک وقت گزر جاتا ہے۔

ہر نقطہ کے کئی مطلب ہوتے ہیں اور ہر مطلب

میں فرق ہوتا ہے۔

نیندا آدمی موت ہے اور موت مکمل نیند۔

اگر تمہارے پاس مال و دولت نہیں تو غم زدہ ہونے کی

ضرورت نہیں کیونکہ اگر تمہارے پاس احساس کرنے

والا خوبصورت دل ہے تو تم دنیا کے مال دار شخص

ہو۔

ارم کمال۔ فیصل آباد

بچہ



نکال دی جلائی



ادم کمال \_\_\_\_\_ فیصل آباد \_\_\_\_\_ ناہید اسماعیل \_\_\_\_\_ کراچی \_\_\_\_\_  
 آئے نا سیلے مجھ کو \_\_\_\_\_  
 دیکھے نا بکھر گیا ہوں میں \_\_\_\_\_  
 اقرع ز جلابانی \_\_\_\_\_ گاؤں دیدیاخان \_\_\_\_\_ مارے نذر \_\_\_\_\_  
 کبھی چاند اس نے کہا مجھے \_\_\_\_\_  
 کبھی آسمان سے گرا دیا \_\_\_\_\_  
 اقصی ناصر \_\_\_\_\_ کراچی \_\_\_\_\_  
 زندگی کی غزل تمام ہوئی \_\_\_\_\_  
 قسانہ رہ گیا محبت کا \_\_\_\_\_  
 نوال افضل گھمن \_\_\_\_\_ بگرات \_\_\_\_\_  
 لفظوں کے کچھ کسکر پھینکو \_\_\_\_\_  
 جھیل سی گہری خاموشی ہے \_\_\_\_\_  
 عائشہ تحریم \_\_\_\_\_ گوہرہ \_\_\_\_\_  
 ایک شخص یاں رہ کر بھی سمجھا نہیں مجھے \_\_\_\_\_  
 اس بات کا افسوس ہے شکوہ نہیں مجھے \_\_\_\_\_  
 مدد عمران \_\_\_\_\_ کراچی \_\_\_\_\_  
 فقط بائیں اندھیروں کی، محض قصے ابدال کے \_\_\_\_\_  
 چسراخ آدو کے کہ تم نکلے نہ تم نکلے \_\_\_\_\_  
 مدد فہید \_\_\_\_\_ مدینہ کالونی \_\_\_\_\_  
 زندگی میں یہ ہنر بھی آزمانا چاہیے \_\_\_\_\_  
 جنگ کسی اپنے سے ہو تو ہار جانا چاہیے \_\_\_\_\_  
 زینب \_\_\_\_\_ کراچی \_\_\_\_\_  
 اب ہم کو ڈھونڈنے کا لگت نہ کیجے \_\_\_\_\_  
 ہم کھو گئے کہ آپ کا ملنا محال تھا \_\_\_\_\_  
 سحر خان \_\_\_\_\_ کوٹہ \_\_\_\_\_  
 وہ جو گیت تم نے سنا نہیں \_\_\_\_\_  
 مہری عمر بھر کا ریاض تھا \_\_\_\_\_  
 میرے درد کی کھن داستان \_\_\_\_\_  
 جسے تم ہنسی میں اڑا گئے \_\_\_\_\_

نمرہ عبید \_\_\_\_\_  
 میری جاں اب یہ صورت ہے کہ مجھ سے \_\_\_\_\_  
 تیری عادت چھڑائی جا رہی ہے \_\_\_\_\_  
 زینہ خانم \_\_\_\_\_ منظر گردہ \_\_\_\_\_  
 سفر کا مزہ لینا، ہو تو ساتھ میں سامان کم رکھے \_\_\_\_\_  
 زندگی کا مزہ لینا، ہو تو دل میں ارمان کم رکھے \_\_\_\_\_  
 تبسم بشیر حسین \_\_\_\_\_ ڈنگہ \_\_\_\_\_  
 اس کو بھولیں کہ یاد اس کو کریں \_\_\_\_\_  
 دل پہ اب اختیار تھوڑی ہے \_\_\_\_\_  
 سرے اترے گا عشق کیسے بھول \_\_\_\_\_  
 ایسا دیا خسار تھوڑی ہے \_\_\_\_\_  
 مالا بشیر حسین \_\_\_\_\_ ڈنگہ \_\_\_\_\_  
 ہو رہا ہوں میں کس طرح برباد \_\_\_\_\_  
 دیکھنے والے ہاتھ ملتے ہیں \_\_\_\_\_  
 فریا گل \_\_\_\_\_ پاکستانی \_\_\_\_\_  
 آجاکہ ابھی ضبط کا موسم نہیں گزرا \_\_\_\_\_  
 آجاکہ پہاڑوں پہ ابھی برف جمی ہے \_\_\_\_\_  
 خوشبو کے جزیروں سے تاروں کی صدا نک \_\_\_\_\_  
 اس شہر میں سب کچھ ہے بس اک تیری کمی ہے \_\_\_\_\_  
 نمرہ، اقرع \_\_\_\_\_ کراچی \_\_\_\_\_  
 اب میرے عشق بھی نہیں آپ کو یاد \_\_\_\_\_  
 آپ تو اپنے ہی دامن کی نمی بھول گئے \_\_\_\_\_  
 اب مجھے کوئی دلائے نہ محبت کا یقین \_\_\_\_\_  
 جو مجھے بھول نہ سکتے تھے وہی بھول گئے \_\_\_\_\_



امّت الصبور

# خالق کی ڈاڑھی

نمرہ، اقسراً

نمرہ، اقسراً

عرفان صدیقی بہترین کالم نگار ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے شاعر بھی ہیں۔ موجودہ حالات کے تناظر میں ان کی یہ غزل پڑھیے۔

عرفان صدیقی بہترین کالم نگار ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے شاعر بھی ہیں۔ موجودہ حالات کے تناظر میں ان کی یہ غزل پڑھیے۔

سب کچھ دہی ہے اب دہوا جیسی سی ہے  
اپنے ہی گھر میں ہوں، یہ عجیب بے گھری سی ہے

مانوس منزلوں کے سب ہی خواب لٹ چکے  
انجان راستوں میں وہی دلکشی سی ہے

اس شہر بے چراغ کے دیوار و در کے ساتھ  
دل تو لگا لیا مگر بے دلی سی ہے

آئین شکن تو کوئی آئینہ شکن  
ہر راہ میں فطرتا بے راہ روی سی ہے

منظر تراش لوگ بھی نامطرح سے ہیں  
خلق خدا کی بھیڑ میں بھی براہی سی ہے

گو کھل کے بولتے نہیں دانشورانِ عصر  
کچھ ان کی گفتگو میں بھی طر مندگی سی ہے

غاروں کا رزق ہو گئے ہم اس فریب میں  
غاروں کے اس دہانے پر اک روٹنی سی ہے

پاؤں نہ جم سکے بڑی کوشش کے باوجود  
مٹی مری زمین کی کچھ بھر بھری سی ہے

کچھ لوگ نہیں سمجھائیں گے  
وہ تم کو خوف دلائیں گے  
جو ہے وہ بھی کھوسکتا ہے  
اس راہ میں ماہرن ہیں اسنے  
کچھ اور یہاں ہو سکتا ہے  
کچھ اور تو آشہر ہوتا ہے  
پر تم جس لمحے میں زندہ ہو  
یہ لمحہ تم سے زندہ ہے  
یہ وقت نہیں پھر کے گا  
تم اپنی کرنی کر گزرو  
جو ہو گا دیکھا جائے گا

ماہیہ اسماعیل

میری ڈاڑھی میں تحریر نامعلوم شاعر کی یہ نظم مجھے  
بہت پسند ہے امید ہے آپ کو بھی مزدور پسند  
آئے گی۔

بلا کے اپنے مجھے میں  
کہا اک پیر نے مجھ کو  
کہو، کس بات کا خم ہے؟  
میری آنکھوں سے غم دریا  
کچھ ایسے پھوٹ کر نکلا  
کیجہ پھٹ بڑا میرا



تڑپاتے ہیں، سسکتے ہیں  
کچھ لوگ بہت یاد آتے ہیں  
اک روز میں یوں ہی شام ڈھلے  
بس تنہا تنہا بیٹھا تھا  
تب چاند مجھے اُلجھا سالکا  
مجھ سے آخر یہ کہنے لگا  
معلوم ہے تم کو کچھ ارشد  
وہ لوگ جو میرے اپنے تھے  
کیوں مجھ سے آخر روٹ گئے  
میں ہر شب ڈھونڈتا رہتا ہوں  
پر مشکل ہے  
تڑپاتے ہیں، سسکتے ہیں  
کچھ لوگ بہت یاد آتے ہیں

کہا اس نے تیرے سینے سے  
بلائیں آن چھٹی ہیں  
محبت بے ہمدردی کر  
ملا نہ کچھ مجھے اب تک  
میرا تعویذ کے جاتو  
بہت غمراا اتر ہوگا  
تیرے خورہ ہوئے اب تک  
تیری تسبیح کریں گے وہ  
مجھے اپنا لیں گے  
فدا اسی دیر سوچا پھر  
تھکائے سر چلا آیا  
محبت بھک ہے کوئی  
جو درد مانگے جاؤں  
جنہیں میری محبت بھی  
میرے اطراف نہ لائی  
انہیں تعویذ لائیں گے  
محبت سے بڑا ظلم  
محبت سے بڑا جادو  
ہنیں ہے کوئی دھرتی پر  
محبت سے ہیں یہ آگے  
فدا سوچو۔۔۔  
جلا لیتے بھی ممکن ہے

ماہا بیری میں

میری ڈائری میں تحریر یہ نظم جانے کس شاعر کی  
ہے اللہ نہ جانے میں نے کب لکھی تھی۔ آج نظر پڑی  
تو سوچا آپ کو بھی سناؤں۔

## منافق

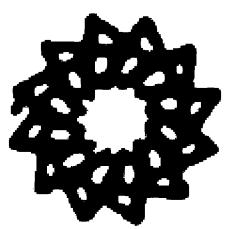
کہا اس نے کہ شاخوں سے  
جدا پھولوں کو کرنے کی  
ہواؤں کی جو سازش ہے  
وہ اسے اچھی نہیں لگتی

اسے اتنا تو کہہ دو آج  
محبت پھولوں کی ان بیٹیوں سے بڑھ کر  
نازک تھی  
جسے قدموں تلے اس نے  
کنہی کا دند ڈالا ہے

فاکھیل

جب وقت کی بہتی دھارا میں محبت کرنے  
والوں میں جدائی کے موسم مٹھ جاتے ہیں تو وہ اپنے  
یاد کر دل کو تڑپاتے ہیں۔ ارشد ملک کی اس نظم  
میں بھی جدائی اور یاد کے استزاج کو پیش کیا گیا ہے۔  
پڑھیں اب بھی اور سوچیں کہیں یہ آپ کے دل کی  
آواز ہی تو نہیں ہے۔

کچھ لوگ بہت یاد آتے ہیں  
جو منافق پر رہتے ہیں  
وہ لوگ جو میرے اپنے تھے  
کیوں ہنستے ہنستے روٹ گئے





ایک ٹرائی کر لینی چاہیے تو اپنے بچپن کے دوست رسالے یاد آئے۔ ویسے بچپن ابھی کچھ روز پہلے ہی گزرا ہے۔ لیکن خوشی ہوئی یہ دیکھ کر کہ پرانی ساری رائٹر آج بھی لکھ رہی ہیں۔

نگہت سیما، نگہت عبداللہ، سعدیہ آفریدی، رفعت سراج، راحت جبین، فاخرہ جبین، عمیرہ احمد، نمرہ احمد، فرحت اشتیاق، اف کس کس کو نہیں پڑھا۔ بلکہ کہنا چاہیے، گھول کر ہی پی لیا ہے۔ ہمیشہ بہتر سے بہترین ہی پڑھا اور لکھنا بھی چاہا اور لکھ بھی رہی ہوں اور لکھتی رہنا چاہتی ہوں۔

ج: پیاری سعدیہ! آپ ضرور لکھیں۔ اتنا پڑھا ہے تو یقیناً اچھا لکھیں گی۔ ہم آپ کی تحریر کے منتظر ہیں۔  
شائستہ یاسین..... ہڑپہ شہر

کرن کرن روشنی سے مستفید ہوئے۔ عالم کیا سنس ہوتا ہے یار کہ مزہ آ جاتا ہے۔ جس کہانی نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کیا وہ ہے ”ہوا سیلی چلی پیا کی حویلی“ شاعری کے ساتھ کہانی مزہ دو بالا کر گئی۔ نفسیاتی ازدواجی الجھنیں ایسا پلیٹ فارم ہے جس میں بہنیں بلا جھجک اپنا مسئلہ بیان کر کے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتی ہیں اور ان کو ان کے مسائل کا بہتر حل بتایا جاتا ہے۔ ہمارے نام میں مجھے قارئہ بھٹی، تبسم بشیر حسین، اقراء ممتاز، صائمہ مشتاق کے تبصرے پڑھنے کا مزہ آتا ہے۔ رائٹرز سے ایک گزارش ہے کہ ”گاؤں“ پر بھی لکھا کریں ہمیں انتظار رہتا ہے، قارئہ بھٹی کے گاؤں کی طرح جب مہمان آجائے تو گوشت لینے کے لیے دور جانا پڑتا ہے تو پلیز گاؤں کا ماحول آئی لوو لچ، منشا حسن علی آجائیں کہاں کم ہیں۔ اینڈ میں شاہین رشید سے ایک التجا ہے کہ پلیز پلیز پلیز ”دنیا نیوز“ کے کامران شاہد کا تفصیلی انٹرویو لازمی لیں۔ سیدہ لوبا سجاد، سیدہ نسبت زہرہ آپ لوگ بھی دعا سلام کر لیا کریں کہ ابھی معروف ہیں۔

ج: پیاری شائستہ: تاخیر سے موصول ہونے کی بنا پر آپ کا پچھلے ماہ کا خط اس ماہ شامل ہے۔ گاؤں کی کہانی کوئی گاؤں میں رہنے والی رائٹر ہی لکھ سکتی ہے۔ ہماری جو مصنفین گاؤں میں رہتی ہیں متوجہ ہوں۔ کامران شاہد نے انٹرویو دیا تو ضرور شائع کریں گے۔



نائد خالون



خط بھجوانے کے لیے پتا  
خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔  
Email: info@khawateendigest.com

سعدیہ راجپوت..... لاہور کینٹ  
اگر کہا جائے کہ آنکھ کھولتے ہی کتابوں کی دنیا اپنے حارون طرف دیکھی ہے تو غلط نہیں ہوگا۔ شاید ہی پاکستان کا کوئی ٹاپ کا اخبار، رسالہ یا میگزین ہوگا جو میں نے نہ پڑھا ہو۔ پورا بچپن ہی اخبار، رسالوں کو پڑھتے گزرا ہے۔ بچوں کی دنیا سے لے کر ”آنکھ پھولی“، ”تعلیم و تربیت“ سے پھول تک کا سفر اخبار جہاں سے سنڈے میگزین اور خواتین ڈائجسٹ سے کرن، شعاع، عمران ڈائجسٹ اور نجانے کون کون سے ناول، سیریز۔ صرف پڑھنے کا ہی شوق پورا نہیں کیا بلکہ لکھا بھی۔ شائع کرنے کے لیے کم بھیجا لیکن اپنی الماری کو ہر چھوٹی، بڑی کہانی لکھ کر بھر دیا۔ یہی نہیں بلکہ اپنی ذاتی، دیب سائٹ بھی بنالی ڈالی اپنے شوق کو پورا کرنے کے لیے اور وہاں بھی کام مزے سے چل رہا ہے۔ آج کئی سالوں بعد پرانے انبار پر گئی تو سوچا



سارا انجم بھٹی..... ڈیرہ غازی خان

ٹانگلہ مکے کے تازگی بھرا احساس آنکھوں کے رستے اندر تک اتر گیا۔ کئی سنی میں مدیر صاحب کی باتیں حقیقت پر مبنی تھیں چاہے حقیقت تلخ ہو، سنی ہی پڑتی ہے۔ کرن کرن روشنی روزمرہ کے لیے سبتی تھا۔

تبسم بشر ڈنگ کے مشورہ ہے کہ بہن بلکہ بہت اچھی بہن محنت جاری رکھو۔ عالم پڑھا۔ تھینک گاڈ عالم اپنے ٹریک پر واپس آگئی۔ شرہ بخاری کا ناولٹ ”خوشبو کا پیغام“ پرانے زمانے کی یاد دلا گیا، جب ٹرین کا سفر سستا اور محفوظ گردانا جاتا تھا۔ خیر مکمل ناول اس دفعہ میری پیاری نچرہ آلی کا تھا۔ ”لحوں کی خطا“ عنوان سمیت پسند آیا۔ دوسرا ناول ”سب جھوٹ نہیں ہوتا“ گل ارباب مصنفہ کا نام اور کام ہلکی بارنگاہوں کے سامنے آیا اور چھا گیا۔ واقعی بہت کم مرد خواتین کے رسالے کی تعریف کرتے ہیں حالانکہ پڑھتے وہ بھی خواتین کی طرح ذوق شوق سے ہیں۔ ”رنگ ریز میرے“ عفت آلی کی یہ قسط دھماکے دار ثابت ہوئی۔ افسانوں کی بات کروں تو ”حاشیائی“ کو بہترین افسانہ نگار کا ایوارڈ دے دوں۔ ان کے متعدد افسانے پڑھے اور تقریباً سب نے ہی دل جیت لیے۔ ویلڈن، باقی افسانے بھی اچھے لگے۔ مستقل سلسلوں میں عدنان بھائی کے مشورے ہر ایک کے لیے ہوتے ہیں جو بھٹک کر مایوس ہو چکے ہوں۔

احل آلی کے بیوٹی بکس نے ہمارے چہروں پر گلو سا کر دیا ہے گھریلو ٹوکنوں کی کتاب سی جمع ہوگئی ہے جس سے میں ہر آئے گئے کو مستفید کرتی رہتی ہوں۔ ”آپ کا باورچی خانہ“ ارجمند شاہین کے جوابات خاص تھے۔ خالص تھے۔

ج: پیاری سارا تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ، آپ کی تحریریں انہی پڑھی نہیں سکیں۔

ڈاکٹر فریال خان..... ڈی جی خان

ہاں مجھے یہ بتائیں میں اگر کلینک پر رسالہ نہ پڑھوں تو کہاں پڑھوں۔ گھر پر باقی نہیں پڑھنے دیتی ہیں۔ آج مجھے بخار بھی ہے اور گلے میں درد، سر میں درد پھر بھی دیکھیں، آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ آپ میری محبت دیکھ لیں۔ اچھا اب آجائیں عالم پر اس بار قسط بہت اداس

رہی۔ خطوط میں یہ پڑھ کے حیران ہوگئی کہ عالم میں تالیہ کا چوری کرنا یاد ہے۔ اس کا اس رستے کو چھوڑنا اور پھر سر دائیہ کرنا کیوں بھول گیا پڑھنے والوں کو۔ آپ کا باورچی خانہ بڑھا اور تندور کی روٹی کا لکھا ہوا پڑھ کے حیرت ہوئی آپ کو پتا ہے ہمارے ہاں گرمیوں میں جنتی ہی تندور کی روٹی سے میں نے ایف ایس سی کی تھی تو پہلی بار تندور پر روٹی لگائی۔ سب گھر والے حیران تھے کہ فری بھی کام کرنا جانتی ہے۔ خراب تو بہت کچھ بنانا آتا ہے سوائے بیوقوف بنانے کے ہاں۔

گل ارباب کا، سب جھوٹ نہیں ہوتا، موضوع اچھا تھا لیکن اس میں رسالہ پڑھنے کی تکرار بہت تھی۔ ”رنگ ریز“ میرے عفت جی! پلیز کچھ صفحے بڑھا دیں۔ رنگ ریز میرے اور سلی جیسا پیار دونوں کا موضوع ایک ہی ہے پلیز اس طرح نہ کریں۔ ایک ہی موضوع ماں باپ کو دھوکا دینا پھر پیار کی شادی، ناکامی ’اف ف ف‘ میرے ابو دی گریمٹ ایسے نہیں ہیں۔ یقین کریں ہمارے ابو جہاں سے بھی رشتہ آئے پہلے ہم سے پوچھتے ہیں اپنے پاس بٹھا کے پھر ان کو ہمارے گھر آنے کی اجازت ہوتی ہے۔ میرے ابو بہت بہت اچھے ہیں۔ لحوں کی خطا نے دل کو اداس کر دیا۔ لحوں میں ہماری رائٹرز پھڑوں کو ملا دیتی ہیں اس میں گیت کا نرم دل ہونا اور اس کی ماں کا اسلام کے اصولوں کو پھر سے یاد کرنا متاثر کر لیا۔ باقی افسانے سب ہی اچھے تھے کچھ نہ کچھ کہتے ہوئے۔ کچھ نہ کچھ بتاتے ہوئے۔ مریم عزیز، ام مریم، نبیلہ راجہ اور شازیہ چوہدری! ترس گئیں۔

پھڑے ہوئے یاروں کی صدا کیوں نہیں آتی اب روزی زنگیوں سے ہوا کیوں نہیں آتی بلائیں سب کو۔ سب کی دعوت کریں۔ ساتھ مجھے بھی بلا لیں۔ واہ واہ میں زیادہ تو نہیں بس کلی ہوئی پھلی، چائیز چاول، مٹن، میٹھے میں۔۔۔ باقی جو آپ کا دل چاہے، میں انکار کر کے آپ کا دل نہیں توڑوں گی۔

ج: پیاری فریال..... جب بھی آپ کا خط پڑھتے ہیں، دل سے یہی دعا نکلتی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ اسی طرح خوش باش، ہنستا مسکراتا رکھے۔ آمین۔

شازیہ چوہدری تو اللہ تعالیٰ کے پاس چلی گئی ہیں



لیکن دیگر مصنفین نے پتا نہیں کیوں لکھنا چھوڑ رکھا ہے۔  
ہم ان تک آپ کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔  
مکن اسحاق..... کراچی

مجھے کہانیاں پڑھنے اور لکھنے کا بہت شوق ہے۔ امی جان کہتی ہیں میں بے وقوف ہوں اور دنیا کو سمجھنے کی مجھ میں عقل نہیں اور وہ مجھے کہیں جانے آنے نہیں دیتیں حتیٰ کہ دوست بھی نہیں بنانے دیتیں۔ ایسے میں میری صرف ایک ہی دوست ہے۔ خواتین ڈائجسٹ 2010 میں ہم دوست بنی تھیں اور ماشاء اللہ سے ہماری دوستی قائم ہے۔

”ٹائٹل گرل بہت پیاری لگی ان سے مل کر ہم ”کہنی سنی“ پر آئے۔ مدیر جی کی باتیں پڑھیں، مدیر جی ہم آپ سے اتفاق کرتے ہیں۔

”کرن کرن روشنی“ سلسلہ کو جاری رکھیے گا، اللہ آپ کو اجر و ثواب دے اور ہمیں ان احادیث پر عمل کرنے کی توفیق دے (آمین ثم آمین)

”ہمارے نام“ سب سے بہت خوب تبصرے کیے دیری ٹائٹل، ”خاموش رہو“ بہت اچھی لگی انشاء جی۔

”میری ڈائری سے“ بھی غزلیں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں دل خوش ہو گیا پڑھ کر۔

”باتیں عالی علی سے“ عالیہ علی کی تمام باتیں اچھی لگیں۔

”تلی جیسا پیاز“ زو بایہ نے جو کچھ کیا اس میں اکیلی وہ ہی نہیں بلکہ اس کے والدین کی بھی غلطی تھی۔ جب بچہ بہت لاڈلا ہوتا ہے ایک دم غصہ یا سختی نہیں نری سنبھال سکتی ہے۔

”رنگ ریز میرے“ میں بھی زمین کے پاپا نے سرمہ جیسی غلطی کی ہے۔ جب ہی زمین کا رزلٹ زو بار یہ جیسا ہے۔ ”حالم“ نمرہ جی کیا داغ پایا ہے آپ نے۔  
”لمحوں کی خطا“ واقعی والدین کا کیا اولاد کے آگے آتا ہے جیسے گیت اور اس کی ماں نے بے وجہ بے قصور سزا کاٹی۔

”سب جھوٹ نہیں ہوتا“ یار کہانی میں جھوٹ تھا پر کہانی اچھی تھی۔ خوشبو کا پیغام یہ اسٹوری دل چھو گئی واااا۔  
سب سے افسانے و نثر فل اے دن رہے۔

ج: پیاری مکن! آپ کی امی آپ کو بیوقوف کیوں

کہتی ہیں۔ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ آپ کے خط سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ آپ بہت ذہین اور سمجھ دار لڑکی ہیں۔ دنیا کو سمجھنا ضروری نہیں ہے۔ انسان کو اپنے معاملات کی سمجھ ہونا چاہیے، یہ کافی ہے۔ ہر کسی کو تو دوست نہیں بنایا جاسکتا لیکن کچھ اچھی لڑکیوں سے ضرور دوستی کرنا چاہیے۔ آپ کی امی ان لڑکیوں سے بات کر کے نسل کر سکتی ہیں۔ سب سے الگ تھلگ رہنا ٹھیک نہیں۔  
ٹوبیہ نور..... بھاول نگر

آٹھویں کے پرچوں میں میری وہاں ڈیوٹی لگادی، جہاں جانے سے سب نے انکار کر دیا تھا۔ ہم ٹھہرے تھوڑے سے کچھ زیادہ فرماں بردار سو..... ”آئے جو مشکل تو چل سر کے بل نہ ٹھہر آتش“ کے مصداق بوریا بستر سمیٹ کر نکل کھڑے ہوئے مگر اس افراتفری میں بھی خواتین ساتھ لے کر جانا نہ بھولے۔ اب ادھر آٹھویں کے پرچے ختم ہوئے، ادھر ہم نے اپنا پرچا مکمل کیا۔ سب سے پہلے تو ٹائٹل پر بھرپور نظر ڈالی، پس منظر سے جھانکتے برگ و گل ارد گرد کے ماحول میں مل سے گئے چونکہ بہار کی آمد آمد ہے تو سروسوں کے خوش رنگ پیلے اور مونگرے کے سفید چاندی جیسے پھول تاحد نگاہ پھیلے، بہار کا سندیرہ دے رہے ہیں۔ سونے یہ سہاگا خوشبوؤں کا سندیرہ لیے شمرہ بخاری شریک محفل تھیں اور بلاشبہ محفل کو چار چاند لگا رہی تھیں۔

کڑکڑاہلی گرمی میں گہرے سرخ، ہرے، پیلے ریشمی سوٹ پہنے اختری، لوری، شکو (اکثر یہی نام ہوتے ہیں) جو گرما گرم محفل سجاتی رونقیں لگاتی ہیں۔ وہ کسی اور کے بس کی بات نہیں۔ بے دھڑک اور بے ساختہ انداز تحریر، اب ان سے رو برو بھی ملوای دیں۔

نعمہ ناز ہمیشہ کچھ اچھا ہی لے کر آتی ہیں۔ ”ایک کروڑ“ سمیرا اتنی غریب نکلی کہ اس کا بس ایک ہی دفعہ ایک کروڑ لکھا۔ ہمارے تو آئے دن جیتو پاکستان اور بے نظیر انکم سپورٹ سے کروڑوں روپے اور سیروں سونا لکھتا ہے۔ وہ تو اپنی ازلی سستی کے باعث ہم جواباً کبھی کال ہی نہیں کر سکے۔

گل ارباب صاحبہ نے بھی اچھا لکھا۔ ہلکا پھلکا سا۔  
☆ پیاری ٹوبیہ! فرائض کی ادائیگی کے بعد تفریح کا



مزا ہی کچھ اور ہے۔ ڈیوٹی کے بعد آپ نے خواتین ڈائجسٹ کا مطالعہ کیا اور ہمیں مزے دار خط لکھا، بہت شکریہ۔

سانہ نقوی..... کراچی

”کہنی سنی“ ہمیں بہت پسند ہے۔ بات کرنے سے پہلے ہمیں سوچنا چاہیے۔ بات کرنے کا کیا طریقہ ہوتا ہے۔ ”کرن کرن روشنی، ہمارے نام“ میں تمام خطوط ہی پڑھے۔ انشائیہ کی ”خاموش رہو“ یہ بھی ہمارے ملکی حالات پر بالکل ٹھیک ہی بیٹھتی ہے۔ خاتون کی ڈائری کے بعد عالیہ علی سے باتیں۔ بہت مزا آیا پڑھ کے۔ ناول ”تلی جیسا پیار“ راحت جیوں۔ ”رنگ ریز میرے“ اچھے جارہے ہیں۔ ”حالم“ کا اختتام کب تک ہے۔ گل ارباب نے تو ڈائجسٹ کو موضوع بنالیا۔ نعیمہ ناز نے بھی بہت اچھا لکھا۔ ناولٹ شمرہ بخاری ”خوشیوں کا پیغام“ تو جناب کس خوب صورتی سے شمرہ نے ایک ٹرین میں کہانی شروع کی اور پورا ناولٹ ٹرین میں ہی اختتام پذیر ہو گیا۔

افسانے۔ ”میرے یرغمال“ ہاجرہ رحمان کا الجھاسا تھا۔ ”خلا“ ایک اچھا افسانہ تھا۔ نور نظر صاحبہ کا ”غلطی“ شازہ الطاف، بہترین تھا۔ ”نیت“ تحسین گل کا افسانہ اس کا نام کچھ اور ہونا چاہیے تھا۔ مثلاً ”خود پرست“ رستہ دیکھتی مائیں، طاہرہ کاظمی کا افسانہ دل کو چھو لینے والا تھا۔ آپ کا باورچی خانہ، ارجند شاہین بہت اچھا لگا۔ موسم کے پکوان بھی خالدہ جیلانی اچھے لائی ہیں۔ عدنان بھالی بہت ہی سلیمے ہوئے جوابات دیتے ہیں۔ بیوی بکس میں ہمیں ڈرائی اسکن کے بارے میں بتائیں کوئی ٹپ وغیرہ۔

☆ پیاری سانہ! خواتین کی پسندیدگی اور تفصیلی تبصرے کے لیے تمہارے دل سے شکریہ۔

رابعہ تحسین..... ممتاز آباد، ملتان

ٹائٹل پسند آیا۔ ”کہنی سنی“ بھی اچھی لکھی۔ بات تو درست ہے۔ الفاظ کا چناؤ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ تمام بڑے رہنما بشمول قائد اعظم محمد علی جناح بھی لوٹس بناتے تھے تقریر کے لیے۔ یہ کوئی بری بات نہیں۔ کرن کرن روشنی ہمیشہ کی طرح زبردست رہا۔

لکھاریوں کے بارے میں پڑھنا ہمیشہ سے اچھا لگتا ہے۔ کاش آپ بشری رحمن سے بھی ملاقات

کروادیں۔ لوریاں رفعت ناہید سجاد کا انٹرویو لازمی لیں۔ ”تلی جیسا پیار“ ابھی تو آغاز ہے۔ آگے دیکھتے ہیں، کیا ہوتا ہے لیکن یہ راحت جیوں کا انشائیہ نظر نہیں آرہا۔ کچھ کمی محسوس ہو رہی ہے، ان کی تحریر تو جکڑ لیتی ہے۔

”میرے یرغمال“ بس مناسب ہی ہے۔ ”لمحوں کی خطا“ نعیمہ ناز کی بہترین کاوش ہے۔ ”ایک کروڑ“ حنا بشری کی اچھی تحریر ہے۔ اس سے بہت ساری خواتین سبق حاصل کریں گی۔

عرصے بعد شمرہ بخاری کا نام دیکھ کر خوشی ہوئی۔ ”خلا“ بھی اچھی تحریر ہے۔ ایسے بچے ہمیشہ کے لیے نفسیاتی مریض بن کر رہ جاتے ہیں۔ میرے خیال میں ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ گل ارباب کی ”سب جھوٹ نہیں ہوتا“ اچھی کہانی ہے۔ لڑکیوں کو پشیمہ جیسا ہی مضبوط کردار کا ہونا چاہیے۔ ”رنگ ریز میرے“ کی کہانی ابھی کچھ خاص واضح نہیں ہوئی۔

دیے آپ ”حالم“ اب بور کرنے لگا ہے۔ اب اینڈ ہو جانا چاہیے۔

”رستہ دیکھتی مائیں“ اف طاہرہ! آپ نے تو رلا ہی دیا اور آخر میں آپ سے ایک درخواست ہے۔ دیکھتے ہیں آپ توجہ دیتی ہیں یا نہیں کہ سمیرا حمید کو کہیں کہ یارم جیسا ناول دوبارہ لکھیں اور رفعت ناہید سجاد سے بھی لکھوائیں پلیز، میرے خیال میں رفعت ناہید سجاد ادارہ خواتین کا انمول اثاثہ ہیں۔ الطاف طاہرہ کے بعد ان جیسی گہری تحریر میں نے ان کی ہی پڑھی ہے۔

☆ پیاری رابعہ! ہم آپ سے سو فیصد متفق ہیں۔ رفعت ناہید سجاد بلاشبہ خواتین ڈائجسٹ کا اثاثہ ہیں۔ ان کے جیسے جملے کوئی نہیں لکھ سکتا۔ ان کے لکھے ہر جملے میں معنی کا ایک جہاں آباد ہوتا ہے۔ تراشے ہوئے ہیروں کی طرح۔ ہم نے ان سے متعدد بار لکھنے کو کہا لیکن انہوں نے کچھ ذاتی مسائل کی بنا پر معذرت چاہی۔ آپ دعا کریں، وہ تمام مسائل سے نجات پائیں اور پرسکون ہو کر دوبارہ لکھیں۔

ناہید اسماعیل..... کراچی

دوسلے ڈائجسٹ کی جان ہیں ایک ”ہمارے نام“



اور دوسرا ”کنی سنی“ جنہیں ہم بے حد ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔ محترم مدیر نے الفاظ و زبان (بولنے) پر بھی نئی باتیں۔ کئی محاذوں پر ایک ساتھ لڑنے والی عوام کی کیا بات کریں، یہاں تو تعلیم یافتہ اور اعلا مناصب پر فائز لوگ زیادہ پست الفاظ بول رہے ہیں۔

”کرن کرن خوشبو“ بدستور نورانی شعاعیں بکھیرتا محسوس ہوا۔ ”حالم“ کی تعریف کے لیے تو الفاظ نہیں ملتے۔ ”تلی جیسا پیار“ نے ہلچل ہی بھادی، شمیمہ اور سرمد پر بہت رحم آیا۔ لگتا ہے دوبار یہ کو اپنی غلطی کا احساس ہونے والا ہے۔ ”رنگ ریز میرے“ سبک رفتاری سے آگے بڑھ رہا ہے۔

”لحموں کی خطا“ بہترین تحریر تھی۔ ”سب جھوٹ نہیں ہوتا“ گل ارباب غالباً نئی رائٹر ہیں، بلکا پھلکا مزاح اور تحریر کی روانی دیکھ کر لگ نہیں رہا کہ پہلی تحریر ہے۔ ”خوشبو کا پیغام“ پڑھ کر مزہ آ گیا ہے، پلیز آئیہ رزائی صاحبہ کی بھی تحریر شائع کریں۔

ارجمند شاہین کا بادورچی خانہ اچھا لگا۔ ان کی کچھ باتوں نے چونکا یا بھی۔ اللہ آسانیاں فرمائے، آمین۔ نفسیاتی الجھنیں میں دونوں بہنوں کے مسائل، اف خدایا۔ یہ سب تو ہم کہانیوں میں پڑھتے ہیں۔ باری تعالیٰ ان دونوں کے مسائل حل کرے اور قسم بشیر پیاری بہن! اللہ تعالیٰ آپ کی امی کو کلی شفا عطا فرمائے، آمین۔ ڈاکٹر فریال کا خط مزے دار، ام انعام کا خط، واہ۔ ہاجرہ عمران کا تبصرہ بہت خوب اور ان کا بہنا کہنا، بس دل موہ لیا۔

☆ پیاری ناسید! آپ نے جون ایلیا کی جو غزل بھیجی تھی، وہ دوبار پہلے بھی شائع ہو چکی ہے چونکہ آپ نے اتنی محنت سے انتخاب کیا اور ہمیں لکھ کر بھجوایا، اس لیے ہم نے اپنی پسند کی غزل آپ کے نام سے شائع کر دی۔ اگر آپ کو یہ اچھا نہیں لگا تو معذرت۔

تبصرہ تو آپ ہمیشہ ہی بہت خوب کرتی ہیں اور ہم بھی بڑی دلچسپی اور توجہ سے پڑھتے ہیں۔ صفحات کی مجبوری آڑے آتی ہے اس لیے پورا تبصرہ شائع نہیں کر پاتے۔ تبدیلی سرکار کے بارے میں آپ نے جو لکھا، ہماری بہت سی قارئین ان ہی خیالات کا اظہار کرتی ہیں۔ لیکن اپنی کچھ قارئین کی دل آزاری کی وجہ سے ہم اسے

شائع کرنے سے قاصر ہیں۔

عابدہ احمد نے ہمارے ہاں تو شاید ایک ہی تحریر لکھی ہے، وہ آج کل ٹی وی پر ڈرامے لکھ رہی ہیں۔

شہلا نواز..... لاہور

دس سال پہلے خواتین میں خط لکھا تھا، اب پھر لکھ رہے ہیں۔ جب ہم گڑیا تھے تب بھی خواتین پڑھتے ہیں، اب جب بڑھیا ہو جائیں گے تب بھی پڑھیں گے (ان شاہ اللہ)۔ خواتین ہم نے اپنے گھر کے صحن میں نرم گرم دھوپ میں جہاں امی نے خوب صورت گیندے کے پھول کتلوں میں اگائے ہیں، ہمراہ سونف اور الائچی کے خوشبودار تھوڑے کے ساتھ ختم کیا۔ بہت لطف آیا۔ ٹائٹل گرل کی اسمارٹنیں اچھی لگی۔ ساتھ پچرل میک اپ بھی۔ ”تلی جیسا پیار“ پڑھ کر دل بوجھل ہو گیا۔ عابدہ احمد کا انٹرویو اچھا لگا۔ ”میرے ریغمال“ کچھ خاص نہ لگی۔ ”لحموں کی خطا“ بھی اچھی تھی۔ ”خوشبو کا پیغام“ ثمرہ بخاری کی تحریر پڑھ کر طبیعت فریش ہو گئی۔ گل ارباب کا ٹائٹل ”سب جھوٹ نہیں ہوتا“ پڑھ کر بہت زیادہ لطف آیا۔ واقعی افسانوں کی دنیا میں سب جھوٹ نہیں ہوتا۔ گل ارباب کو کئی نئی مصنفہ ہیں کیا؟ بہت خوب لکھا بھی۔ شکر ہے سیرانج گنی ورنہ شوہر سے چھتر پڑنے تھے۔ ”رستہ دیکھتی مائیں“ بھی اچھی تھی۔ دین کی باتیں تو ہوتی ہی اچھی ہیں۔ ہم نے ایک تحریر بھیجی تھی۔ اس کا بتائیں، معیار پر پوری اتری یاد دل سے اتر گئی۔ بتائیے گا ضرور ورنہ ہم کچھ اور لکھیں۔ ڈاکٹر فریال کا خط بہت دلچسپ تھا۔ کوثر خالد کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔

☆ پیاری شہلا! خوشی کی بات ہے کہ خواتین ڈائجسٹ دس سال پہلے بھی آپ کے ساتھ تھا اور آج بھی ہے۔ وقت کے ساتھ یقیناً بہت سی تبدیلیاں آتی ہیں، ان تبدیلیوں کے باوجود خواتین ڈائجسٹ سے آپ کا لگاؤ برقرار ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ ہم وقت کے ساتھ چلے ہیں۔ آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں گئی، اس لیے اس کے بارے میں کچھ بتانے سے قاصر ہیں۔

ڈاکٹر فرحانہ..... گوجرہ

”کرن کرن رو سنی“ میں بہت ہی دلکش کھانے کے متعلق احادیث بیان کی گئیں۔ ”تلی جیسا پیار“ زبانی تو بہت بے وقوف ہے۔ باپ کا پتا چل گیا پھر بھی صائم کے



ساتھ ہے۔ صائم اور زہمی جس فیملی سے ہیں، اس حساب سے راحت آتی ہے بہت اچھا لکھا۔ نکاح کرانے کا منظر۔ ”لمحوں کی خطا“ نغمہ ناز کا موضوع پرانا تھا لیکن پڑھتے ہوئے کچھ بھی پرانا نہ لگا۔ ثمرہ بخاری ٹرین والی کہانیاں بہت اچھی لگتی ہیں۔ گل ارباب کا ”سب جھوٹ نہیں ہوتا“ سب سے اچھی لگی۔

باقی افسانوں میں نور نظر کا ”خطا“ بازی لے گیا۔ کتنا سچ لکھا۔ نامہ تو میرا ہی عکس لگی۔

آخر میں ”خط آپ کے“ یہ میرا بھی پسندیدہ سلسلہ ہے۔ ریحانہ چوہدری آپ کے منہ میں گھی شکر۔ رس مگلے، گلاب جامن سب کچھ بھئی، آپ نے ہمیں مستقبل کی مصنفہ سمجھا۔ اور سیدہ بخاری جی پلیز مجھے مہناز کے نام سے نہ پکاریں، یہ تو میرے تایا زاد بھائی نے جب اسکول میں میرا ایڈمیشن کر دیا تو فرحانہ کے ساتھ لگا دیا۔

مجھے فرحانہ ہی پسند ہے اور آپ بھی مجھے فرحی آپنی کہہ سکتی ہیں۔

☆ فرحانہ! معذرت کہ آپ نے دو خط لکھے اور ایک خط بھی شائع نہیں ہوا۔ باورچی خانہ کے سلسلے میں بھی آپ کا سلسلہ شائع نہیں ہوا۔ باورچی خانہ کا سلسلہ ہم ان شاء اللہ ضرور شامل کر لیں گے۔

خواتین کی پسندیدگی کا شکر ہے۔

کنزہ خالق..... چکوال

زمانہ طالب علمی زندگی کا ایک سنہرا دور تھا جس میں ایک لڑکی ڈھیروں خواب بنتی ہے۔ تئلیاں، رنگ، خوشبو، اسے اپنی جانب راغب کرتے ہیں۔ اسی خوشبوؤں اور تئلیوں کے دور کا ساتھ ہے میرا اور خواتین ڈائجسٹ کا۔ کالج کے لان میں بیٹھ کر بے تابی سے قسط دار نادلر کی پیش رفت دیکھنے کی یادیں، دوستوں کے گروہ میں ناؤل کے کرداروں پر تبصرے، زندگی کی بہترین یادوں میں سے ہیں۔ میرے والد صاحب ادب سے لگاؤ رکھنے کے باوجود ”ڈائجسٹ“ کو لڑکیوں کی صحت کے لیے مضر گردانتے تھے۔ ہماری قسمت کہ کبھی رنگے ہاتھوں پکڑے نہیں گئے۔ سوان کے ڈر سے ڈائجسٹ چھپا کر پڑھنا بھی ایک دلچسپ مشغلہ تھا۔

آج ایک عرصے بعد ڈائجسٹ خریدی۔ تو بہت سی یادیں۔ دم مسکراتی ہوئی آن ملیں۔ پڑھنے کے سفر میں

میرا اور خواتین ڈائجسٹ کا خوب صورت ساتھ رہا ہے۔ سو میری خواہش ہے کہ لکھنے کے اس سفر میں بھی ہم مسافت بانٹیں۔ بھلے وہ مسافت چند قدموں کی ہی کیوں نہ ہو۔

☆ کنزہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ چند قدموں کی مسافت کیوں؟ ہم تو چاہیں گے کہ خواتین ڈائجسٹ اور آپ کا ساتھ ہمیشہ رہے۔ آپ کی تحریر ابھی پڑھی نہیں۔ اطمینان رکھیں قابل اشاعت ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔

ریحانہ چوہدری نے مدد کے سے لکھا ہے دو باتوں کی وجہ سے خط لکھنے پہ مجبور ہوئی ایک تو عاصمہ زبیر کے خط کی وجہ سے جنہوں نے اتنے خوب صورت الفاظ استعمال کیے میرے بارے میں مگر اتنا ضرور کہوں گی کہ یہ صرف ان کا حسن نظر ہے۔ دوسری وجہ بنی ساجرہ کلاں کی مس تبسم اسلم جن کی ڈیوٹی آج کل ہمارے اسکول میں امتحان کے لیے ڈپٹی سپرٹینڈنٹ کے طور پر لگی ہوئی ہے۔ انہوں نے رندھیرا ڈے پہ مدد کے کا نام پڑھ کر میری دوست نویدہ انجم سے استفسار کیا کہ کیا آپ مس ریحانہ چوہدری کو جانتی ہیں اور مجھے ان سے ملوا سکتی ہیں۔ اب نویدہ کی خوشی دیدنی تھی۔ فوراً میرے پاس دوڑی دوڑی آئیں کہ آؤ تمہیں کسی سے ملوانا ہے۔ خیر جب میں مس نسیم سے ملی تو وہ بہت تپاک سے ملیں اور انہوں نے بتایا کہ وہ ادب کی رسیا ہیں اور زمانہ طالب علمی سے ہی شعاع اور خواتین ان کے پسندیدہ ڈائجسٹ ہیں اور یہ شوق ابھی تک ساتھ دے رہا ہے۔

ڈاکٹر فریال کا مریضوں کو چوہوں سے تسینہ دینا بہت غیر اخلاقی لگا۔

ارجمند شاہین نے باورچی خانے سے ناراضی کا سبب نہیں بتایا کہ 2015ء سے آپ کچن بدر کیوں ہوئیں۔ کہیں صحت کا تو کوئی پرالہم نہیں خدا نخواستہ؟ بچیوں کی تربیت بھی تو ضروری ہوئی ہے سرالی کہاں کوئی سمجھوتہ کرتے ہیں۔ اسی لیے بچیوں کو کچن کی راہ دکھانا پڑتی ہے بلکہ سمجھ دار بچیاں تو خود شوق سے سب کچھ کرتی ہیں میری بیٹیوں کی طرح، یاد آیا۔ بھئی میری نویدہ کی بیٹی اسماء رضوان جب بھی میرا خط ڈائجسٹ میں دیکھتی ہے۔ تو بہت خوش ہوتی ہے اور یہ خوشی اس کی خوب صورت آنکھوں میں چمکتی ہوئی نظر آتی ہے۔



ج: پیاری ریحانہ! سب سے پہلے تو آپ کو مبارک باد آپ کی کہانی قابل اشاعت ہے۔ ان شاء اللہ اپریل کے شمارے میں شامل ہو جائے گی۔

عفت سحر اور راحت جبین کے ناولوں میں والدین کی نافرمانی کرنے والوں کو جس ذلت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ سب لڑکیوں کے لیے سبق ہوگا اور یہی ان ناولوں کا پیغام ہے لیکن پیاری بہن! والدین کو بھی دیکھیں۔ بچیوں کی تربیت، ان کی شادی والدین کی ذمہ داری ہوتی ہے، راحت جبین کے ناول میں والدین کی غفلت دیکھیں۔ سارا تصور دوبارہ کا تو نہیں ہے۔ دوسری طرف عفت سحر کے ناول میں، ہمارے مذہب میں لڑکی کا رشتہ کرنے کے لیے واضح احکامات ہیں۔ سب سے ضروری لڑکی کا رضا مند ہونا ہے۔ لڑکی کی رضا مندی کے بغیر رشتہ نہیں ہو سکتا۔ دوسری طرف لڑکے کا ہم پلہ ہونا ضروری ہے۔ زلفی کسی طور بھی زمین کے قابل نہیں ہے۔ نہ عقل نہ تعلیم، نکٹھو اور بے روزگار ہونے کے ساتھ ساتھ کوئی کام کرنا بھی نہیں چاہتا۔ بیوی کی کمائی پر نظر ہے۔ معاشرے کے بگاڑ کی ذمہ دار صرف نئی نسل نہیں والدین کا بھی فرض ہے کہ وہ سوچ سمجھ کر فیصلے کریں۔

بشریٰ علی..... ملتان

میں 2010ء سے خواتین، شعاع اور کرن ڈائجسٹ کی مسلسل خاموش قاری ہوں۔ یہ تینوں رسالے شروع ہی سے ہمارے گھر میں پڑھے اور بے حد پسند کیے جاتے ہیں۔ عمیرہ احمد، فائزہ افتخار، ثمرہ بخاری، فرحت اشتیاق، غیلہ عزیز، سائرہ رضا، صائمہ اکرم چوہدری، سائرہ عارف، راحت جبین، ثمرہ احمد اور نعیمہ ناز سے لے کر فرزانہ کھرل تک، آپ کی ترقی کا سفر دیکھ کر بے حد فخر اور خوشی محسوس ہوتی ہے۔ ان کی تحریریں پڑھ کر مجھ میں لکھنے کا شوق پیدا ہوا ہے مگر میں نے سنا ہے کہ آپ کے ادارے میں صرف نامور رائٹرز کی ہی تحریریں شائع کی جاتی ہیں۔

ج: پیاری بشریٰ! جو آج نامور رائٹرز ہیں، وہ کبھی نئی بھی تھیں۔ تب بھی ان کی تحریریں خواتین میں شائع ہوئیں۔ آپ کی تحریریں ابھی پڑھی نہیں گئیں۔ اچھی ہوئیں تو ضرور شائع ہوں گی۔ اور اگر کسی بنا پر شائع نہ ہوئیں تو آپ مزید کوشش کرنا..... جو کوشش کرتے رہتے ہیں۔ وہ ایک نہ ایک دن ضرور کامیاب ہوتے ہیں۔

زریاب سرور طور..... سوکن وٹ

میں نے خواتین ”الف“ کی پہلی قسط سے پڑھنا شروع کیا تھا۔ ویسے خواتین، شعاع اور کرن ڈائجسٹ کی تمام رائٹرز ہی اچھا لکھتی ہیں۔ اب آتے ہیں تبصرے کی طرف۔ ماڈل گرل بہت کیوٹ لگ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر ہی دل خوش ہو گیا۔ پھر چھلانگ لگائی۔ عفت سحر طاہر کے ناول ”رنگ ریز میرے“ بہت کمال ناول ہے اور بہت خوب صورتی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ مگر عفت جی! آپ اتنا کم کیوں لکھتی ہیں۔ ہم پورا ایک مہینہ انتظار کرتے ہیں اگلی قسط کے لیے مگر آپ نے اتنا کم لکھا ہوتا ہے کہ ہم تشنہ ہی رہ جاتے ہیں ویسے جتنا بھی تھامزے کا تھا۔ پھر ”تلی جیسا پیار“ کی طرف آئے تو زو بار یہ پہنچ کر غصہ آیا۔ راحت جی! میں آپ کا پہلا ناول پڑھ رہی ہوں ماشاء اللہ آپ بہت اچھی رائٹر ہیں۔ ”لمحوں کی خطا“ وٹ رفل اسٹوری تھی۔ عالیہ علی اور عابدہ احمد سے مل کر بہت اچھا لگا۔

ج: زریاب! بہت خوشی ہوئی آپ نے خط لکھا۔ بڑھائی کی مصروفیات میں وقت نکالنا مشکل ہوتا ہے لیکن کوشش کیجیے گا کہ ہماری محفل میں باقاعدگی سے شرکت کرتی رہیں۔

ارجمند شاہین..... حویلیاں ہزارہ

فردری سے پہلے جنوری کے مہینے کی اسٹوری آف دامنہ کے بارے میں لکھنا چاہوں گی۔ ”ہوا پہلی چلی پیا حویلی“ سحرش بھٹو کی بہت زبردست تحریر تھی۔ جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ یقیناً جابے سد جان کے سرورنٹ کو آرڈر میں جانے سے لے کر آخر تک میں نے کوئی آٹھ سے دس دفعہ یہ کہانی پڑھی اور مزے لے لے کر پڑھی۔

فردری کا شمارہ بھی اپنی خوب صورتی لیے ہوئے تھا۔ نعیمہ ناز کی ”لمحوں کی خطا“ زبردست رہی۔ حالات و واقعات سادہ اور ریاست، ماریہ اور کبیر اپنی اپنی جگہ سب ہی ٹھیک تھے مگر محبت پا کر بھی ناخوش رہے۔ گیت کا فیصلہ دیر سے کرنا اپنے بڑوں کی غلطیوں سے سبق سیکھنا اچھا لگا۔ رنگ ریز میرے اور تلی جیسا پیار دلچسپی لیے ہوئے ہے۔ ”حالم“ کی یہ قسط پڑھتے ہوئے تو سانس رک رک جاتی رہی۔ نیت، غلطی اور ایک کروڑ بھی اچھی اور سبق آموز کہانیاں تھیں۔ ایک کروڑ والا قصہ میرے ساتھ بھی ہوا تھا۔ لینڈ لائن پہ کال آئی کہ آپ کی سپریم چائے بنانے والوں کی طرف سے ”خیبر کار“



قرعہ اندازی میں نکلے۔ میں واقف تھی، سو میں نے کہا بھائی! میری طرف سے آپ رکھ لیں۔ میرے پاس پہلے ہی اتنی گاڑیاں ہیں، کھڑی کرنے کی جگہ ہی نہیں ہے اس کا میں کیا کروں گی..... کڑاک اس بندے نے ریسور کرڈل پر رکھ دیا۔

۱۱۱۱۱۱

آخر میں خط لکھنے والی بہنوں کے لیے مشورہ ہے کہ نام کے ساتھ جگہ لکھتی ہیں تو کسی بڑے شہر یا صوبے کا نام بھی لکھ دیا کریں۔ کیونکہ مجھے اور بہت سی بہنوں کو بعض علاقوں کا نہیں پتا، جیسے مدو کے۔ ڈنگہ۔ کیر والا مجھے بالکل نہ پتا یہ علاقے سندھ، پنجاب، بلوچستان، خیبر پختونخوا میں سے کدھر ہیں؟ جس طرح میں حویلیاں کے ساتھ ہزارہ لکھ دیتی ہوں تو آئیڈیا ہو جاتا ہے کہ جگہ ملک کے کس کوئے یا علاقے سے ہے۔

ام انعام اپنی لکھائی کی وجہ سے شرمندہ ہوتی رہتی ہیں آپ سے، ذرا کبھی میری لکھائی انہیں دکھائیے گا۔ میری لکھائی سے تو اچھی ہی ہوگی ان کی لکھائی۔

ج: پیاری اور جند! آپ سے کس نے کہا کہ آپ کی لکھائی اچھی نہیں ہے، آپ کی لکھائی اچھی بلکہ بہت اچھی ہے۔ ام انعام کی رائٹنگ بھی خراب نہیں ہے۔ وہ سندھی رسم الخط میں خط لکھتی تھیں جس کی بنا پر ہمارے لیے خط پڑھنا دشوار ہوتا تھا۔ اب تو وہ بہت اچھی لکھائی میں بہت صاف صاف خط لکھتی ہیں۔ آپ نے غلطیوں پر توجہ دلائی۔ شکریہ۔

حمیرا گل..... ملتان

پچھلے ماہ حاضر نہ ہو سکی وجہ موسم کی سازش تھی۔ یک شاپ بھی ہمارے گھر سے بہت دور ہے۔ اس لیے جب تک ڈائجسٹ ہاتھوں میں آیا تب تک (میرے اندازے کے مطابق) خط لکھنے کی تاریخ نکل چکی تھی۔ مہربانی کر کے خط بھیجنے کی آخری تاریخ بتادیں اور ہاں یہ بھی بتادیں کہ اگر کوئی مجبوری ہو جیسے موسم یا ہم گاؤں گئے ہوئے ہوں (جہاں پوسٹ آفس نہیں ہے) تو کیا خط ای میل کر سکتے ہیں؟ اس بار ٹائٹل دیکھ کر ذہن میں دو لفظ آئے۔ سہل اینڈ اسٹاکش۔ حاسن مبارک ہو۔ آخری سسٹر سے بھی فارغ ہو گئیں۔ گل آپ کے گھر میں لگی موسیقی بڑی کا پڑھ کر مجھے اپنے گھر میں لگے کھیرے کا ذائقہ یاد آ گیا (اب بھائی نے کھیرے ہٹا کر انگور لگا دیے ہیں) سیدہ بخاری

میں بھی آپ کی طرح سب سے پہلے خطوط ہی پڑھتی ہوں مگر جن جن کو نہیں پہلے سے آخری تک ترتیب سے۔ حسین گل کی تحریر ”نیت“ بھی اچھی لگی آئندہ جیسی لڑکیاں ہاں باپ کا مان اور فخر ہوتی ہیں۔ طاہرہ کاظمی کی ”رستہ دیکھتی مائیں“ پڑھ کر آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اللہ سب کی ماؤں کو سلامت رکھے آمین ثم آمین۔ ”خاتون کی ڈائری“ اور نفسیاتی الجھنیں ہمیشہ کی طرح زبردست ہے۔ ج: پیاری حمیرا! آپ خط پوسٹ نہ کر سکیں تو ای میل کر سکتی ہیں۔ کہانیاں ضرور لکھیں۔ ہمیں لگتا ہے کہ آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے، آپ لکھ سکتی ہیں۔ خط بھیجنے کی آخری تاریخ بائیس ہے۔

نوشابہ زینت..... باشندہ

پورے سال بعد آج تبصرہ کرنے کی جرات دوبارہ کر بی ڈالی۔ جنوری کا خواتین ہر لحاظ سے اچھا رہا۔ کہنی سننی دیکھی تو ماہ و سال کی بات ہو رہی تھی۔ جج کہا صرف سال ہی بدل رہے ہیں باقی وہی سب کچھ ہے۔

”کرن کرن روشنی“ کی ساری احادیث پڑھیں۔ شکر ہے شعر و شاعری گناہ نہیں۔ ورنہ تو ”دسمبر ٹھہر جاتا ہے“ کی ہیروئن کی وجہ سے اس کا ابا جہنم میں جانے والا تھا۔ سردے اچھا رہا۔ ”تلی جیسا پیار“ ٹھیک جا رہا ہے۔ اس سے آگے بڑھے تو ”رنگ ریز“ میرا منتظر تھا۔ جب ہوا سہیلی کی داستان پڑھی تو بہت ہی زیادہ اچھی لگی۔ بہت بہت اچھا تھا ناول۔ مجھے کیا سب کو یہ بہت ہی پسند آیا ہوگا۔ جنوری کے خواتین کا سب سے بہترین ناول یہی تھا۔ باقی سب بھی بہت اچھے۔ ریحانہ چودھری کا باورچی خانہ تو چھا گیا مجھے خود بھی اچھا لگا تھا۔ دوسرا نام جو ہر خط میں تھا۔ عائشہ نور محمد یہ بہت اچھی رائٹر ہیں۔ خاتون کی ڈائری ہمیشہ اچھی غزلوں سے بھری ہوتی ہے۔ آپ کا باورچی خانہ ”گڑیا راجپوت“ اچھا لگا پڑھ کے۔ چلتے چلتے نفسیاتی الجھنوں تک پہنچے۔ صبا اقبال کچھ عرصے بعد آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ لیکن ”شائستہ انجم“ آپ کا مسئلہ پڑھ کر میں دم بخود رہ گئی۔ توبہ استغفار نبجانے ہم خود کتنے گناہ گار ہیں لیکن میری بہن یہ سب ٹھیک نہیں۔ مجھے لگتا ہے آپ ادارہ خواتین کے ڈائجسٹ نہیں پڑھیں۔

ج: پیاری نوشابہ! آپ کا خط تاخیر سے موصول



ہوا۔ اس لیے پچھلے شمارے میں شامل نہ کر سکے۔ اس ماہ آپ کا خط شامل ہے۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے ممنون ہیں۔

ماریہ نذیر..... بھاگتا نوالہ

”ٹائٹل“ بہت ہی خوب صورت۔ ”کہنی سنی“ مدیر صاحب کا ہر لفظ انتہائی غور سے پڑھا اور ان پر اتنا ہی تبصرہ کہ ”انسان ہاتھوں کی مار بھول جاتا ہے پر لفظوں کی لہجوں کی مار کبھی نہیں بھولتا۔“ اور واقعی سوچ سمجھ کے بولنا چاہیے غصہ میں ہوں یا کسی بھی موڈ میں۔ آپ کا بولا ہر لفظ اگلے پر الگ تاثر چھوڑتا ہے۔

کرن کرن کرن روشنی کھانے کے بارے میں بے حد مفید معلومات تھیں اور پسندیدہ رسالہ ہے۔ اس کے لیے دعائیں اور جزائے خیر۔ خاموش رہو انشاء جی آپ تو ہیں ہی گریٹ۔ عالیہ علی سے ملاقات اچھی رہی۔ شاہین آبی ماہرہ خان کا انٹرویو بھی لیس پلیز۔ عابدہ احمد کا کوئی ڈرامہ نہیں دیکھا میں نے تو اور لگتا ہے کوئی کہانی بھی نہیں پڑھی۔ ریحانہ آپی! مجھے بھی میٹھی والا پراٹھا کھلا دیں گی؟ فوزیہ شربت اور فائزہ بھٹی کی کمی محسوس ہوئی۔ خاتون کی ڈائری سے چاروں بہنوں کے انتخاب لا جواب تھے۔ رنگارنگ پھول پسندیدہ ترین سلسلہ ہے۔ بیویوں کے طعنے کس کی نگارشات تھی آپ نے نام نہیں لکھا مگر بتائیے گا ضرور پلیز۔ واصفہ آپی کے تبصرے بہترین ہیں۔ آپ کا باور جی خانہ ارجمند آپ کا باور جی خانہ بہت بہت اچھا لگا خصوصاً آخری بات۔ مون سون آیا تو آپ کے ہاتھ کے پکڑے کھانے آئیں گے۔ (ہاہاہاہا)

لحوں کی خطا نغمہ ناز کا ناول ہو اور اچھا نہ ہو، ہو ہی نہیں سکتا۔ سنجیدہ مسئلے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ خوشبو کا پیغام ثمرہ بخاری دیر آئے درست آئے اور آتے ہی چھا گئے۔ اف کیا منظر کھینچا ہے ہنس ہنس کے پیٹ میں مل پڑ گئے قسم سے۔ بہت اچھا لکھا آپ نے۔ جیل کا کردار سب سے زیادہ اچھا لگا۔ ظانور نظر کا افسانہ بھی اچھا لگا۔ گل ارباب نیا اضافہ ہیں ان کا ناول بھی اچھا لگا۔ ڈائجسٹ سے محبت اچھی لگی۔ گل

ارباب جی تعریفیں آپ کے لیے۔

ج: پیاری ماریہ! تفصیلی تبصرے کے لیے ممنون ہیں۔ بہت اچھا تبصرہ کیا ہے آپ نے۔ رنگارنگ پھول میں جن نگارشات پر نام نہ ہو، وہ ادارے کا انتخاب ہوتی ہیں۔

تبسم بشیر حسین..... ڈنگہ

اس ماہ کا شمارہ 8 گولڈ۔ ٹائٹل واؤ زبردست۔ اس کے بعد ”کہنی سنی“ پڑھی جہاں مدیر صاحب بہت اچھا سبق پڑھا رہے تھے دیے بھی ”زبان انسانی جسم کا ٹالا ہے جب یہ مٹھلتی ہے تو ہی معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر اتنا صاف نظر آنے والا انسان کیا واقعی اتنا صاف ہے؟ اس کے بعد کرن کرن روشنی میرا موٹ فیورٹ سلسلہ ہے۔ سب سے پہلے ”لحوں کی خطا“ پڑھا۔ یہ اپنی نغمہ ہیں یا دوسری کوئی کیونکہ ان کے نام کے آگے سلطان لکھا تھا۔ خیر کہانی زبردست رہی۔ سب جھوٹ نہیں ہوتا گل ارباب کی یہ شاید پہلی طویل تحریر تھی جو اچھی رہی۔ ”غلطی“ میرا دل کرتا ہے کہ شازیہ کا قلم چوری کر لوں۔ اب آخر میں ذکر کرنا چاہوں گی اپنے پسندیدہ سلسلے ”ہمارے نام“ کا سب سے پہلے تو بہت بہت شکریہ! ام انعام اور ریحانہ چودھری کا۔ پیاری ریحانہ آپ کا سمجھنا ایسا لگا جیسے کوئی بڑی بہن سمجھا رہی تھی۔

ج: پیاری تبسم! آپ نے ناول منگوانے کے لیے جو پیسے بھجوائے تھے۔ وہ ہم نے سرکولیشن والوں کو دے دیے ہیں۔ جلد ہی آپ کو ناول مل جائے گا۔

ہماری طرف سے بھی آپ کو سالگرہ کی مبارک باد اور دعائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو زندگی میں ڈھیر ساری کامیابیوں سے نوازے۔ آمین

## سرورق کی شخصیت

ماڈل ..... صاحبہ انصار

میک اپ ..... روز بیٹی ہارلر

ٹیشو گرائنگ ..... میسنی دھما



## خبریں ویریا

دعوتِ مہل

علی عظمیٰ صاحب! آپ ایک بڑے گلوکار ہیں  
آپ کو یہ چھوٹی بات زیب نہیں دیتی۔ جب کہ علی ظفر نے  
بڑے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں اپنا سینئر قرار دیا۔

مشکل

پاکستان میں مہنگائی جس رفتار سے بڑھ رہی ہے  
اس سے ہر شخص ہی پریشان ہے۔ عوام سخت تالاں  
ہیں۔ حکومت صرف باتیں کر رہی ہے۔ عملی طور پر ایسا کچھ  
ہوتا نظر نہیں آ رہا جس سے عوام کی مشکلات میں کچھ کمی  
ہو۔ عام لوگوں کے ساتھ ساتھ اب مشہور شخصیات بھی  
اس پر تنقید کرتی نظر آ رہی ہیں۔ مشی خان بھی ان میں  
سے ایک ہیں۔ مشی خان نے ایک ڈھابہ ہوٹل سے  
کڑھی خریدی، ایک پلیٹ کڑھی جس میں دو پکوڑے  
تھے، اتنی روپے کی تھی۔ مشی خان کا کہنا ہے کہ عام عوام  
کس طرح اس مہنگائی میں گزارا کرتے ہوں گے۔ جن  
کی تنخواہ اتنی نہیں کہ وہ دو وقت کا کھانا کھا سکیں انہیں تو  
شاید ایک وقت کا کھانا بھی مشکل سے ملتا ہوگا۔ وہ اس  
بڑھتی ہوئی مہنگائی میں کس طرح گزارا کرتے ہوں گے (یقین  
نہیں آتا کہ مشی خان بھی یہ سوچ سکتی ہیں؟)

سوچ

خلیل الرحمن قمر کا لکھا ہوا ڈرامہ سیریل 'میرے  
باس تم ہو' ختم ہو گیا لیکن اس کے حوالے سے خلیل  
الرحمن قمر کے انٹرویوز کا حال جاری ہیں۔ کچھ لوگوں  
کو ان کے انٹرویوز پر اعتراض ہے اور کچھ لوگوں نے تو  
ان پر تنقید بھی کی ہے (لیکن خلیل الرحمن قمر نے تو ایسی  
کوئی متنازع بات نہیں کی۔ وہ ان کی سوچ اور  
خیالات ہیں، کسی کو اس پر کیوں اعتراض ہے؟) سنا  
ہے کہ ان کے ڈرامے میں کام کرنے والی رحمت  
اجمل (جو دانش کے دوست کی وائف اور ان دونوں  
کی کلاس فیلو بھی تھی) نے خلیل الرحمن کے نظریات

بھنڈ

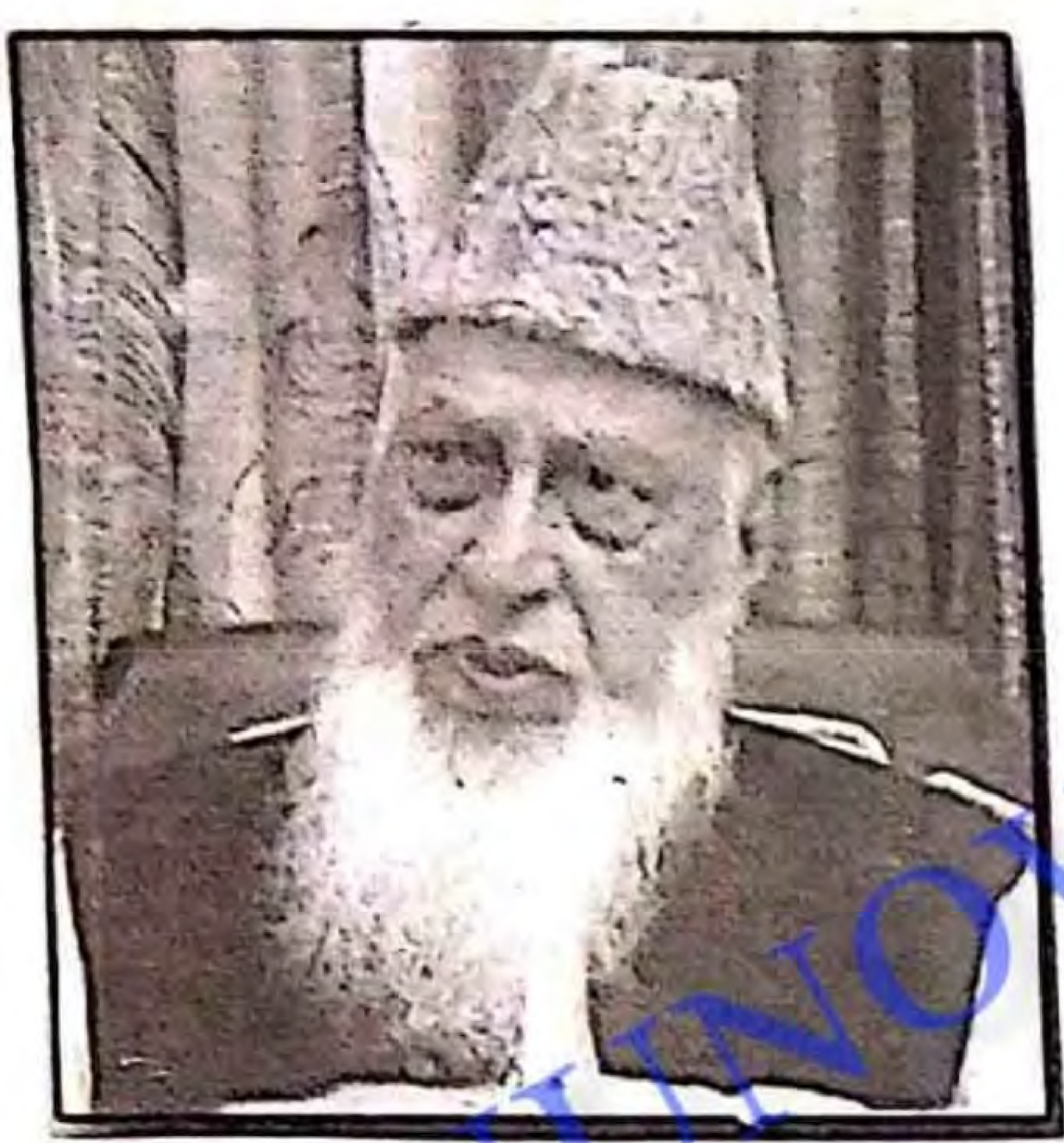
پی ایس ایل فائیو کی تقریب کا جتنا چرچا تھا  
تقریب کے بعد بھی چرچا اتنا ہی رہا۔ تقریب انتہائی  
افرا تفری کا شکار ہونے کے ساتھ ساتھ بد نظمی کا بھی  
شکار رہی۔ احمد گوڈیل نے تقریب کی ابتدائی میزبانی  
کی جس میں وہ بری طرح ناکام رہے جو بغیر اسکرپٹ  
کے انہیں سوپ دی گئی تھی۔ ساتھ ہی انہیں نوکری  
سے ہاتھ بھی دھونے پڑے۔ (جو یقیناً کرنا دھرتاؤں  
کی اپنی نا اہلی چھپانے کے لیے کی گئی) فخر عالم کی  
میزبانی بھی ایسی رہی کہ کوئی نیا نیا اسٹوڈنٹس کسی کالج  
تقریب کی میزبانی کے لیے کھڑا کر دیا جائے۔ پھر  
لائو تقریب میں پوز آتے رہے۔ (اس سے بہتر تھا  
کہ پی ایس ایل کے برائے گانے چلا دیتے تو  
شاہین کرکٹ کی دل کی تسلی کا کچھ سامان ہوتا) جبکہ  
بڑے بڑے گھبراہٹ کا شکار رہے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ بھارتی خاتون کو اس کا  
ٹھیکہ دینے کی کیا ضرورت تھی۔ اس سے بہتر تھا کسی  
ویڈیو پلانر کو ہی دے دیتے، اس سے اچھا وہ اس کا  
انتظام کر لیتے۔

پی ایس ایل کے پانچویں ایڈیشن کے لیے تیار  
ترانے گو علی عظمیٰ، عارف لوہا، ہارون اور عاصم ظہر  
نے گایا۔ جو ایک مرتبہ پھر علی ظفر کے "سیٹی بجے گی"  
کا مقابلہ نہ کر سکا۔

علی عظمیٰ نے ایک انٹرویو میں علی ظفر کا نام لیے  
بغیر کہا کہ ایک فنکار نے گانے کو خراب کرنے کے لیے  
ایک بلاگرز کا گروپ بنایا (ہا ہا)۔ انہیں پیسے دیے تاکہ  
وہ گانے کو ناکام کر دیں اور ان کے خلاف سوشل میڈیا پر  
مہم چلائیں (ہا ہا) جناب علی ظفر اگر اتنے ہی اثر والے  
ہیں کہ آپ کے بڑے گانے کو خراب کر دیں تو پھر  
ان سے خراب کیے کام بھی ٹھیک کروانے کا سوچنا  
(چاہیے۔)





سننے کے بعد ان کے ڈرامے میں کام کرنے پر افسوس کا اظہار کیا۔ وہ کہتی ہیں ”میں جانتی ہوں کہ فنکار ہونے کی حیثیت سے ہماری سماجی ذمہ داری ہے کہ ہم ایسا مواد پروڈیوس کریں جس کے ذریعے مثبت پیغام دیا جائے (اس ڈرامے میں ایسا کیا منفی تھا ہم تو نہیں سمجھ پائے ہمیں تو مثبت ہی لگا) میں اپنی ذمہ

داری انتہائی سنجیدگی سے ادا کرنے کی کوشش کرتی ہوں (کب؟ آپ کو تو آئے ہوئے ہی؟) میں خلیل الرحمن قمر کے نظریات سے بالکل اتفاق نہیں کرتی (تو نہ کریں) ہمیں ان کے ڈرامے کی مکمل کہانی معلوم نہ تھی۔ میں ایسے کسی پروجیکٹ کا حصہ بن کر فخر محسوس نہیں کرتی جس کے لکھاری کے نظریات یہ ہوں۔“

### قائل

سابق ناظم کراچی نعمت اللہ خان طویل علالت کے بعد انتقال کر گئے۔ نعمت اللہ خان ایک صاف گو اور ایمان دار آدمی تھے۔ ان کی دیانت داری کے قائل تو ان کے دشمن بھی تھے۔

2001 میں وہ کراچی کے پہلے ناظم منتخب ہوئے۔ نعمت اللہ خان کے دور کو کراچی کی ترقی کا سنہری دور کہا جاتا ہے ان کے دور میں کراچی میں بڑے پیمانے پر ترقیاتی کام ہوئے۔ انہیں کراچی میں سڑکوں، پلوں اور انڈر پاسز کا جال بچھانے اور شہر میں پارکوں اور کھیلوں کے میدانوں کی بحالی کے حوالے سے بھی یاد رکھا جائے گا۔ انہیں بابائے کراچی کا خطاب بھی دیا گیا تھا۔

نعمت اللہ خان نے شہر میں واقع پارکس پر قبضوں کے خلاف سپریم کورٹ کا دروازہ بھی کھٹکھٹایا جس کے نتیجے میں شہر میں پہلی بار پارکوں سے تجاوزات کے خلاف بڑے پیمانے پر آپریشن کیے گئے اور شہر کو کچی۔ پارکس واپس ملے۔

تھر میں ایک ہزار کنوئیں کھدوائے۔ تھر کے لوگ انہیں تھر کا بیٹا کہتے ہیں۔

کچھ ادھر ادھر سے

تکلف برطرف، میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ پکتان کے جن دوستوں نے ان کے حالیہ غیر ملکی دورے کے اخراجات اٹھائے ہیں۔ ان کی عام آدمی کو کیا قیمت ادا کرنا پڑے گی۔ پکتان نے گھبراہٹ کے عالم میں کہہ دیا ہے کہ لوگ اخبار نہ پڑھیں اور نیوز چینل نہ دیکھیں، مگر پکتان کی پرانی تقریروں کا کیا کیا جائے؟

(ترازو، محمد بلال غوری)

غرق شدہ سرمائے کا مغالطہ کہتا ہے کہ نہیں، کوئی بھی اس نقصان کی ذمہ داری قبول نہیں کرے گا۔ بالکل ویسے جیسے اطالوی سیاست دانوں نے پہلی لڑائی ہارنے کے بعد شکست قبول نہیں کی تھی جبکہ عقل کا تقاضا یہ تھا کہ چھوٹے نقصان پر اکتفا کر کے قوم کو بڑے نقصان سے بچالیا جاتا۔ کہیں ہم بھی ایسے ہی کسی مغالطے کا شکار تو نہیں؟ اس وقت تو گھانا ”دارے“ میں ہے۔ دو چار سال بعد کہیں ہمارا دیوالیہ ہی نہ نکل جائے۔

تحریک انصاف کا بیانیہ بنیادی طور پر اسٹیبلشمنٹ کا بیانیہ ہے جس کے مطابق صرف سیاست دان کرپٹ ہوتے ہیں۔ تحریک انصاف کو کریڈٹ جاتا ہے کہ اس نے ایسا سیاسی بیانیہ اپنایا جس کا بظاہر فوری طور پر توڑ نظر نہیں آرہا تھا۔ ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل کی کرپشن بڑھنے کی رپورٹ نے یہ کام کر دیا ہے۔

(عباس مہکری..... نشیب و فراز)



## رس ملائی

۱۷۱

## کارن کلور

خالد مجلدي

مثن گشتابہ

171

## مثنیٰ قیمرہ

نمک

پسی کالی مرچ

لہسن

ادرك

## کٹی لال مرج

پادشاه

پسی ہوئی سونف

## پہری

## قصوری میتھی

پودینہ

نہی الا جہی

وہی

ثابت گرم سال

ترکیب:

ایک پیالے میں قیر، نمک، اورک، کالی مرچ اور لہسن ڈال کر مکس کر لیں۔ اب تیار شدہ کسچر کے گول گول کوftے بنالیں۔ اس کے بعد ایک برتن میں چار کپ پانی گرم کر لیں اور اس میں تیار کیے ہوئے کوftے ڈال کر تین منٹ تک ابال لیں۔ ایک پیالے میں دہی ڈالیں اور اس میں نمک، کٹی لال مرچ، اورک پس ہوئی الائچی، سونف اور پادھنیا ڈال کر مکس کر لیں۔ پھر ایک برتن میں مسالا طے دہی کو، ملکی آنچ پر پانچ منٹ تک پکالیں۔ اب اس میں ثابت گرم مسالا اور ابلے ہوئے کوftے ڈال کر پانچ منٹ تک پکائیں۔ پھر پودینہ سے گارلش کریں۔ مزیدار مٹن گشتابہ تیار ہے۔ گائے کا قیر بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔

## ایک چائے کا چم

دولت

پیش کشی کرام

پینتیس گرام

پینتیس گرام

## ایک چٹلی

آدھا کپ

## چارکپ

## ایک کپ

تمن چائے کے چمچے

۵۹۹

ج.ک

بادام

سے

زعفران

کنڈینڈ ملک

تحتانی

۱۰۰

ایمویں کارس

تاریخ :-

ایک برتن میں دودھ ابال لیں۔ اب اس میں  
لیموں کا رس ڈالیں تاکہ دودھ پھٹ جائے۔ اب  
اس دودھ کو ایک ٹمل کے کپڑے میں ڈال کر چھان  
لیں اور ہلکا سا نچوڑ کر سارا پانی نکال دیں۔ نچوڑی  
ہونی پوٹلی کو دوبارہ تیس منٹ تک لٹکا دیں تاکہ مزید  
پانی نکل جائے۔ اب پھٹے ہوئے دودھ کو ایک برتن  
میں ڈال کر اس میں کارن فلور شامل کریں اور ہلکا سا  
گوندھ کر اس کے پیڑے بنالیں پھر ایک برتن میں  
پانی اور چھنی لے کر اچھی طرح چلا کر ملا لیں۔ چوبے  
کی آنچ کو تیز کریں اور اس میں تیار کیے ہوئے  
پیڑے ڈال دیں۔ ڈھکن بند کر دیں اور اٹھارہ سے  
بیس منٹ تک پکانے کے بعد نکال لیں۔ اب تیار  
شدہ پیڑوں کو ایک برتن میں ڈال کر شیرے میں ڈپ  
کریں اور ٹھنڈا کر لیں۔ ایک برتن میں تین کپ  
دودھ لیں اور اس میں کنڈینسڈ ملک، پستہ، کاجو اور  
بادام ڈال کر بارہ سے پندرہ منٹ تک پکالیں اور  
گاڑھا ہونے پر اتار لیں۔ اب ایک برتن میں پیڑے  
لیں اور اس پر تیار کی دودھ ملائی ڈال دیں۔ مزید  
رس ملائی تیار ہے۔

★



## بقیہ شہاب الدین

”ٹی وی کو تو آپ نے 23، 24 سال دیے۔ دیگر چینلوں کی طرف کیوں نہیں گئے۔ یا پھر اچھی آفرز نہیں آئیں۔“

”اچھی آفرز کی تو بات نہ کریں..... ہاں یہ سوال کہ پی ٹی وی کے علاوہ کسی اور چینل کے لیے کیا کیا۔ تو آپ کو یاد ہوگا کہ جیو چینل نے ایک پروگرام ”جیو میٹری“ شروع کیا تھا اس کی مرکزی آواز کے لیے کافی عرصہ کام کرتا رہا اور ڈاکو میٹریز مجھے ذاتی طور پر بہت پسند ہیں۔ اور چونکہ یہ میری پسند کا شعبہ تھا اور انہوں نے کہا تو میں نے کر لیا۔ اور کافی عرصے تک میں نے ان کے ساتھ کام کیا۔ اور اب بھی اکا دکا چینلوں ہیں جو وائس کے لیے مجھے بلاتے ہیں تو میں ضرور چلا جاتا ہوں کہ مجھے اچھا لگتا ہے۔ البتہ فل ٹائم کے لیے میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔ کیونکہ میں پہلے سے ہی ایک غیر ملکی خبر رساں ادارے کے لیے کام کر رہا ہوں جو کہ ایک بڑا ادارہ ہے اس لیے ”لوکل“ چینل پر کام کرنے سے انکار کیا۔“

”فارغ اوقات میں کیا کرتے ہیں؟“

”فارغ اوقات میں بڑھتا ہوں۔ انٹرنیٹ کا استعمال اس دور میں ناگزیر ہو گیا ہے۔ لہذا فیس بک اور واٹس اپ کا استعمال کرتا ہوں۔“

”ٹریولنگ کا شوق ہے؟“

”جی، لیکن سفر زیادہ تو نہیں کیا۔ البتہ بھارت، سعودی عرب اور تھائی لینڈ جانے کا اتفاق ہوا۔ اچھا لگا مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کے لوگوں سے ملنا، ٹریولنگ سے معلومات میں خاصا اضافہ ہوتا ہے اور دیکھنے کو بھی بہت کچھ ملتا ہے۔“

”آپ شاعری اور مصوری بھی کرتے تھے۔“

اب بھی کرتے ہیں؟“

”جی اب بھی کرتا ہوں۔ مصوری کے موضوع پر ایک کتاب ترجمہ کی، جسے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس

نے شائع کیا اور درسی کتاب کے طور پر بھی مصوری کے طلباء کو پڑھائی جاتی ہے۔ کتاب کا نام ”آرٹ کے پہلو“ ہے۔ اور شعری مجموعہ زیر ترتیب ہے جس میں غزلیں، نظمیں اور ہائیکو شامل ہوں گی۔ اور اس کے ساتھ ہی ہم نے شہاب الدین شہاب صاحب سے اجازت چاہی۔ اس شکر یہ کے ساتھ کہ انہوں نے وقت دیا۔

ماہنامہ کرن

مارچ 2020ء کے سالگرہ نمبر کے شمارے کی ایک جھلک



• ”ماہنامہ کرن“ کی سالگرہ کے حوالے سے قارئین سے خصوصی سروے  
• گلوکار ”عامر سلیم“ سے شاہین رشید کی ملاقات،

• اداکار ”نصیب شیر“ کتنی ہیں ”میری بھی بننے“،

• آواز کی دنیا سے ”طیب حسین صدیقی“ ہاں، مہمان ہیں،

• ”میرے ہم نفس میرے ہم لڑا“ آسیہ مرزا کا سلسلہ وار ناول،

• ”ہوائیں رخ بدل گئیں“

• نعیمتاز، عطیہ خالد، نصیرہ سعید اور

مارچ 2020ء کا شمارہ شائع ہو گیا



## اپ کا باوقی خانہ

ذریعہ خاتم

س: کھانا پکاتے وقت آپ کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں پسندنا پسند لذت یا گھر والوں کی صحت؟  
ج: صرف پسند اور صرف چسکہ، یہ ہے ہمارا ماٹو غذائیت جائے بھاڑ میں غذائیت کے لیے دودھ اور ملک فیک کافی ہے، مکھن بھی گھر پر بنتا ہے۔

س: گھر میں اچانک مہمان آجائیں کھانے کے وقت کسی ایسی ڈش کی ترکیب بتائیں جو فوری تیار کر کے پیش کر دی جائے۔  
ج: آج کل فریج زندہ باد۔ کوٹے، شامی بنے رکھے ہوتے ہیں۔ لہسن وغیرہ پیس کر فریز ہوتا ہے جھٹ پھٹ سب تیار ہو جاتا ہے۔ پہلے زمانے میں ہماری ماؤں کو بڑی دقت ہوتی تھی۔ مہمان کے آنے کے بعد مرغی ذبح کی جاتی، سالہ بنتا تھا۔ آٹا اسی وقت گوندھنا پڑتا تھا۔ لکڑیوں سے آگ جلانا ایک مرحلہ تھا۔ اب تو ہر چیز ریڈی میڈ ہے۔ گوشت کے پکٹ رکھے ہوتے ہیں، آٹا گوندھ کے رکھا ہوتا ہے۔

س: کچن عورت کی سلیقہ مندی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ آپ کچن کی صفائی کے لیے کیا خصوصی اہتمام کرتی ہیں۔  
ج: کھانا پکانے کے وقت تو کچن میں خوب افراتفری پھیلی ہوتی ہے لیکن ساتھ کے ساتھ جیسے ہی دہی والا چنوں والا شاپر خالی ہوا اسے فوری ڈسٹ بن

میں ڈال دیا جو برتن میلا ہوتا ہے، اسے اسی وقت سین میں رکھ کر کام والی بچی سے دھلوا لیا۔ کھانا پک چکا تو اسے ڈونگوں میں ڈال دیا جاتا ہے۔ ہمارے ناشتے سے فارغ ہوتے ہی کام والی ملازمہ آ جاتی ہے برتن دھو کر، پونچھا لگا کر کچن کو چکا کر رکھ دیتی ہے۔ چولہا بھی ہر دن دھولیا جاتا ہے۔

س: آپ مہینے میں کتنی بار کھانا کھانے باہر جاتی ہیں؟  
ج: مہینے میں؟ ہم تو کبھی سالوں میں بھی باہر کھانا کھانے نہیں گئے ہاں اگر کوئی کسی خوشی میں ہوٹل میں دعوت دے تو پھر جانا پڑتا ہے۔ ابھی ہمارے

س: کھانا پکاتے وقت آپ کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں پسندنا پسند لذت یا گھر والوں کی صحت؟  
ج: صرف پسند اور صرف چسکہ، یہ ہے ہمارا ماٹو غذائیت جائے بھاڑ میں غذائیت کے لیے دودھ اور ملک فیک کافی ہے، مکھن بھی گھر پر بنتا ہے۔

س: گھر میں اچانک مہمان آجائیں کھانے کے وقت کسی ایسی ڈش کی ترکیب بتائیں جو فوری تیار کر کے پیش کر دی جائے۔  
ج: آج کل فریج زندہ باد۔ کوٹے، شامی بنے رکھے ہوتے ہیں۔ لہسن وغیرہ پیس کر فریز ہوتا ہے جھٹ پھٹ سب تیار ہو جاتا ہے۔ پہلے زمانے میں ہماری ماؤں کو بڑی دقت ہوتی تھی۔ مہمان کے آنے کے بعد مرغی ذبح کی جاتی، سالہ بنتا تھا۔ آٹا اسی وقت گوندھنا پڑتا تھا۔ لکڑیوں سے آگ جلانا ایک مرحلہ تھا۔ اب تو ہر چیز ریڈی میڈ ہے۔ گوشت کے پکٹ رکھے ہوتے ہیں، آٹا گوندھ کے رکھا ہوتا ہے۔

س: کچن عورت کی سلیقہ مندی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ آپ کچن کی صفائی کے لیے کیا خصوصی اہتمام کرتی ہیں۔  
ج: کھانا پکانے کے وقت تو کچن میں خوب افراتفری پھیلی ہوتی ہے لیکن ساتھ کے ساتھ جیسے ہی دہی والا چنوں والا شاپر خالی ہوا اسے فوری ڈسٹ بن

میں ڈال دیا جو برتن میلا ہوتا ہے، اسے اسی وقت سین میں رکھ کر کام والی بچی سے دھلوا لیا۔ کھانا پک چکا تو اسے ڈونگوں میں ڈال دیا جاتا ہے۔ ہمارے ناشتے سے فارغ ہوتے ہی کام والی ملازمہ آ جاتی ہے برتن دھو کر، پونچھا لگا کر کچن کو چکا کر رکھ دیتی ہے۔ چولہا بھی ہر دن دھولیا جاتا ہے۔

س: آپ مہینے میں کتنی بار کھانا کھانے باہر جاتی ہیں؟  
ج: مہینے میں؟ ہم تو کبھی سالوں میں بھی باہر کھانا کھانے نہیں گئے ہاں اگر کوئی کسی خوشی میں ہوٹل میں دعوت دے تو پھر جانا پڑتا ہے۔ ابھی ہمارے

س: کھانا پکاتے وقت آپ کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں پسندنا پسند لذت یا گھر والوں کی صحت؟  
ج: صرف پسند اور صرف چسکہ، یہ ہے ہمارا ماٹو غذائیت جائے بھاڑ میں غذائیت کے لیے دودھ اور ملک فیک کافی ہے، مکھن بھی گھر پر بنتا ہے۔

س: گھر میں اچانک مہمان آجائیں کھانے کے وقت کسی ایسی ڈش کی ترکیب بتائیں جو فوری تیار کر کے پیش کر دی جائے۔  
ج: آج کل فریج زندہ باد۔ کوٹے، شامی بنے رکھے ہوتے ہیں۔ لہسن وغیرہ پیس کر فریز ہوتا ہے جھٹ پھٹ سب تیار ہو جاتا ہے۔ پہلے زمانے میں ہماری ماؤں کو بڑی دقت ہوتی تھی۔ مہمان کے آنے کے بعد مرغی ذبح کی جاتی، سالہ بنتا تھا۔ آٹا اسی وقت گوندھنا پڑتا تھا۔ لکڑیوں سے آگ جلانا ایک مرحلہ تھا۔ اب تو ہر چیز ریڈی میڈ ہے۔ گوشت کے پکٹ رکھے ہوتے ہیں، آٹا گوندھ کے رکھا ہوتا ہے۔

س: کچن عورت کی سلیقہ مندی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ آپ کچن کی صفائی کے لیے کیا خصوصی اہتمام کرتی ہیں۔  
ج: کھانا پکانے کے وقت تو کچن میں خوب افراتفری پھیلی ہوتی ہے لیکن ساتھ کے ساتھ جیسے ہی دہی والا چنوں والا شاپر خالی ہوا اسے فوری ڈسٹ بن



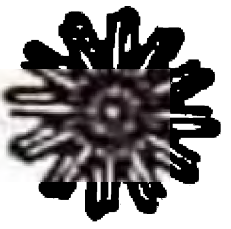
بہتجے کی شادی کے بعد ہم سب گھر والوں کو کافی رشتہ داروں نے ہوٹل میں دعوت دی۔ ہم نے خوشی سے قبول کر لی ورنہ جب ہوٹل یا باہر کا کھانا کھانے کا موڈ ہو تو گھر میں منگوا لیا جاتا ہے۔

س: کچن کی کوئی ٹپ بتائیں؟

ج: سب سے پہلے اچھی طرح دوپٹے سے سر ڈھانپیں۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر کچن میں پہلے دایاں پاؤں رکھیں پھر کام کرتے ہوئے آہستہ آواز میں سبحان اللہ پڑھتی رہیں بعض بہنیں کچن میں گانے سننے میں مگن رہتی ہیں، یہ بے برکتی والی بات ہے۔

س: اچھا پکانے کے لیے کتنی محنت کی قائل ہیں؟

ج: اچھا پکانے کے لیے محنت تو درکار ہے نمک مرچ توجہ اور تناسب سے ڈالو۔ گوشت کو اچھی طرح گلا لو پھر بھنائی کا مرحلہ شروع ہوتا ہے جتنی اچھی طرح بھنائی ہوگی اتنی ہی چیز مزیدار بنے گی۔ روٹیاں



ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 4 خوبصورت ناول

ایک میں  
اور ایک تم



تنزیلہ ریاض  
قیمت - 350/- روپے

اُجالوں کی بستی



فاخرہ حبیب  
قیمت - 400/- روپے

کسی راستے کی  
تلاش میں



میمونہ خورشید علی  
قیمت - 350/- روپے

میرے خواب  
لوٹا دو



نگہت عبداللہ  
قیمت - 400/- روپے

فون نمبر:  
32735021

منعوانے  
مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی



## عنوان

# نہایتی لڑکی گھس

انسانی ذہن کے دو حصے ہیں۔ (۱) شعور (۲) لاشعور۔

جب کسی چیز کا خیال بغیر اسے دیکھے ہمارے ذہن میں موجود ہو اور ہمیں اس کے متعلق سب کچھ معلوم ہو اور اس کا پورا ادراک ہو، اسے شعور کہتے ہیں لاشعور صرف وہ خیالات ہیں جو ذہن میں موجود تو ہوں، مگر ان کی موجودگی کا علم شعوری طور پر نہ ہو۔ لاشعور ہمارے ذہن کا وہ تاریک گوشہ ہے جس کے بارے میں ہمیں شعوری طور پر کچھ معلوم نہیں ہوتا، فرائیڈ نے شعور اور لاشعور کے اس فرق کو فوٹو گرافی کی مثال دے کر واضح کیا ہے۔ جب فوٹو اتارا جاتا ہے تو سب سے پہلے نیکلیو بنتا ہے۔ پھر ان نیکلیو میں سے جو پسند ہوں، انہیں پوزیٹو میں تبدیل کر کے فوٹو بنائی جاتی ہے۔ اسی طرح خیالات کی بھی لاشعور میں چھان بین ہوتی ہے جو خیالات صحیح ہوں۔ انہیں شعور میں آنے کی اجازت ملتی ہے۔ لاشعور میں جو نا پسندیدہ، متضاد، سرکش اور آوارہ خیالات رہتے ہیں، وہ کسی نہ کسی طرح شعور میں آتے رہتے ہیں۔

نارمل حالت میں، صحت مندی میں — شعور کو لاشعور پر سوتے جاگتے دونوں کیفیتوں میں مکمل کنٹرول ہونا چاہیے۔ لیکن بعض اوقات وہ خیالات لاشعور سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو انسان ذہنی توازن کھو بیٹھتا ہے اور غیر معمولی حرکتیں کرنے لگتا ہے۔ جاگتے وقت جو باتیں شعور میں ہوتی رہتی ہیں، سوتے وقت انسانی شعور غافل ہو جاتا ہے تو یہ کئی روپ دھار لیتی ہیں، کبھی خوابوں کی شکل میں اور کبھی نیند میں چلنے کی حالت میں۔

☆☆☆

ش..... سکھر

س:- بہن ش نے لکھا ہے ”بھائی مجھے اکیلے رہنا قبول ہے مگر کسی اور کے ساتھ نہیں اور اوپر سے میرا گناہ..... مجھے بتائیں کیا کروں۔ کیسے نکلوں اس مصیبت سے..... مجھے پتا ہے میرا گناہ بہت بڑا ہے۔ مگر کوئی تو حل ہوگا۔“

ج:- عزیز بہن.....! جو کچھ آپ سے سرزد ہوا، وہ غلط تو تھا۔ اس میں آپ کا قصور تو ہے ہی لیکن آپ کے گھر والوں کا بھی قصور ہے۔

حیرانی کی بات ہے کہ لڑکیاں اتنے بڑے بڑے کام کر گزرتی ہیں اور گھر والے بے خبر رہتے ہیں۔ اب مسئلہ ایک نہیں دو ہیں۔ ایک طرف آپ کی محبت ہے۔ آپ کا ذہن محبوب کے علاوہ کسی اور کو قبول کرنے کو تیار نہیں..... یہ مسئلہ اتنا اہم نہیں ہے۔ سب کو محبت میں ایسا ہی لگتا ہے کہ اگر محبوب نہ ملا تو مرجائیں گے۔ پھر دونوں کی شادی کہیں اور ہو جاتی ہے اور پرانی محبتیں حماقت لگتی ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ محبوب کی جدائی ابتدا میں بہت دکھ دیتی ہے پھر آہستہ آہستہ مبرا آ جاتا ہے۔

دوسرا مسئلہ واقعی اہم ہے۔ ایک لڑکی جس سے معنی ہوئی ہے وہ شکی مزاج ہے، پھر آپ کے ساتھ جو مسئلہ ہے وہ بہت بڑا ہے، اسے کسی سے پتا چلایا شک ہو گیا تو آپ کی مشکلات مزید بڑھ سکتی ہیں۔

اگر آپ کی بڑی بہن ہیں یا والدہ ہیں تو آپ ہمت کریں اور ان کو بتادیں۔ ممکن ہے وہ اس مسئلہ کا کوئی حل

=====



نکال سکیں۔ آپ کسی لیڈی ڈاکٹر سے بھی مشورہ کر سکتی ہیں۔ ممکن ہے وہ کوئی حل نکال لیں۔  
جہاں تک اس لڑکے کا مسئلہ ہے جب تک اس کے گھر والے رضامند نہ ہوں آپ کوئی ایسا قدم نہ اٹھائیں  
جو مزید پچھتاوؤں کا باعث بن جائے۔

سوالیہ

ج: 16۔ کل ایک سو صفحات پر مشتمل آپ کا خط پڑھ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ کا مسئلہ آپ کی حد  
سے بڑی ہوئی حساسیت ہے۔ آپ کے گھر میں جو نامساعد حالات ہیں۔ وہ اس ملک کے ساٹھ فیصد گھروں میں  
نظر آتے ہیں، جہاں محدود آمدنی اور زیادہ بچے ہوں۔ والد کا کوئی معقول ذریعہ روزگار نہ ہونے کے باوجود آپ  
پر اللہ کا یہ بڑا کرم ہے کہ آپ سب بہنوں نے اچھی تعلیم حاصل کی اور آپ خود بھی پڑھ رہی ہیں۔ پورے خط میں  
آپ کا مسئلہ آپ کی بہن ہے جس کی فکر میں آپ مبتلا ہیں۔ جس کے پاس فون ہے۔ وہ کسی لڑکے سے فون پر  
باتیں کرتی ہے۔ اول تو یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے دوسرے آپ کے والد نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی اسے فون  
کی چھوٹ دے رکھی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس لڑکے سے رشتے پر راضی ہیں۔ بالفرض اگر ایسا نہیں بھی  
ہے تو یہ آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ کے والدین جانیں اور آپ کی بہن آپ اس چکر میں نہ  
پڑیں کہ وہ کیا کر رہی ہے کیا نہیں۔ آپ اپنی پڑھائی پر توجہ دیں یہی آپ کے لیے بہتر ہے۔ خط سے اندازہ  
ہوتا ہے۔ آپ ذہین ہیں، پڑھ لکھ کر اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکتی ہیں۔ دل لگا کر پڑھیں۔ گھر کے حالات بھی  
ٹھیک ہو جائیں گے۔

س۔ ق۔ سیالکوٹ

س: ایک بہن کا خط ملا ہے۔ جوائنٹ فیملی سسٹم میں رہتی ہیں۔ ان کا مسئلہ جیٹھانی کے بدتمیز بچے ہیں۔  
جو بد زبان ہیں۔ بڑوں کا ادب لحاظ نہیں کرتے۔ گالیاں دیتے ہیں۔ یہ بہن ماں بننے والی ہیں۔ کوئی پھل فروٹ  
یا جوس بنے بیٹھتی ہیں تو یہ بچے چھین کر بھاگ جاتے ہیں۔ اگر اپنے کمرے میں بیڈ پر کھانے بیٹھ جائیں تو بچے  
بھی اپنا کھانا لے کر ان کے ساتھ بیڈ پر کھانے بیٹھ جاتے ہیں۔ آدھا کھاتے ہیں۔ آدھا بیڈ پر گراتے ہیں۔ میک  
اپ کا سامان ڈرینک بیبل پر گرا دیتے ہیں۔ اگر کوئی ان بچوں کو کچھ کہہ دے تو جیٹھانی لڑنے کو تیار۔ ان کو فکر یہ  
ہے کہ اس ماحول میں رہ کر ان کا بچہ بھی بری عادات کا شکار ہو جائے گا۔ دوسری نگر یہ ہے کہ یہ اپنی شخصیت میں  
اعتماد کی کمی محسوس کرتی ہیں۔ اس لیے چاہتی ہیں کہ ان کا بچہ ایک پُر اعتماد انسان بنے۔

ج: عزیز بہن!..... جو پریشانیاں آپ کو لاحق ہیں۔ خیر جوائنٹ فیملی سسٹم میں رہنے والوں کو پیش آتی  
ہیں۔ کسی کے بچے کو چاہے کتنا بھی پیار کر لیں۔ لیکن اگر اسے کسی بات پر ٹوک، میں یا ڈانٹ دیں تو وہ ناراض  
ہو جائے گا۔ مسئلہ یہ ہے کہ آپ کے شوہر بھی باہر ہیں۔ ورنہ وہ ان بچوں کو سمجھا لیتے یا علیحدہ پورشن کا انتظام  
کرتے۔ اب آپ کو خود ہی اس مسئلہ کو حل کرنا ہوگا۔ آپ ان بچوں کو خود سے مانوس کریں۔ انہیں کہانیاں سنانے  
کے بہانے اپنے پاس بلائیں اور کہانیوں کی شکل میں اچھی باتیں بتائیں۔ ان کے ساتھ پیار محبت سے پیش  
آئیں۔ جو بچہ اچھی بات سیکھے اور اس پر عمل کرے۔ اس کو ٹائی، چاکلیٹ یا مٹھائی انعام میں دیں۔ خواہ کتنے ہی  
بدتمیز اور بد زبان سہی، ہیں تو بچے ہی۔ آپ دیکھیں گی کہ بہت جلد ان میں تبدیلی آئے گی۔

آپ کے خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ متحمل مزاج اور سمجھ دار ہیں اور بخوبی یہ کام انجام دے سکتی ہیں۔  
جہاں تک شخصیت میں اعتماد پیدا کرنے کا تعلق ہے تو اس کے لیے پریشان نہ ہوں آپ کا بچہ ایک پڑھی  
لکھی ماں کی گود پرورش پائے گا۔ وہ پُر اعتماد ہوگا۔ ان شاء اللہ

☆



امّت الصّبور

بیوٹی ٹیکس

شمینہ عمر..... کراچی

س: میرے سر میں بے انتہا خشکی ہے۔ بہت سے شیمپو استعمال کیے ہیں لیکن وہ کسی طرح دور نہیں ہوتی۔ اس خشکی کی وجہ سے میرے ماتھے پر ریل بھی نکلنے لگے ہیں۔ کیا آپ کوئی علاج تجویز کر سکتی ہیں اور ہاں مجھے کبھی بھار قبض کی بھی شکایت رہتی ہے۔

ج: آپ کے چہرے پر دانے، قبض اور بالوں کی خشکی کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ اس لیے سب سے پہلے نظام ہضم کو درست کرنے کی فکر کریں۔ ایک گلاس پانی خالی پیٹ پیئیں۔ اس کے علاوہ دن میں بھی جتنا زیادہ پانی پی سکیں اتنا اچھا ہے۔ کھانے میں زیادہ سے زیادہ سبزیوں اور پھلوں کا استعمال قبض کو دور کر سکتا ہے۔ روزانہ صبح مناسب ورزش کریں۔ خشکی جہاں تک بالوں کی خشکی کا سوال ہے۔ خشکی بعض اوقات بالوں کو تیل کی مناسب مقدار نہ ملنے کی وجہ سے بھی ہو جاتی ہے۔ جس طرح جسم کو خوراک کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح بالوں کی جڑوں کو نرم رکھنے کے لیے تیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس بات کو اپنی عادت بنالیں۔ اگر زیادہ نہیں تو ہفتے میں ایک بار سونے سے پہلے بالوں کی کسی اچھے تیل سے مالش کریں۔ سر کا مساج اس طرح کریں کہ تیل جڑوں میں چنچ کر جذب ہو جائے۔ بال دھونے کے لیے اچھا اور معیاری شیمپو استعمال کریں۔

سعدیہ..... سرگودھا

س: میرا مسئلہ بڑھا ہوا پیٹ ہے جس کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔ میری عمر بیس سال ہے۔ میں نے پیٹ کم کرنے کے لیے بہت کچھ کر دیا

ہے۔ کھانا کم کیا ہے۔ رسی بھی کودتی ہوں۔ لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوا۔

ج: پیٹ کم کرنے کے لیے آپ درج ذیل ورزش کریں۔

1۔ سیدھی کھڑی ہو جائیں۔ دونوں بازو اوپر کر لیں اب جھک کر دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے پیر چھونے کی کوشش کریں۔ یہ عمل پانچ دفعہ کریں۔ پھر آہستہ آہستہ بڑھا کر دس تک لے جائیں۔

2۔ گہرا سانس لے کر پیٹ کو اندر کی طرف کریں اور ایک سے دس تک گنیں۔ پھر گہرا سانس منہ کے ذریعے خارج کر دیں۔ یہ عمل چلتے پھرتے۔ کھانا پکاتے، ٹی وی دیکھتے کسی بھی وقت کیا جاسکتا ہے۔ دن میں کم از کم سو بار یہ عمل کریں۔ جلد ہی نتائج برآمد ہوں گے۔

اپنے پیٹ کا خیال رکھیں۔ قبض نہ ہونے دیں۔ صبح سویرے اٹھ کر نہار منہ دو گلاس پانی پیئیں آج کل امرود کا موسم ہے امرود، کینو اور دوسرے پھل باقاعدگی سے استعمال کریں۔ جلد افاقہ ہوگا۔

فرحت صدیقی..... لاہور

س: میرا رنگ گورا ہے لیکن چہرہ فریش نظر نہیں آتا۔ جلد خشک اور مرجھائی ہوئی ہے۔ میری عمر بیس سال ہے لیکن میں اپنی عمر سے زیادہ نظر آتی ہوں۔

ج: چہرے کی تازگی اور دل کشی کے لیے بیسن میں عرق گلاب اور تھوڑی سی ملائی ملا کر گاڑ جا پیسٹ بنالیں۔ اسے چہرے پر لگائیں۔ جلد کی خشکی دور ہو جائے گی۔ صابن کا استعمال کم سے کم کریں اور بہتر ہوگا کہ گلسرین سوپ استعمال کریں۔





خواتین ڈائجسٹ مارچ کا شمار لے ماہز ہیں۔  
 کوئی نہیں جانتا کہ بنی نوع انسان نے ابتدا سے اب تک ارتقا کی کتنی منزلیں طے کیں۔ تہذیب و تمدن نے کتنی ترقی کی۔ تہذیبیں بنی اور بگڑتی رہی ہیں۔ انسانی تہذیب اور تمدن ارتقا پذیر ہیں۔ وقت کے ساتھ ہمارا فکری اسلوب اور معاشرتی طرز زندگی بھی بدلتا رہا ہے۔  
 انسانی تہذیب اور تمدن کے فروغ میں دیگر عوامل کے ساتھ ساتھ ادب اور فن بھی اہم ذریعہ رہا ہے۔ ادب نے انسانی زندگی اور معاشرے پر بہت گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔  
 زندگی میں لطافت اور خوبصورتی پیدا کرنے میں ادب اور فن کا کردار بہت اہم ہے۔ ایک کہانی کے ذریعے جو سبق دیا جاتا ہے، وہ براہ راست تبلیغ سے زیادہ مؤثر ثابت ہوتا ہے۔ کہانی آسانی سے ذہن نشین ہو جاتی ہے اور اس میں جو سبق پوشیدہ ہوتا ہے، وہ ہمارے ذہن پر نقش ہو جاتا ہے۔  
 یہی وجہ ہے کہ ہمارے بزرگ چھوٹی چھوٹی حکایتوں اور کہانیوں کے ذریعے ذہنی تربیت کا فریضہ انجام دیتے رہے ہیں۔

ایک کہانی جو تمام انسانی تقاضوں پر پورا اُترتی ہو، اچھی کہانی کہلائی جاسکتی ہے، لیکن اسے مکمل اور قابلِ قداسی صورت کہا جائے گا جب یہ زندگی کے لیے سواد کا باعث ہو۔ ادب کا مقصد صرف تفریح نہیں زندگی کی اصلاح اور فلاح بھی ہے۔

## سالگرہ نمبر،

اپریل کا شمار سالگرہ نمبر ہوگا۔ مسنفین سے درخواست ہے کہ سالگرہ نمبر کے لیے اپنی تحریریں جلد از جلد مجلہ میں شامل ہو سکیں۔

سالگرہ نمبر میں حسبِ ضرورت قارئین سے سروے بھی شامل ہوگا۔  
 سروے کے سوالات یہ ہیں۔

۱۔ خواتین ڈائجسٹ کو پڑھنے ہوئے آپ کو کتنا عرصہ گزرا۔ اس وقت سے اب تک کے عرصے میں آپ کی زندگی میں کتنی تبدیلیاں آئیں۔ کوئی ایسا واقعہ جس نے زندگی بدل دی۔

۲۔ پچھلے ایک سال کے دوران کوئی ڈراما دیکھا؟ کوئی کتاب پڑھی؟ اس کے بارے میں آپ کی رائے؟

۳۔ اپنا پسندیدہ شعر، اقتباس لکھیں۔ جو خواتین ڈائجسٹ میں پڑھا ہو؟

ان سوالات کے جواب اس طرح بھیجائیں کہ، بیس 25 مارچ تک موصول ہو جائیں۔

## اس شمارے میں،

۱۔ گل ارباب کا مکمل ناول۔ عشقِ زان،

۲۔ فریح جیٹو کا مکمل ناول۔

۳۔ شعیب علی کا ناولٹ۔ عرق،

۴۔ راحت جبین، محنت محلا ہر ادبِ عمرہ، محمد کے ناول،

۵۔ غزالہ نگار اور کزنی، حمیرا، کھنچ، قرۃ العین سکندر، زلالہ، منجرا، منیرین ولی اور قرۃ العین خرم، اٹھی کے افسانے،

۶۔ مامنی کے معروف نوز کا سر شہاب الدین شہاب سے ملاقات،

۷۔ معروف شیف فریح محمد سے باتیں،

۸۔ کہہ کر کن روشنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،

۹۔ خطِ آپ کے، نئی بات اور دہائی اٹھیں اور عدنان کے سروے شامل ہیں۔



قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

## کین کین روٹی

ادارہ

فوائد و مسائل:

1- بعض گناہ عام لوگوں کی نظر میں معمولی ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ بڑے ہوتے ہیں مثلاً گالی گلوچ ہنسی مذاق میں جھوٹ بولنا، مرد کا اپنی شلوار، تہ بند اور پاجامہ، وغیرہ سے ٹخنوں کو چھپالینا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اپنا تہ بند آدمی پنڈلی تک اونچا رکھنا، اگر یہ نہ ہو سکے تو ٹخنوں تک ضرور اونچا رکھنا اور تہ بند کو (ٹخنوں سے نیچے تک) لٹکانے سے بچنا کیونکہ یہ تکبر ہے۔“ (سنن ابی داؤد..... حدیث ۴۰۸۴)

2- جو گناہ معاشرے میں عام ہو جائے، عوام کی نظر میں وہ گناہ نہیں رہتا، خواہ کبیرہ ہی ہو۔ علماء کو چاہیے کہ ایسے گناہوں سے خاص طور پر منع کریں اور ان کے بارے میں اسلامی احکام کی وضاحت کریں۔

3- جو گناہ واقعتاً صغیرہ ہیں ان کے بارے میں بھی احتیاط ضروری ہے کیونکہ صغیرہ گناہ بہ کثرت کرنے سے مجموعی طور پر گناہوں کی مقدار بہت زیادہ

امید اور اجل

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”یہ ابن آدم ہے اور یہ اس کی اجل ہے، گدڑی کے قریب۔“ پھر آگے کو ہاتھ بڑھا کر فرمایا۔ ”اور وہاں تک اس کی امیدیں ہیں۔“ (ترمذی)

فائدہ: انسان کی امیدوں کے مقابلے میں اس کی اجل بہت قریب ہے، لہذا اس کے استقبال کی تیاری ضروری ہے۔ دنیا میں مشغول ہو کر آخرت سے غفلت انتہائی نادانی ہے۔

معمولی گناہ

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا۔

”اے عائشہ! معمولی سمجھے جانے والے گناہوں سے بچنا، اللہ کے ہاں ان کا بھی مواخذہ ہوگا۔“ (احمد)



ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے انسان سزا کا مستحق ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ صغیرہ گناہوں کی پروا نہ کرنے سے کبیرہ گناہوں کے ارتکاب کی جرات پیدا ہو جاتی ہے، اس لیے ان سے بھی اجتناب ہی بہتر ہے۔

### توبہ میں جلدی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”جب مومن کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے۔ اگر وہ توبہ کر لے، باز آ جائے اور (اللہ سے) بخشش کی درخواست کرے تو اس کا دل صاف ہو جاتا ہے۔ اگر مزید گناہ کرے تو سیاہی کا نقطہ زیادہ ہو جاتا ہے (حتیٰ کہ ہوتے ہوتے دل بالکل سیاہ ہو جاتا ہے۔) یہی وہ زنگ ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں (اس فرمان میں) کیا ہے۔

ترجمہ :- یوں نہیں بلکہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال کی وجہ سے زنگ پڑ گیا ہے۔“

### فوائد و مسائل:

- 1- گناہ ہو جائے تو جلد سے جلد توبہ کرنی چاہیے تاکہ دل پاک صاف ہو جائے۔
- 2- گناہوں کی وجہ سے دل سیاہ ہو جانے کا یہ نقصان ہوتا ہے کہ نیکی سے محبت اور گناہ سے نفرت ختم ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے توبہ کی توفیق نہیں ملتی۔
- 3- روحانی بیماریوں کا علاج اللہ کی یاد، قرآن کی تلاوت، توبہ و استغفار اور موت کی یاد ہے۔

### نیکیاں غبار میں تبدیل

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”میں اپنی امت کے ان افراد کو ضرور پہچان لوں گا جو قیامت کے دن تہامہ کے پہاڑوں جیسی سفید (روشن) نیکیاں لے کر حاضر ہوں گے تو اللہ عزوجل ان (نیکیوں) کو بکھرے ہوئے غبار میں تبدیل کر دے گا۔“ (طبرانی)

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ نے عرض کیا ”اللہ

کے رسول ان کی صفات بیان فرما دیجیے۔ ان (کی خرابیوں) کو ہمارے لیے واضح کر دیجیے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم ان میں شامل ہو جائیں اور ہمیں پتا بھی نہ چلے۔“ آپ نے فرمایا۔

”وہ تمہارے بھائی ہیں اور تمہاری جنس سے ہیں اور رات کی عبادت کا حصہ حاصل کرتے ہیں جس طرح تم کرتے ہو۔ لیکن وہ ایسے لوگ ہیں کہ انہیں جب تنہائی میں اللہ کے حرام کردہ گناہوں کا موقع ملتا ہے تو ان کا ارتکاب کر لیتے ہیں۔“

### فوائد و مسائل:

- 1- بہت سے گناہ نیکیوں کو ضائع کر دیتے ہیں۔
- 2- لوگوں کے سامنے نیک بنے رہنا اور تنہائی میں گناہ کا ارتکاب بے تکلف کر لینا، یہ بھی قسم کی منافقت ہے جس کی وجہ سے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں۔

3- تہجد پڑھنا بڑی نیکی ہے لیکن اس سے زیادہ ضروری تنہائی میں تقویٰ پر قائم رہنا ہے۔

- 4- اصل تقویٰ یہی ہے کہ انسان اس وقت بھی گناہ سے باز رہے جب اسے دیکھنے والا کوئی نہ ہو۔
- 5- نیکیوں کو غبار میں تبدیل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں کو قبول نہیں فرمائے گا، اس لیے وہ بے وزن ہو جائیں گی اگرچہ دیکھنے میں وہ پہاڑوں جیسی عظیم اور سفید ہوں۔

### تقویٰ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا۔ ”کون سا عمل سب سے زیادہ (لوگوں کو) جنت میں داخل کرے گا؟“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”تقویٰ اور خوش اخلاقی۔“

سوال کیا گیا ”کون سی چیز سب سے زیادہ (لوگوں کو) جہنم میں لے جائے گی؟“



فرمایا ”دو کھو کلی چیزیں منہ اور شرم گاہ۔“

فوائد و مسائل:

1- تقویٰ اللہ سے ڈرنے اور گناہوں سے بچنے کا نام ہے اور خوش اخلاقی انسانوں پر ظلم و زیادتی کرنے سے اور برا سلوک کرنے سے باز رکھتی ہے۔ اس طرح تقویٰ سے حقوق اللہ صحیح ادا ہوتے ہیں اور خوش اخلاقی سے حقوق العباد۔ ان دونوں کی ادائیگی یقیناً جنت کے حصول کا ذریعہ ہے۔

2- منہ کے گناہوں میں حرام رزق کھانا بھی ہے جس کی وجہ سے نیکیاں قبول نہیں ہوتیں اور زبان کے گناہ بھی، مثلاً جھوٹ، غیبت، گالی گلوچ وغیرہ جن سے لوگوں میں فساد پیدا ہوتا اور بڑھتا ہے۔ یہ دونوں قسم کے گناہ بڑے گناہ ہیں۔

3- شرم گاہ کا گناہ زنا ہے جو کبیرہ گناہ ہے اور معاشرے میں بے شمار خرابیاں پیدا کرنے کا باعث ہے۔ زبان کے گناہ (غیر محرم سے ناجائز بات چیت وغیرہ) آنکھ کے گناہ (نامحرم کو دیکھنا) ہاتھ کے گناہ (نامحرم کو چھونا، یا خط وغیرہ لکھنا اور فون کرنا) پاؤں کے گناہ (بدکاری کے لیے چل کے جانا) وغیرہ سب اسی بڑے گناہ کے لیے کیے جاتے ہیں جن کی وجہ سے انسان جہنم میں پہنچ جاتا ہے۔

4- منہ اور شرم گاہ کے گناہوں سے بچتے والے کے بارے میں امید کی جاسکتی ہے کہ وہ دوسرے گناہوں سے بھی بچ جائے گا اور جنت میں چلا جائے گا۔

### توبہ کا بیان

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اللہ تعالیٰ تمہاری توبہ سے اس سے زیادہ خوش ہوتا ہے جتنا کوئی اپنی کم شدہ سواری پا کر خوش ہوتا ہے۔“

فوائد و مسائل:

1- حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب بندہ گناہ

سے توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بہت خوش ہوتا ہے۔

2- بندے کو جب احساس ہو جائے کہ اس نے

گناہ کیا ہے، خواہ وہ چھوٹا گناہ ہو یا بڑا، براہ راست اللہ کے آگے توبہ کرے، یعنی اپنی غلطی کا اعتراف کر کے آئندہ کے لیے یہ عزم اور وعدہ کرے کہ وہ اس گناہ سے بچ کر رہے گا۔

3- توبہ اللہ اور بندے کا معاملہ ہے۔ اس میں کسی تیسرے کی مداخلت کی ضرورت نہیں، البتہ کسی نیک عالم آدمی کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کر کے نیکی کا عزم کرنے کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ پہلے انسان اس عالم کی شرم سے گناہ سے بچتا ہے، پھر براہ راست اللہ کی شرم سے گناہ سے بچنے کی توفیق مل جاتی ہے، تاہم یہ ضروری نہیں۔ تنہائی میں توبہ کر کے اللہ سے استقامت کی دعا کرے تو کافی ہے۔

4- جس گناہ کا تعلق حقوق العباد سے ہے، اس کے ارتکاب کی صورت میں وہ حق ادا کرنا یا صاحب حق سے معاف کروانا ضروری ہے ورنہ توبہ مکمل نہیں ہوگی۔

### توبہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اگر تم اتنی غلطیاں کرو کہ تمہاری غلطیاں آسمان تک پہنچ جائیں، پھر توبہ کرو تو (پھر بھی اللہ تمہاری توبہ قبول فرمائے گا۔“

فوائد و مسائل:

1- یہ ضروری ہے کہ انسان گناہ کے بعد جلد از جلد توبہ کر لے، تاہم اگر نفس اور شیطان کے بہکاوے اور دل کی غفلت کی وجہ سے جلد توبہ نہ کی جاسکے تو جب بھی احساس ہو توبہ کر لینی چاہیے۔ یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ اتنے زیادہ گناہ ہو گئے ہیں، وہ معاف نہیں ہوں گے، البتہ توبہ وہ ہے جو دل سے ہو، صرف زبان سے نہ ہو۔

### ندامت



حضرت عبداللہ بن معقل رحمۃ اللہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔ ”میں اپنے والد (حضرت معقل بن مقرن رضی اللہ عنہ) کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے انہیں سنا، وہ کہہ رہے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”ندامت توبہ ہے۔“

میرے والد صاحب نے ان سے کہا۔ ”کیا آپ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے (براہ راست) سنا ہے کہ آپ نے فرمایا۔ ”ندامت توبہ ہے؟“

انہوں نے کہا۔ ”ہاں۔“

فوائد و مسائل:

1- ندامت توبہ کا اہم جزو ہے۔

2- عالی سند کی طلب مستحسن ہے۔

3- اگر کسی چیز میں شک ہو تو استاد سے دریافت کر لیتا احترام کے معانی نہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”بے شک اللہ تعالیٰ اس وقت تک بندے کی توبہ قبول فرماتا رہتا ہے جب تک نزع کا عالم ظاہری نہ ہو۔“ (ترمذی)

فوائد و مسائل:

1- نزع سے مراد روح قبض کرنے کا عمل شروع ہوتا ہے۔

2- جب موت کے فرشتے ظاہر ہو جاتے ہیں تو عالم آخرت سے تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ اس لیے توبہ کی مہلت ختم ہو جاتی ہے۔

3- بندے کو چاہیے کہ جلد از جلد توبہ کر لے، معلوم نہیں کب آخری وقت آ جائے۔

### گناہ

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور بتایا کہ اس نے ایک (انجی) عورت

کا بوسہ لے لیا ہے اور وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس گناہ کا کفارہ دریافت کرنے لگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمادی۔

ترجمہ: ”دن کے کناروں میں اور رات کی گھڑیوں میں نماز قائم کیجے۔ بے شک نیکیاں گناہوں کو ختم کر دیتی ہیں۔ یہ نصیحت ہے نصیحت قبول کرنے والوں کے لیے۔“

اس آدمی نے کہا۔

”اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کیا یہ

(رعایت) میرے (یعنی) لیے ہے؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”یہ میری

امت کے ہر اس شخص کے لیے ہے جو اس پر عمل

کرے۔“

### فوائد و مسائل:

1- بعض گناہ دوسرے گناہوں سے چھوٹے

بڑے ہوتے ہیں۔ جتنا بڑا گناہ ہوگا اس کی معافی کے

لیے اتنی بڑی نیکی کی ضرورت ہے۔

2- وہ شخص اپنے گناہ پر نادم تھا اور اس کی معافی

کے لیے ہر کفارہ ادا کرنے کو تیار تھا، اس وجہ سے وہ

گناہ نماز کی برکت سے معاف ہو گیا۔ جو شخص نادم نہ

ہو، گناہ کو معمولی سمجھے، اس کا چھوٹا گناہ بھی بڑا ہو جاتا

ہے۔

3- آیت کی شان نزول سے اس کا مطلب اور

منہوم واضح ہو جاتا ہے۔ لیکن آیت میں مذکورہ حکم

امت کے سب افراد کے لیے ہوتا ہے۔

4- گناہ ہو جائے تو فوراً کوئی نیکی کرنی چاہیے،

مثلاً نفل نماز پڑھ کر گناہ کی معافی کی دعا کرے، یا

صدقہ خیرات کرے یا کوئی اور نیکی کرے جو اس گناہ

کی معافی سے مناسب رہتی ہو، مثلاً ذکر اذکار،

تلاوت اور نقلی روزہ وغیرہ۔

### اللہ کا خوف

امام زہری رحمۃ اللہ نے (اپنے شاگرد معمر سے)



فرمایا ”کیا میں تجھے دو عجیب حدیثیں نہ سناؤں؟“  
(پہلی حدیث یہ ہے جو) حمید بن عبد الرحمن  
نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”ایک آدمی نے اپنی جان پر زیادتی کی (اور  
زندگی میں بہت گناہ کیے) جب اس کی موت کا  
وقت آیا تو اس نے اپنے بیٹوں کو وصیت کرتے  
ہوئے کہا۔ جب میں مر جاؤں تو مجھے جلا دینا، پھر مجھے  
(میری لاش کو) پیس کر مجھے (میری راکھ کو) ہوا میں  
اڑا دینا اور سمندر میں بہا دینا۔ قسم ہے اللہ کی! اگر اللہ  
نے مجھے پکڑ لیا تو مجھے ایسا عذاب دے گا جو کسی کو نہیں  
دیا ہوگا۔“

ان بیٹوں نے ایسے ہی کیا۔

اللہ نے زمین سے کہا۔ ”جو تو نے لے لیا ہے  
حاضر کر دے (ایسے ہی سمندر سے بھی اس کی راکھ  
کے ذرات جمع کر کے اسے زندہ کر دیا) اچانک وہ  
(زندہ سلامت) کھڑا تھا۔

اللہ نے اس سے فرمایا۔ ”تو نے جو کام کیا ہے،  
اس پر تجھے کس چیز نے آمادہ کیا۔“

اس نے کہا۔ ”میرے رب! تیرے خوف نے۔“  
”اللہ تعالیٰ نے اسی وجہ سے اسے معاف کر دیا۔“

جانوروں سے سلوک

امام زہری رحمۃ اللہ نے (دوسری حدیث بیان  
کرتے ہوئے) فرمایا اور مجھے حمید بن عبد الرحمن نے  
ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث سنائی کہ رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”ایک عورت ایک بلی کی وجہ سے جہنم میں چلی  
گئی۔ اس نے اسے باندھ دیا تھا، نہ اسے کچھ کھانے  
کو دیا، نہ اسے چھوڑا کہ زمین کے کیڑے مکوڑے  
کھا لیتی حتیٰ کہ وہ (بھوک سے) مر گئی۔“

امام زہری رحمۃ اللہ نے فرمایا (میں نے یہ  
دو حدیثیں اس لیے سنائی ہیں) تاکہ کوئی (اپنی  
نیکیوں پر) بھروسہ نہ کرے اور کوئی (اللہ کی رحمت

سے) مایوس نہ ہو۔

فوائد و مسائل:

1- انسان کو اللہ کی رحمت کی امید کے ساتھ  
ساتھ اللہ کے عذاب سے خوف بھی رکھنا چاہیے۔

2- محدثین کی فقاہت صرف اخلاقی فروغی  
مسائل تک محدود نہ تھی بلکہ ایمان، اخلاق اور عملی  
زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔

3- اپنی لاش جلانے اور اس کی راکھ اڑانے کی  
وصیت کرنے کی وجہ موت کے وقت خشیت کی کیفیت  
کا غلبہ تھی، اس لیے اس کی یہ غلطی بھی معاف ہو گئی کہ  
اس نے نامناسب وصیت کی۔

4- اللہ تعالیٰ اس کے جسم کو زندہ کیے بغیر روح  
سے بھی سوال کر سکتا تھا لیکن اس کو اللہ نے اپنی  
قدرت اور سطوت کا مشاہدہ کروا دیا۔

5- قبر کے عذاب اور نعمت سے مراد وہ تمام  
حالات ہیں جو موت کے بعد قیامت تک پیش آئیں  
گے۔ یہ حالات ہر شخص کو پیش آتے ہیں، خواہ اسے  
دفن کیا جائے یا اسے جنگلی جانور یا مچھلیاں کھجلیں یا  
اس کی خاک سیاہ کر کے اس کے ذرے بکھیر دیے  
جائیں یا اس کی راکھ کو کسی برتن میں محفوظ کر لیا جائے یا  
اس کی لاش محفوظ ہو جسے لوگ دیکھ رہے ہوں۔

6- عذاب قبر کا تعلق عالم غیب سے ہے، اس لیے  
زندہ انسان اس کے ادراک کی طاقت نہیں رکھتے۔

7- کسی بھی جان دار چیز پر ظلم کرنا بہت بڑا  
گناہ ہے، خاص طور پر ایسا ظلم جس سے جان دار ایک  
ہی بار مر جانے کے بجائے تڑپ تڑپ کر اور سسک  
سسک کر مرے۔

8- پالتو جانوروں کی ضروریات کا خیال رکھنا  
فرض ہے بلکہ ایسے جانور جو کسی کے پالتو نہیں، ان پر  
رحم کرنے سے بھی اللہ کی رحمت حاصل ہوتی ہے، جیسے  
کتے کو پانی پلانے کی وجہ سے گناہ گار انسان کی  
معفرت ہو گئی تھی۔



# کچھ انڈوں کی طرف داری مسئلہ

## انشائی

میں کوئی واضح ہدایات نہیں چھوڑیں۔ اس لیے ان کے عقیدت مند ان کو سنبھال سنبھال کر رکھے جارہے ہیں۔

اقبال کے ایک شارح نے تو اس شعر کی مدد سے علامہ اقبال کی گھریلو زندگی پر بھی پورا مقالہ لکھ دیا ہے۔ آج کل دستور یہی ہے کہ غالب کی زندگی معلوم کرنی ہے تو اس کے دیوان سے اخذ کرو کہ وہ شہر میں بے آبرو پھرا کرتے تھے۔ دھول دھپا اور پیش دستی کیا کرتے تھے درکعبہ سے اٹے پھر آیا کرتے تھے۔ سیدھے نہیں اور مرنے کے بعد بھی بولا کرتے تھے۔

”کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ“  
وغیرہ وغیرہ۔ ان صاحب نے لکھا ہے کہ علامہ اقبال ایک روز بازار سے نئی تہذیب کے چند انڈے لے کر آئے۔ ان کی بیوی آلیٹ بنانے بیٹھیں تو انہیں دوسرا مصرع پڑھنا پڑا۔

نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے  
اس پر علامہ موصوف نے ترکی بہ ترکی یعنی مصرع بہ مصرع ہدایت کی کہ۔  
ان کو اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں

یہ تحقیق یہاں ختم نہیں ہو جانی کیونکہ اتنی سی بات کو ہر عام آدمی بھی سمجھ سکتا ہے۔ شارح موصوف کا کہنا ہے کہ شاعر کا گھر کسی گلی میں تھا۔ یہ شعر لازماً ان دنوں کا ہے، جب علامہ مرحوم نے میوروڈ پر ابھی اپنی کوٹھی نہیں بنائی تھی۔ ورنہ وہ یہ فرماتے کہ۔

اٹھا کر پھینک دو باہر سڑک پر  
جناب محقق نے علامہ اقبال کی زبان میں نقص بھی دریافت کیا ہے کہ باہر کا لفظ زائد ہے کیونکہ گلی گھر کے اندر نہیں ہوتی۔ مزید لکھا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو ہر معاملے میں خواہ مخواہ اپنی رائے دینے کی

دنیا میں یہ بحث ہمیشہ سے چلی آرہی ہے کہ انڈا پہلے یا مرغی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں انڈا۔ کچھ کا کہنا ہے مرغی۔ ایک کو ہم مرغی اسکول یا فرقہ مرغیہ کہہ سکتے ہیں۔ دوسرے کو انڈا اسکول۔ ہمیں انڈا اسکول سے منسلک سمجھنا چاہیے۔ ملت بیضا کا ایک فرد جاننا چاہیے۔ ہمارا عقیدہ اس بات میں یہ ہے کہ اگر آدمی تھانیدار یا مولوی یعنی فقیہ شہر ہو تو اس کے لیے مرغی پہلے..... اور ہم ایسا غریب شہر ہو تو اس کے لیے انڈا پہلے..... اور غریب شہر سے بھی گیا گزرا ہو تو نہ اس کی دسترس مرغی تک ہو سکتی ہے نہ انڈا اس کی گرفت میں آ سکتا ہے۔ اسے اپنی ذات اور اس کی بقا کو ان چیزوں سے پہلے جاننا چاہیے، پہلے مقدم رکھنا چاہیے۔

ایک زمانے میں ہمارا دھیان بھی بھی مرغی کی طرف بھی جایا کرتا تھا۔ لیکن جب سے بکری کے دام گائے کی قیمت کے برابر ہوئے ہیں اور مرغی، بکری کے دام پانے لگی ہے اور انڈا مرغی کے بھاؤ دستیاب ہونے لگا ہے، ہمارے لیے انڈا ہی مرغی ہے۔ ہم وحدت الوجود کی منزل میں آگئے ہیں۔ انڈاپوں بھی بڑی خوبیوں کی چیز ہے۔ اس میں سفیدی ہوتی ہے۔ اس میں زردی ہوتی ہے۔ اس میں چونا ہوتا ہے۔ اس میں پروٹین ہوتا ہے۔ اسے دانہ نہیں ڈالنا پڑتا۔ یہ بیٹ نہیں کرتا۔ بلیاں اس کی جان کی خواہاں نہیں ہوتیں۔ اس کے لیے دڑبا نہیں بنوانا پڑتا۔ اس کے خول پر رنگ کر کے اسے گھر میں سجاسکتے ہیں۔ ہاں کبھی کبھی یہ گندا ضرور نکل جاتا ہے۔ سوائے آسانی سے اٹھا کر باہر گلی میں پھینکا جاسکتا ہے۔ علامہ اقبال بھی جب نئی تہذیب کے کسی گندے انڈے کو دیکھتے تھے، یہی کہا کرتے تھے۔ افسوس کہ پرانی تہذیب کے گندے انڈوں کے متعلق انہوں نے اپنے کلام





عادت تھی ورنہ گندے انڈے کو گلی میں پھینکنے کا فیصلہ ان کی بی بی خود بھی کر سکتی تھیں۔

شارح موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ شعر علامہ اقبال مرحوم کے ابتدائے جوانی کا ہے۔ جب انہیں پہلوانی، کسرت اور کرتب بازی سے دلچسپی تھی۔ وہ بھاری بھاری وزن کو اٹھا کر دو چار بار گردش دیتے تھے، پھر پھینکتے تھے۔ یہ ان کی عادت ثانیہ بن چکی تھی۔ اس لیے کہا ہے کہ ”اٹھا کر پھینک دو۔“ صرف پھینک

دو کہنا کافی نہیں سمجھا۔ معاملہ انڈوں ہی کا کیوں نہ تھا ہمارے خیال میں اس شعر سے ابھی اور معنی نچوڑنے کی بھی گنجائش ہے۔

علامہ مرحوم کو اپنے باطن کی صفائی کی طرف زیادہ دھیان رہتا تھا۔ باہر کی صفائی کا کچھ خیال نہ کرتے تھے ورنہ وہ یہ بھی نہ فرماتے کہ انڈے اٹھا کر باہر گلی میں پھینک دو۔ انہیں کوڑے کے ڈرم میں پھینکنا چاہیے تھا۔ باہر کسی بھلے آدمی کی اچکن پر گر جاتے تو بڑا فحشہ ہوتا۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہماری قوم کو علامہ مرحوم کی ہر ہدایت پر آنکھ بند کر کے عمل کرنا چاہیے۔ ہماری رائے میں اپنی عقل کا واجبی استعمال بھی کر لینا چاہیے۔ تھوڑی احتیاط بھی لازم ہے۔ ہر خوشہ گندم کو جلانے، مرمر کی سلوں سے ناخوش و بیزار ہونے، اس رزق سے موت اچھی ہونے اور گندے انڈے گلی میں اٹھا کر پھینک دینے کے متعلق اشعار اس کی محض چند مثالیں ہیں۔

آج انڈوں کی طرف رہ رہ کر ہمارا دھیان جانے کی کئی وجہیں ہیں۔ ایک تو سردی، دوسرے حکومت کا یہ اعلان کہ گوشت اور دودھ کی طرح انڈوں کی بھی قیمتیں مقرر کی جا رہی ہیں تاکہ مقررہ قیمتوں پر نہ ملیں۔ تیسرے شاد عارفی مرحوم کا ایک نادرہ کار شعر ہماری نظر سے گزرا ہے۔ صیاد اور قفس اور نشیمن کے مضمون بہت شاعروں نے باندھے ہیں۔ نئے رنگ اور نئے ڈھنگ سے بھی باندھے ہیں۔ خود علامہ

اقبال مرحوم نے بھی ایک بلبل کی فریاد لکھی ہے لیکن اس مضمون کے جملہ متعلقات پر کسی کی نظر نہیں گئی تھی۔ فرماتے ہیں شاد عارفی رام پوری۔

انہیں بھی ساتھ لیتا جا، کہیں ٹکیاں بنا لیتا۔ ارے صیاد دو انڈے بھی رکھے ہیں نشیمن میں انڈے کا مضمون تو ختم ہوا لیکن اپنے دوست عنقا کے شکریے کے ساتھ شاد عارفی مرحوم کے چند اور اشعار۔

تاچند باغبانی صحرا کرے کوئی  
لیکن سوال یہ ہے کہ پھر کیا کرے کوئی

جناب شیخ ہی اب رہ گئے ہیں لے دے کے  
وہ دن گئے کہ کسی برہمن پہ چوٹ کروں

ستم گر کو میں چارہ گر کہہ رہا ہوں  
غلط کہہ رہا ہوں مگر کہہ رہا ہوں

کانٹے چنے جو ہم نے سر راہ کوئے دوست  
جھگڑا یہ ہے دکھاؤ ہمیں، کیا اٹھا لیا

جفا و جور کو خوبی تو ہم سمجھتے ہیں  
حکومتوں میں نہیں بلکہ مہ جبینوں میں  
☆



# باتیں فرح محمد سے

شاہین رشید

- (1) ”اصلی نام؟“  
”فرحانہ محمد..... لیکن مجھے لگتا ہے کہ میرا نام میرے والدین بھی رکھ کر بھول گئے، کیونکہ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے اپنے کانوں سے اپنے لیے ”فرح“ ہی سنا ہے۔ میرے قریبی رشتے داروں کو بھی میرا اصلی نام نہیں معلوم۔“
- (2) ”پیار کا نام؟“  
”یہی ہے یعنی فرح۔“
- (3) ”سن پیدائش؟“  
”12 مارچ..... باقی رہنے دیں۔“
- (4) ”قد/ستارہ؟“  
”پانچ فٹ تین انچ..... اور Pisees (حوت) ستارہ ہے۔ بہت پیار کرنے والے ڈسینٹ لوگ ہوتے ہیں جیسی کہ میں ہوں۔“
- (5) ”مادری زبان؟“  
”اردو۔“
- (6) ”بہن بھائی؟/آپ کا نمبر؟“  
”چار بہن بھائی ہیں اور میرا نمبر آخری ہے۔“
- (7) ”شادی؟“  
”ابھی کم ہی عرصہ ہوا ہے شادی کو۔“
- (8) ”تعلیمی قابلیت؟“  
”گریجویشن۔“
- (9) ”میڈیا میں آمد؟“  
”میں میڈیا میں خود ہی آئی تھی۔ میں بیوٹی ایکسپرٹ ہوں۔ سندھ گورنمنٹ سے سند یافتہ ہوں۔ تقریباً تیرہ، چودہ سال پہلے میں کسی بھی مارننگ شو میں پیسے دے کر بیٹھا کرتی تھی بہ حیثیت بیوٹی ایکسپرٹ کے۔“
- (10) ”بچپن کی ایک عادت جو مشکل سے گئی؟“  
”بچپن کی ایک عادت جو شکر ہے اب چلی گئی ہے کہ پہلے مجھے کوئی کچھ کہہ دیتا تھا تو میں ناراض ہو جاتی تھی، موڈ آف ہو جاتا تھا مگر اب میرے اندر بہت برداشت آ گئی ہے۔“
- (11) ”کھیلوں سے آپ کا لگاؤ، کون سا کھیل پسند ہے؟“  
”مجھے کھیلوں سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔“
- (12) ”زندگی سے کیا سیکھا؟“  
”میں نے زندگی سے اچھے برے کی پہچان سیکھی۔“
- (13) ”اس فیلڈ میں آپ کا آئیڈیل؟“  
”اس فیلڈ میں میرے آئیڈیل جنید جمشید تھے جنہوں نے مجھے اپنی بہن بنایا ہوا تھا۔“
- (14) ”ملک کی موجودہ صورت حال سے مطمئن ہیں؟“  
”بالکل بھی مطمئن نہیں ہوں۔ بہت دل دکھتا ہے بہت پریشان رہتی ہوں کہ کیا حالات ہو گئے ہیں۔“
- (15) ”پہلی بار کیمرے کا سامنا کیا تو؟“  
”جس دن مجھے جانا تھا۔ اس رات مجھے نیند نہیں آئی..... لیکن جب کیمرہ آن ہوا، لائٹس آن ہوئیں تو مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ کس طرح شو ہو گیا۔“
- (16) ”بھی ہجوم میں تنہائی محسوس ہوئی؟“  
”مجھے ہجوم میں بہت تنہائی محسوس ہوتی ہے۔ اس وقت خاص طور پر جب کوئی مجھ پر توجہ نہ دے۔ پھر خیال آتا ہے کہ میں یہاں کیوں آئی ہوں۔“
- (17) ”دل کی دھڑکن کب تیز ہو جاتی ہے؟“  
”کیا کیا بیان کروں۔ دل کی دھڑکنوں کو دل میں ہی رہنے دیا جائے تو اچھا ہے۔“
- (18) ”مارننگ شو میں میزبانی کا موقع ملے تو کیا چنچ لائیں گی؟“





”سب سے پہلے تو یہ کروں گی کہ جو بھی ڈاکٹر، ہر بلست آتے ہیں، ان سب کی ڈگریاں چیک کروں گی کہ اصلی بھی ہیں کہ نہیں کیونکہ یہ ڈاکٹر، ہر بلست لوگوں کی زندگیوں سے کھیل رہے ہوتے ہیں۔“

(19) ”گھر میں سب سے زیادہ پیار کس نے دیا؟“

”امی ابو دونوں سے ملا، بہت پیار کرتے ہیں، خیال رکھتے ہیں۔“

(20) ”اپنی بیماری کو سیریس لیتی ہیں؟“

”بہت سیریس لیتی ہوں کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ

میں زیادہ بیمار رہوں اور میرے کام کا حرج ہو۔“

(21) ”رمضان ٹراکسمیشن یا پروگرام میں کوئی بھنڈ ہوا؟“

”بھنڈ؟..... ایک نہیں بہت سارے بھنڈ ہوئے ہیں۔ کبھی فرصت میں بیٹھیں تو بتاؤں گی۔“

(22) ”گھر میں آپ کے بغیر کون کھانا نہیں کھاتا؟“

”سب ہی کھا لیتے ہیں۔ کوئی میرا انتظار نہیں کرتا۔“

(23) ”ادب سے لگاؤ ہے؟ کس کو پڑھتی ہیں؟“

”مجھے کہانی سنا بہت اچھی لگتی ہے۔ میں یوٹیوب پر کہانی سنتی ہوں۔ پڑھتی نہیں ہوں۔ ادب سے کوئی خاص

لگاؤ نہیں ہے۔ اشعار میری سمجھ میں نہیں آتے۔“

(24) ”کوئی فیصلہ جو غلط ثابت ہوا ہو؟“

”جی..... بہت سارے فیصلے ہیں جو غلط ثابت

ہوئے اور بعد میں پچھتاوے کا باعث بنے۔“

(25) ”کچن سے دوستی کس عمر میں ہوئی؟“

”کچن سے دوستی ہوئی نہیں تھی، کروا کی مٹی تھی،

جب میں نویں جماعت میں تھی تو امی نے زبردستی کچن کے

کاموں میں ڈالا۔ دھوا صاف کر دو، چاول جن دو، چاول

دھو دو۔ وغیرہ وغیرہ..... خود سے دوستی میٹرک کے بعد

ہوئی۔“

(26) ”رونا آتا ہے جب؟“

”جی رونا آتا ہے اکثر باتوں پر..... اور کوشش کرتی

ہوں کہ رات کو روؤں تاکہ کوئی دیکھ نہ سکے۔“

(27) ”کوئی خواہش جو حسرت بن گئی ہو؟“

”نہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ کوئی خواہش حسرت نہیں

بنی۔ بلکہ میں تو یہ کہتی ہوں کہ مجھے جو ملا ہے شاید میں اس کی

بھی مستحق نہیں تھی۔ مجھے اللہ نے بہت نوازا ہے۔“

(28) ”کس کے لیے زندہ رہتا جا رہی ہیں؟“

”صرف اور صرف اپنی پہلی کے لیے۔“

(29) ”آپ کو نفرت ہے؟“

”نفرت ہن لوگوں سے ہے جو دوست کے روپ

میں آپ کے کپے دشمن ہیں۔۔۔ اور ایسے لوگ چاروں

طرف پھیلے ہوئے ہیں۔“

(30) ”آپ کی پہلی کمائی؟“

”اپنی پہلی کمائی سے گھر والوں کو عمرہ کرایا تھا اور میں

خود بھی ساتھ گئی تھی۔ اچھی خاصی تھی پہلی کمائی۔“

(31) ”شوہر کی مصروفیات کے علاوہ آپ کی

مصروفیات؟“

”میں کلاسز لیتی ہوں ”لال قلعہ“ گورنمنٹ کے









”مجھے سارے ہی انکر اچھے لگتے ہیں اور سب سے میری دوستی بھی ہے..... مگر پھر بھی مجھے اقرار الحسن بہت پسند ہیں۔ ان کا اسٹائل بہت اچھا ہے۔“

(50) ”نصیحت جو بری لگتی ہے؟“  
”نصیحت مجھے بری نہیں لگتی مگر مجھے وہ لوگ برے لگتے ہیں جو دوسروں کو تو نصیحت کرتے ہیں مگر خود اس پر عمل نہیں کرتے۔“

(51) ”کوئی ڈیٹ جو بھول نہیں سکتیں؟“  
”12 مارچ..... کیونکہ اس دن میری سالگرہ ہوتی ہے اور مجھے خوشی ہوتی ہے کہ مجھے گفٹ ملیں گے۔“

(52) ”ایک کھانا جو کسی بھی وقت کھا سکتی ہیں؟“  
”مجھے بھنڈی بہت اچھی لگتی ہے اور دن کے کسی بھی حصے میں مجھے آپ بھنڈی کھانے کو دے دیں میں کھالوں گی۔“

(53) ”اپنے آپ کو اسکرین پہ دیکھ کر کیسا لگتا ہے؟“

”سچ بتاؤں..... میں اپنے آپ کو اسکرین پہ نہیں دیکھ سکتی۔ کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ میں بہت بری لگتی ہوں..... بہت عجیب لگتا ہے اپنے آپ کو دیکھ کر۔“

(54) ”کون سی ڈش بہت اچھی پکاتی ہیں؟“  
”میں مچھلی کا سالن بہت ہی اچھا پکاتی ہوں اور مجھے لگتا ہے کہ مجھ سے اچھا کوئی بنا بھی نہیں سکتا، اور مجھے کسی کے ہاتھ کا پسند بھی نہیں ہے۔“

(55) ”ریموٹ کس چینل پہ رک جاتا ہے؟“  
”کوئی بھی چیز، کوئی بھی پروگرام اچھا لگے تو ریموٹ رک جاتا ہے۔ وہ کوئی شو بھی ہو سکتا ہے، نیوز چینل بھی ہو سکتا ہے۔“

(56) ”سینما میں پہلی فلم کون سی دیکھی؟“  
”اے ہوش میں جو پہلی فلم دیکھی وہ ”ساحر لودھی“ کی فلم راستہ تھی اور بچپن کی کوئی فلم مجھے یاد نہیں۔“

(57) ”کوکنگ میں کوئی نئی ڈش ایجاد کی؟“  
”نئی ڈشیز تو میں بہت ساری بناتی رہتی ہوں اور مجھے یاد ہے کہ میں نے ”ہم“ ٹی وی کے ایک پروگرام میں

چپاتی نوڈلز بنائے تھے، جسے منچورین بنتا ہے تو بہت ہی اچھے بنے تھے اور سب نے بہت پسند کیا تھا۔ اسے آپ ”چپاتی منچورین“ کہہ سکتی ہیں، ایجاد کچھ نہیں کیا۔“

(58) ”آپ کا کوئی ناقابل فراموش پروگرام؟“  
”نا قابل فراموش پروگرام تو کوئی نہیں۔ البتہ جب میں ڈرامہ کر رہی تھی تو اس میں میرا جو پہلا سین تھا، وہ ناقابل فراموش تھا کیونکہ میں بہت ڈر رہی تھی۔“

(59) ”کوئی ایسا پروگرام جس کو کرنے سے انکار کیا ہو؟“

”جس میں ڈانس پر فارمنگ زیادہ ہو..... ہلکا ہلکا تو میں کر لیتی ہوں تو ایسے پروگرام کو بہت بار انکار کر چکی ہوں۔“

(60) ”ٹی وی پہ کام کرنے والی لڑکیوں کے لیے کوئی نصیحت؟“

”کہ آپ کو جو کامیابی ملتی ہے، اسے ہمیشہ کی کامیابی نہ سمجھیں کیونکہ میڈیا میں کامیابی کچھ وقت کے لیے ہوتی ہے۔“

(61) ”مرد حسین ہونا چاہیے یا کماؤ؟“  
”حسن ضروری نہیں ہے..... بس اسے کماؤ ہونا چاہیے۔“

(62) ”آپ کی فیوچر پلاننگ؟“  
”کچھ بھی نہیں..... بس آرام کرنا ہے۔ مگر سنبھالنا



”بہت کم وقت لیتی ہوں۔ تقریباً دس سے پندرہ منٹ لگتے ہیں مجھے تیار ہونے میں۔“

(72) ”شاپنگ کرتے وقت پہلے کس کا خیال آتا ہے؟“

”سب سے پہلے مجھے اپنے ”ابو“ کا خیال آتا ہے، پھر امی کا خیال آتا ہے کہ ان کے لیے کچھ لے لوں۔۔۔۔۔ پھر مجھے اپنا خیال آتا ہے۔“

(73) ”کب ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کرتی ہیں؟“

”انٹرنیشنل شیف ڈبے پر ہمارے ”سر“ نے ایک بہت بڑے پروگرام میں میری تعریف کی تھی تو مجھے ایسا لگا کہ میں ہواؤں میں اڑ رہی ہوں۔ اور کئی دن تک محسوس ہوتا رہا۔“

(74) ”کبھی تنہائی میں کسی کو یاد کر کے رونا آیا؟“

”تنہائی میں رونا آتا تو ہے، مگر کسی کو یاد کر کے نہیں، ایسے ہی کسی سوچ کو یاد کر کے رونا آتا ہے۔“

(75) ”بیوٹی ٹیم کبھی غلط ثابت ہوئیں؟“

”شکر ہے، ایسا کبھی نہیں ہوا۔ بہت احتیاط کے ساتھ بتاتی ہوں۔“

(76) ”اگر آپ کو کسی سلیبرٹی کا انٹرویو کرنے کو کہیں تو کس کا کریں گی؟“

”میں ندیم صاحب کا انٹرویو کروں گی جو ہمارے لچنڈ قلم اشار ہیں، وہ مجھے بہت پسند ہیں اور بڑا تفصیلی انٹرویو کروں گی۔“

(77) ”نیند کتنی پیاری ہے؟“

”مجھے اپنی نیند بہت پیاری ہے۔ سارے جہاں سے پیاری ہے۔“

(78) ”وائٹنگ کریم سے کیا واقعی رنگ گورا ہوتا ہے؟“

”وائٹنگ کریم سے رنگ گورا ہوتا ہے مگر کچھ دنوں کے لیے اس کے بعد ڈبل کالا ہو جاتا ہے۔“

(79) ”بجٹ کس شکل میں کرتی ہیں؟“

”ہے اور گھردالوں کو سنبھالنا ہے۔“

(63) ”کھلی آنکھوں سے کون سا خواب بار بار دیکھتی ہیں؟“

”بہت بار دیکھتی ہوں اور دن میں کئی بار دیکھتی ہوں کہ میں خانہ کعبہ کی زیارت کر رہی ہوں۔ ویسے میں خانہ کعبہ جا بھی چکی ہوں۔“

(64) ”پسندیدہ فوڈ اسٹریٹ؟“

”کوئی خاص نہیں ہے۔ جہاں کا کھانا اچھا لگتا ہے کھا لیتی ہوں۔“

(65) ”اگر میک اپ ایجاد نہ ہوتا تو؟“

”تو بہت ہی اچھا ہوتا۔۔۔۔۔ مجھے تو میک اپ کرنا بہت ہی برا لگتا ہے، اسکن خراب ہو جاتی ہے۔“

(66) ”شادی کیوں ضروری ہے؟“

”اس لیے ضروری ہے کہ اگر اچھا جیون ساتھی مل جائے تو آپ دوسروں کی برائیاں اس کے سامنے کر سکتے ہیں کہ وہ کسی کو نہیں بولے گا۔“

(67) ”اپنا Past (ماضی) سوچ کر کیا احساسات ہوتے ہیں؟“

”اپنا Past سوچ کر ہنسی آتی ہے کہ بہت ساری غلطیاں کی ہوئی ہوتی ہیں اور کبھی کبھی شرمندگی بھی ہوتی ہے کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔“

(68) ”آئینے کو کتنا وقت دیتی ہیں؟“

”میں آئینہ بالکل بھی نہیں دیکھتی۔ ایک دفعہ تیار ہو جاؤں تو پھر آئینے کے سامنے نہیں جاتی۔“

(69) ”دوسروں کو خوش کرنے میں اپنا دل ٹوٹ جاتا ہے، ایسا ہوا؟“

”ہاں اکثر ایسا ہوا ہے کہ دوسروں کو خوش کرنے میں مجھے بڑی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ مگر پھر بھی میں چاہتی ہوں کہ سب مجھ سے خوش رہیں۔“

(70) ”گھر میں کون سا لباس پہنتی ہیں؟“

”ٹراؤزر اور شرٹ۔۔۔۔۔ مجھے بہت پسند ہے۔“

(71) ”کسی بھی تقریب میں جانے کے لیے تیاری میں کتنا وقت لیتی ہیں؟“



”گوڈ کی شکل میں کرتی ہوں، کیونکہ گوڈ مجھے بہت پسند ہے۔“

(80) ”شادی میں کون سی رسموں کے خلاف ہیں؟“

”میں ہندی مایوں کے بہت خلاف ہوں۔ یہ سب فضول کی رسمیں ہیں۔“

(81) ”لی وی کا کون سا پروگرام بند ہو جانا چاہیے؟“

”وہ تمام پروگرام جس سے لوگوں میں احساس کسری جنم لے اور لوگ جرائم اور گناہ کی طرف راغب ہوں، بند ہو جانے چاہئیں۔“

(82) ”آج کی فکر زیادہ ہوتی ہے یا کل کی؟“

”اصولی طور پر تو آج کی فکر ہونی چاہیے۔ مگر مجھے کل کی فکر کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔“

(83) ”زندگی کب تقسیم ہوتی ہے؟“

”تب جب رشتوں میں لحاظ اور شرم نہ رہے۔“

(84) ”گھر میں کون مزاج کا گرم ہے؟“

”مزاج کا گرم تو کوئی بھی نہیں ہے۔ سب نارمل

مزاج کے لوگ ہیں گھر میں۔“

(85) ”کس عمر میں موبائل استعمال کرنے کی

اجازت ملی؟“

”تقریباً سولہ سال ہو گئے ہیں مجھے موبائل استعمال

کرتے ہوئے۔ جب سے میڈیا میں آئی ہوں۔ یعنی

پندرہ سال میڈیا میں ہو گئے ہیں اور اس سے چھ سات ماہ

پہلے موبائل ملا تھا۔“

(86) ”غصے میں پہلا لفظ کیا نکلتا ہے؟“

”غصے میں پہلا لفظ یہ نکلتا ہے کہ تم سے تو مجھے بات

ہی نہیں کرنی چاہیے تھی۔“

(87) ”کھانا کھانے کے بعد کیا کھانے کو دل

چاہتا ہے؟“

”کھانا کھانے کے بعد کچھ بھی کھانے کو دل نہیں

چاہتا..... چونکہ میں ڈائننگ پہ ہوں تو اس لیے کھانے کے

بعد کچھ نہیں کھاتی۔“

(88) ”بدلتی ہوں؟“

”نہیں، بدلہ تو بالکل بھی نہیں لیتی، لیکن ایک عادت

مجھ میں بہت بری ہے کہ اگر کوئی مجھ سے برا کرے تو میں

خس خس کے اسے بتا دیتی ہوں کہ تم نے مجھ سے یہ برا کیا

ہے۔“

(89) ”اپنے تجربے سے سیکھتی ہیں یا دوسروں

کے تجربے سے؟“

”میں اپنے تجربے سے بھی سیکھتی ہوں اور دوسروں

سے بھی بہت کچھ سیکھتی ہوں..... اور بالکل بھی شرم محسوس

نہیں کرتی۔“

(90) ”کیا چیز نشے کی حد تک پسند ہے؟“

”توبہ توبہ۔ مجھے نشے کی کوئی بھی چیز پسند نہیں، حتیٰ

کہ میں تو چھالیہ بھی نہیں کھاتی نہ ہی مجھے پسند ہے۔“

(91) ”دل کی سنتی ہیں یا دماغ کی؟“

”میں ہمیشہ اپنے دماغ کی سنتی ہوں۔ دل کی کبھی

بھی نہیں سنتی۔ میرا دل چاہتا ہے کہ یہ کروں وہ کروں اور

بہت سوچتی بھی ہوں اور ہر فیصلہ سوچ سمجھ کر کرتی ہوں۔“

(92) ”کیا لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتیں؟“

”اپنا بیک..... کیونکہ میرے بیک میں ہر چیز موجود

ہوتی ہے۔“

(93) ”کھانا کہاں پسند ہے، چٹائی، اپنا بیڈ یا

ڈائننگ ٹیبل؟“

”چٹائی پہ دسترخوان بچا کر کھانا کھانا مجھے بہت پسند

ہے۔ آرام و سکون کے ساتھ آلتی پالتی مار کر کھانا کھانے

میں سکون ملا ہے۔“

(94) ”کس شخصیت کے ساتھ ایک شام گزارنا

چاہتی ہیں؟“

”صرف اور صرف اپنی فیملی کے ساتھ، جو اپنا بہت

قریب ہے اس کے ساتھ۔“

”اگر آپ کی شہرت کو زوال آ جائے تو؟“

”جب میڈیا میں قدم رکھا تھا تو اسی دن سوچ لیا تھا

کہ شہرت مل گئی تو زوال بھی آتا ہے..... اور میں اس کے

لیے ذہنی طور پر تیار ہوں..... اور مجھے کوئی فرق نہیں پڑے

گا..... اللہ نے چاہا تو۔“



## شادی مبارک ہو

مزنہ فاطمہ ہمراہ احمد عمر سلیمانی

محسنہ صریم ہمراہ حافظہ حبیبہ یوسف

فائنہ رابعہ

کے لوازمات تیار تھے۔ پہنچتے پہنچتے کچھ دیر ہو گئی تو ساگ، مشن اور بریانی بھی پیش کر دی گئی۔ میں پچیس منٹ معزز مہمانوں نے تحلیہ کیا اور محسنہ کو نیلے نیلے ٹوٹوں کے ساتھ بیٹی بنانے کا عندیہ دے دیا گیا۔ یہ طے ہے کہ کچھ بھی ہو میری قرآنی کلاسز کا شیڈول متاثر نہیں ہونا چاہیے، اس لیے میں ان سب کو آپس میں گپ شب کرتے جھڑکے مسجد چلی گئی جہاں قرآنی کلاسز کا وقت شروع ہونے کو تھا۔

میں بھی پچھلی رات سے مسلسل دعائے استخارہ پڑھ رہی تھی چونکہ دل کا اطمینان مرکزی نقطہ ہے اور الحمد للہ دل مطمئن تھا۔ وجوہات بہت سی تھیں، بڑی بیٹی اسی گھر میں تھی، وہی ماؤں والی روایتی سوچ۔ دو بیٹیاں ایک گھر میں ہوں گی ایک دوسرے کو، دوسرا ہٹ ہوگی حبیبہ بھی حافظہ قرآن ہے اور رمضان میں جب یہ دونوں بھائی اپنی مسجد میں تراویح پڑھاتے ہیں تو سنا ہے۔ دور دور سے لوگ آتے ہیں گزشتہ رمضان میں ہم سب بھی قیام الیل کے لیے گئے تھے۔ ایسا سرور ملا تھا ان کی قرأت میں کہ دل خوش ہو گیا تھا پھر یہ کہ پانچ سالوں سے ہم ان کے لیے دیکھے بھالے، وہ ہمارے لیے۔ باقی قسموں کا مالک تو اللہ ہے۔

گھنٹہ بعد گھر واپس پہنچی تو چند منٹ قبل مہمان دبیر کے آخری ہفتہ کو ذہن میں رکھنے کی تاکید کر گئے تھے۔

مزنہ کی بھی شادی سردیوں میں ہی متوقع تھی۔ رابطہ کر کے صورت حال بتائی گئی تو خالہ ہاجرہ (عمر کی امی میری مامی) نے فیصلہ کے لیے کچھ وقت مانگا دونوں شادیوں کو ایک ساتھ ایک ہی دن میں کرنے

یادش بخیر اگست 2019ء میں محسنہ کا بی ایس سی کارزلٹ آیا۔ اس کی دلی خواہش پنجاب یونیورسٹی سے ماسٹرز کرنے کی تھی۔ اماں نے گوجرہ کے پوسٹ گریجویٹ کالج میں داخلہ لینے پر اصرار کیا۔

گوگو کی کیفیت کے بعد استخارہ کیا۔ گو استخارہ میں خواب شرط نہیں مگر عجیب و غریب سے خواب کی تعبیر پوچھی گئی تو جواب ملا شادی میں آسانی ہوگی۔

استخارہ میں دل کا مطمئن یا غیر مطمئن ہونا اہم بات ہے۔ دل اس کا پنجاب یونیورسٹی پر مطمئن تھا سو داخلہ ہو گیا۔ کلاسز بھی اکتوبر میں شروع ہو گئیں۔

مزنہ کا رشتہ جنوری 2019ء میں میرے ماموں زاد احمد عمر سے طے ہوا تھا۔ مزنہ کے ایم فل کے مکمل ہونے تک یہ رشتہ کاغذات کے بجائے زبانی کلامی تھا اس کا ایم فل حال ہی میں مکمل ہوا تھا اور میں دوسرے کاموں کے ساتھ اس کی شادی کے سلسلہ میں پلاننگ میں مصروف رہتی تھی۔

اچانک نومبر کے اختتامی دنوں میں بڑی بیٹی مومنہ کا فون آیا۔

”امی! محسنہ آئی ہوئی ہے؟ اسے بلا لیں۔“

میرے استفسار پر اس نے جواب دیا۔ ”ہم آ رہے ہیں۔“

میں نے فون پر اس کا مذاق اڑایا۔ ”یہ تم کب سے ہم ہو گئی ہو۔“

”ہم محسنہ اور حبیبہ کے رشتے کے لیے آ رہے ہیں۔ اکل، آنٹی، زینہ، آلی وغیرہ۔“

لیجے جناب چوبیس گھنٹوں میں محسنہ لاہور سے گوجرہ آ گئی۔

مومنہ کے سسرال والوں نے صبح پہنچنا تھا ناٹھتے



ہوا اور چھت کے بجائے خواتین کے لیے لاؤنج اور کمرے ہی طے کئے گئے۔

گھر کی شادی میں مثبت اور مشکل دلوں پہلو سامنے آئے۔ گھر میں تو سارے بہن بھائیوں کو بمع ”اہل و عیال“ بلانا ممکن نہیں تھا۔ بس گھر کے دو دو بڑے افراد کو بلایا گیا۔ بارانی بھی تیس سے چالیس تک متوقع تھے، میڈیو کا انتخاب بھی صبر آزما..... ایسا کیا ہو کہ رولی، ٹن، قورسے، بریانی کی جگہ لے سکے جو مینو بنایا جاتا کبھی کوئی کبھی کوئی کمی بیشی سامنے آتی۔ بڑی دروہری کے بعد چکن روسٹ، فرائی فش، کلب سینڈویچز چکن کارن سوپ، گاجر کا حلوہ، رشمن سلاد، کشمیری چائے اور گوجرہ کی مشہور سوغات برتی۔

ہاں دہنوں کے کپڑوں، جوتوں، زیورات، کراکری، کٹلری، مشینری، بستر..... الامان الحفظ فہرست بناتی تو دل میں خیال آتا کہ بازار میں ہی نہ ڈیرا ڈال لیا جائے۔ بہر حال برسوں کا آزمودہ نسخہ پھر نقل میں آیا اور جادو اثر ثابت ہوا کہ صبح دس بجے کے قریب میں اور مزہ بازار پہنچے۔ تیسرا کلمہ پڑھ کے بازار میں داخل ہوئے۔ جو چیز دیکر کار ہوئی وہ شاہنگ مال میں منٹوں میں سامنے آ جاتی..... دونوں بیٹیوں کے کپڑوں کے علاوہ ان کی سسرال کے لیے چھاندنیاں اپنے اور گھر والوں کے کپڑے مجھے تو مزہ، محسنہ کے ساتھ ساتھ تیسرا جہیز اپنی چار سالہ (89) نواسی عائشہ سہد یہ کا بھی تیار کرنا تھا اس کے لیے لینگے، شرارے، میکسیاں پیپلم وغیرہ وغیرہ۔

قارئین کو راز کی بات بتا رہی ہوں۔ صبح مارکیٹ کھلنے کے ٹائم میں شاہنگ میں بڑی برکت ہے دکان دار تروتازہ..... موڈ خوش گوار..... اور ہمارے معاشرہ کی نفسیات بونہی اہلیان کراچی شاید اس لفظ سے واقف نہ ہوں۔ بونہی اصل میں، ابتداء کو کہتے ہیں اور بندے کی یہ نفسیات سے صبح سویرے اگر گاہک واپس چلا جائے بغیر کچھ لے لے تو اس کو بڑا شگون لیا جاتا ہے۔

والا نہیں تھا۔ بہت سے مراحل کے بعد مزہ کے لیے 6 جنوری 2020ء بروز جمعہ اور محسنہ کے لیے 13، جنوری 2020ء بروز ہر طے پایا۔

اپہل تو پہلے ہی مچ چکی تھی اب باضابطہ طور پر تیاریاں شروع ہو چکی ہیں۔

آٹھ دنوں میں دو بیٹیوں کی شادی ہمارے معاشرے میں بہت مشکل کام ہے لیکن مجھے اس حدیث کے تناظر میں بہت سلی تھی کہ اللہ تین کاموں میں اپنے بندے کی معاونت کرتا ہے۔ قرآن شروع کیا جائے تو اس کی تکمیل، میں مسجد کی تعمیر شروع کی جائے تو اس کے مکمل ہونے میں اور بچی کا رشتہ طے کر دیا جائے تو اس کے نکاح میں۔

الحمد للہ میں نے اس عرصہ میں ہر لمحہ اپنے رب کو مہربان پایا۔

گو کہ جہانیاں سے عمر نے کڑی شرائط عائد کی تھیں کہ شادی کی تقریب گھر میں ہی ہوگی۔ رخصتی بھی گھر سے ہوگی، جہیز نہیں لیا جائے گا، کھانے کے بجائے چائے پر غور ہو سکتا ہے، مسجد میں نکاح ہوگا وغیرہ وغیرہ۔

عام حالات میں گھر کا لاؤنج سولوگوں کے لیے کافی ہے، مگر شادی کی تقریب مشکل کام ہے بار بار خیالی ایچج بنائے جاتے ستراسی یا اسی نوے لوگوں کے لیے کسے بندوبست ہو سکتا ہے۔

گھر والوں کو ٹینشن ہی نہیں تھی۔ ایک ٹیبل لان میں، دو ڈرائنگ روم میں اور خواتین کے لیے کھلی چھت پر کیٹرنگ کروالی جائے گی۔ میں ہمیشہ اس پلاننگ کو مسٹر دکرٹی رسی، جاتی ہوئی گرمیوں کے موسم میں سخت سردی ہڈیوں میں گودا جھا دینے والی ٹھنڈ کا تصور ہی چھت پر خواتین کے انتظام کا سوچ کے کچلی طاری کر دیتا۔

اشتیاق (شوہر) اپنے آپشن پر بھند رہے تا آنکہ دسمبر پوری تیاری کے ساتھ سردی لے آیا دھند، سردی کیٹرنگ والوں کو دوبارہ بلایا..... الحمد للہ اتفاق



ہمارا جانا تو ”ریٹ فکس“ والے مال پر تھا مگر دکان دار اس وقت رش نہ ہونے کی وجہ سے اچھا سودا کرتے ہیں۔

مردانہ زمانہ جریاں، شالیں سویٹروں کا ایک ”کوہ ہالیہ“ تھا جو خیر باد شادی کے دن قریب آتے جا رہے تھے۔ محسنہ کی شادی کا فنکشن ہمارے گھر سے تین کلومیٹر کے فاصلے پر رائل پرل مارکی، میں طے ہوا تھا کہ دور سے آنے والے موٹروں کی قربت کا فائدہ اٹھائیں۔

پارلر کے لیے انتخاب بہت مشکل تھا۔ گو مزینہ، محسنہ دونوں کے کانوں میں دن رات نصیحتوں کا سلسلہ جاری رکھتی۔

غم میں صبر کرنا بہت آسان ہے، اجر کی امید ہوتی ہے شادی میں خواہشات پر کنٹرول مشکل ہے۔

اور حدیث کا مفہوم ہے خوشی میں اللہ کو یاد رکھنے والے کے لیے اللہ آسانیاں پیدا کرتا ہے۔

خوشی میں حرام حلال، محرم نامحرم کا فرق بہت مشکل ہوتا ہے۔ میرے ابا جی نے باجی کی شادی پر کہا تھا..... مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اگلی شادیوں پر (میری اور تینوں چھوٹی بہنوں کی) میں دولہا کے ساتھ کسی غیر محرم کو نہیں بلاؤں گا..... کیونکہ شادیوں پر جو بھی خلاف شرع کام ہوگا اس گھر کا سربراہ اس میں برابر کا شریک ہوگا۔

مومنہ کی شادی پر میں نے اس بات کو مد نظر رکھا الحمد للہ اللہ نے شادی میں برکت ڈالی۔

اور ایک ضروری بات سن لیجیے بل از اسلام دولہا دلہن کو شادی پر ”الرفاء والبنین“ محبت سے رہو اور بیٹے پیدا کرو گے دعائے کلمات کہتے تھے۔

محبوب دوجہاں نے ان کلمات کو بدل کے بارک اللہ لکھا دبارک علیہما میں بدل دیا۔ دینیوی محبت کے حصول اور نسل بڑھانے کے بجائے شادی کا مرکزی نکتہ برکتوں کا حصول رکھا۔

یہ برکت شادی بیاہ میں رب کو ناراض کر کے

کبھی نہیں مل سکتی، قارئین! میں اس معاملہ میں کچھ زیادہ حساس اس لیے بھی ہوں کہ میں درس قرآن کی کلاسز لیتی ہوں اور داعی..... ہائے پل صراط پر ہی رہتا ہے۔ دین بتانے والی کی ایک نکتہ برابر غلطی عوام الناس میں پہاڑ بن جاتی ہے۔

سو جناب ہمارا گھر روز بروز مارکیٹ کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا جس میں بس سامان ہی سامان جمع ہو رہا تھا۔ مرحلہ وار سب کام مکمل ہوتے گئے۔

کبل لحاف صرف محسنہ اور مزینہ کے لیے نہیں گھر کے لیے بھی مزید درکار تھے۔ جنوری کی آمد سے قبل سرد ہوا میں اور دھند..... تا حد نگاہ صفر والی دھند بھی..... پارلروالی بھی شعاع خواتین کی شوقین نکلیں۔

بہر حال پانچ جنوری کو کراچی سے شافعہ اور اس کے بچوں کی آمد نے باضابطہ طور پر شادی کا سماں پیدا کر دیا۔ شافعہ نے ہر مرحلہ پر مزینہ محسنہ کی چھوٹی خالہ

ہونے کا حق ادا کیا..... چھ جنوری کو صورت حال یہ تھی کہ رم جھم رم جھم پڑے پھوار سے بارش کا سلسلہ شروع ہوا اور چھ جنوری یعنی پیر والے دن ”بس کریار بس کریار تک پہنچ گیا۔

سب نے شادی کا دن اچھا گزرنے کے لیے دعائیں کی تھیں اور سردیوں کی بارش..... اف بارش کے اس نہ ختم ہونے والے سلسلہ نے سب کے لبوں پر مہر لگا دی تھیں کہہ رہے تھے۔

”ہم نے تو اپنی دعا کی تھی موسم شادی کے دن بہت اچھا ہو“..... کچھ دیر تو یہ فقرہ سنا پھر سب کی کلاس لی۔

”اس کا مطلب ہے جسے تم اچھا کہو وہ اچھا ہے۔ اور اللہ کی نظر میں جو اچھا ہے..... وہ اچھا نہیں۔ ارے اس بارش کی قدر و قیمت کسان سے پوچھو ایک ایک بوند سونے کی قیمت کی ہے۔ تم شکوہ کر رہے ہو۔ وہ شکر کر رہے ہیں، کیا تمہارا گھر ٹپک رہا ہے یا سواری کے بغیر کہیں جانا پڑ رہا ہے۔“

کٹیرنگ والے صبح ہی آ کے سفید اور پنک کور



ہو چکی تھی۔ ضبط کی شدت کے باوجود جب دل پانی ہو رہا تھا اچانک ایک منظر میرے سامنے آیا۔  
بن ماں کی سیدہ فاطمہ الزہراء کی رخصتی آپ نے جو سرکار دو جہاں ہیں باپ بن کے کیسے کی ہوگی۔ مجھے یاد آیا ان کو رخصت کرنے کے فوری بعد نبی اکرم ————— بیٹی کے گھر پہنچ گئے تھے اڑوس پڑوس کی خواتین کو ان کے گھر میں موجود پائے آپ نے انہیں جو دعا میں دی تھیں۔ وہ احادیث کی کتب میں موجود ہیں مجھے قرار آ گیا۔

یہ رخصتی تو سنت رسول ہے، ورنہ ناخن کو گوشت سے جدا کرنا آسان، بیٹی کو رخصت کرنا مشکل، عمر ماشاء اللہ بہت خوب صورت لگ رہا تھا ان کی رخصتی کے ساتھ ہی تمام مہمان بھی رخصت ہو گئے۔ میں اپنے گھر پر نظر ڈال رہی تھی۔ کرسیاں، میز، برتن، بچے ہوئے کھانے کی پلیٹیں، ڈسپوزیبل کپ، اف اللہ پھر یاد آیا۔

میری کام والیوں نے سب کچھ سمیٹا اور اگلی صبح

ولیمہ پر جہانیاں روانگی کے لیے تیاری، محسنہ کی اگلے پیر کو شادی کے اکثر کام کرنے والے تھے۔

ولیمہ پر میرج ہال کے بہت باہر تک پھول اور کھانا بہت اچھا تھا۔ سب مہمان میرا میکہ تھے۔

لبے سخر کی وجہ سے چلو چلو جلدی چلو، کا نعرہ لگایا۔ گیارہ بجے سے پہلے جہانیاں سے نکلے اور رات کے ایک ڈیڑھ بجے گھر پہنچے، زندگی کبھی کبھی بندے سے بڑا مذاق کرتی ہے میں نے ساری زندگی رات کو جلدی سونے پر درس دیے، ساری زندگی رات میں جلدی سونے کی عادی رہی..... اور اب دنوں بیٹیوں کے ویسے رات میں تھے۔ بیک وقت رونے اور ہنسنے کو جی چاہتا تھا۔

منگل کی رات میں ولیمہ تھا۔ بدھ کے دن تھکاوٹ کوئی الحال سر پر سوار نہ کرتے ہوئے محسنہ کا زیور لینے اور دیگر کاموں کے لیے بازار کا رخ کیا۔ جیولر کو ایڈوائس دس دن کل دیا تھا۔ جیولر نے سب

والی کرسیاں، ٹیبل سیٹ کر کے سارے گھر کو جمعہ نور — بنا چکے تھے۔ کچھ بارانی عزیز رشتہ دار لاہور سے ڈائریکٹ آ چکے تھے۔ میرے سرالی عزیز واقارب بھی جمع تھے۔

بارات لپٹ گئی۔ ساڑھے بارہ بجے کے قریب مزہ بھی آ چکی تھی تیار ہو کے، ماشاء اللہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ وہ برائیڈل لہنگا جسے خریدتے ہوئے میں نے تاکید کی تھی کہ فلاح صرف نماز سے مشروط ہے۔ ہم نے بے جا اسراف خواہ وقت کا ہو یا پیسے کا نہیں کرنا۔ پچیس منٹ میں لہنگا خرید کے سلائی کے لیے ٹیلر کے سپرد کر دیا تھا۔ وہ بندیا، جھومر اور سیٹ جسے پسند کرنے اور لینے میں ہم ماں بیٹیوں کی ایک دم ایک ہی وقت میں انگلی اٹھی تھی یہ والا وہ پہن کے اس نے لہنگے اور جیولری کو چار چاند لگا دیے تھے۔

طے تو یہ تھا نماز ظہر کے بعد مسجد میں نکاح ہوگا مگر نماز ظہر کیا، عصر بھی ہوگئی۔ بارات واقعی تاخیر سے پہنچی۔

سوپ کے پیالے پکڑاتے ہی زبیر بھائی نے فوجی ہونے کا حق ادا کیا اور فوری طور پر مسجد کا رخ کیا۔ خواتین کے لیے فوری کھانے پینے کی اشیاء سرو کر دی گئیں۔ الحمد للہ نکاح ہوا۔ عمر بھی دوسرے باراتیوں کے ساتھ جو سب میرے ماموں، ماموں زاد بھائی یا بہنوئی تھے گھر میں داخل ہو۔

خیر و برکت کی دعاؤں سے اسے اندر بلایا..... مزہ کی معمر دادی اماں دولہا سے ملنے کا بہت اشتیاق رکھتی تھیں۔ لگے ہاتھوں سلامیوں والا کام بھی کچھ نہ کچھ ہوا مگر شام ہو چکی تھی۔ بارش گھپ اندھیرا..... دھند اور زبیر بھائی کا فوجی حکم نامہ جلدی کرو۔ جلدی اپنا اپنا سامان اور بچے لے کے جلدی چلو۔ موٹر وے بند نہ ہو جائے ہاتھ کو ہاتھ نہ دکھائی دینے والی سردی اور دھند میں مزہ رخصت ہوگئی۔

میرے ر کے آنسو سیلاب کی طرح بہہ نکلے۔ لے کے جانے والے سب اپنے تھے۔ مگر مزہ برائی



ہاتھ میں لے کے میری طرف دیکھا۔

”باقی آپ بہت خوش قسمت ہیں یا قدرت مہربان ہے جس دن آپ نے آرڈر دیا تھا سونا بیاہی ہزار روپے دس گرام تھا آج ترانوے ہزار روپے ہے آپ کی تو ٹھیک ٹھاک بچت ہو گئی۔“

میں نے دل میں کہا اللہ سے مدد مانگی ہمیشہ تیسرا کلمہ پڑھ کے بازار میں قدم رکھا تو قسمت بھی مہربان ہو گئی۔

پورا ہفتہ خشک موسم رہا اور اتوار کی رات وہی، پچھلی اتوار والا گیلیا ٹھنڈا موسم..... مہمانوں کی آمد کا سلسلہ اتوار کی صبح کو ہی شروع ہو چکا تھا۔ بچیوں نے دن میں ہی مہندی لگوا لی تھی۔ مجھے ڈرتا تھا رات میں مہندی لگانا۔ باقی قاتلہ نے تو خود بھی مہندی کی تھی۔ فقرہ نہ پھیل جائے بچیوں کو تشبہ کا مطلب پتا تھا کوئی ایسا کام جو دیگر اقوام سے لیا جائے۔

مہندی، تیل مایوں، ہندوؤں کے تہوار ہیں لہذا مہندی والی رات، فل شادی والا گھر تھا۔ چوڑیاں، مہندی، مٹھائیاں، چائے کے ہر دو منٹ بعد چلتے دوڑتے ہیں میں نے سادگی کو ملحوظ کیا تھا، وہ برقرار رہی۔

رات کا کھانا کیٹرنگ والوں نے دیا تھا زردہ، بریانی، قورمہ اور خیرری رولی چونکہ مزنہ بھی اسی شام میں آئی تھی اس لیے مہمان خصوصی وہی لگ رہی تھی۔ محسنہ بھی مہندی دن میں لگوا چکی تھی۔

پیر کی صبح بارش کچھڑ اور ٹھنڈک کی وجہ سے ہم نے جو مہمان جمع تھے ان کا ناشتہ گھر میں کر دیا۔ باقی لوگوں کو بھجوا دیا تھا چوں کہ قائد اعظم والی بیماری مجھ میں بھی ہے کام کام اور کام..... وقت سے قبل کام کر کے فارغ ہو جاؤں بھی کسی حد تک زندگی کی روشن میں رہا ہے۔

محسنہ کو پارلر بھواتے ہی میں نے بھانجیوں بھتیجیوں کو تیار ہونے کی ڈیل لائن دی۔ مہمانوں کی وقفہ وقفہ سے آمد کا سلسلہ جاری تھا۔ ان کی میزبانی

کے ساتھ ساتھ سب کو جلد تیار ہونے کی تلقین کے ساتھ ایک بجے فیصل آباد سے ویریس پہنچ گئیں۔ سب سے پہلے ہم بے پردگی نہیں ہونے دیں گے دوسرا فوٹو سیشن..... یہ دونوں کام ہی نہیں ہونے چاہئیں۔ اللہ بھلا کرے میرے بڑے داماد صہیب کا جس نے ہمیں ہمارے مسکوں کو چٹکی بجاتے حل کروا دیا۔ اس نے خواتین ویرس فیصل آباد سے بلوائیں۔

”آئی خرچہ زیادہ ہو جائے گا۔“ اس نے کہا۔

”تو کوئی بات نہیں بیٹا! لوگوں کو آسانی دینے کی قیمت سب سے بڑھ کر ہے۔“

جب میں ان خواتین کو لے کے مارکی میں پہنچی تو میری وقت کی پابندی سے متاثر ہونے والی خواتین بھی داخل ہو رہی تھیں۔ فون کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ کمرے اور پھولوں کے ہار پہنچ چکے تھے۔ مگر بارات کا نام و نشان تھا نہ کمرے پھول پستانے والیوں کا۔

میرا حلقہ احباب عزیز واقارب سب جمع تھے..... لیکن یہ کوئی درس تو نہیں تھا کہ میں ایک سیکنڈ پہلے والے فارمولے پر عمل کرتی..... یہ تو معاملہ ہی اور تھا بارے خدا خدا کر کے بارات تین بجے پہنچی۔

محسنہ بھی ڈرینگ روم میں تیار تھی۔ مجھے سہیلیاں، رشتہ دار سب بتا رہی تھیں۔

”محسنہ ماشاء اللہ بہت پیاری لگ رہی ہے۔“ اور میں آنکھوں میں آنے والا پانی خشک کرنے کے لیے نشو کا سہارا لیتی شادی کے لیے مزنہ اور محسنہ دونوں نے سرخ لہنگے لیے تھے آج مزنہ اپنے ولیمہ والے گولڈن بلیک کام والے ڈریس میں تھی۔ چوں کہ مزنہ کو دلہن بنے بہت کم لوگوں نے دیکھا تھا لہذا آج بھی سب اسے دلہن کی حیثیت سے دیکھ رہی تھیں۔

بارات میں مومنہ، محسنہ کی جنھانی کی حیثیت سے آئی تھی مگر صہیب محسنہ کا جینہ بن کے نہیں میرا بیٹا بن کے آیا۔

اللہ میرے دامادوں کو خوش رکھے۔ تینوں اس



دن پہلی مرتبہ جمع تھے۔

کھانا نکاح کے فوری بعد پیش کر دیا گیا۔ بے پردگی نہ ہونے کی وجہ سے سب گاؤں اور عیال اتار کے مزے لے لے اپنے اپنے گروپ میں خوش گئیوں میں مصروف تھیں۔ میری رائیڈ دوست صالحہ محبوب اور سباحہ نے شرکت کر کے میرا مان بڑھایا۔ دن ڈش کی وجہ سے مشن فورمہ، چکن بریانی رشین سلاڈرائسٹ وغیرہ وغیرہ۔

آتے ہی گرما گرم سوپ اور جاتے ہوئے فروٹ کسٹرڈ کے بعد کشمیری چائے۔ محسنہ اسٹیج پر آئی تو اس نے متوقع فوٹو گرافی سے بچنے کے لیے انتظامات کیے ہوئے تھے۔ لہنگے کی ہم رنگ چادر اس کی سر پر تھی جسے وہ سہولت سے منہ پر ڈال لی۔

مہمانوں کے جانے کے بعد خبیب کو بلایا گیا۔ اللہ نے میرے لیے ہمیشہ برکتوں کے دروازے کھولے۔

میرے داماد حافظ قرآن ہیں۔ بہت صالح فطرت کے ہیں۔ میں نے جوتا چھپائی وغیرہ کی کوئی رسم نہیں کرنے دی۔ مبادا قاتلہ باجی کے ہاں تو ہوئی تھی، حجت بنا کے دس مزید رسمیں ایجاد کر لی جائیں۔

میرے حلقہ احباب میں سے زیادہ تر شامل تھے۔ میری بہت سی نئی کلاس ممبرز نے خود سے فرمائش کی تھی کہ آنٹی ہم آپ کی بیٹی کی شادی پر آنا چاہتی ہیں تاکہ ہمیں پتا چلے شادیاں کیسے ہونی چاہئیں۔ اور جاتے وقت ان سب نے بہت حیرانی کا اظہار کیا..... کھانا بہت اچھا اور وافر مقدار میں مزے دار تھا۔ مارکی بہت عمدہ۔

میزبانی کے لیے میں نے قاصرہ اور شافعہ وغیرہ سے کہا ہوا تھا۔ سب سراہ رہی تھیں ہم اپنے بچوں کی شادیاں ایسے ہی کریں گی..... جہاں سب کچھ تھا مگر بہت مشکل عہدگی کے ساتھ۔ بغیر شور شرابے کے۔

ان کی تعریفوں پر میں دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔

”اے میرے رب میں نے خوشی میں تجھے یاد رکھا ہے..... اور یہ سب تیری توفیق سے ہی ممکن ہے۔“

میں ان سطور کے توسط سے ان سب کا شکر یہ لدا کرتی ہوں جو میرے ساتھ ہر طرح سے تعاون کرتے رہے۔

محسنہ بھی مغرب کے وقت رخصت ہو کے میرے دل اور آنگن کو خالی کر گئی۔ میرے لیے آنسوؤں پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ لیکن کچھ آنسو شکرانے کے بھی تھے، فرض کی ادائیگی پر میرے حلقہ احباب کی محبت اور تعاون میرے لیے نئی سرمایہ رہا۔ زائدہ باجی جن سے پڑوسی ہونے کے علاوہ درجنوں رشتوں میں ایک نمایاں رشتہ ”ڈائجسٹ ریڈر“ کا بھی ہے۔ ہمارے تمام مرد حضرات بمعہ نوجوان باری کے ان کے اوپر والے پورشن میں تین راتیں جس طرح قبضہ گروپ بنے رہے۔ اس نے ثابت کیا۔ دل کے ساتھ گھر کے در بس کوئی کوئی ہی کھولتا ہے۔ اور شکر یہ اصل جسے لکھنے کے لیے بہت سے لوگ اکسار ہے تھے آپ نے اسے پہل بنا دیا۔

☆

انٹرنیشنل انجمن اہل علم و ادب کے زیر اہتمام

# پسلاطیل

انٹرنیشنل آفریدی

بسلطیل

نئی عجیب شے

قیمت 400/- روپے

مکتبہ نے کا پتہ:

مکتبہ و عمران ڈائجسٹ: 37 - اندو بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021



ماضی کے معروف نینو کاسٹر

## شہاب الدین شہاب سے ملاقات

شاہین رشید

آکر آباد ہوئے۔ یہاں آکر والد نے اپنا چھوٹا سا کاروبار شروع کیا۔ میں 16 فروری 1956ء میں شکار پور میں پیدا ہوا۔ میرے دو بڑے بہن بھائی ہجرت کی صعوبتوں کے نتیجے میں بیمار ہو کر انتقال کر گئے۔ ان کی وفات کے آٹھ سال بعد میری پیدائش ہوئی۔ میرے بعد میرے چار بھائی اور ایک بہن ہیں۔ شکار پور بڑا پرسکون مگر چھوٹا سا شہر تھا۔ جہاں پرنس کریم آغا خان اسکول سے مڈل اور گورنمنٹ ہائی اسکول سے میٹرک کیا جس کے بعد ہم کراچی منتقل ہو گئے۔ کراچی میں گریجویشن اور پھر اردو میں ایم اے کیا۔ اور پھر مکمل زندگی میں مصروف ہو گیا۔

”شادی؟“

”جی 1990 میں میری شادی ہوئی۔ ماشاء اللہ تین بیٹے ہیں۔ دو انجینئر ہیں اور ایک نے کامرس کی تعلیم حاصل کی۔“

”بچپن؟..... کیسے طالب علم تھے آپ؟“

”بچپن بہت اچھا گزرا۔ پڑھنے لکھنے کا شوق بچپن سے ہی تھا۔ کیونکہ شکار پور انتہائی پرسکون شہر تھا اور پڑھنے لکھنے کے لیے یہاں کا ماحول بہت اچھا اور سازگار تھا۔“

”زبان کون سی بولتے تھے اور پڑھائی کے علاوہ کیا مشاغل تھے آپ کے؟“

”بچپن سے ہی گھر میں اردو اور سندھی زبان بولی جاتی تھی۔ مشاغل کچھ یوں تھے کہ بچپن میں مصوری کی طرف رجحان بہت زیادہ تھا جو بعد میں ”ادب“ کی طرف منتقل ہو گیا۔ میٹرک کے بعد شعر گوئی کی طرف طبیعت مائل ہوئی تو اپنے رشتے کے

اظہار لودھی، شریا شہاب، باہ پارہ صغدر، شائستہ زید، زبیر الدین، نسرین قریشی اور شہاب الدین شہاب، یہ وہ نام ہیں جن کے دم سے پی ٹی وی نیوز کا شعبہ فعال رہتا تھا۔ پھر جب پرائیویٹ چینلز کا غلبہ ہوا تو یہ سارے نام بیک گراؤنڈ میں چلے گئے۔ جن کے بغیر ”نیوز“ نامکمل نظر آتی تھیں انہیں لوگوں نے یکسر بھلا دیا۔ کیونکہ لوگ ہمیشہ چڑھتے سورج کی پوجا کرتے ہیں۔

یہ تمام لوگ پی ٹی وی سے کافی عرصہ وابستہ تو رہے مگر کیا کریں کہ لوگوں نے پی ٹی وی دیکھنا ہی چھوڑ دیا۔ اور آج تک پی ٹی وی اپنا کھویا ہوا مقام نہیں بنا سکا۔ اس لیے کہ پی ٹی وی نے زمانے کے ساتھ چلنا سیکھا ہی نہیں ہے۔

خیر..... بات ہو رہی تھی نیوز کاسٹرز کی تو آج ہم آپ کی ملاقات ماضی کے نامور نیوز کاسٹر ”شہاب الدین شہاب“ صاحب کر رہے ہیں۔ شہاب صاحب نے نہ صرف نیوز سے وابستہ رہے بلکہ بہت اچھے شاعر بھی ہیں۔

”کیسے مزاج ہیں آپ کے؟“

”الحمد للہ..... بہترین۔“

”اور آج کل کیا مصروفیات ہیں آپ کی؟“

”شاعری تو میری چل رہی ہے اور ویسے میں جاب کرتا ہوں۔ Reuters کی ویرٹن نیوز ایجنسی میں یہ حیثیت نیوز پروڈیوسر کے۔“

”اور کچھ اپنے بارے میں بتائیے؟“

”میرے والدین میرے دادا، ان کے ایک بھائی اور ہمارے دو چچاؤں نے ”بریلی“ سے ہجرت کی۔ اور 1950 میں وہ سندھ کے شہر شکار پور میں





چچا استاد انور بریلوی، کے سامنے اپنی شاعری پیش کی اور ان سے اصلاح لی۔ بعد میں غزلیں، نظمیں معروف ادبی جرائد میں شائع ہوتی رہیں۔

”اس زمانے میں لوگ پہلے ریڈیو کی طرف جاتے تھے اور بعد میں ٹی وی کی جانب۔۔۔۔۔ آپ نے بھی ایسا ہی کیا؟“

”جی ایسا ہی ہوا۔ پہلے ریڈیو کی طرف آیا۔ پھر ٹی وی کی طرف۔ آواز اچھی ہے کا احساس مجھے میرے دوستوں نے دلایا۔ اور یہ بھی کہا کہ آپ کی آواز ”ریڈیو“ کے لیے بہت موزوں ہے۔۔۔۔۔ دل میں خیال ہوا کہ دوست اگر کہتے ہیں کہ آواز اچھی ہے تو پھر کیوں نہ قسمت آزمائی جائے۔ چنانچہ تقریباً

1976-77 میں آواز کا کیریئر شروع کیا۔ اس وقت ریڈیو کی حیثیت ایک اکیڈمی کی سی تھی۔ سو ابتدائی تربیت ریڈیو پر ہوئی اور اس کے بعد ٹی وی کی طرف آنا ہوا۔

”پھر ٹی وی پر کون لایا؟“

”اس زمانے میں کراچی میں کئی جگہوں پر ادبی نشستیں بہت ہوا کرتی تھیں۔ ہم انجمن جدید مصنفین کی نشستوں میں باقاعدگی سے شرکت کرتے تھے جہاں ایک روز افسانہ نگار ”شاہد کمرانی“ نے کہا کہ آپ کی آواز بہت ریڈیائی ہے کیا آپ ریڈیو پر کچھ کرتے ہیں؟ میں نے کہا جی ہاں۔۔۔۔۔ بولے میں ٹی وی میں نیوز پروڈیوسر ہوں کیا آپ خبریں پڑھ سکتے ہیں۔“ میں نے بڑی خود اعتمادی سے کہا ریڈیو کے تجربے کے بعد بہت سے لوگوں سے بہتر خبریں پڑھ سکتا ہوں۔ کہا ٹھیک ہے۔ فلاں دن آڈیشن کے لیے آجائے گا۔۔۔۔۔ آڈیشن میں تقریباً تین سو لوگ آئے تھے جن میں صرف دو لوگ منتخب ہوئے۔ ان میں ایک میں تھا دوسرا ایک نو جوان۔ جو آن ایر ہونے کے بعد چھوڑ گیا۔۔۔۔۔ مجھے پڑھنے کے لیے مقامی خبریں دی گئیں بعد میں اچھی پرفارمنس کی وجہ سے خبرنامہ دے دیا گیا اور کچھ ہی عرصے کے بعد میں آؤٹ

اسٹینڈمگ کیٹگری میں آ گیا۔“

”گڈ۔۔۔۔۔ کتنے سال خبریں پڑھیں اور خبروں

کے علاوہ آواز کا قاعدہ کہیں اٹھایا آپ نے؟“

”میں نے تقریباً تیس چوبیس سال خبریں پڑھیں اور صرف خبریں ہی نہیں پڑھیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ بے شمار دستاویزی فلموں کے بیک گراؤنڈ میں اپنی آواز کا استعمال کیا۔ اور 1986 سے لے کر 2000ء تک سینما ہاؤسز میں چلنے والی نیوز ریل پاکستان کا تصویری خبرنامہ بھی کرتا رہا۔ یعنی اس میں بھی میری آواز ہوتی تھی۔ میں نے کمرشلز بھی کیے۔ بے شمار کمرشلز میں بھی میری آواز ہوتی تھی۔“

”کیا آج کی طرح آپ کے وقت میں بھی خبریں لائیو ہوتی تھیں کیا؟“

”جی۔۔۔۔۔ جی بالکل۔۔۔۔۔ خبریں ہیٹھ لائیو ہوتی تھیں اور جب لائیو کوئی بھی پروگرام کر دیا تو اعصاب پر اس کا دباؤ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اور یہ تو پھر خبریں تھیں اور سب ہمیں ہی دیکھ رہے ہوتے تھے تو اعصاب پر دباؤ بہت زیادہ ہوتا تھا۔“



” شاید اس لیے کہ ایک ہی چینل تھا۔  
ایکساٹھٹ تو ہوتی ہوگی کہ سب ہمیں دیکھ رہے  
ہیں؟“

”جی..... بالکل..... جب پہلی بار نیوز پڑھی تو  
بہت زیادہ ایکساٹھٹ تھی کہ ایک ہی چینل تھا اور  
کروڑوں لوگوں کی نظریں ہم پر مرکوز تھیں، اس لیے  
پہلی بار اعصابی دباؤ بھی بہت تھا۔ مگر پھر آہستہ آہستہ  
یہ دباؤ کم ہوتا گیا اور نیوز پڑھنے اور کیمرے کا سامنا  
کرنے کی عادت بھی ہوتی گئی۔“

”اس وقت اردو کے تلفظ پہ بہت توجہ دی جاتی  
تھی۔ اب نہیں..... کیا آپ اس بات کو محسوس کرتے  
ہیں؟“

”ریڈیو کی تربیت کی وجہ سے ہمیشہ تلفظ اور لب  
و لہجہ کا خیال رکھا گیا جسے لوگوں نے بہت سراہا۔ کبھی  
کبھی سندھی نیوز کاسٹر کے نہ آنے پر سندھی خبریں بھی  
پڑھنی پڑتی تھیں اور میرے انداز کو سندھی دوستوں  
نے بھی بہت پسند کیا۔ اور آپ کے سوال کا دوسرا حصہ  
کہ کیا میں اس بات کو محسوس کرتا ہوں تو کیوں  
نہیں..... اور میں آپ کو بتاؤں کہ ہمارے زمانے  
میں تو فارسی، عربی اور اردو بنیادی مضامین کی حیثیت  
سے پڑھائے جاتے تھے اور فارسی اور عربی سے اردو کو  
سمجھنے میں آسانی ہوتی تھی۔ آج کل اول تو یہ مضامین  
پڑھائے ہی نہیں جاتے اور اگر پڑھائے بھی جاتے  
ہوں تو بچے اس پر توجہ نہیں دیتے۔ نتیجہ، ہوتا ہے کہ  
اردو بہت کمزور رہ جاتی ہے۔“

ویسے بھی اب ہمارے یہاں اردو ایک واجبی سا  
مضمون رہ گیا ہے۔ اس میں نئی نسل کا کوئی تصور نہیں  
ہے بلکہ پرانی نسل نے ہی یہ سوچ لیا ہے کہ انگریزی  
پڑھانی ہے۔ بس..... اس کی وجہ سے ”نہ املا“ درست

ہے اور نہ ہی تلفظ درست ہے۔ بچوں کو یہی نہیں معلوم  
ہوتا کہ یہ لفظ عربی کا ہے یا فارسی کا ہے۔ وہ جیسا سن  
لیتے ہیں ویسا پڑھ لیتے ہیں۔ اب تو اردو کا اسم الف  
بھی خطے میں پڑ گیا ہے کیونکہ اب ”رومن زبان

میں اردو لکھی اور پڑھی جاتی ہے۔“ زیر پریش کا کچھ  
اتنا پتا نہیں ہوتا اور Vocabulary بھی بہت کمزور  
ہے۔ کسی بھی واقعے کو بیان کرنے کے لیے رپورٹر  
کے پاس الفاظ کا ذخیرہ نہیں ہے۔ مثال کے طور پر  
میں ایک ٹی وی چینل پر دیکھ رہا تھا کہ کہیں کسی جگہ پر  
”بم“ دھماکہ ہوا تو اسکرین نے رپورٹر سے کہا کہ جہاں  
دھماکہ ہوا ہے وہاں آپ موجود ہیں تو ذرا وہاں کی  
صورت حال بتائیے تو رپورٹر نے کہا کہ میں عین اسی  
جگہ پر موجود ہوں اور یہاں بہت گہما گہما پائی جاتی  
ہے۔ حالانکہ اس کو لفظ گہما گہما کے بجائے لفظ  
”افرا تفری“ استعمال کرنا چاہیے تھا۔ شاید اسے  
مناسب یا موڈوں لفظ نہیں مل رہا تھا۔

ایک ٹی وی چینل سے خبر نشر ہو رہی تھی کہ آج  
پرچم سوگ میں سرنگوں“ رہے گا۔ اگر اسکرین نے فارسی  
پڑھی ہوئی یا یہ لفظ بھی سنا ہوتا تو وہ ”سرنگوں“ کو  
سرنگوں نہ پڑھتا۔

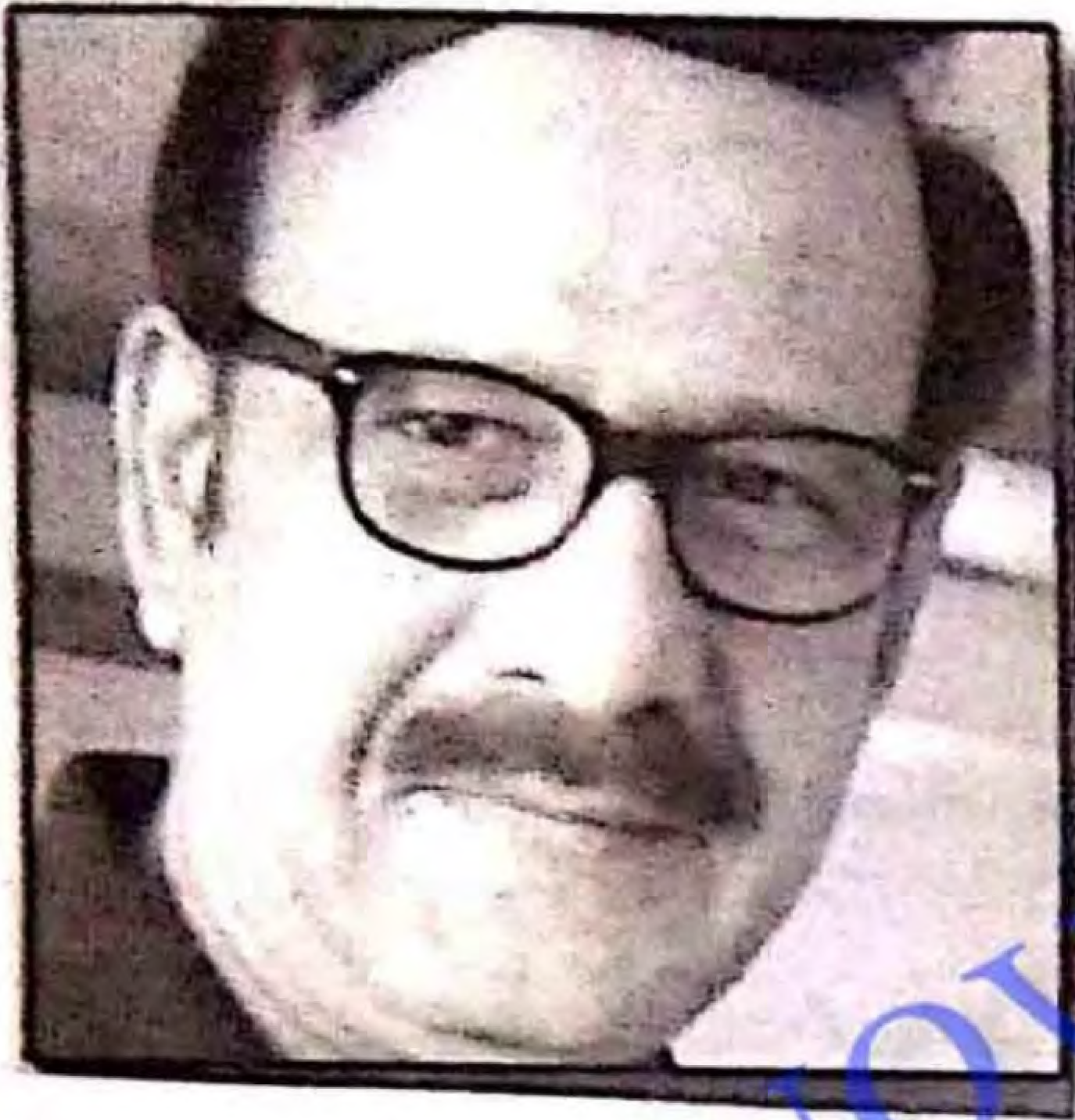
پیرپکارا صاحب کا انتقال ہوا تو تمام چینل ایک  
ہی خبر نشر کر رہے تھے کہ ”ان کے انتقال کے بعد ان  
کے گھر پر ”مریدین“ جمع ہونے شروع ہو گئے ہیں۔  
میں چند گھنٹے تو سنتا رہا۔ پھر تنگ آ کر میں نے ایک  
چینل پر فون کر دیا کہ یہ حملہ صحیح کریں۔ ”مریدین“  
نہیں ہوتا آپ مریدین کہیں، کیونکہ مریدین کا  
مطلب دو مرید ہوتا ہے اور مریدین کا مطلب بہت  
سارے مرید ہوتے ہیں.....

ریڈیو میں تلفظ کی درستی کے لیے ”آغا جان“  
(ایک پوزیشن ہوا کرتی تھی جس میں آغا جان کام  
کیا کرتے تھے) ہوا کرتے تھے جو مرزا یاسین چنگانہ  
چٹیزی کے بیٹے تھے جو اسٹیشن ڈائریکٹر کے تلفظ بھی  
درست کیا کرتے تھے یا ٹوک دیا کرتے تھے اور  
”بخاری“ صاحب کو بھی ٹوک دیا کرتے تھے اور بخاری

صاحب سنتے تھے اور برا نہیں مانتے تھے۔ تو جب ہم  
ایسے تلفظ سنتے ہیں تو بد مزہ ہو جاتے ہیں۔“

”پلی ٹی وی کا پرانا دور یاد آتا ہے آپ کو؟“





”بہت یاد آتا ہے۔ وہ دور بہت اچھا تھا۔ نوز روم کا ماحول بہت اچھا تھا۔ بعد میں جب میں نے ایک غیر ملکی خبر، رساں ادارے کے ساتھ کام کرنا شروع کیا بطور نوز پروڈیوسر کے تو کچھ دن تو خبریں بڑھتا رہا لیکن بعد میں بہت زیادہ مصروف ہو جانے کے سبب خبریں پڑھنے کو خیر باد کہہ دیا۔“

”جیتلو بہت ہیں، کون کیا دیکھے، اب تو پہچان بھی مشکل سے ہوتی ہے۔ آپ لوگ تو راتوں رات شہرت پاتے تھے۔“

”جی۔۔۔ بالکل۔۔۔ اس وقت صرف ایک جیتلو تھا اور پہچان بہت آسان تھی اور لوگ یاد رکھتے تھے البتہ سلیکشن کا معیار بہت سخت تھا۔ آج کل تو معیارات کا خیال ہی نہیں رکھا جاتا۔“

”پہلے زمانے میں پی ٹی وی کا بلکہ پی ٹی وی کا ماحول بہت اچھا ہوتا تھا۔ مگر کہا جاتا تھا کہ ماحول خراب ہے۔ جبکہ آج کل ماحول خراب ہے تو کہا جاتا ہے کہ ماحول اچھا ہے۔ آپ کچھ کہیں گے اس بارے میں؟“

”پی ٹی وی کے ماحول کی خرابی کی جب ہم بات کرتے ہیں تو نیوز کے ماحول کے بارے میں تو میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ بہت اچھا تھا۔ لیکن ڈرامہ وغیرہ کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ وہاں ہر طرح کے لوگ ہوتے تھے۔“

”آپ کے وقت میں ہاتھ سے لکھی ہوئی خبریں پڑھی جاتی تھیں۔ اب ایسا نہیں ہے۔ تو مشکل ہوتی تھی آپ کو؟“

”پی ٹی وی پر ہمیشہ لائیو خبریں ہوتی تھیں۔ اور ظاہر ہے کہ اعصاب پر اس کا بہت دباؤ بھی ہوتا تھا۔ ابتداء میں ہاتھ سے لکھی ہوئی خبریں پڑھی جاتی تھیں اور کہیں کہیں پڑھنے میں دشواری بھی ہوتی۔ بعد میں کمپوزنگ آگئی۔۔۔۔۔ بریکنگ نیوز کافیشن بعد میں

متعارف ہوا۔ اور ہاتھ سے لکھی ہوئی خبریں پڑھتے وقت حماقتیں بھی سرزد ہو جایا کرتی تھیں۔“

”دیگر جیتلو آ جانے سے پی ٹی وی کو لوگ بھول گئے ہیں۔ پی ٹی وی ابھی تک آزاد کیوں نہیں ہوا؟“

”پی ٹی وی کا دیگر جیتلو سے موازنہ کرتے ہوئے لوگ بھول جاتے ہیں کہ سرکاری پی ٹی وی دنیا میں ہر جگہ اسی طرح حکومتی پالیسی کے تحت ہی چلتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ہمارے یہاں تو پی ٹی وی کافی حد تک آزاد ہے۔ اور پی ٹی وی کے لوگوں کو آج بھی واضح طور پر پہچانا جاتا ہے۔ خاص طور پر پرانی نسل کے لوگ فوراً ہی پہچان میں آ جاتے ہیں۔ نئی نسل البتہ پرانے لوگوں کو نہیں جانتی۔ پرانے لوگ بہت اچھے طریقے سے ملتے ہیں اور سب کو عزت دیتے ہیں۔“

”آج کل کے نیوز کاسٹرز کے لیے آپ کیا کہیں گے؟“

”نئی نسل کے نیوز کاسٹرز کو زبان و بیان پر مکمل عبور حاصل نہیں ہے۔ اس طرح سے جس طرح عبور حاصل ہونا چاہیے۔ جیسے ہمارے دور میں ہوتا تھا۔“

”آپ کے بچے اس فیلڈ میں ہیں؟“

”نہیں۔۔۔ میرے بچے اس فیلڈ میں نہیں آئے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے ان پر کوئی چیز مسلط نہیں کی۔ انہیں جس شعبے سے دلچسپی تھی وہ اسی میں چلے گئے۔“